پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

لائبریری اینڈ ... پوائنٹ
ساؤنڈ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
نئے اور پرانے ... خرید و فروخت کی جاتی ہے

انشائیہ — جون ایلیا — 7
سال کے چار موسموں کے علاوہ پانچویں
موسم کی آمد کا شاخسانہ، جون ایلیا کی زندہ تحریر

آپ کے خط — مدیر اعلیٰ — 8
سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و
شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

آخری شمع — الیاس سیتاپوری — 16
ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

سسپنس ڈائجسٹ

چھٹکارا — کاشف زبیر — 45
تاریک راہوں پر لرزاں سائے اور.....
مجرمانہ سرگرمیوں کا احوال

پسِ زنداں — طاہر جاوید مغل — 64
دیارِ غیر میں اپنوں سے دور کسی اپنے کی تلاش میں سرگرداں
محبتوں کی کرم فرمائیاں اور رقیبوں کی عنایتوں کی داستان

چبھن — محمد خواجہ — 101
ایک باضمیر سوداگر کے بھید
بھرے سفر کا مختصر احوال

کلاون ڈے — سلیم انور — 103
پردیسی ماحول میں ایک شاطر
کھلاڑی کا دلچسپ تماشا

گواہی — تنویر ریاض — 109
آزاد معاشرے کی سرکشی
اور بندشوں کا احوال

عقدہ — ملک صفدر حیات — 120
ملک صاحب کی ڈائری سے زیست کے
اسرار و رموز سمجھاتا ایک اور قصہ

جواری — ثمر عباس — 143
منزلوں سے بے خبر ایک
بلند پرواز پنچھی کی سمتوں کا ماجرا

محفلِ شعر و سخن — قارئین — 150
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

اندھیرا — ڈاکٹر شیر شاہ سید — 153
ہجرتوں میں زندگی تمام
کرنے والوں کی روداد الم

ماروی — محی الدین نواب — 158
ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی
عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک طویل سلسلہ

مالِ غنیمت — ڈاکٹر مقبول حسین — 203
وعدوں کا دھنی اور ضد کا پکا
ایک ایسے ہی مستقل مزاج کا ماجرا

خوردہ فروش ولی — ضیا تسنیم بلگرامی — 217
حقوق اللہ اور حقوق العباد کے رموز
سے آگاہ کرتی ایک یادگار تحریر

بے داغ منصوبہ — امجد رئیس — 231
مالِ مفت دلِ بے رحم کی عملی
تفسیر اور مجرم کی خوش فہمیاں

انوکھی سزا — بابر نعیم — 235
غلط اقدام اٹھا کے درست نتائج
کی امید لگانے والے بے وقوفوں کا قصہ

چال — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی — 242
بھولے ہوئے رشتوں اور بھٹکے ہوئے رستوں کے
درمیان ایک روٹھی ہوئی حسینہ کی ہنگامہ خیزیاں

جلد44 • شمارہ02 فروری 2014 • زرِسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

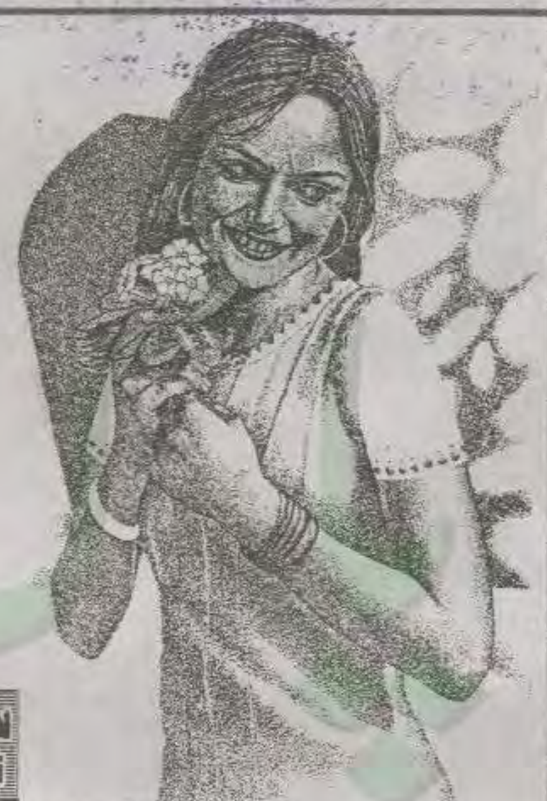

انشائیہ

مشاعرہ

جون ایلیا

مشاعرے کے معنی ہیں شاعروں کا ایک دوسرے کو شعر سنانا یا شاعروں کا فن شعر گوئی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا۔ پہلے معنی کے پیش نظر غیر شاعر سامعین کا مشاعرے سے کوئی تعلق نہیں، یہ شاعروں کا آپس کا معاملہ ہے۔ اب رہے دوسرے معنی تو ان معنی کی رو سے مشاعرے کا سامعین سے بنیادی تعلق ہے اس لیے کہ جب شاعروں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا تو اس مقابلے کا فیصلہ کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو شاعر نہ ہوں اور اگر شاعر ہوں تو اس مقابلے میں شامل نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اب ناقد کہلاتے ہیں۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ عرب کے دو عظیم شاعروں میں مقابلہ ہوا۔ اس مقابلے کا فیصلہ کرنے کے لیے ان دو شاعروں میں سے ایک شاعر کی بیوی مقرر کی گئی جو شاعری کی بہت بڑی پارکھ تھی۔ اس خاتون نے اپنے شوہر کی نظم کے خلاف اور حریف شاعر کی نظم کے حق میں فیصلہ دیا۔ عجب خاتون تھی۔ اس نیک بخت خاتون کا انجام کیا ہوا، یہ بات مجھے یاد نہیں رہی بہر حال اگر ہم میں سے کسی کی بیوی ہماری تخلیق کے خلاف اور ہمارے حریف کی تخلیق کے حق میں فیصلہ دیتی تو ہم اسے طلاق دے دیتے۔ ہمارے یہاں مشاعرے کا مفہوم مختلف ہے اور اپنے اس مفہوم کے پیش نظر مشاعرہ صرف اردو زبان سے مخصوص ہے۔ عربی میں مشاعرے کا جو دوسرا مفہوم ہے یعنی دو شاعروں کا باہمی مقابلہ، اس مفہوم کے اعتبار سے اردو مشاعرے اور عربی مشاعرے کی کیفیت میں قریبی مناسبت پائی جاتی ہے۔ اردو مشاعرے میں بھی دو شاعروں کے درمیان تو نہیں، مشاعرے میں شریک ہونے والے تمام شاعروں کے درمیان خواہ مخواہ مقابلے کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فضا کے پیدا کرنے میں سامعین حسب ذوق اور بر بنائے جانبداری بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اس کے نتیجے میں کوئی ایک شاعر یا چند شاعر داد و تحسین کی بنیاد پر مشاعرے کے فتح مند شاعر قرار پاتے ہیں۔ مگر فتح مندی، کا یہ فیصلہ ایک ہنگامی فیصلہ ہوتا ہے اور اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی لیکن مشاعرے کے عام سامعین بلکہ تماش بین اس شاعر کو جسے سب سے زیادہ داد ملے اور جس سے بار بار شعر سنانے کی فرمائش کی جائے سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بدترین شاعر یا بہت معمولی شاعر اپنے اشعار کے سطحی اور اپنی پڑھت کے انداز کے موثر ہونے کی وجہ سے بہترین شاعر قرار پاتا ہے لیکن اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بڑے شاعروں کو مقابلے کی اس سطح سے بلند سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کم یا زیادہ داد پانا کسی کسوٹی کی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ مشاعروں کے انعقاد کا مقصد یہ فیصلہ کرنا ہرگز نہیں ہوتا کہ کون شاعر یا کون کون سے شاعر بڑے یا بہترین شاعر ہیں۔

اردو کے قدیم مشاعروں کے سامعین معاشرے کے وہ لوگ ہوتے تھے جو اعلیٰ ادبی اور فنی شعور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا تعلق اعلیٰ طبقے سے ہوتا تھا۔ اس زمانے میں مشاعرہ کوئی عوامی ادارہ نہیں تھا۔ یہ مشاعرے درباروں اور امراء کی حویلیوں میں منعقد ہوتے تھے۔ مشاعرے کو عوامی حیثیت اس وقت حاصل ہوئی جب کالجوں اور یونیورسٹیوں یا دوران سال کی خاص سماجی تقریبات کے مواقع پر مشاعرے برپا ہونے شروع ہوئے۔ سیاسی تحریکوں نے بھی مشاعروں کو ایک خاص اہمیت بخشی۔ بہر حال "عظیم الشان" مشاعرے بیسویں صدی کی پیداوار ہیں اور اردو زبان کے خواص و عوام کے لیے سب سے اہم تہذیبی ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے خواص اور عوام کے فرق کو دور کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

مشاعرے کا تذکرہ ہو رہا ہے تو اس ضمن میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ مشاعرے کی نسبت سے دیکھا جائے تو شاعری کی چار قسمیں متعین ہیں۔ شاعری کی ایک قسم وہ ہے جو اچھی بھی ہو اور مشاعرے میں بھی پسند کی جائے۔ دوسری قسم وہ ہے جو اچھی ہو مگر مشاعرے میں داد حاصل نہ کر سکے۔ تیسری قسم وہ ہے جو بری ہو اور مشاعرے میں بھی بری قرار پائے اور چوتھی قسم وہ ہے جو بری ہو مگر مشاعرے میں بہت پسند کی جائے۔ بہر حال مشاعرہ ایک ایسا خطرناک ہنگامہ ہے جس میں شاعر کی عزت لحہ لحہ خطرے کی زد میں رہتی ہے۔ یہاں مجھے برادر عزیز معراج رسول نے ایک خاص معاملے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جو افراد یا ادارے مشاعرے منعقد کرتے ہیں وہ بلاشبہ قابل داد ہیں اس لیے کہ وہ ایسے "ہنگامے" بھی برپا کر سکتے ہیں جن سے عوام الناس کو مشاعروں سے کہیں زیادہ دلچسپی ہے اور جن کے ذریعے مشاعرے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مالی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اب بعض مثالیں ایسی بھی پائی جانے لگی ہیں کہ مشاعرے ادبی اور تہذیبی ذوق کی تسکین کے بجائے محض تجارتی مقصد کے پیش نظر برپا کیے جاتے ہیں اور ان میں ایسے "شعرا" اور "شاعرات" کو خاص الخاص طور پر مدعو کیا جاتا ہے جو محض گویوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس قبیل کے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو خود کہتے ہیں اور بہت برا کہتے ہیں۔ مگر اپنی گائیکی کی وجہ سے مشاعرے کو تہ و بالا کر ڈالتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو خود نہیں کہتے بلکہ کسی "مرد غیب" سے کہلوا لاتے ہیں اور اپنے ٹیلنٹ کے زور پر مشاعرے کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس قسم میں شاعرات کی تعداد زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ صورت حال بہت عام ہے۔ ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ترنم سے پڑھنے والے شاعروں کی تنقیص کریں۔ ترنم سے پڑھنے والے بے شمار شاعر ایسے بھی ہیں جن کی ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مشاعرے کے عوام پسند اور خواص پسند تہذیبی ادارے کو اب آہستہ آہستہ محض ایک سطحی قسم کے تفریحی ہنگامے کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور اس کے ذمے دار وہ افراد اور ادارے ہیں جو مشاعروں کو اپنا تجارتی مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ وہ معاملہ ہے جس کی شدید ہمت شکنی کی جانی چاہیے۔ کیونکہ اب مشاعرہ ہی وہ سب سے بڑا ادبی اور معیاری ادارہ رہ گیا ہے جو اعلیٰ ذہنی فرحت بخشی اور تہذیب نفس کا فرض انجام دیتا ہے اور اس کی اس محترم اور اہم حیثیت کی حفاظت کرنا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔

آپ کے خط

محترم قارئین

السلام علیکم!

فروری 2014ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے...... اور ہاتھوں سے ہاتھوں کا یہ سلسلہ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا مظہر ہے۔ فروری کا مہینا اب ایک مخصوص دن کے حوالے سے اپنی شناخت بنا چکا ہے...... 14 فروری ویلنٹائن ڈے...... دوسرے بے شمار دنوں کی طرح ہم نے یہ دن بھی منانا سیکھ لیا۔ قطع نظر کہ اس کی تاریخ کیا ہے، چاہتوں کا اعادہ کرنا اچھا سہی مگر اکثریت نے جس طرح ہر ایجاد اور دریافت کا غیر مناسب اور بے جا استعمال کر کے اسے مضر بنا دیا ہے بالکل اسی طرح اس دن کی افادیت اور اہمیت کو بھی گہنا دیا ہے...... یہ سب دیکھ کر بہت ضروری ہے کہ اپنا مقام، اپنی اہمیت اور اپنے معیار کو جانتے، جانچنے کا شعور بیدار کیا جائے...... نوجوان نسل ہر قوم کا سرمایہ ہوتی ہے اور ہر سرمائے کی قدر و قیمت کا انحصار اس کے استعمال پر ہوتا ہے...... لہٰذا امید ہے کہ ہمارے ان بند لفظوں میں دیا گیا پیغام نوجوان نسل تک پہنچ گیا ہوگا...... تفریح وہی اچھی جو ماحول کو آلودہ نہ کرے۔ آلودہ تو ہمارے ملک میں بہت سی چیزیں ہیں مثلاً کرپشن ہمارا مزاج، دھاندلی ہمارا معیار اور دروغ گوئی ہمارا وتیرہ بن گیا ہے...... جس طرح ہمارے حکمرانوں نے ہمارے عوام کی عام فہم گفتگو کو بھی اب وہی انداز اور موضوعات عنایت کر دیے ہیں...... پہلے دو چار لوگ جمع ہو کر خاندانی گفتگو اور خیر و عافیت کی باتیں کرتے تھے اب...... ملکی حالات و واقعات...... بجلی اور گیس کے آنے اور جانے کے اوقات زیر بحث رہتے ہیں...... سال کے آغاز میں ہی دو دھماکوں نے نہ صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہلا کر رکھ دیا ہے بلکہ عوام کو بھی خوفزدہ کر دیا ہے۔ بہرحال عجیب حکمران اور بے چارے غریب عوام...... گویا ملک رفتہ رفتہ عجیب و غریب کا مرکب بنتا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آنے والے دن اپنے دامن میں عوام کے لیے ڈھیر ساری خوشیاں اور ملک کے لیے امن و سلامتی کا پیغام لائیں۔ (آمین) ان سب باتوں کے باوجود ابھی ہماری محفل میں کچھ انفرادیت باقی ہے جہاں مثبت سوچ اور رویوں پر بات چیت کی جاتی ہے...... تو چلیے دیکھیں کس بات کی ہے۔

✠ **ڈاکٹر نعیم اکبر**، مانسہرہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "برسوں کی ترتیب سے آگاہی کے باوجود کہ سسپنس کے دیدار کون سی تاریخ کو ہوتے ہیں مگر ہم مانند عاشق نامراد تین چار دن پہلے ہی چکر لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ بہرحال! دیدار یار سے بہرہ مند ہوئے۔ ذاکر انکل نے 2014ء کو ایک گولے میں قید کر رکھا ہے کہ اپنی آمد کا اعلان پھٹ کر فرمائے۔ رب کرے کہ نیا سال امن و سلامتی اپنے ہمراہ لائے۔ میرے دوستو! میں ایک خوشخبری آپ سے شیئر کرنا چاہوں گا کہ ٹماٹر سستے ہو گئے ہیں تقریباً 40 روپے کلو۔ حالانکہ پچھلے سال یہی ٹماٹر 40 روپے کے 5 کلو مل جاتے تھے۔ اب کی مرتبہ 160 سے صرف 40 روپے مجزاتی طور پر کم قیمت ہے۔ لہٰذا ٹماٹر کھائیے۔ ورنہ ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ ٹماٹر کی تصویر بنا کر آئندہ نسلوں کے لیے بطور یادداشت رکھ دیتے ہیں کہ پوتے پوتیوں کو بتلایا کریں گے کہ یہ تصویر ٹماٹر کی ہے جو پندرہ بیس برس قبل اسی سرزمین پر اگا کرتے تھے۔ اب یہ پھل معدوم ہو گیا ہے جس طرح ڈائنوسار اس دنیا سے مٹ گیا معدوم ہو گیا۔ فہرست میں پہنچے، ڈر کے مارے رسالہ ہاتھوں سے چھوٹ کر قدموں میں جا پڑا۔ اللہ معاف فرمائے ہماری پیار کی فہرست اور دائیں بائیں دو چڑیلیں! اف میرا تو کلیجا دہل کر رہ گیا۔ اگلا نمبر آپ کے خط کا تھا۔ جو واقعی آپ ہی کے خط کا مظہر تھا۔ ہمارے خط کا حال تو نوکری سے تیور بتلا رہے تھے کہ بچا ہوا گیا بلیک لسٹ! خیر دو تین سالوں (سال کی جمع) بعد حاضری چاہی تھی ہائے ہائے۔ خطوط پر تبصرہ ادھار رہا۔ اسی محفل سے واحد خوشخبری آمد "پس زنداں" تھی۔ جو فروری میں جلوہ افروز ہو رہی ہے اور ہم آج ہی سے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہیں۔ روشنی کی پکار! بھلا روشنی کو پکارنے اور شور مچانے کی کیا ضرورت۔ روشنی کی ننھی سی کرن بھی بذات خود اعلان ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ روشنی نے نہ ہمیں یاد کیا اور نہ ہی ہمیں پکارا، مگر ہمیں تو آمد اچھی لگی۔ اب ایک نظر ہمارے رائٹرز کی قلم کاریوں پر۔ "ذراہٹ کے" کاشف زبیر صاحب لے کر آئے۔ شیرف ٹاؤن بھوت بنگلا کا ایڈیشن معلوم ہوا تھا۔ مگر ہمارا خیال غلط ثابت ہوا۔ حصول زر کے لیے شارٹ کٹ عموماً جرائم کے زمرے میں آتا ہے اور جرم کو دوام نہیں، لالچ بری بلا ہے۔ کشکول انجام کو پہنچی۔ انوار صدیقی صاحب کو بہت مبارک باد۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب مکافات لے کر آئے۔ عورت کا یہ پرانا ہتھیار ہے اور یقیناً آزمودہ بھی۔ ہماری ہندکو کی کہاوت ہے کہ "گجر کو مت مارو۔ گجر کی گئی کو مارو۔" مرد کی گئی بھی اپنی عزت ہے۔ جب بات اپنی عزت تک پہنچ جائے تو حضرات کو بہت ہی تکلیف ہوتی ہے۔ ماروی پر تبصرہ ادھار۔ جہیز منظر امام صاحب لے کر آئے۔ محرر فکریہ ہے میرے دوستو! خود بھی سنبھل جاؤ اور اسی لگن میں تمام اہل وطن کو ڈھال دو۔ اسی بات کی تبلیغ کرو۔ دعوت دو کہ سنبھل جاؤ۔ ورنہ داستان تک نہ ہوگی تمہاری داستانوں میں کا مظہر بن جاؤ گے۔ تقسیم محبت میں محمود کے انجام پر رونا آیا۔ مدیحہ فریحہ نے تو معاہدہ کے تحت محمود کی محبت کو تقسیم کر لیا۔ مگر چند دنوں بعد محمود صاحب جمع تفریق ضرب کے مسائل میں الجھے نظر آ رہے ہیں اور محمود کی حالت پر بس تصور ہی تصور میں قہقہے لگا رہا ہوں کہ میاں! ہمارا ایک کے ساتھ یہ حال ہے تو تمہارا 1+1=11 کیا تو کیسا حال ہوگا؟ ہاہاہا!"

✠ **گل مروت**، لکی مروت سے محفل میں شریک ہیں "دھند میں لپٹی ایک صبح 2014ء کا پہلا شمارہ ملا۔ محفل میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے

"تورہ پشتی" (بلیک کیٹ) کو دیکھا۔ تورہ پشتی بی بی، سسپنس والے سب میرے بھائی اور لالا ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، اف اتنا لمبا نام لے کر ہی بندہ تھک جائے۔ منشی حماد لالا، اللہ تعالیٰ آپ سب قیدی بھائیوں کی مشکلات آسان فرمائے۔ مہرین ناز آنٹی، انگور تو آپ نے خود کھائے ہیں۔ اب محفل میں کھٹا ہونے کا واویلا بھی خود مچا رہی ہو۔ اب مغل صاحب کی نئی کہانی کا انتظار ہے۔ ماروی میں کردار ابھی کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ محبوب چانڈیو آگے اور گل کھلائے گا۔ تھرڈ کزن میں وکیل انکل نے ایک بے گناہ کو باعزت بری کروا کر اصل مجرم گرفتار کروا دیے۔ تقسیم محبت میں مدیحہ اور فریحہ جیسی قربانی دینا دل گردے کا کام ہے۔ صحرا نورد درویش کے واقعات بہت پسند آئے۔ جوڑا میں شون اور مائیکا کا انجام ہوا۔ جہیز ایک کڑوا سچ ثابت ہوئی۔ کاروبار میں بے ایمان بیوپاری پھر بازی لے گیا۔ مٹی کا فساد میں عبدالرحمن نے ہر زخم سہہ کر بھی اف تک نہیں کیا۔ مکافات میں عبداللہ کے انجام پر دکھ ہوا، اوور آل سسپنس کا شمارہ بیسٹ رہا۔"

✠ **سید اکبر شاہ**، اوگی مانسہرہ سے تشریف لائے ہیں "سردی کی وجہ سے کانپتے ہاتھوں میں سسپنس آیا تو عجیب سی گرمائش کا احساس ہوا۔ نئے سال کے ابتدائی مہینے کا شمارہ بیس تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل گرل اور تھوہر کے پودے پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ "پھولوں کو دیکھنا ہو تو کانٹوں پر نگاہ پڑ ہی جاتی ہے۔" محفل آپ کے خط میں پہنچے۔ بلیک کیٹ کو مسند اقتدار پر قبضہ جمائے پایا۔ آپ کا نام پڑھ کر فلم اسٹار شاہ رخ خان کا ایک ڈائیلاگ یاد آیا کہ "مجھے کالی بلیاں بہت پسند ہیں۔" ویسے صنف وجاہت کو کرخت کہنا ٹھیک نہیں۔ مہرین ناز، میں عام لوگوں کی طرح خامیوں کے بجائے خوبیوں پر نظر رکھتا ہوں اور کھل کر اظہار بھی کرتا ہوں اس لیے آپ کو خوشامد لگا۔ سعدیہ بخاری، آپ کا تبصرہ پڑھ کر آپ ہی کی طرح مجھے بھی محاورہ یاد آیا کہ "کھسیانی بلی کھمبا ہی نوچے"۔ ابرار وارث صاحب، تبصرہ بہت زبردست تھا آپ کا۔ مسٹر اینڈ مسز بابر عباس، آپ اپنا تبصرہ کہانی کی شکل میں بھیج دیا کریں تاکہ کہانیوں کی جگہ شائع ہو اور ہمارے مختصر مختصر تبصروں کے لیے جگہ باقی رہے۔ محفل میں تبصرہ نہ پا کر دکھ ہوا۔ روشنی کی پکار اچھی تھی۔ کائنات اینڈ جانوی خوش آمدید۔ رانا منشی کے مشورے اچھے تھے۔ حسب معمول ماروی سے ابتدا کی۔ محبوب علی کی دیوانگی میں اضافہ نظر آیا۔ کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ کاشف زبیر کی ذراہٹ کے میں شیرف ٹاؤن کے بارے میں پڑھنے کو ملا جہاں شیرف نے انصاف اور قانون کا منفرد نظام قائم کیا تھا۔ منظر امام کی جہیز بہت ہی دلچسپ کہانی تھی۔ اینڈ میں بھوت، پاکستان آیا ہوگا۔ بیگ صاحب کی تھرڈ کزن پڑھی۔ حسد کی آگ میں جلنے والوں کا انجام سکون بخش تھا۔ اختتامی صفحات پر موجود نشور ہادی کی تقسیم محبت کا مطالعہ کیا۔ اینڈ میں محمود کو دو دلہنیں ملیں، کیا خوش قسمتی ہے۔ اشعار معیاری تھے۔"

✠ **ہارون رشید**، کاٹلنگ، مردان سے تبصرہ کر رہے ہیں "سسپنس تو ہر مرتبہ انتظار کرواتا ہے لیکن اس بار تو حد کر دی۔ 22 دسمبر کی ایک ابر آلود شام کو کزن نے مردان سے لا کر دیا۔ سرورق کو دیکھے بغیر سیدھا محفل میں پہنچا اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارا خط ایک مرتبہ پھر بلیک لسٹ میں شامل تھا۔ خوب صورت رنگوں سے مزین اس دفعہ سرورق کا اسٹائل ہی کچھ نرالا تھا، ہمیں تو بہت اچھا لگا۔ یہ لڑکی غالباً طاہرہ گلزار تھی جو کیلے میں اپنی سالگرہ منا رہی تھی۔ اس بار سلطنت کے تخت پر بلیک کیٹ جلوہ افروز تھی۔ جناب کے قلم کا نشتر ایک خنجر کی طرح تیز ہے۔ عاصم اقبال! یار بڑا زبردست لکھتے ہو، قلم سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ یار حماد! دکھی کروایا آپ نے ہم کو۔ بڑی سیڈ منظر کشی کرتے ہو۔ ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اور سب اسیروں کو ان کال کوٹھڑیوں سے نجات دلا دے۔ مہرین ناز! کیا کہہ رہی ہو آپ، اکبر خان تو A-one انسان ہے۔ مجھے تو کہیں سے بھی خوشامدی نہیں لگ رہا۔ روشنی رشید صاحبہ کافی عرصہ بعد نظر آئیں موصوفہ کو اپنے پرستاروں کے لسٹ میں ہمارا نام بھی لکھنا چاہیے۔ اپنے پرانے دوستوں کو محفل میں واپس لے آنا آپ کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بابر عباس صاحب اپنے خطوں کی حالت زار پر روتے نظر آئے، خطوط کی محفل میں۔ طاہر جاوید مغل کی نئی سلسلہ وار کہانی کا اشتہار دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ قوی یقین ہے کہ یہ کہانی لازوال داستان مسافر کی کمی کو پورا کرے گی۔ اپنے فیورٹ رائٹر انوار صدیقی کی کہانی کشکول کی آخری قسط ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ مجھے افضل خان کی فکر تھی لیکن شکر ہے اسے کچھ نہیں ہوا۔ ویلڈن انوار صدیقی صاحب۔ باقی کوئی بھی کہانی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ کیونکہ اس وقت جسم تیز بخار سے تپ رہا ہے، ساتھ ساتھ نزلہ بھی ہے۔ یہ سسپنس کی محبت اور دل کی طاقت ہے جو اس حالت میں خط لکھ رہا ہوں۔ (بہت شکریہ جناب) آخر میں دوستوں سے حضرت علیؓ کا قول شیئر کرنا چاہوں گا، وہ کہتے ہیں کہ "زمین کے اوپر عاجزی سے رہنا سیکھو تو زمین کے نیچے سکون سے رہ پاؤ گے۔"

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے چلے آ رہے ہیں "قارئین اور سسپنس دوستوں کو آنے والے سال نو کی بھرپور مبارکباد۔ یہ صدا ہر دل کی و ہر بشر کی ہے۔ پوری دنیا امن و امان کا گہوارہ بن جائے۔ انشائیہ بھی امید سے پر امید ہے کہ یہی زندگی ہے، یہی زندہ رہنے کی پہچان ہے۔ محفل میں پہنچے۔ سرفہرست بلیک کیٹ نظر آ رہی تھیں تو مبارک باد۔ کیٹ بلیک ہو یا وائٹ اچھی ہوتی ہے، بشرطیکہ پنجوں کا ذکر نہ ہو۔ طویل غیر حاضری کے بعد خوش آمدید۔ خدا خدا کر کے کشکول بھی ختم ہوئی۔ امید ہے "پس زنداں" طاہر جاوید مغل کی بہتر سے بھی بہت بہتر ہوگی۔ اور ماروی عشق و عاشقی کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ سینئر قلم کار محی الدین نواب صاحب کی اہلیہ کی رحلت پر تعزیت کا اظہار، اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند کرے (آمین) الیاس سیتاپوری کی مٹی کا فساد تاریخ کے دریچوں سے پڑھ کر مزہ آیا اور یہ بھی واضح ہوا کہ تخت ہو یا تختہ عورت کا کردار مرکزی رہا۔ ذراہٹ کے کاشف زبیر کی اچھی تحریر تھی۔ جہاں دو روایتی چیزوں نے اپنی روایت کے مطابق ہی رد عمل کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی مکافات سے یہ ثابت ہوا کہ خواہ کتنی ہی ساعتیں اور مدتیں گزر جائیں مگر عورت اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے انتقام کو کبھی بھی نہیں بھولتی۔ فن کار، کاروبار اور منظر امام کی بھوتیات نے کافی محظوظ کیا۔ صحرا نورد درویش نے ایمان کو جلا بخشی۔ خس کم اور جوڑا نے بھی اچھا تاثر دیا اور آخری صفحات کی کہانی، اچھوتی کہانی کے روپ میں، بہت اچھی لگی۔"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے تشریف لائے ہیں "نئے سال کا پہلا شمارہ 18 دسمبر کو مل گیا۔ سرورق نئے سال کی مناسبت سے خوب رہا۔ انشائیہ و اداریہ بھی نئے سال میں حالات کی بہتری کی امید کرتے نظر آئے۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط غائب پایا پھر بلیک لسٹ پر نظر ڈالی تو میرے علاوہ اور بھی "خانیوالیے" وہاں استراحت فرما رہے تھے۔ کرسی صدارت پر بلیک کیٹ کو چھڈتے پایا تو بے اختیار راستہ کاٹنے والی بلی یاد آ گئی۔ تمام صنف

WWW.PAKSOCIETY.COM

وجاہت کو خوب لتاڑنے کے بعد راستہ کاٹ کر یہ جا وہ جا۔ آخر مبارکاں کہ رسم دنیا بھی یہی ہے۔ اشفاق شاہین! جیتے رہو بہت اچھی تجویز دی ہے، اول، دوم اور سوم اشعار کے انعام کی۔ مظہر سلیم! ہم ہر کسی کو اس کی ضرورت کے مطابق ڈوز دیتے ہیں۔ آپ کو بونگیاں چاہیے تھیں مل گئیں۔ اب خوش؟ کائنات مریم وغیرہ آپ شاید محفل کو سرسری سا پڑھتی رہتی ہیں ورنہ تو قیصر اقبال وہ خوش نصیب ساتھی ہیں کہ سال میں 3 بار وہ کرسی صدارت پر قبضہ جما چکے ہیں، آپ کی سعدیہ دیدی شاک پروف ہیں۔ زویا اعجاز! ابھی یہاں تو زبان بندی کا وعدہ نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ ہمارے پیارے سسپنس کی محفل ہے جہاں اظہار رائے کی مکمل آزادی ہے۔ قیصر اقبال! آپ کے سفرنامہ نے اشک بار کر دیا، آپ یہ تصاویر کیا Fecebook پر نہیں لگا سکتے؟ سعدیہ بخاری! ابتدا آپ کی طرف سے ہوئی، اب آپ پتھر ماریں تو جواباً پھول تو نہیں آئے گا۔ روشنی کی پکار پہ عرض ہے کہ سب ساتھی آکر چہرہ تو کرا جائیں۔ کشکول کی آخری قسط کا علم ہوا تو سب سے پہلے اس کی طرف رخ کیا۔ آخر کار آکٹوپس کو پکڑ ہی لیا گیا، لیاقت حسین کی روحانی قوت بھی اس میں شامل رہی۔ افضل خان اور شبنم کے علاوہ بھی کئی افراد کی زندگیاں شیخ حامد کے انجام تک پہنچنے سے خوشگوار ہو گئیں۔ نواب صاحب کی ماروی بہت Slow ہے کچھ تیزی لائیں اس میں، ابھی تک ماروی کا رنگ نہیں جم سکا۔ آخری صفحات پر تقسیم محبت درمیانہ درجہ کی کہانی ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی مکافات زبردست رہی۔ عبداللہ کو اس کے کیے کی خوب سزا ملی۔ فن کار کافی خوف ناک رہی۔ لوسی اور جوزف نے کئی افراد کو حنوط کر رکھا تھا۔ منظر امام کی جہیز ہمارے معاشرے کے حالات کی خوب عکاسی کرتی نظر آئی۔ مریم کے خان کی جوڑا سنسنی خیز رہی۔ مصنفہ نے خونی جوڑے کا شک بہت خوب صورتی سے براؤن، جوڈی اور کبھی ڈین، نینسی کی طرف کیے رکھا۔ کترنوں کی کثیر تعداد دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔“

✠ **ثمینہ حبیب**، مری آباد، کوئٹہ سے محفل کی زینت بنی ہیں ”2014ء کا نیا اور پہلا سسپنس عین میری سالگرہ والے دن یعنی 19 دسمبر کی یخ بستہ شام کو رونق افروز ہوا۔ انکل جی آپ نے تو سالگرہ کا تحفہ دے دیا کیونکہ سب سے پہلے اپنا خط ڈھونڈا اور مجھے مل گیا، شکریہ وڈی مہربانی جی۔ اس کے بعد آئی سرورق کی ماہ جبینہ سے ملنے، سرورق بہترین رہا۔ امید کے عنوان سے جون صاحب کا انشائیہ کافی ثقیل رہا۔ اداریہ میں انکل جی کرسمس اور قائداعظم کی پیدائش کے دن کو منانے کے حوالے سے غیر مسلم اور مسلم دنیا خاص کر پاکستان کا موازنہ کر رہے تھے۔ بلیک کیٹ جی آپ کے بقول کچھ کچھ چیچہ گیری سے صدارت ملی اس بار آپ بھی صدارت فرما رہی ہیں اس کے بارے میں کیا خیال ہے......؟ ویسے آپ کا تبصرہ اچھا تھا، مبارکباد قبول فرمائیں۔ اشفاق شاہین! آپ کی ایزی لوڈ کی تجویز نے محظوظ کیا۔ لمبے نام والے بھائی مطلب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، آپ کا نام جاوید احمد صدیقی ہو گا ناں......؟ آپ کا تبصرہ دلچسپ رہا۔ محی الدین نواب صاحب کی پہلی اہلیہ کی وفات کی خبر پڑھی، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور نواب صاحب کو صبر جمیل عطا کرے (آمین) کہانیوں میں ذراہٹ کے واقعی ذراہٹ کے رہی، جب عدل و انصاف نہ ہو ہر طرف چوپٹ راج ہو تو معاشروں میں شیرف جیسے لوگوں کا ظہور بعید از امکان نہیں رہتا۔ پوری کہانی مایاجال کے گرد جاری رقص اجل پر مبنی تھی، کچی عمر کی لغزشوں، معاشروں میں موجود منفی رویوں، ہوس ناکی جیسے تلخ حقائق پر مبنی ڈاکٹر ساجد امجد کی طبع زاد کہانی مکافات اچھی کاوش رہی۔ تھرڈ کزن میں قتل کی تفتیش کے دوران ماضی کے حادثے کی کڑیاں حالیہ واردات سے جوڑتے، ملاتے ہر بار کی طرح بیگ صاحب نے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔“

✠ **عروہ خان**، کراچی سے محفل میں شریک ہوئی ہیں ”دو ماہ بعد محفل رنگ و بو میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش نے قلم اٹھانے پر اکسایا ہے۔ پچھلے ماہ اپنے نام کی تلاش میں ناکامی نے نفیس و نازک احساسات کو خاصا دھچکا پہنچایا۔ وہ تو شکر ہے کہ دل اور جگر لوہے کا پایا ہے ورنہ یہ صدمہ سہارتے ہوئے تو مجھے مر ہی جانا تھا مگر چلو...... ہمیں یہ بھی ہے غنیمت۔ جنوری کے ٹائٹل پر سونالی باندرے سے مشابہت رکھنے والی لڑکی کے علاوہ اگر کوئی چیز قابل ذکر ہے تو وہ ہے نیکلس پر کھلا پھول۔ کالی بلی اور مسند صدارت...... او مائی گاڈ! تو آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ بھی ڈاکر انکل سے کسی طرح کم نہیں۔ مبارکاں۔ بلیک کیٹ صاحبہ! آپ کی ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمایوں سعید کے تبصروں کا تو پسند ہونا سمجھ میں آتا ہے مگر ہمایوں سعید کا فین ہونا! اشفاق شاہین نے جو تجویز دی ہے اور امین مراد انصاری نے طاہرہ گلزار کو جو جواب دیا ہے میں اس سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں...... پلیز بی پوزیٹو اینڈ اسٹے ہیپی۔ بابر عباس بھائی! آپ کا بس چلے تو آپ مدیرہ جی کو ہر مہینے صرف ایک خط شائع کرنے کا مشورہ دیں اور وہ خط صرف آپ کا ہو۔ کشکول کی آخری قسط نے حیران کر دیا۔ مغل صاحب کی نئی تحریر کے بارے میں علم تو تھا مگر یہ توقع نہیں تھی اور نہ ہی کہانی کے انداز سے یہ لگ رہا تھا کہ اگلی قسط ہی آخری ہو گی۔ حقیقت سے کافی دور اور بہت ڈرامائی قسم کا اینڈ تھا اور میرے پاس یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انت بھلا تو سب بھلا۔ اب طاہر صاحب کی تحریر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ماروی کی دوسری قسط نے بھی وہ تاثر نہیں چھوڑا جو چھوڑنا چاہیے تھا۔ مرزا امجد بیگ کی تھرڈ کزن اچھی رہی۔ کاشف زبیر کی تحریر ایک ہی نشست میں ختم کی۔ کیونکہ جس طرح میں اس کہانی میں محو ہو چکی تھی۔ بیچ میں چھوڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روبینہ رشید کی فن کار اپنے طرز کی ایک انوکھی تحریر تھی، جس نے حیرانی کے ساتھ تھوڑے سے خوف میں مبتلا کر دیا اور سلیم انور کی مختصر تحریر میں ہمیشہ کی طرح آخری سطروں میں ہی کہانی کا مقصد پنہاں تھا۔ محفل شعر و سخن میں اظہر حسین پچار، ابرار وارث، رحیمہ سرور اور احمد حسن عرضی کے اشعار زبردست بلکہ زبردست سے بھی آگے کی چیز تھے۔“

✠ **شوکت شہریار**، گورنمنٹ کالونی، اوکاڑہ سے محفل میں شریک ہیں ”لگاتار پانچ دن بک اسٹال کے چکر لگانے کے بعد جب 17 تاریخ کو سسپنس کا دیدار نصیب ہوا تو سب سے پہلے اپنے محبوب رسالے کو چوما، سینے سے لگایا پھر گھر کی جانب دوڑ لگا دی اور ایک ہی نشست میں پورا رسالہ پڑھ لیا (ارے واہ...... محبت اسی کو کہتے ہیں) سرورق حسب معمول شاندار تھا۔ جون ایلیا سے امید لے کر جب محفل میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کرسی صدارت پر ایک محترمہ (کالی بلی) صاحبہ بڑے غصے میں میاؤں میاؤں کرتے ہوئے محفل کی صنف کرخت کو اپنے خونخوار پنجوں سے بھنبھوڑتی نظر آئیں۔ محترمہ (کالی بلی) صاحبہ سے گزارش ہے کہ جو انہوں نے قیصر اقبال صاحب کو سسپنس کا چیچہ گیر کہا ہے تو بات یہ ہے کہ ہر شخص کا سسپنس سے اظہار محبت کا اپنا اپنا انداز ہے اور اگر آپ اس

کو چیچہ گیری کہتی ہیں تو یہ آپ کا ذہنی فتور ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی مٹی کا فساد پڑھی۔ بہترین تاریخی کہانیاں پیش کرنے میں میرے سسپنس کو خاص مقام حاصل ہے۔ کاشف زبیر، ذراہٹ کے لے کر آئے جس میں شیرف کا کردار واقعی ذراہٹ کے لگا۔ کشکول کی آخری قسط پڑھی تو یقین نہیں آیا کہ سب کو انگلی کا ناچ نچانے والا شیخ حامد ایک حقیر بچھو کی طرح مارا جائے گا۔ مکافات میں فیروزہ نے عبداللہ سے خوب انتقام لیا۔ ویسے اچھا ہوتا کہ اگر وہ عبداللہ کو معاف کر دیتی تو دونوں کی زندگی اچھی گزرتی اور ایک معصوم بچی کی زندگی برباد نہ ہوتی۔ تھرڈ کزن میں مرزا امجد بیگ نے کمال مہارت سے جھوٹے کو اس کے گھر پہنچایا اور اپنے موکل اکبر کو صاف بچا لے گئے۔ فن کار ایک منفرد موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی لوسی اور جوزف واقعی فن کار تھے جو اتنی وارداتوں کے بعد بھی پولیس کو اپنے جرائم کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ کاروبار میں ولسن گراہم نے نگورپاسے اپنے دوست جیک کا خوب انتقام لیا اور ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ماروی کا آغاز بہت اچھا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ کہانی بھی قارئین کے دلوں پر راج کرے گی۔ منظر امام کی جہیز، مریم کے خان کی جوڑا، خس کم اچھی کہانیاں تھیں۔ آخری صفحات پر نشور ہادی کی تقسیم محبت ایک عجیب سی کہانی لگی۔ فریحہ اور مدیحہ کا ایک دوسرے کے لیے ایثار آج کل کے دور میں ایک ناقابل یقین سی بات لگتی ہے۔ محفل شعر و سخن کے تمام اشعار پسند آئے۔ کترنیں بھی ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھیں۔ آخر میں گزارش ہے کرسی صدارت کا اعزاز پانے والے کی تصویر اگلے ماہ سسپنس میں لگا دی جائے تو یہ سسپنس کی طرف سے قارئین کے لیے ایک بہترین تحفہ ہو گا۔“

✠ **ابرار وارث**، سندیلیانوالی سے حاضر ہوئے ہیں ”جنوری 2014ء کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ اتنا خوب صورت اور دلفریب سرورق تھا کہ نظریں ہٹانا محال تھا پہلے سال ہی کا شمارہ اتنا زبردست اور پیارا کہ دل بے اختیار داد دینے کو چاہ رہا ہے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے من موہنے کو کھولا اور انشائیہ پڑھا جو جون ایلیا کے قلم سے بکھرے موتی کی طرح خوب صورت مالا کے مانند امید بن کر ہمارے سامنے آیا، سچ ہے دنیا امید ہی کے سہارے قائم ہے۔ یہ ہماری امید ہی تو ہے جو ہر دفعہ بہتر سے بہتر تحریر پڑھنے اور اپنا خط شائع ہونے کے لیے اتنا بے تاب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی باتوں سے دل بہلا کے اپنے باذوق قارئین کی مجلس میں انٹری دی، یہ کیا ”کالی بلی“ شروع ہی میں نئے سال کی آمد کا پہلا جھونکا بن کر ہمارے رستے میں ناکام رکاوٹ بن کر آ گئی اور چھا گئی۔ ویلڈن جی محترمہ کالی بلی جی آپ کا تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ اشفاق شاہین کا آئیڈیا اول، دوم اور سوئم والا پسند آیا۔ یقین جانیں آپ لوگ کہ میں اس وقت حیران و پریشان رہ گیا جب میں نے اپنے خواب کو حقیقت ہوتے دیکھا خواب کیا تھا؟ خواب یہ تھا کہ میں نے دیکھا کہ سسپنس میں طاہر جاوید مغل کی سلسلہ وار تحریر شائع ہوتی دیکھی میں نے اور ٹھیک اسی طرح ہوا جب میں نے آنکھیں رگڑ رگڑ کے ”پس زنداں“ کے بارے میں پڑھا ایک دفعہ نہیں بار بار...... میں تو کوشش میں تھا کہ سسپنس میں مسافر چونکہ اینڈ ہو چکی تھی کشکول مجھے پسند نہیں تھی اور میں سسپنس کو خیرآباد کہنے والا تھا کہ آپ نے میرے خواب کو عملی جامہ پہنا کر مجھے پھر برسوں تک سسپنس کا اسیر بنا دیا۔ طاہر جاوید مغل کی تحریر تو ہمارے لیے ایک قیمتی خزانہ سے کم نہیں ہوتی...... مہرین ناز کیا بات کرتی ہو اکبر شاہ کو خوشامدی کہہ رہی ہو اور خود اعجاز راحیل کی تعریف میں زمین آسمان کی قلابیں ملا رہی ہو یہ کھلا تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟ محمد جاوید میں آپ کی تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ تصویر بھی شائع ہونی چاہیے۔ مسٹر اینڈ مسز عباس کا محبت نامہ ہر دفعہ زبردست ہوتا ہے۔ محی الدین نواب کی اہلیہ کے لیے مغفرت کا دعا گو ہوں۔ طاہرہ گلزار، عادل خان اور رضوان تنولی کریزوی بھائی کہاں ہو محفل میں آپ کی ضرورت ہے جلدی آؤ نا۔ اکبر شاہ کو اونچا سلام۔ شمارے میں اس دفعہ سب سے پہلے آخری صفحات کی زینت ”تقسیم محبت“ پڑھی بہت خوب صورت کہانی تھی۔ فریحہ اور مدیحہ دونوں کا کردار بلاشبہ بہت بہتر تھا۔ اینڈ پر حیران رہ گیا جب دو دلہنیں بیک وقت ایک دولہا کے حصے میں آ گئیں اور خاندان بھی ان کا ایک ہو گیا۔ دوسری زبردست کہانی کاشف زبیر کی ”ذراہٹ کے“ لگی۔ کاشف زبیر آئی لو یو ویری مچ جی، آپ کی ہر تحریر نایاب اور سبق آموز ہوتی ہے۔ کشکول کی آخری قسط ہے، اگلی دفعہ ”پس زنداں“ پڑھنے کو ملے گی ابھی سے نیندیں اڑ گئی ہیں کہ پتا نہیں کیسی ہو گی یہ تحریر بہرحال، جو بھی ہو میری تو پسند ہو گی۔ محفل شعر و سخن میں امتیاز علی، رانا حبیب اور بابر عباس کے شعر پسند آئے۔“

✠ **محمد جاوید شبیر**، بربرہ علی پور مظفر گڑھ سے ”شدید سردی اور دھند کی لپیٹ میں جنوری کا شمارہ ملا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا۔ 2013ء کا سال، مار دھاڑ، دہشت گردی، مہنگائی کا طوفان، لوڈشیڈنگ، بجلی، سی این جی اور ان کے خونی مل۔ حکمرانوں کے جھوٹے وعدے جھوٹی تسلیاں اور جھوٹے لاروں سے اختتام پذیر ہوا۔ رب جلیل سے دعا ہے کہ 2014ء میں ہم سب مسلمانوں اور خصوصاً پاکستان پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے اور ہر پاکستانی کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ اور انکل اداریہ میں آپ نے وزیراعظم بے روزگار اسکیم کے بارے میں جو خدشہ ظاہر کیا تھا اس کی شفافیت کے بارے میں وہ بالکل صحیح خدشہ تھا۔ کیونکہ اس اسکیم میں جو گرنٹر والی شرط رکھی گئی ہے کہ 15 اسکیل افسر ہی یا اس سے اوپر اسکیل کا افسر ہی گارنٹی دے سکتا ہے 3 عدد چیک کے ساتھ اگر قرض دار واپس قرضہ نہ کرے تو اس کی تنخواہ سے قسط کٹوتی کی جائے گی اس سے تمام بے روزگاروں کے زخموں میں مزید اضافہ کر دیا گیا ہے، کون افسران غریب بے روزگار کی گارنٹی دے گا اگر یہ حکومت فی بے روزگار کو صرف ایک لاکھ روپے بھی بغیر گارنٹی کے دیتی تو یہ بے روزگار کچھ عرصے کے بعد لاکھوں کے مالک ہوتے لیکن افسوس۔ محی الدین نواب کی پہلی وائف کی ڈیتھ کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا ہم نواب صاحب کے غم میں برابر کے شریک ہیں خدا مرحومہ کو جنت الفردوس عطا کرے، آمین۔ نواب صاحب کی لکھی ہوئی تحریر ماروی بہت اچھی جا رہی ہے اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی پس زنداں کا بے چینی سے انتظار ہے، کشکول کے اینڈ ہونے کا بالکل بھی غم نہیں۔ آخری صفحات میں نشور ہادی کی تقسیم محبت بہت ہی اچھی کاوش تھی۔“

✠ **قیصر اقبال گچہ**، کلول، ضلع بھکر سے تشریف لا رہے ہیں ”شدید سردی میں نئے سال کی نوید سناتا جنوری 2014ء کا سسپنس 15 دسمبر کو ملا۔ سرورق پر 2014ء کے ہندسوں کے اوپر لڑکی کا مسکراتا چہرہ اچھا لگا۔ انشائیہ امید، بے شک ہم امید کے سہارے ہی زندہ ہیں۔ خطوط کی محفل میں داخل ہوئے تو بلیک کیٹ کو صدارت کی کرسی پر براجمان دیکھ کر بے اختیار وہ محاورہ یاد آ گیا کہ ہماری بلی اور ہمیں ہی میاؤں۔ ویسے ایک دفعہ کھلی آنکھوں سے گل مروت اور اپنا خط پڑھ لو، حقل نام کو بھی ہوئی تو چیچہ گیری کا فرق نظر آ جائے گا۔ کائنات مریم! یہ اپنی آپی والی روش کب سے اپنائی ہے؟ زویا اعجاز! یہ بھی بتا دیں کہ یہ فہم و ادراک کہاں

ملے گا؟ سعدیہ بخاری! آئینے کے سامنے بیٹھ کر خط نہ پڑھا کرو اور اب صبر کا دامن تھام کر "او کھے سو کھے" جنوری گزار دو۔ کہانیوں میں انوار صدیقی کے کشکول کو انجام تک لے کر گئے۔ شیخ حامد کا انجام ہوا۔ لیاقت حسین کا کردار عرصے تک یاد رہے گا۔ نواب صاحب کی ماروی بہت اچھی جا رہی ہے۔ محبوب علی چانڈیو کے ساتھ ساتھ معروف تجلی بھی اچھا کردار ہے۔ آخری صفحات پر نشور بادی کی تقسیم محبت میں دو لڑکیوں نے (فریحہ اور مدیحہ) اپنے پیار کو ایک دوسرے کے ساتھ تقسیم کر کے اچھا فیصلہ کیا۔ الیاس سیتاپوری کی مٹی کا فساد تاریخ کے دروں روشن کرتا عبدالرحمان بن ہشام کے حالات و واقعات سے معلومات کا خزانہ ہاتھ لگا۔ تھرڈ کزن، بیگ صاحب کی ایک اور فتح اور بیگ صاحب ہی کے ہاتھوں فیصل اور نازش کا انجام ہوا۔ ذراہٹ کے میں کاشف زبیر ایک الگ تھلگ قصبے کی کہانی بیان کرتے نظر آئے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی مکافات میں عبداللہ کے اپنے کارنامے اسے زندگی بھر کا روگ دے گئے۔ منظر امام کی جہیز، آج کے حالات بیان کرتی ایک ایسی سچائی جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ تحریر ریاض کی کاروبار میں بے ایمانی کا کاروبار کرنے والے نے ایک بار پھر نفع کا سودا کیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے صحرا نورد درویش کی صورت میں ایک ولی ابراہیم خواص کی زندگی کی کرامات سے آگاہی دلوائی۔ مریم کے خان کا جوڑا مطلب قاتل جوڑا آخر کار جہنم واصل ہوا۔ محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر ناہید شیخ کا انتخاب پسند آیا۔ اس ماہ کتر نیں بھی بہت اچھی اور معیاری تھیں۔"

✠ **متین سلطان، کراچی** سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "بابا کی بے پناہ مصروفیت کے باعث اس ماہ تبصرہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھے پر آ پڑا۔ سسپنس کے تبصرہ نگاروں میں سب سے کم عمر تبصرہ نگار کا ریکارڈ درج کرواتے ہوئے اہل محفل کو پُر خلوص سلام پیش کرتا ہوں، اپنے بارے میں صرف اتنا عرض کروں گا، خوش مزاجی بھی مشہور تھی، ہماری سادگی بھی کمال ہے، ہم شرارتی بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی بے مثال ہے...... جنوری 2014ء کے حسین سسپنس کے سرورق کو ذاکر انکل نے منفرد انداز میں خوب سجایا، انشائیہ میں جون ایلیا نے لفظوں کے خوب موتی پروئے، بروس لی انداز میں اچھلتے ہوئے بلفظوں کی فلائنگ کک راج سنگھاسن کی گدی پر بیٹھی برخکسس ماریتی بلیک کیٹ کی گردن پہ جا گی آئیں بائیں شائیں کرتی بلیک کیٹ کائنات مریم کے سر پہ کھاتی ہوئی جانوی دیوی کو دو ہنٹر رسید کرتے ہوئے بلیک لسٹ سے باہر جا پڑی، بولو کالی بلی اب کرو گی مستی؟ ویلڈن لالہ اشفاق شاہین آپ کے منہ میں گھی شکر آپ نے کتنی عمدہ تجویز دی...... چاچو منظر سلیم آپ کا تبصرہ ہٹو بچو ٹش پش ہوتا ہے۔ واہ جی واہ میری آنٹی عبایہ مغل آپ کا تبصرہ پڑھ کے بہت اچھا لگا...... روشنی رشید و ٹیلم بلیک اور میرے بابا نے بھی آپ کو بہت یاد رکھا...... جاوید بلوچ زیادہ ہاؤں ہاؤں کرو گے تو جانوروں کے ڈاکٹر پکڑ کے لے جائیں گے۔ سوہنے من موہنے چاچو ذیشان بدر منیر اپنے خوب صورت پیارے بیٹے کا نام بھی بتا دیجیے...... آنٹی طاہرہ گلزار جی اللہ پاک آپ کو سدا خوش و خرم رکھے (آمین) میرے نٹ کھٹ دوست چاچو ابرار وارث آپ کے تبصرے نے محفل کو چار چاند لگا دیے۔ احسان سحر میرے بابا کی پیش گوئی کے مطابق آپ اس ماہ شامل محفل ہیں۔ گل مروت آپ کے تبصرے نے ناز بیگم کے ہوش اڑا دیے اس لیے ناز بیگم دماغی توازن کھو بیٹھی۔ علی پور والے جاوید زیادہ چاپلوسی سے آپ کا نظام انہضام گڑبڑ کر دے گا۔ کشکول میں لوچن کے قتل نے افسردہ کر دیا اور گونگے کے روپ میں چھپا آکٹوپس اپنے انجام کو پہنچا، اس کے ساتھ خوب صورت کشکول اختتام پذیر ہو گئی، نواب محی الدین کی ماروی نکھرنے لگ گئی ہے۔ الیاس سیتاپوری کی مٹی کا فساد بادشاہ کی عیاشی اور بے پروائی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ طروب کی فریب کاریوں میں آ کر عبدالرحمن نہ دنیا کا رہا نہ آخرت کا...... کاشف زبیر کی ذراہٹ کے شیرف کا اپنا بنایا ہوا سزا کا نظام کافی بھیانک اور سبق آموز رہا۔ روبینہ رشید کی فن کار گھٹیا سوچ کی حامل کہانی رہی، ایسی گری ہوئی ایجاد صرف گورے ہی کر سکتے ہیں۔ منظر امام نے ایک بھوت کی آپ بیتی بیان کی، جہیز میں وہ ہمارے ملک کے حالات کو واضح کر رہے تھے، بہت عمدہ رہی...... مریم کے خان کی جوڑا مناسب رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی صحرا نورد درویش سسپنس کی عظمت کو چار چاند لگا گئی۔ آخری صفحات کے لیے میری فیورٹ رائٹر نشور بادی نے خوب صورت تحریر قلم بند کی۔ محفل شعر و سخن میں محمد قدرت اللہ نیازی، ابرار وارث، رانا حبیب الرحمن، سعدیہ بخاری کا انتخاب عمدہ رہا۔ کترنیں مناسب رہیں...... محی الدین نواب کی اہلیہ کی حق مغفرت فرمائے، مرحومہ کے درجات بلند ہوں (آمین) گل مروت آپ کا خلوص دل سے بھیجا گیا گفٹ مل گیا ہے، بابا کی جانب سے بہت بہت شکریہ۔"

✠ **سید محی الدین اشتیاق، فتح پور، لیہ** سے تشریف لائے ہیں "جنوری 2014ء کا شمارہ دو تین بار اسٹال کے چکر لگا کر ملا۔ ٹائٹل گرل میرے خط کے شامل نہ ہونے سے اداس سی لگی۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی اُمید نے نئی راہ دکھائی۔ بلیک کیٹ نے آتے ہی مار دھاڑ شروع کر دی ہے۔ حالانکہ شیروں کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مسافر کا وہ حال کیا ہے رائٹر نے کہ بس، اتنا ظلم! اللہ کے بندے شہرے کو کسی سے تو ملا دیتے؟ خیر خوشخبری یہ ہے کہ سسپنس کا سنہری ترین دور آنے والا ہے۔ نواب انکل کے ساتھ طاہر جاوید مغل اگلے ماہ سے پس زنداں کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں۔ یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ بس ان سے گزارش ہے کہ وہ کہانی کا انجام برا نہ کیا کریں۔ قلم کار کے نواب جناب محی الدین نواب کی اہلیہ کی وفات کے بارے میں پڑھ کر صدمہ محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور نواب انکل کو حوصلہ دے۔ کشکول کا اختتام ہوا۔ بڑی معذرت کے ساتھ کہ کہانی کا اختتام بھی یوں ہوا ہے جیسے کہ کہانی کی ماہانہ قسط ہی ہو۔ آخری کہانی تقسیم محبت نشور بادی نے محبت کی تکون کو کامیاب کرایا۔ محمود، مدیحہ اور فریحہ کے کرداروں کے لیے لکھے گئے مکالمے زبردست تھے۔ نواب انکل سے ماروی میں ملاقات ہوئی۔ ماروی مراد علی کی خاطر اس کے ہم شکل محبوب پر بھروسا کر رہی ہے۔"

✠ **عامل سائیں مستانہ بے پروا، تحصیل لیاقت پور** سے چلے آ رہے ہیں "محفل کے تمام ساتھیوں کو چھوٹا سا پیغام کہ آپ سب میرے لیے قابلِ احترام ہیں میری کوئی بات بھی آپ کی طبع نازک پہ گراں گزرے تو آگاہ فرما دیجیے گا تاکہ اگلے ماہ ہم آپ کی شان میں کچھ ایسا ویسا نہ لکھ دیں۔ ہم دلوں کو دکھا کر ہرگز خوش نہیں ہوتے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے آستانے پر ایک شخص جو کہ دل کا روگی تھا تعویذ دھاگے کی غرض سے آیا وہ اپنے ہاتھ میں ایک کتابچہ لیے پھرتا تھا۔ ہم از راہِ مذاق اس سے پوچھ بیٹھے او میاں یہ کیا ہے؟ تو وہ یوں گویا ہوا "علاجِ غم" ہے، ہم حیرت زدہ ہو گئے، وہ صاحب جاتے جاتے اپنا "علاجِ غم" ہمارے پاس چھوڑ گئے۔ ایک دن اس کتابچے کا خیال آیا تو محض ورق گردانی کے لیے اٹھا لیا پھر کیا تھا یونہی ٹائم ملا اسے ٹائم دیا۔ آج وہ کتابچہ میرے جیون کا حصہ بن گیا

ہے۔ وہ کتابچہ، وہ کسی کا علاج غم سسپنس ڈائجسٹ ہے۔ مجھے خطوط کی محفل، پہلی کہانی اور اللہ کے ولیوں کا سلسلہ واقعات بہت پسند ہیں۔ جون ایلیا نے جو بھی لکھا ہے اچھا لکھا ہے ہمیں امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ نونہالوں کی محفل میں حاضر ہونے کا بس شوق سا ہوا ہے اور حاضر ہوں۔ یہ کیا، صدارت کی کرسی پر بلیک کیٹ، کیا اور کوئی نام نہیں ہے آپ کا۔ امین مراد انصاری، طاہرہ گلزار کی کس چیز کی فیکٹری ہے بیٹے کچھ وضاحت بھی فرما دیجے۔ مظہر سلیم صاحبزادے، بشریٰ افضل کو رنگ والی سیاہی والا قلم بھیج دو اس کی تحریر کے رنگ پھیکے نہیں رہیں گے۔ ثمینہ حبیب بیٹی بہت حساس دل والی لگتی ہو۔ رانا نقشی حماد فریاد بچہ اللہ تم پر رحم کرے۔ مہرین ناز بیٹی آپ مجھے بہت اچھی سوچ کی مالک لگتی ہو جیتی رہو۔ مریم کائنات اور جانوی دیوی کا تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ دو الگ مذہب ہونے کے باوجود آپ گہری دوست ہو۔ سعدیہ بخاری بی بی رانی آپ مجھے کسی اجاڑ مندر کی داسی لگتی ہو، فضول گھنٹیاں مت بجایا کرو۔ بابر عباس بھائی آپ کا تبصرہ اچھا ہے مگر ادارے والوں کی مجبوری ہوتی ہے سب کو جگہ دینی ہوتی ہے نہ کہ آپ کا ہی خط چھاپ دیں۔ پہلی کہانی مٹی کا فساد بہت ہی عمدہ ہے مٹی کے بنے ہوئے انسان جنہوں نے ایک دن خود بھی مٹی ہو جانا ہے آنے والے کل سے بے خبر ایک دوسرے کے ساتھ کیا کچھ کرتے ہیں۔ عبدالرحمن کا زندہ دل کردار پسند آیا ملکہ طروب دولت کی ہوس میں اندھی ہو کر بادشاہ عبدالرحمن کو بے وقوف بناتی رہی۔ اللہ کے بزرگ بندے حضرت ابراہیم کی سوانح حیات صحرا نورد درویش میرے ایمان کو تازہ کر گئی۔"

✠ **اعجاز احمد راحیل، ساہیوال** سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "16 دسمبر کو ایک دوست کی شادی کی دعوت پر میرا حیدر آباد جانا ہوا۔ دسمبر کی سہانی شام ہو، اپنوں کا ساتھ اور حیدر آباد کا شہر ہو پھر سال نو کا خوب صورت سسپنس مل جائے تو دل خوشی سے کیوں نہ جھوم اٹھے؟ مجھے یہاں آ کر بہت خوشیاں ملی ہیں کاش یہ وقت ٹھہر جائے، یہ لمحے قید کر لوں...... یہاں گزرے پل میری زندگی کا اثاثہ ہیں، میں اپنا تبصرہ شہر محبت کے خوب صورت پارک۔ رانی باغ کی مہکی مہکی فضاؤں میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ سرورق اپنی مثال آپ ہے نکھرے نکھرے چہرے والی محبوبہ دلنواز بھی کسی جانے والے کا رستہ دیکھ رہی، شاید...... جون ایلیا صاحب کی امید کچی بات ہے ہم امید کے سہارے جیتے ہیں اور امید ہی ہمارا آسرا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کا اداریہ ہمارے بے ضمیر حکمرانوں کو خواب غفلت سے جگانے کی اپنی سی سعی ہے مگر......؟ سب سے پہلے میں بہت پیاری دوست مہرین ناز کا تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد محفل کی بلیک کیٹ یعنی کالی بلی بھی اپنے نو سو چوہے پورے کرنے کے بعد بغیر حج کیے واپس آ گئی۔ آپ کے منہ سے کیا لگتا ہے ہمیں کوئی پروا نہیں؟ مظہر بھیا آپ کے دل پہ قیامت آئے اور ہم نہ روئیں یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ رانا نقشی حماد فریاد کا انداز بیاں اپنی طرف توجہ دلانے میں کامیاب رہا۔ خود کو عقل کل سمجھنے والی سعدیہ بی بی آپ کی عقل پر پاگل بھی ماتم کرتے ہوں گے۔ روشنی رشید کی بے وقت پکار اچھی لگی۔ محمد جاوید تحصیل علی پور منہ اچھا نہ ہو تو بندہ بات تو اچھی کر لیا کرے...... بھائی بابر عباس بھی ہم تو چلے اس جہاں سے دل اٹھ گیا اب یہاں سے یعنی ملک پاکستان کی حالت پہ گریہ زاری کرتے نظر آئے۔ نواب انکل کی ماروی نے دل کے تاروں کو اس طرح چھوا ہے کہ جلترنگ بج اٹھے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ان کی پہلی ایسی تحریر ہے جس نے اپنے سحر میں جکڑا ہو بلکہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ جادو اثر رکھتے ہیں۔ ماروی کے تعارف میں لکھے ہوئے ایڈیٹر کے الفاظ بھی بہت پسند آئے۔ نشور بادی کی تقسیم محبت قابل داد ہے انسان کے جذبوں میں صداقت اور یقین کامل ہو تو قسمت کی دیوی بھی مہرباں ہو جاتی ہے۔ منظر امام صاحب کی جہیز ملک پاکستان کو مستقبل میں درپیش گمبھیر مسائل کی طرف توجہ دلا گئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی مکافات سبق آموز تحریر ہے، سیدھی سی بات ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی انسان کو ہمیشہ سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہیے۔ انوار صدیقی صاحب نے بھی آخر کشکول بھر دیا۔ آکٹوپس اپنی تمام تر شیطانیوں کے ساتھ نیست و نابود ہوا۔ سازشوں، رنجشوں پر مبنی روداد تھرڈ کزن از مرزا امجد بیگ زبردست رہی۔ فن کار سسپنس و تجسس سے بھرپور اسٹوری ہے۔ ایلی کے کردار نے متاثر کیا...... محفل جذبات یعنی محفل شعر و سخن میں مہرین ناز، کائنات مریم، جانوی دیوی، ثمینہ حبیب، رانا نقشی حماد فریاد، بابر عباس اینڈ فیملی، ماہین فاطمہ کے انتخاب پسند آئے، تمام دوستوں کو نیا سال مبارک ہو۔"

✠ **مہرین ناز، حیدر آباد** سے محفل میں شرکت کر رہی ہیں "اپنا لاڈلا، چہیتا اور پیارا سسپنس اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ 16 دسمبر کو نئے سال کی خوشیاں سمیٹے ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق سال نو کا عکاس ہے کانٹے دار پودے پر ایک معصوم سا پھول ہمارے لیے خوشیوں کا پیغام دے رہا ہے۔ یہ پھول ہمارا سسپنس ہے۔ انشائیہ میں امید پر جون صاحب کی سوچ آزاد دی بیٹ امید ہی انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ آپ کے خط میں ایڈیٹر صاحب کے حالات پر تبصرے بے حد متاثر کن ہوتے ہیں حقیقت پر مبنی اور سب کے لیے پیغام ہوتا ہے۔ ان کی یہ بات دل کو چھو گئی کہ جب محکوم نہ ہوں تو حکمرانی کا تصور حماقت ہے۔ بجا فرمایا آپ نے۔ اب بات ہو جائے اپنی نٹ کھٹ محفل کے سدا بہاروں پر۔ ارے یہ کیا ایک بلیک کیٹ کو محفل کے دروازے پر دانت نکوسے دیکھا۔ اس کالی بلی کی پروا کیے بنا ہم محفل میں انٹر ہوئے۔ اشفاق شاہین صاحب آپ کی یہ نئی تجویز ہمارے سسپنس کو مہنگی پڑے گی۔ امین مراد صاحب طاہرہ گلزار کی مفت مشورے دینے کی فیکٹری ہے۔ مظہر سلیم بھائی آپ کو سوال پوچھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلے آپ خود تو ایک جواب دیں کہ جیو اور جینے دو کا اصول آپ کو کیسا لگتا ہے۔ روشنی رشید باجی آپ کی یہ پکار اصل میں بے وقت کی پکار ہے پلیز ہمارے بزرگوں کو تکلیف نہ دیں تو بہتر ہے۔ سر ابن مقبول صاحب آپ نے سسپنس کی جس پیرائے میں تعریف کی قابل رشک ہے۔ زویا اعجاز جی آپ نے کچھ لوگوں کو تعصب کا چشمہ ہٹا کر دیکھنے کا مشورہ دیا۔ دل کو چھو لیا آپ کی اس بات نے۔ اعجاز احمد راحیل جی آپ بہت سچی دل انسان ہیں۔ آپ کو حیدر آباد اور حیدر آباد والوں کا پیار و خلوص کیسا لگا۔ گل بانو بے مروت جچھ گیری میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ نئے سال کا سسپنس اپنے اندر ایک انوکھی کشش لایا ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مٹی کا فساد پڑھی۔ الیاس سیتاپوری نے ہمیں گنگ دیا۔ بادشاہ کی کنیز حکم نے جو دو گیت گائے وہ دل میں گھر کر گئے۔ وہ گیت ہی اس کہانی کا نچوڑ تھے۔ طروب ملکہ بن کے بھی کنیز ہی رہی۔ لالچ کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد کی مکافات ایک عبرت اثر اسٹوری ثابت ہوئی۔ عبداللہ کو اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے شجر کی چھاؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تلے بیٹھنا پڑا۔ منظر امام صاحب نے جہیز میں فرسودہ پاکستانی رسوم کو واضح کیا۔ آسانی سے مل جانے والی چیز کی قدر نہیں ہوتی۔ نشور ہادی نے نئے سال میں ایک نیا تجربہ پیش کیا۔ بالکل منفرد کہانی ویل ڈن۔ فریحہ اور مدیحہ کا ایثار محمود کی خوشی۔ محی الدین نواب کی ماروی کی دوسری قسط لاجواب رہی۔ محبوب چانڈیو کا کردار کافی متاثر کن ہے۔ کشکول کی آخری قسط عمدہ لگی، شیخ حامد اپنے انجام کو پہنچا۔ تھرڈ کزن، چور رشتہ، بیگ صاحب کی ایک اور فتح۔ نازش اور فیصل جیسے لوگ فراڈ کرتے وقت بھول جاتے ہیں کہ ایک پاک ذات ہم سب کے کارنامے دیکھ رہی ہے۔ تمام کترنیں شاندار ہیں محفل شعر و سخن میں جانوی دیوی، علی ڈوگر، مسز بابر عباس کی چوائس اچھی لگی۔ سسپنس ہماری پسند ناپسند کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہے اس وجہ سے ہمارے دلوں پر راج کرتا ہے۔"

✠ **بشریٰ افضل**، بہاولپور سے تشریف لائی ہیں "18 دسمبر کو سسپنس ملا 2014ء جگ مگ کر رہا تھا اور خوب صورت سا کیک بھی آب و تاب سے اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ خدا سب کے لیے اور پاکستان کے لیے خوشیاں نصیب کرے ساتھ خیریت کا سال گزرے۔ آپ کے خط میں حاضر ہوئے مابدولت ویٹنگ لسٹ میں موجود...... چلیں ڈاک پہنچی تو چاہے لیٹ ہی سہی بلیک کیٹ کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تھینکس، بلیک کیٹ ایک سے بھلے دو۔ ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں، ماریہ فاروق، آسیہ مقبول کامیابی مبارک ہو۔ روشنی کی پکار بھی سنی کیوں بھئی حکیم خان کس کس کو کشتے کھلائے؟ یہ محفل اپنی ہے سب کی ایک خاندان کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ افتخار حسین اعوان سوہنا کام کیا ہے۔ محی الدین نواب کی اہلیہ کی ڈیتھ کا پڑھ کر دکھ ہوا خدا ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ایمی کی فنکاری، فنکار میں دیکھی۔ ایمی نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر بڑا ہی گھناؤنا کھیل کھیلا، اتنی سنگدلی۔ فیروزہ مکافات میں اگر اپنا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیتی تو اچھا تھا وہ انتقام میں اپنی اور بیٹی کی زندگی میں زہر بھر رہی ہے۔ جہیز، اس کہانی میں لوگوں کے لیے اہم میسج موجود ہے۔ ہمارے یہاں یہی کچھ ہو رہا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ خس کم میڈیلین نے بڑی ہوشیاری سے شوہر سے جان چھڑائی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی صحرا نورد درویش ایک درویش کے بارے میں اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ محفل شعر و سخن میں اچھے شعروں کا انتخاب تھا۔ تقسیم محبت مدیحہ اور فریحہ کی محبت کی داد دینی چاہیے۔ محمود کو دو دو چاہنے والی مل گئیں۔ کترنیں بھی اچھی لگیں۔"

✠ **صوبیہ اقبال**، راول پنڈی سے محفل کی زینت بنی ہیں "سسپنس ڈائجسٹ سے ہمارا رشتہ تو دیرینہ ہے مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہی ہوں (خوش آمدید) سال نو کا پہلا شمارہ جس کے سرورق پر لڑکی کا سال نو کو خوش آمدید کہنے کا انداز بہت پیارا لگا۔ انشائیہ امید کی طرح ہم بھی کہیں گے پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اپنی محفل میں دیکھا تو صدارت ایک کیٹ کر رہی تھی۔ کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ پاکستان ہے، سب چلتا ہے۔ منشی حماد بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو آزادی نصیب فرمائے۔ مہرین ناز آنٹی ذرا اپنے خط کو پڑھ لینا۔ آپ نے تو چاپلوسی کی انتہا کر دی ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ ہر کسی میں اپنا عکس نہ دیکھا کرو۔ کہانیوں میں ابتدا کشکول سے کی۔ شیخ حامد کا انجام ہوا اور اورنگ زیب اینڈ کمپنی سرخرو ٹھہرے۔ ماروی میں چانڈیو اور معروف تجلی اچھے کردار ہیں۔ تقسیم محبت میں مدیحہ اور فریحہ نے ایک دوسرے سے بڑھ کر ایثار کا مظاہرہ کیا۔ صحرا نورد درویش میں اللہ کے ولی ابراہیم کے واقعات نے دل پر اثر کیا۔ تھرڈ کزن میں فیصل اور نازش کا منصوبہ ناکام ہوا اور دونوں اپنے انجام کو پہنچے۔ مٹی کا فساد، ایک بار پھر زن، زر اور زمین کے باعث حکومتوں کی تباہی ہوئی۔ ذراہٹ کے ایک بہترین کہانی۔ مکافات ادلے کا بدلہ ثابت ہوئی۔ جوڑا میں قاتل جوڑے کا انجام ہوا۔ ہمیشہ فتح پر نظر رکھنے والے بیوپاری کا کاروبار بھی اچھا رہا۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی زبردست رہیں۔"

✠ **محمد ہمایوں تنولی**، مانسہرہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "سال 2014ء کا جنوری شمارہ 22 دسمبر کی سہانی شام کو ستارہ مارکیٹ پاکستان بک اسٹال سے لیا اور سرورق بہت خوب صورت تھا اور نیچے 2014ء کا مونوگرام بنا ہوا بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ بہت افسوس ہوا کہ مسافر کے بعد کشکول بھی توڑ دیا آپ نے۔ مسافر کی جگہ ماروی نے لے لی، ماروی کو نواب صاحب لکھ رہے ہیں۔ اگر نواب صاحب کا نام نہ بھی لکھتے تو نواب صاحب اپنے لفظوں کی جادوگری کی وجہ سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ خدا نواب صاحب کو اور تمام لکھنے والے حضرات کو صحت اور تندرستی دے۔ جن کی وجہ سے ہر ماہ سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت میں ماہ بہ ماہ اچھا مواد پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ ایک گزارش ہے کہ ہر ماہ ایک لکھنے والے کا فوٹو، تعارف اور نام کے ساتھ آئندہ دیں۔ جس میں یعنی نواب صاحب یا کوئی بھی پیدائش، ابتدائی تعلیم، مشغلہ، شادی اور بچوں کے بارے میں دیگر تمام معلومات ہوں تاکہ پڑھنے والے اپنے لکھنے والے کے حالات زندگی سے بھی آگاہی کر لیں۔"

✠ **علی ڈوگر**، ساہیوال سے تشریف لائے ہیں "جنوری 2014ء کا پہلا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح لاجواب ہے، خاص طور پر آنکھیں اور ہونٹ تو لاجواب ہیں، اداریہ میں حکمرانوں کی بے حسی کو صحیح طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ اس دفعہ محفل میں کافی شور شرابا تھا، صدارت اس دفعہ ایک سیاہ بلی کے حصے میں آئی۔ بلی صاحبہ آپ بھی تو ہمایوں سعید اور محمد جاوید کی چمچہ گیری کرتے میں ایوارڈ یافتہ لگتی ہیں۔ برادر مظہر سلیم تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ ثمینہ حبیب مین نوازش آپ کا تبصرہ بھی شاندار ہوتا ہے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، سر جی اگر مائنڈ نہ کریں تو اپنا اسم گرامی تھوڑا اشارٹ لکھا کریں۔ ویسے آپ سلجھے ہوئے لگتے ہیں۔ مہرین ناز آپی آپ کے تبصرے نے دل گارڈن گارڈن کر دیا۔ جم کے لکھا کریں۔ سعدیہ صاحبہ آپ اپنی منفی سوچ کو بدلیں۔ انکل محی الدین نواب کی اہلیہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ کہانیوں کی ابتدا ہم نے مٹی کے فساد سے کی۔ طروب بادشاہ کے جذبات سے کھیلتی رہی مگر عبدالرحمن نے محبت کی انتہا کر دی۔ انوار صدیقی کی کشکول کی آخری کڑی مزہ دے گی۔ خیر و شر کی اس جنگ میں فتح حق کی ہوئی۔ محی الدین نواب کی ماروی نے کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ حشمت جلالی کی رقابت نہ جانے کیا گل کھلائے۔ نشور ہادی کی تقسیم محبت خوب رہی۔ محبت میں انسان اپنے محبوب کے ساتھ کسی کو برداشت نہیں کرتا مگر سچے جذبے اپنے اندر بڑا حوصلہ رکھتے ہیں۔ صحرا نورد درویش دل میں اتر گئی۔ حضرت ابراہیم کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ ان کا سفر

خالص اللہ کے لیے تھا۔ اللہ پاک ایسے لوگوں پر اپنی خاص نوازش کرتا ہے۔ اس دفعہ کترنیں لاجواب تھیں، خاص طور پر مہرین ناز اور اعجاز احمد کی بہت پسند آئیں۔ محفل شعر و سخن تو ہماری روح کو سرفراز کرتی ہے۔ سال نو کا شمارہ مجموعی طور پر بہت پسند آیا۔ قارئین اور ادارے والوں کو نئے سال کی بہت مبارک باد۔"

✠ **سید شکیل حسین کاظمی**، اسلام آباد سے حاضر ہوئے ہیں "یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں پہلے بھی سسپنس میں خط لکھنے کی کامیاب کوششیں کر چکا ہوں، اور چند ایک خطوط تاریک راہوں میں گم بھی ہو گئے جو کہ بلیک لسٹ تک بھی نہ رسائی حاصل کر سکے۔ مگر جب بھی خط لکھنے بیٹھوں ایسا لگتا ہے جیسے پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں۔ سرورق کے متعلق ہمیشہ ایک ہی موقف پر قائم رہنا چاہتا ہوں کہ بہت اچھا ہے۔ جون ایلیا کی تحریر کا عنوان ساتھ دے کر بڑی زحمت سے بچا لیا ورنہ ہم کہاں سے کہاں بات لے جاتے۔ خطوط کی محفل میں پہنچے تو بلیک کیٹ اپنے خط کے ساتھ سرفہرست تھیں۔ اتنے غیر جانبدارانہ تبصرے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہی ہے۔ بہرحال مبارکباد قبول کریں۔ مظہر سلیم نے اپنے منفرد اسلوب سے کافی متاثر کیا۔ رانا منشی حماد فرہاد کا طبیب بھی قابل دید رہا۔ افتخار احمد اعوان آپ کا اختصاریہ آپ کی موجودگی کو ظاہر کر رہا تھا جو میرے جیسے اجنبی کے لیے باعث راحت تھا۔ روشنی رشید کو امتیازی نشست سے نوازا گیا۔ اور اس رنگ رنگ محفل کو مسٹر اینڈ مسز بابر عباس کے بہترین تبصرے کے ساتھ مکمل کیا گیا۔ اس بار بلیک لسٹ میں بھی بہت بڑے بڑے ستارے جگمگا رہے تھے۔ کہانیوں کی طرف بڑھنے سے پہلے طاہر جاوید مغل کی پس زنداں کا پڑھ کر خوشی سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کافی سوچ بچار کے بعد کشکول سے کہانیوں کی ابتدا کی۔ آخرکار کشکول بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ لو جی جیسے کردار کا شیخ حامد سے اتنی آسان سے مار کھا جانا قابل ہضم بات نہیں تھی۔ نواب صاحب کی ماروی کافی متاثر کن جا رہی ہے۔ محبوب کا کردار بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی ذراہٹ کے بہت عمدہ کہانی تھی۔ آخر تک میں شریف کو آسیب زدہ سی کوئی چیز سمجھتا رہا۔ تاریخ کے اوراق میں سے ابن حکم کی داستان کے ساتھ الیاس سیتاپوری نے اولین صفحات کی زینت بڑھائی۔ ملکہ طروب کے عیش و نشاط اور بے جا خواہشات پر بہت حیرت ہوئی۔ باقی کچھ کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔

✠ **زویا اعجاز**، لاہور سے محفل میں شریک ہیں "مہنگائی، دہشت گردی اور سی این جی کی بندش کے ستائے ہوئے عوام کو سال 2014ء کی آمد مبارک ہو۔ دعا ہے کہ یہ سال ہم سب کے لیے حقیقی معنوں میں مبارک ثابت ہو۔ سال نو کا پہلا شمارہ 18 دسمبر کی دھند آلود شام کو اپنائیت کی حرارت لیے ملا۔ ذاکر صاحب نے اس بار علامتی ٹائٹل بنا کر یہ حقیقت یاد کروائی کہ 2014ء اپنے جلو میں خار و گل سمیٹے طلوع ہوا ہے۔ جون ایلیا نے آس و امید کا بہت خوب صورت پیغام دیا۔ مطالعے کا آغاز حسب معمول اپنی کھٹی میٹھی محفل سے کیا جہاں بلیک کیٹ بڑے جاہ و جلال سے وکٹری اسٹینڈ پر براجمان تھیں۔ ویلڈن جی بہت شاندار تبصرہ تھا آپ کا۔ جن ممبران کو میرا تبصرہ پسند آیا ان کا شکریہ اور جن کو پسند نہیں آیا ان کے لیے مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنا معیار بلند کریں۔ اس ماہ بڑی خوشخبری یہ ملی کہ ہمارے ہردلعزیز مغل اعظم کے ناول کا آغاز عنقریب ہے۔ کشکول کا انجام پھیکا رہا۔ شیخ حامد کو اس کے بد اعمالی کی قرار واقعی سزا نہ مل سکی۔ کرداروں کی بھرمار اور ذومعنی مبہم مکالموں نے کہانی کے حسن کو گہنا رکھا تھا۔ تقسیم محبت قطعی غیر متاثر کن ثابت ہوئی میرے ذاتی تجزیے کے مطابق فریحہ اور مدیحہ جیسی عظیم خواتین شاید یوٹوپیا میں کہیں پائی جاتی ہوں گی۔ محمود انتہائی کنفیوزڈ سوچوں کا حامل انسان تھا۔ ماروی میں محبت، نفرت، ہوس اور سازشوں کا موسم ہے۔ تھرڈ کزن میں کاروباری محبت اور بے جوڑ شادیوں کا منطقی انجام نظر آیا۔ قاتل حسب توقع کزن صاحب نکلے۔ طبع زاد کہانیوں میں جہیز ٹاپ پر رہی۔ منظر امام نے ظریفانہ انداز میں ایک انتہائی بھیانک المیہ کی نشاندہی کی اور ہمیں ہمارے مستقبل قریب کا بہت واضح آئینہ دکھایا۔ مکافات عمل میں فیروزہ نے انتقام کے لیے خود کو انتہائی حد تک برباد کر کے حماقت دکھائی، طارق کے انجام نے کافی طول کیا۔ مٹی کا فساد میں طروب کا لامتناہی لالچ اور بادشاہ کی بے بس محبت تاسف انگیز تھی۔ صحرا نورد درویش نے توکل کی روح پرور تصویر دکھائی۔ مترجم کہانیوں میں ذراہٹ کے کا انجام کافی ہٹ کے ہوا سو پسندیدگی کے معیار پر پوری اتری۔ جوڑا بھی بہت جاندار تحریر رہی۔ مائیکا نے اپنے جنون میں بھیانک موت کو گلے لگا لیا۔ فنکار میں ایمی کی سفاکی نے تو رونگٹے کھڑے کر دیے۔ لوسی کی احمقانہ بہادری اسے لے ڈوبی۔ کترنوں میں ازدواجیات اور الوداع اردو بیسٹ رہیں۔ محفل شعر و سخن میں نیازی اور رمضان پاشا کا انتخاب زبردست تھا۔ مجموعی طور پر سال نو کا پہلا شمارہ انٹرٹینمنٹ کا فل پیکیج تھا۔"

(بہت شکریہ)

✠ **منشی محمد عزیز مئے**، ضلع وہاڑی سے تشریف لائے ہیں "بڑھاپے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مجھے یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ سسپنس کو آخری خط کب بھیجا تھا۔ لیکن آپ اپنے پرانے چاہنے والے کو مت بھول لیے گا۔ منشی لکھنے کا خیال مجھے رانا منشی حماد فرہاد کا خط پڑھ کر آیا۔ مدیر اعلیٰ صاحب! باتیں تو بہت سی ہیں جو ذہن میں گڈمڈ ہو رہی ہیں لیکن پہلے ایک شعر سن لیجیے جو کہ سسپنس کے نام ہے، گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار۔ لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ پڑھے بنا رہا بھی نہیں جاتا۔ (بہت شکریہ جناب) اب آپ کی اجازت سے تھوڑی سی باتیں لکھاری صاحبان سے۔ ہیلو ساتھیو، کیسے ہو، کبھی میری یاد نہیں آئی آپ کو؟ یا پھر آپ نے یہ سمجھ لیا کہ عزیز مر کھپ گیا ہوگا۔ نہیں بھئی بلیک کیٹ جی! مبارکباد قبول فرمایے صدارت سنبھالنے کی۔ روشنی رشید جی! آپ مسلسل آتی رہا کریں، جائیں نہیں کیونکہ لوڈشیڈنگ کا مسئلہ تو پورے پاکستان کا ہے کم از کم۔ "آپ کے خط" کو تو اس سے بچایے کیونکہ اگر روشنی ہوگی تو پھر بھی لوڈشیڈنگ نہیں ہوگی۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل، لاہور۔ احسان سحر، میانوالی۔ محمد طارق خان، مانسہرہ۔ روشنی رشید، دھمیال کیمپ راولپنڈی۔ نیاز پری، مردان۔ طاہرہ گلزار، پشاور۔ حوریہ علی مروت، مقدس، نورنگ۔ مظہر سلیم رانا، رحیم یار خان۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور۔ قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا۔ کائنات مریم، جانوی دیوی، ملتان۔ راجا ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادن خان۔ حکیم خان سلامت پوری، لاہور۔ احمد خان توحیدی، اسٹیل ٹاؤن، کراچی۔ مسٹر اینڈ مسز بابر عباس، کھاریاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

آخری شمع

الیاس سیتاپوری

دنیا میں کوئی سوچ... کوئی چیز... کوئی جذبہ دائمی نہیں... جس کا آغاز ہے اس کا انجام بھی ہے یہ اور بات کہ اس کا دورانیہ کتنا طویل یا کتنا مختصر ہوتا ہے۔ بادشاہت کے سلسلے کی یہ بھی آخری کڑی تھی جس سے جتنی توقعات وابستہ تھیں اتنا ہی مایوس کن یہ دور رہا۔ جہاں دولت اور طاقت کا سنگم ہوجائے اور اگر وہاں کہیں نہ کہیں سے، کسی نہ کسی چور دروازے سے یا کھلے عام سہی عورت اور شباب کا دخل ہوجائے تو دولت اور طاقت رفتہ رفتہ گہنانے لگتی ہیں کیونکہ ہر عروج توجہ کا طالب ہے۔ جب کسی کو اپنے حصے کی توجہ نہ ملے تو دھیرے دھیرے دوریاں پیدا ہوجاتی ہیں... بادشاہت کا یہ دور بھی دھیرے دھیرے اپنے انجام کی طرف گامزن تھا کیونکہ اس سلطنت میں آخری کیل بھی ایک عورت کے ہی ہاتھوں لگنے والی تھی... بھلا بادشاہت اور ایک فقیر کا کیا سنجوگ... جس کا حکم زمین پر پھیلے ہر انسان کے لیے ماننا لازم تھا وہی ایک کنیز کا غلام نکلے تو بغاوت آپ ہی جنم لے لیتی ہے... مخالفوں نے یہاں بھی اس جذبے سے فائدہ اٹھایا اور اسے اس کی سب سے بڑی کمزوری ثابت کردیا۔ گویا تاریخ گواہ ہے کہ زن، زر اور زمین نے کیسی کیسی دلگداز اور عبرت اثر داستان رقم کی ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

غیاث الدین بلبن ساٹھ سال شاندار حکومت کرکے جب اس عالم ناپائیدار سے اپنے نادیدہ سفر پر روانہ ہوا تو بدقسمتی سے اس عظیم الشان اور گراں بار حکومت کا بوجھ اٹھانے والا کوئی اہل دہلی میں موجود نہیں تھا۔ بلبن کا لائق بیٹا خان سلطان ملتان میں مغلوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوچکا تھا۔ خان سلطان کی موت نے بوڑھے بادشاہ کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ دوسرا بیٹا بغرا خان دہلی سے دور دور رہتا تھا اور اس نے لکھنوتی کو اپنے وطن کی طرح قبول کرلیا تھا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے بغرا خان کو دہلی بلا کر روکنے کی بڑی کوشش کی لیکن بغرا خان بھی ایک ہی ضدی تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کو عالم یاس میں سسکتا ہوا چھوڑ کر لکھنوتی چلا گیا۔ اب دہلی میں دو نوجوان شہزادے موجود رہ گئے تھے، ایک تو خان سلطان شہید کا بیٹا کیخسرو اور دوسرا بغرا خان کا اٹھارہ سالہ بیٹا کیقباد۔ اب بلبن کو انہی دو میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے کیخسرو کو ترجیح دی اور اسے اپنا جانشین نامزد کردیا۔ نامزدگی کے تیسرے دن بلبن چل بسا۔ جن امرا اور کوتوال کے روبرو بادشاہ نے کیخسرو کی ولی عہدی کا اعلان کیا تھا انہیں اس سے اختلاف تھا۔ انہوں نے کیخسرو کو اس وصیت سے لاعلم رکھ کر ملتان روانہ کردیا اور بلبن کے دوسرے پوتے بغرا خان کے اٹھارہ سالہ بیٹے کیقباد کو تخت نشین کردیا۔ یہ 1287ء کا واقعہ ہے۔ یہ وقت اور تاریخ کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ باپ کی موجودگی میں بیٹا بادشاہ بن گیا اور باپ اس کے زیر نگیں لکھنوتی کا ایک حاکم بن کر رہ گیا۔

کیقباد کا خطاب معزالدین قرار پایا۔ مرحوم بادشاہ کی موجودگی میں کیقباد کی پرورش اور تربیت میں ایک خاص قسم کی سختی روا رکھی گئی تھی۔ شہزادے کے اتالیق اور نگراں سائے کی طرح اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے، اسے ایسی کتابیں پڑھائی گئی تھیں جن میں عشق و محبت اور ہجر و فراق کا اشارے کنایے میں بھی کہیں ذکر نہ ہوتا تھا۔ اسے حسینوں اور مہ وشوں کے سائے تک سے دور رکھا گیا تھا۔ مرحوم بادشاہ چونکہ خود بھی ایک دین دار اور صوم صلوٰۃ کا پابند انسان تھا اس لیے اس نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کی تربیت میں بھی ان امور کا بطورِ خاص خیال رکھا تھا۔ نوجوان شہزادے کے لیے وہ لمحات بڑے اذیت ناک ہوتے جب کسی پُرکیف موسم میں پورا جسم ایک ناقابلِ بیان لذت و سرور سے ہمکنار ہوتا اور خواہشاتِ نفسانی امواجِ بلا کی طرح سرکشی اختیار کرتیں، نزدیک اور دور گداز اور نور کی

ترشی ہوئی حسین اور معصیت ترغیب جوانیاں موجود ہوتیں۔ ان کے قلقل مینا قہقہے اور مدھم مدھم سرگوشیوں جیسی ہنسی تیر نیم کش کی طرح کانوں سے داخل ہو کر دل میں ترازو ہو جاتیں اور وہ اپنے اتالیق اور نگراں حضرات کی قہر آلود نظروں سے ڈر کر دل مسوس کر رہ جاتا۔ باغیوں کی سرکوبی اور نئے علاقوں کی فتح یابی کی خوشی میں جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں جمتیں اور ان محفلوں میں لوگ اپنے سیم وزر کے علاوہ جان و ایمان تک نذر کر آتے لیکن شہزادہ کیقباد ان کی جھلک تک نہ دیکھ سکتا تھا اور فضا میں رس گھول دینے والی آوازوں تک سے محروم رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں وہ اچانک بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور یہ وہ حالات تھے، جن میں اسے آخری درجے کی خود مختاری حاصل ہو گئی تھی۔ درباری امرا اور دوسرے اعلیٰ منصب دار نوجوان سلطان کی کمزوریوں سے خوب اچھی طرح واقف تھے، ان میں امیر الامرا کوتوال ملک فخر الدین کا داماد نظام الدین سب سے زیادہ چالاک اور ذہین امیر تھا۔ اس نے حکمرانی کی زیادہ سے زیادہ ذمے داریاں خود سنبھال لیں اور نوجوان بادشاہ کے لیے بالواسطہ وہ سب مہیا کر دیا جس کے لیے وہ ترستا رہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے شہر کی گلی گلی اور کوچے کوچے میں یہ پھونک دیا تھا کہ حسن پرستی، مزاح و تمسخر، عیش و عشرت اور لطف و لذت کا سب سے بڑا حریص اور جویا دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہو چکا ہے۔ نوجوان بادشاہ ملک کا سب سے بڑا گاہک تھا۔ اس کی طلب اور ضرورت کا اندازہ لگا کر دکاندار اور تاجر مطلوبہ مال لے لے کر اس کے پاس پہنچ گئے۔ در و دیوار سے نغمے پھوٹ پڑے، بام و در میں نوخیز و فتنہ انگیز اپنے شکار کی تلاش و جستجو میں کھڑے دکھائی دینے لگے، شراب خانے آباد ہو گئے، بادشاہ کے چاروں طرف پرستان مہیا کر دیا گیا۔ جام بکف پری چہرے اس کی رانوں پر لیٹ کر جب اپنی مخمور نگاہوں سے مسکراتے ہوئے شراب کے جام اس کے ہونٹوں سے بھڑاتے تو نوجوان بادشاہ پر دو آتشے کا اثر ہوتا۔

نوجوان بادشاہ کو بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ بلبن کا محل اس کے لیے ناموزوں ہے، اس نے اپنے عشرت کدے کے لیے دہلی کے جنوب میں جمنا کے کنارے کیلوکھری کا انتخاب کیا، نوجوان بادشاہ کے ایما اور حکم پر کیلوکھری میں ایک شاندار محل تعمیر کیا جانے لگا۔ درباری امرا اور شہر کے دوسرے معززین اور تجار کو جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے بھی شاہی محل کے آس پاس تعمیرات کا سلسلہ شروع کروا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں ایک شہر آباد ہو گیا۔ یہ شہر پہاڑی پر آباد ہوا تھا، اس کے اردگرد دو دو میل تک باغ تھے جن کی آبیاری دریائے جمنا سے ہوتی تھی۔

جمنا کے کنارے شاہی محل آراستہ و پیراستہ بہشت کی طرح نظر آتا تھا۔ نیچے کا حصہ اینٹوں کا بنا تھا جس پر آئینے کی طرح صاف شفاف چونے کا گچ تھا، اوپر کے حصے میں سنگ مرمر کا استعمال ہوا تھا۔ اس کا عکس دریا میں نہایت بھلا لگتا تھا، دوسری طرف باغ تھا چونکہ یہ باغ محل کے باہر تھا اس لیے اس کے درختوں کی شاخیں محل کے اندر لٹکتی رہتی تھیں۔ یہاں جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تو نظام الدین اس کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑا رہتا۔ نظام الدین دادبک کے عہدے پر فائز تھا۔ اس عہدے کا تعلق عدلیہ سے تھا۔ عدالتیں جو فیصلے صادر کرتیں دادبک ان کا نفاذ عمل میں لاتا، اس کے علاوہ مساجد اور رفاہِ عامہ سے متعلق عمارتوں کا انتظام بھی دادبک ہی کے ذمے ہوتا تھا۔ دادبک کو امیر داد بھی کہتے تھے۔ نظام الدین بہ ظاہر تو دہلی کا دادبک تھا لیکن وہ عملاً نائب سلطنت تھا۔

نظام الدین کے علاوہ ملک قوام الدین عمدۃ الملک اور نائب وکیل کا منصب رکھتا تھا۔ بلاغت، انشا اور مخصوص طرزِ تحریر میں ملک قوام الدین کا کوئی جواب نہ تھا۔

محل میں نوجوان بادشاہ کے آس پاس زمانے بھر کا منتخب حسن جمع کر دیا گیا۔ بادشاہ خود بھی بہت حسین تھا۔ بلبنی عہد کے بعض امرا نوجوان بادشاہ کے لہو و لعب اور ملک نظام الدین کے تیور سے خوف زدہ اور دل گرفتہ تھے۔ وہ اس تاک میں رہتے کہ نظام الدین جیسے ہی بادشاہ کے پاس سے ہٹے وہ نہایت دل سوزی اور خلوص سے نوجوان اور ناتجربہ کار بادشاہ کو یہ باور کروائیں کہ شراب و شباب میں ایک ایسی سلطنت کو نہ غرق کیا جائے جس کی اس کے عظیم دادا غیاث الدین بلبن نے ساٹھ سال تک اپنی لہو آمیز جدوجہد اور فکر سے آبیاری کی تھی اور اسے یہ بھی بتا دیں کہ نظام الدین کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہوتے، شاید وہ خود بھی تختِ دہلی پر متمکن ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔

اس شام موسم بڑا رنگین تھا، مشرق سے اڑتے ہوئے بادلوں کے پرے شمال میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہوا میں خنکی اور نمی پائی جاتی تھی، سرمئی اور سیاہ گھٹائیں برسنے کو تلی کھڑی تھیں۔ نوجوان بادشاہ کے رگ و پے میں کیف و مستی سرایت کرنے لگی۔ وہ محل سے نکل کر اس کشادہ سبزہ زار میں پہنچ گیا جہاں ہر طرف طرح طرح کے پھولوں کے تختے

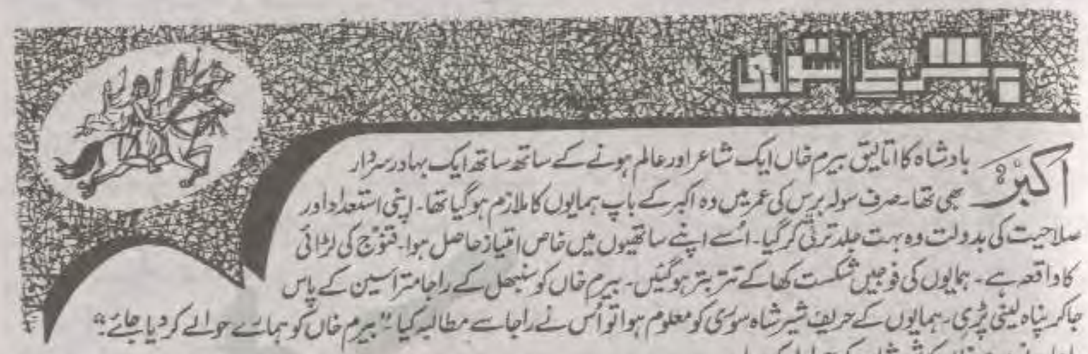

اکبر

بادشاہ کا اتالیق بیرم خاں ایک شاعر اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سردار بھی تھا۔ صرف سولہ برس کی عمر میں وہ اکبر کے باپ ہمایوں کا ملازم ہو گیا تھا۔ اپنی استعداد اور صلاحیت کی بدولت وہ بہت جلد ترقی کر گیا۔ اُسے اپنے ساتھیوں میں خاص امتیاز حاصل ہوا۔ قنوج کی لڑائی کا واقعہ ہے۔ ہمایوں کی فوجیں شکست کھا کے تتر بتر ہو گئیں۔ بیرم خاں کو سنبھل کے راجا مترا سین کے پاس جا کر پناہ لینی پڑی۔ ہمایوں کے حریف شیر شاہ سوری کو معلوم ہوا تو اُس نے راجا سے مطالبہ کیا "بیرم خاں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔" راجا نے بیرم خاں کو شیر شاہ کے حوالے کر دیا۔

شیر شاہ کی جوہر شناس نگاہ نے بیرم خاں کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ بیرم خاں کے ساتھ لطف و مروّت سے پیش آیا۔ اُس نے یہ کوشش بھی کی کہ بیرم خاں، ہمایوں کی ملازمت چھوڑ کے اُس کی ملازمت میں آجائے، بیرم خاں رضامند نہیں ہُوا۔

گوالیار کا حاکم ابوالقاسم اور بیرم خاں گہرے دوست تھے۔ ایک روز بیرم خاں موقع پا کر ابوالقاسم کے ساتھ بھاگ نکلا۔ شیر شاہ کو خبر ہوئی تو اُس نے فوراً اپنے سپاہی پیچھے دوڑائے۔ سپاہیوں نے بیرم خاں اور ابوالقاسم کو راستے میں جا لیا۔ وہ بیرم خاں کو پہچانتے نہیں تھے، انھوں نے اُس کے دھوکے میں ابوالقاسم کو حراست میں لے لیا۔ بیرم خاں مردانہ وار سامنے آ گیا "ٹھیرو۔ بیرم خاں میں ہوں۔"

ابوالقاسم نے مداخلت کی "یہ جھوٹا ہے، بیرم خاں میں ہوں۔ یہ میرا نمک خوار ہے، مجھ پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ بیرم خاں میں ہوں۔" سپاہی ابوالقاسم کو لے گئے، بیرم خاں کو چھوڑ گئے۔

ابوالقاسم کو شیر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ شیر شاہ نے تعجب سے کہا "ابوالقاسم! تم؟ بیرم خاں کہاں ہے؟" اس سے پہلے کہ ابوالقاسم کچھ کہتا، شیر شاہ خود واقعے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس کا چہرہ انگارے کی طرح سُرخ ہو گیا۔ اُس نے ابوالقاسم کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا "اس غدّار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔" ابوالقاسم کو قتل کر دیا گیا ——— تاریخ اکبری۔ نظام الدین احمد

موجود تھے۔ یہاں ہلکے ہلکے اور باریک کپڑوں کے شامیانے کھڑے کر دیے گئے جن کے آس پاس سے پانی کی پھواریں ہوا کے دوش پر داخل ہو کر بادشاہ اور اس کے شرکائے محفل کو آلودۂ کیف و سرور کر سکتی تھیں۔ بادشاہ کے چاروں طرف نازنینانِ لذت بخش اور مہ وشانِ شہوت بداماں موجود تھیں۔ آلاتِ مے کشی ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ شراب کے جام دستِ نازک سے بادشاہ کے ہونٹوں تک پہنچ رہے تھے۔ ان خوبرویوں سے ذرا دور فاصلے پر بذلہ سنج، لطیفہ گو اور داستان سرا بیٹھے تھے۔ ان کے آگے بھی مے و مینا کا بازار لگا تھا اور یہ بھی غرقِ مے ناب اولیٰ ہو رہے تھے۔

بادشاہ نے ایک نیکھی چتون اور مخمور چشم حسینہ کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے لب و رخسار کے بوسے لیتے ہوئے بولا۔

"سنبل! اگر تجھ سے یہ کہا جائے کہ تجھے ایک اعلیٰ شاہی منصب اس شرط پر عطا کیا جائے گا کہ تو اس منصب کی مجموعی تنخواہ اپنی عمر کے آخری دن حاصل کر سکے گی، تو کیا تو اس اعلیٰ شاہی منصب کو قبول کر لے گی؟"

سنبل نے بادشاہ کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "ایسا منصب کوئی بے وقوف ہی قبول کر سکتا ہے۔ کوئی معمولی منصب ہی کیوں نہ ہو اور اس کا معاوضہ جلدی جلدی ملنے کا وعدہ یا امکان ہو تو اسے آدمی بہ خوشی قبول کر لیتا ہے۔"

بادشاہ نے جھک کر اس کی ایک آنکھ کو بوسہ دیا اور کہا۔ "میرے دادا بلبن اور ان کے مقرر کردہ اتالیق نے میرے سامنے ایک ایسی ہی پیش کش رکھی تھی اور اپنے سخت گیر رویوں اور شدید طرزِ عمل سے اس پر مصر رہتے تھے کہ میں ان کی اس پیشکش کو قبول کر لوں۔ جب تک جدِ امجد غیاث الدین بلبن زندہ رہے میں اس پیشکش کو منافقت سے قبول کیے رہا لیکن جب وہ ہم سے بچھڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور مجھے خود مختاری، آزادی اور اقتدار میسر آ گیا، میں نے ادھار کے سودے کو ٹھوکر ماردی اور نقد اور فوری معاوضے کو قبول کر لیا۔"

سنبل نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں اور بادشاہ کے سیاہ اور ملائم بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔ "میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔"

بادشاہ کھلکھلا کر ہنس دیا، دوسری مہ وشوں کو مخاطب کیا۔ "ارے تم میں کوئی اتنی ذہین لڑکی ہے جو میری باتوں کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اصل مفہوم اس بھولی بھالی سنبل کے ذہن نشین کروادے؟"

ایک شوخ و شنگ نوخیز لڑکی بادشاہ کے روبرو آ بیٹھی۔ اس کے گلستان شباب میں ابھی کلیوں ہی کی آمد آمد تھی۔ اس کا چہرہ شباب کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محبت سے دباتے ہوئے بولی۔ "اگر اجازت مرحمت فرمائی جائے تو یہ ناچیز حضورِ والا کے کلمات کا مفہوم بیان کردے۔"

بادشاہ نے حیرت اور بے یقینی سے اس ناشگفتہ کلی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "یعنی میری رمز و کنایے کی گفتگو کا مفہوم تم بیان کرو گی کیا تم اپنی عمر کے برعکس اتنی بالغ نظر ہو کہ میری باتوں کا واقعی مفہوم بیان کرسکو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "بندہ پرور! میری عمر سے میری سمجھ کو نہ ناپیے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اچھا اگر یہ بات ہے تو، تو میری باتوں کے اصل مفہوم سے ان سب کو مطلع کردے۔"

لڑکی نے بادشاہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگالیا، بولی۔ "حضور والا حقیقتاً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے دادا اور سخت گیر اتالیق نے انہیں نماز اور روزے سے لگا کر ایک ایسے مشغلے میں پھنسا دیا تھا جس کا معاوضہ دوسری دنیا میں ملتا۔ حاضر کو غائب کی تمنا میں چھوڑ دینا عقل کے خلاف ہے۔" پھر بادشاہ کی طرف شوخی و شرارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "حضور والا! انصاف سے کہیے گا کہ میں نے جو کچھ کہا وہ غلط ہے یا درست؟"

بادشاہ نے اسے اپنی آغوش میں دبالیا، اس کا سر بادشاہ کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ اس کی سیاہ اور لمبی زلفیں دونوں شانوں پر بکھر گئیں۔ بادشاہ نے اس کے سر کے بیچوں بیچ زلفوں کو بوسہ دیا اور بے اختیاری میں کہا۔ "اس نے جو کچھ بیان کیا، یہی میرا مفہوم تھا۔"

ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوئی اور حاضرین محفل اس ناشگفتہ کلی کو رشک و حسد سے گھورنے لگے۔ بادشاہ نے کہا۔ "کیا حاضرین محفل میں کوئی ایک شخص بھی ایسا ہے جو یہ بتائے کہ ایک چیز ایک جگہ حرام ہو اور کسی دوسری جگہ حلال؟"

سبھی حیرت اور فکر سے بادشاہ کی صورت دیکھنے لگے۔ اس فتنۂ صغیر نے پھر زبان کھولی، کہنے لگی۔ "اگر اجازت ہو تو بندی حضور کی اس بات کا مفہوم بھی عرض کرسکتی ہے۔"

بادشاہ نے خوش ہوکر جواب دیا۔ "بیان کرو۔"

لڑکی نے کہا۔ "حضور والا کی مراد حور اور شراب سے ہے، ان دونوں کو یہاں اس دنیا میں حرام اور حدود میں رکھا گیا ہے لیکن عقبیٰ میں یہ حلال ہوجائیں گی۔"

نوجوان بادشاہ اس کی پیاری پیاری باتوں سے اتنا متاثر اور خوش ہوا کہ اسے بے ساختہ بھینچ لیا، بولا۔ "اے قیامتِ فردا، تجھے اتنی سمجھ کہاں سے مل گئی، تجھے یہ شعور اور تمیز کس نے عطا کردی؟"

لڑکی نے بھینچی بھینچی آواز میں جواب دیا۔ "سمجھ، شعور اور تمیز ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انسان اپنی خواہش اور مرضی سے ان کا اکتساب کرلے، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔"

نوجوان بادشاہ اس کی ایک ایک بات اور ذرا ذرا سی ادا پر مٹا جارہا تھا۔ اسی عالم میں ایک مسخرالرزتا کانپتا بادشاہ سے دس بارہ قدم دور جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، تشکی آواز میں پوچھا۔ "بلا اجازت ہمارے روبرو آنے کی جسارت کس طرح ہوئی؟"

مسخرے نے مسکین صورت بنا کر جواب دیا۔ "حضور کی ان فلسفیانہ باتوں نے طبع رواں کو گدگدایا، خاموشی محال ہوگئی، پیٹ میں ضبط و برداشت نے ابھار پیدا کیا اور یہ غلام اپنی جان کی پروا کیے بغیر حضور کی اجازت سے بے نیاز روبرو آ کھڑا ہوا۔"

شوخ و شریر لڑکی کو مسخرے کی مداخلت بے جا گراں گزری، اس نے چیں بہ جبیں ہوکر بادشاہ سے عرض کیا۔ "اس محفلِ رنگین اور ہجوم مہ وشاں میں اس کی موجودگی سے کیا بادشاہ سلامت کا مذاق لطیف مجروح نہیں ہوا؟"

"ہوا اور بالکل ہوا۔" بادشاہ نے ترش روئی سے کہا پھر مسخرے کو حکم دیا۔ "تو اسی وقت یہاں سے دفعان ہوجا اور اپنے ساتھ ان سب کو بھی لیتا جا جو ان نازک اور لطیف آبگینوں میں پتھر کی طرح موجود ہیں۔"

مسخرے نے کہا۔ "حضور پہلے میری بات تو سن لیں اس کے بعد ہم خود یہاں سے چلے جائیں گے۔"

بادشاہ نے بے زاری سے جواب دیا۔ "اس وقت ہم کچھ بھی نہ سنیں گے۔"

سنبل اس ناشگفتہ، شوخ و شریر لڑکی سے حسد کرنے لگی تھی۔ اس نے بادشاہ کی پشت سے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور وفور جوش میں چمٹا کے عرض کیا۔ "حضور والا کو اس کی بات ضرور سن لینی چاہیے کیونکہ اس کی مزے دار باتوں نے ہمیں کبھی بھی ملول اور افسردہ نہیں کیا ہے۔"

بادشاہ نے مسخرے کو حکم دیا۔ "تجھے جو کچھ کہنا ہے

جلدی جلدی کہہ کر رخصت ہوجا۔"

مسخرے نے عرض کیا۔ "حضور والا خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ بعض چیزوں کے لیے بعض چیزیں بہت ضروری ہیں اگر شراب کے ساتھ نقل (نمکین اور چٹپٹی چیزیں) نہ ہوں... تو شراب کا مزہ نصف رہ جاتا ہے۔ اسی طرح اس محفلِ رنگیں میں اگر بذلہ سنجی اور مزاح کو شامل نہ کیا جائے تو اس بزم طرب کی مثال اس کھانے جیسی ہوگی جس میں نمک نہ ہو۔"

سنبل اور دوسری ان حسین لڑکیوں نے جو بادشاہ کی گود میں بیٹھی ہوئی اس نوعمر لڑکی سے حسد اور رقابت محسوس کررہی تھیں، مسخرے کی باتوں سے بڑی خوشی محسوس کی اور ان سب نے صدائے تحسین بلند کی۔ بادشاہ بھی ان حسینوں کی کثرت رائے سے متاثر ہوا۔ اس نے مسکرا کر مسخرے کو حکم دیا۔ "تو اپنے ساتھیوں کو لے ہمارے قریب آجا اور اپنی پرلطف اور دلچسپ باتوں سے اس محفل کے مزے کو دوبالا کردے۔"

مسخرا خوش خوش واپس ہوا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ بادشاہ کے قریب آبیٹھا اور پھر تمسخر و مزاح، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا بازار گرم ہوا تو نازک اندامو کے نرم ولطیف اور کھنک دار قہقہوں اور ہنسی نے پوری محفل کو شرابی بنا کے رکھ دیا۔ نوعمر اور ناتجربہ کار لڑکی اپنی اہانت برداشت نہ کرسکی، افسردہ دلی سے بادشاہ کی آغوش چھوڑ دی، شراب اور تمسخر کے نشے میں بدمست بادشاہ نے ایک دوسری لڑکی کو آغوش میں لے لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔ یہ لڑکی کچھ دیر تو چپ چاپ، گم صم کچھ الگ تھلگ سی بیٹھی رہی، اس کے چہرے پر بے بسی اور مایوسی کا غبار چھا گیا تھا۔ دوسری لڑکیاں اس کے اندرونی کرب اور دکھ سے ایک لذت محسوس کررہی تھیں، بادشاہ اس ہنگامۂ شراب و شباب میں ایسا کھویا کہ اس لڑکی کا خیال تک نہ رہا۔ بارش تیز ہوچکی تھی اس کی پھوہار شامیانوں میں بن بلائے مہمان کی طرح داخل ہورہی تھی۔ شراب کا دور چلا اور پوری محفل الناس علیٰ دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے طریقے اختیار کرلیتے ہیں) کا عملی نمونہ بن گئی۔ دل شکستہ اور آزردہ طبع لڑکی آہستہ سے اٹھی اور خاموشی سے بادشاہ کی پشت پر چلی گئی۔ یہاں بھی وہ رکی نہیں، آہستہ آہستہ چلتی ہی رہی، یہاں تک کہ شامیانے سے باہر نکل گئی۔ شامیانے کے باہر وہ کچھ دیر کے لیے رک گئی اور لوگوں کی باتیں سنتی رہی پھر اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور تیز تیز قدم اٹھاتی محل کے کسی گوشے میں روپوش ہوگئی۔

☆☆☆

دوسرے دن بادشاہ دن چڑھے تک سوتا رہا.... بیداری کے بعد بھی گزرے دن اور رات کی مستیاں دل و دماغ کو متاثر کیے ہوئے تھیں۔ خدام نے کسل مند بادشاہ کو مطلع کیا کہ ملک قوام الدین بادشاہ کی خدمت میں باریابی کے امیدوار ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ "ان سے کہو انتظار کریں۔"

بادشاہ نے تخت شاہی تک پہنچنے میں کافی وقت لگادیا۔ نقیبوں اور شاہی صدا کاروں نے بادشاہ کی آمد کا اعلان کیا۔ حاضرین دربار ہاتھ باندھ کر مودب دورویہ کھڑے ہوگئے۔ نوجوان بادشاہ ان کے درمیان سے گزر کر تخت پر جا بیٹھا۔ تخت کے دائیں بائیں اور پیچھے حسین اور نوخیز لڑکیاں اور عورتیں بادشاہ کی دل بستگی اور لطف ولذت بخشی کے لیے اس وقت بھی موجود تھیں۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ "ملک قوام الدین اپنی گزارشات پیش کریں۔"

مایہ ناز انشا پرداز دو قدم آگے بڑھا اور بادشاہ کی خدمت میں ایک عریضہ پیش کیا۔ بادشاہ نے عریضہ لینے کے بجائے بے پروائی سے دریافت کیا۔ "یہ کس کا عریضہ ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟"

قوام الدین نے عرض کیا۔ "یہ حضور کے عم زادے کیخسرو کی عرضداشت ہے۔"

بادشاہ نے بہ دستور بے پروائی سے سوال کیا۔ "اس میں کیا لکھا ہے؟"

ملک نظام الدین نے مداخلت کی۔ قوام الدین سے کہا۔ "عریضہ پڑھ کر سنایا جائے کیونکہ نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے اس ناچیز کو بھی ہر بات سے باخبر ہونا چاہیے۔"

بادشاہ نے جام طلب کیا، سنبل اٹھلاتی ہوئی بادشاہ کے قدموں میں اس طرح آبیٹھی کہ اس کا سر بادشاہ کے زانوں سے ٹک گیا۔ زلفیں ران پر بکھر گئیں، چہرہ بادشاہ کے سامنے تھا اور سنبل کے ہاتھ کا جام بادشاہ کے ہونٹوں سے لگ گیا۔ اس نے چند گھونٹ حلق سے اتارے، قوام الدین کو حکم دیا۔ "عریضہ پڑھ کر سنایا جائے تاکہ اس کے مفہوم سے ملک نظام الدین بھی آگاہ ہوجائے۔"

قوام الدین نے بہ آواز بلند پڑھنا شروع کردیا۔ "بھائی کیقباد! میرا یہ فرض ہے کہ میں ہر حال میں آپ کی اطاعت اور فرماں برداری کروں اور مجھے اس بات کا بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پورا یقین ہے کہ آپ بھی مجھ سے برادرانہ محبت اور خلوص رکھتے ہیں لیکن ایک بات میں نہایت افسوس سے کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ کے دربار کے چند خودغرض اور عاقبت نا اندیش امیر میرے خلاف آپ کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں، میں آپ سے ایک درخواست کرنے پر مجبور ہوں وہ یہ کہ آپ مجھے اپنا بہی خواہ سمجھیں اور اپنا سچا ہمدرد تصور کرتے ہوئے میرے باپ کی جگہ میرے حوالے کر دیجیے یعنی ملتان کی حکومت مجھے بخش دیجیے۔ آپ کا یہ عمل برادرانہ شفقت اور حمیت کے عین مطابق ہوگا۔"

خط کی عبارت نے ملک نظام الدین کو فکرمند اور بادشاہ کو مائل بہ تمسخر کر دیا۔ اس نے کہا۔ "یہ کیخسرو کو کیا ہو گیا ہے آخر؟ کیا وہ اس وقت بھی ملتان کا حاکم نہیں ہے؟"

ملک نظام الدین نے عرض کیا۔ "شاید حضور والا اس سے لاعلم نہ ہوں گے کہ شہزادے کیخسرو نے حضور کے خلاف غزنی کے حاکم تیمور خان سے تعلقات محض اس لیے استوار کیے تھے کہ وہ اس سے فوجی مدد حاصل کر کے حضور کا مقابلہ کرے اور آپ کو مغلوب کر کے دہلی کا تاج وتخت خود حاصل کر لے۔ شہزادہ کیخسرو ابھی تک دل سے حضور کو تخت وتاج کا جائز حقدار نہیں تسلیم کرتا۔ اگر مجھے کھل کر عرض کرنے کی اجازت دی جائے تو میں عرض کروں گا کہ وہ حضور کو غاصب سمجھتا ہے۔"

بادشاہ نے شراب کے چند گھونٹ اور انڈیل لیے اور سنبل کے لبوں کا بوسہ لیتے ہوئے بہکی بہکی آواز میں کہا۔ "یہ کیا مصیبت ہے یعنی ان فضول باتوں کے علاوہ ہمارے پاس کوئی موضوع ہی نہیں رہ گیا، تخت وتاج کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں زندگی کے چند روزہ عیش وعشرت سے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔ اس زندگی میں آلام ومصائب اور غم اور دکھ کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے، میں اس زندگی کو جو غموں سے حرام ہو گئی ہے، حرام شے (شراب وشباب) سے خوشگوار بنا لینا چاہتا ہوں۔"

ملک قوام الدین نے پوچھا۔ "شہزادے کو جواب میں کیا لکھ دیا جائے؟"

سنبل نے بادشاہ کی طرف سے جواب دیا۔ "اگر ہر مراسلے اور ہر مکتوب کا جواب بادشاہ سلامت ہی دینے پر مجبور کیے گئے تو پھر تم امرا کے ذمے کیا کام رہ جائے گا؟"

بادشاہ نے بھی سنبل کی تائید کی۔ "تو نے بڑے پتے کی بات کہی۔" پھر قوام الدین اور ملک نظام الدین سے کہا۔ "کیخسرو کو اس کے خط کا معقول جواب دے دیا جائے۔"

ملک قوام الدین نے عرض کیا۔ "چونکہ یہ عریضہ حضور کے عم زادے کا تھا اس لیے اس کا جواب بھی حضور والا کی مرضی سے دیا جانا چاہیے۔"

ایک سترہ اٹھارہ سالہ نازک اندام نے بادشاہ کے بالوں کو اپنی ناک سے لگا لیا۔ انہیں سونگھتے ہوئے بولی۔ "افسوس یہ کیسا ستم ہے اس حسین اور قیمتی جسم وجاں پر کہ لوگ گھڑی دو گھڑی سکھ اور اطمینان کی سانس بھی نہیں لینے دیتے، حضور اگر اس کنیز کو حکم دیں تو یہ کیخسرو کو جواب لکھوا دے؟"

بادشاہ نے امرا کا مذاق اڑایا۔ "میں بادشاہ ہوں، خدا نے مجھے وہ مرتبہ بخشا ہے کہ میں تم امرا کا کام، چاہوں تو ان نازک اندام سے لے سکتا ہوں، تمہیں میری طرف سے اعلیٰ مناصب اور بھاری بھاری اعزاز بخشے گئے ہیں۔ یہ میری بندہ پروری ہے، تمہیں بھی اس کا جواب یوں دینا چاہیے کہ اپنے کام اور کارکردگی سے خود کو اپنے منصب کا اہل ثابت کرو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہارا کام ان مہ پاروں سے لے لوں گا اور تمہیں آرام کے لیے تمہارے گھروں میں قید کر دیا جائے گا۔"

سنبل نے کہا۔ "حضور والا! وہ امرا کہاں چلے گئے جنہوں نے حضور کے مرحوم جد امجد حضرت بلبن کے عہد حکومت میں اس قصر سلطنت کو ستونوں کی طرح اپنے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ جو امرا عہد بلبن میں طویل خدمات انجام دے کر تھک چکے ہیں انہیں ستانے، آرام کرنے کا موقع دیا جائے اور تازہ دم امرا کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع بخشا جائے۔ اگر ان نئے امرا نے مجھے اپنی کارکردگی سے مایوس کیا تو میں بلبنی عہد کے بوڑھوں کو ان پر مسلط کر دوں گا۔"

ملک نظام الدین نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "حضور کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ ہم کوشش کریں گے کہ حضور کے لمحات عیش کو ملکی اور سیاسی الجھنوں اور فکروں سے منغض نہ کریں اور امور ملکی کا سارا بوجھ ہم اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں۔"

بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ بات ہوئی، اگر تم لوگ اپنے قول پر پورے اترے تو میں بھی اس کے صلے میں تم سب کو اتنا نواز دوں گا کہ تمہاری کئی پشتیں مزے کریں گی۔"

دفعتاً حسینوں کی طرف سے ایک ایسا شور بلند ہوا گویا کوئی بڑی مہم سر کر لی گئی ہو۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے

صبر وسکوت

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص نے ایک خوبصورت اور خوشنما پرندہ خریدا۔ اسے جب پنجرے میں ڈالا تو ایک اور پرندہ اڑتا ہوا اس پنجرے کے اوپر آیا اور اپنی زبان میں کچھ بول کر چل دیا۔ اس کے بعد اس قیدی پرندے نے پنجرے میں بولنا بند کر دیا اور بالکل چپ سادھ لی۔ مالک نے یہ دیکھا تو سلیمان علیہ السلام کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پنجرہ منگوایا اور پرندے سے پوچھا: "تمہارے مالک نے تمہیں قیمت دے کر خریدا ہے اس کا تم پر حق ہے۔ تم نے بولنا کیوں بند کیا؟"

پرندے نے جواب دیا۔ "حضور! اس سے کہہ دیجیے کہ میرا خیال چھوڑ دے۔ میں جب تک پنجرے میں بند ہوں۔ کبھی نہ بولوں گا۔"

فرمایا: "کیوں؟"

اس نے کہا: "حضور! میں وطن اور اولاد کی محبت میں روتا تھا کہ میرے ایک بھائی نے مجھے آ کر کہا: نادان! رونے دھونے کو چھوڑ، ورنہ عمر بھر پنجرے ہی میں قید رہیگا۔ صبر وسکوت اختیار کر تو دیکھ تو آزاد ہوتا ہے کہ نہیں۔"

سلیمان علیہ السلام نے اس شخص سے پرندے کا جواب بیان کیا تو اس نے کہا: "پھر اسے آزاد کر دیجیے۔ میں نے تو اسے خوشنوائی کے لیے خریدا تھا۔" چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے اپنی گرہ سے قیمت دے کر پرندے کو آزاد کر دیا۔ (رُوح البیان)

مرسلہ: محمد عارف۔ لاہور

خوابیدہ خوابیدہ نظروں سے بہ انداز فاتحانہ مہ پاروں کی طرف دیکھا اور حکم دیا۔ "دور چلے، کیوں سنبل! کیا ہم وہ خوش قسمت انسان نہیں ہیں جسے اس دنیا ہی میں حور وقصور اور شراب وشہد سے نواز دیا گیا ہے؟"

سنبل نے خود کو بادشاہ کی آغوش میں گرا دیا، بولی۔ "اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔" اور ذرا سی دیر میں پورا دربار کیف وسرور اور شراب وشباب کی بے اعتدالیوں میں ڈوب گیا۔

ملک نظام الدین، قوام الدین اور چند دوسرے امرا الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دربار سے نکل گئے۔ باہر نکل کر ملک نظام الدین نے قوام الدین کو سمجھایا۔ "آج سے ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ بادشاہ کی بزم عیش کو امور ملکی سے منغض نہیں کریں گے۔"

قوام الدین نے کہا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

نظام الدین کو اپنا مستقبل نہایت درخشاں نظر آ رہا تھا، بولا۔ "کیوں نہ ہم دونوں آپس میں ایک ایسا زبانی معاہدہ کر لیں جس کی رو سے ہم دونوں مل کر نظام حکومت سنبھال لیں گے اور سب کے آخر میں اس عضو معطل اور عصب ناکارہ سے نجات حاصل کر لیں گے اور پھر..... اور پھر پورا ہندوستان ہم دونوں کی گرفت میں ہوگا۔"

قوام الدین نے جواب دیا۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر تم نے کسی طرح بقول خود اس عضو معطل اور عصب ناکارہ سے نجات حاصل بھی کر لی تو بادشاہ کے باپ بغرا خان کا کانٹا کس طرح دور کرو گے جو لکھنوتی کا خود مختار حکمران بنا بیٹھا ہے اور بلبنی عہد کے ان تجربہ کار اور آزمودہ عہد امرا کا خطرہ کس طرح ٹالو گے جن کے زیر اثر مغلوں کی ایک کثیر جماعت ہر وقت لڑنے مرنے کو آمادہ رہتی ہے۔"

نظام الدین نے کہا۔ "ان سب سے نمٹنا میرا اپنا کام ہے، تم ذرا بھی فکر نہ کرو بس تم تو مجھ سے یہ وعدہ کر لو کہ تم خود میرا ساتھ دو گے اور کہیں بھی میرے خلاف نہیں جاؤ گے۔"

قوام الدین نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ "تم نے جس مہم جوئی کا ارادہ کیا ہے، بڑی دشوار مہم ہے، اس میں ہم دونوں کے سر بھی ہر وقت تلواروں کی دھار پر رکھے رہیں گے۔"

"کوئی پروا نہیں۔" نظام الدین نے کہا۔ "جتنا شاندار اور عظیم الشان کارنامہ ہے اس میں اتنے ہی خطرات بھی موجود ہیں اور کسی بڑے کام میں جان گنوا دینے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

مطلب ہے کہ آدمی شہید ہوگیا، اگر کامیاب ہوگئے تو حکمراں کہلائیں گے اور ناکام رہے تو اپنی عظیم الشان جدوجہد کی وجہ سے تاریخ میں انمٹ مقام حاصل کرلیں گے۔"

قوام الدین نے کہا۔ "میں تمہاری مخالفت ہرگز نہ کروں گا لیکن یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ تم جو بھی قدم اٹھاؤ نہایت سوچ سمجھ کر اور آگا پیچھا سوچ کر۔"

"یہ میرا کام ہے۔" نظام الدین نے کہا۔ "تم کو فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

قوام الدین نے پوچھا۔ "پھر میں شہزادہ کیخسرو کو کیا جواب دوں؟"

نظام الدین نے کہا۔ "میں جواب کا متن سمجھائے دیتا ہوں۔ اسے اپنی سحر انگیز انشا سے اتنا پراثر بنادو کہ کیخسرو اسے پاتے ہی ملتان سے چل پڑے۔"

قوام الدین نے ملک نظام الدین کی شکل دیکھی، نظام الدین نے کہا۔ "تم بادشاہ کی طرف سے اسے لکھ دو کہ شہزادے! میں دنیا میں تجھ سے بڑھ کر کسی اور سے محبت نہیں کرتا، جو کچھ گزر چکا ہے اسے تم اپنے دل سے نکال دو۔ تم کسی خطرے کا اپنے دل میں خیال لائے بغیر دہلی چلے آؤ۔ تمہارے آتے ہی میں تمہیں نہایت تعظیم و تکریم سے ملتان کا حاکم بنادوں گا۔ تمہارے یہاں دہلی آجانے کا ہمیں ایک یہ فائدہ بھی حاصل ہوجائے گا کہ سازشوں اور بدزبانوں کی زبانیں بند ہوجائیں گی۔"

قوام الدین نے ہنس کر کہا۔ "اگر شہزادہ کیخسرو دہلی آگیا تو اس طرح بادشاہ اور شہزادے میں اتفاق ہوجائے گا اور اتفاق سے ہمیں کیا فائدہ یا نقصان پہنچے گا؟"

"یہ باتیں میرے سوچنے کی ہیں، تمہارے غور کرنے کی نہیں۔"

قوام الدین نے کہا۔ "مہم بڑی پُرخطر ہے لیکن اس کی تسخیر میں فائدے بھی بے شمار ہیں، میں ایک انشا پرداز، خود میں تمہاری جتنی ہمت اور حوصلہ نہیں پاتا۔ ہاں میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھوں گا اور تمہارے خلاف کوئی بات نہیں کروں گا۔"

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

☆☆☆

بادشاہ کو کئی دن بعد اس ناشگفتہ کلی کا خیال آگیا جس کی ناقابل رد دلیلوں نے دنیاوی عیش و عشرت کو جائز قرار دے دیا تھا۔ اس نے سنبل سے دریافت کیا۔ "سنبل! کئی دن سے وہ لڑکی نظر نہیں آرہی جس کے گلستان شباب میں ابھی کلیاں ناشگفتہ اور سربندی ہیں؟"

سنبل نے اپنے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "وہ چاہتی تھی کہ بزم طرب اور ہجوم مہ وشاں کی ان منتخب مہ پاراؤں میں اسے ہمسری حاصل ہوجائے جن کا فی الحال کوئی مثیل نہیں، اس حسد نے اسے گوشہ نشیں بنادیا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "وہ ابھی ناتجربے کار ہے اور اس کا بچپنا چونکہ ابھی تک اس سے جدا نہیں ہوا اس لیے میں اسے اس کا حسد نہیں کہوں گا، اس میں بچپن کی ضد پائی جاتی ہے۔"

سنبل نے کہا۔ "میں بادشاہ سے اختلاف بھی نہیں کرسکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ ابھی اسے تربیت اور تعلیم کی ضرورت ہے، اسے مہذب بنانے کی ضرورت ہے۔"

بادشاہ نے شوق ظاہر کیا۔ "ہماری محفلیں اس کی بہترین تربیت کردیں گی اور شاہی نشست و برخاست اسے مہذب بنادے گی، اس الھڑ، شوخ اور نادان لڑکی کے لیے اس سے بہتر کسی درس گاہ کا خیال تک نہیں کیا جاسکتا۔"

سنبل نے عرض کیا۔ "اگر حضور حکم دیں تو اسے تلاش کرکے حاضر کردیا جائے؟"

بادشاہ نے کہا۔ "ضرور، ضرور لیکن جانے سے پہلے چند مہ پاروں کو میرے پاس بھیجتی جاؤ۔"

سنبل۔ "بہتر ہے۔" کہتی ہوئی چلی گئی لیکن فوراً ہی واپس آگئی، بولی۔ "ملک نظام الدین شرفِ باریابی چاہتے ہیں۔"

بادشاہ نے ناک بھوں چڑھائی اور بے زاری سے کہا۔ "یہ لوگ کسی وقت چین ہی نہیں لینے دیتے۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر حاضر ہوجاتے ہیں اور ذرا بھی نہیں سوچتے کہ میں کتنا مصروف انسان ہوں، حاضر کرو۔"

ذرا دیر بعد ملک نظام الدین حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے بناوٹی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ "کوئی خاص بات؟"

نظام الدین نے عاجزی سے جواب دیا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ ملک کی سب سے زیادہ مصروف شخصیت ہیں لیکن خانہ زادوں کا بھی یہ فرض ہے کہ یہ حضور کو ملک کی نازک اور خطرناک صورت حال سے باخبر رکھیں۔"

بادشاہ نے تشویش ناک انداز میں دریافت کیا۔ "کیا ملک کے کسی حصے سے بغاوت کی خبر آئی ہے؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن مجھے بعض معتبر ذرائع سے جو خبریں ملی ہیں۔ میں سوچتا ہوں انہیں حضور کے گوش گزار کردیا جائے یا کچھ توقف اختیار کیا جائے۔"

بادشاہ پریشان ہوگیا، بولا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی خبر ملی ہے جس سے میری طبیعت میں خوامخواہ تکدر پیدا ہوسکتا ہے تو اسے اپنے پاس ہی محفوظ رکھو اور اس کے لیے تم اپنے طور پر جو کچھ کرسکتے ہو کر گزرو۔ میں تمہارے کسی اقدام کی مخالفت نہیں کروں گا۔"

نظام الدین نے کہا۔ "حضور نے جو کچھ فرمایا بجا ہے لیکن حضور یہ بھی تو سوچیں کہ کسی بھی فرمان کا اجرا اور نفاذ اس وقت تک کس طرح ممکن ہوسکتا ہے جب تک اس پر حضور کے دستخط اور مہر شاہی نہ ثبت ہو۔"

بادشاہ نے کہا۔ "لاؤ وہ فرمان کہاں ہے؟"

نظام الدین نے عرض کیا۔ "ابھی فرمان تیار نہیں کیا گیا، حضور کو اس نازک مسئلے سے مطلع کردینے کے بعد ہی فرمان تیار کیا جاسکتا ہے۔"

بادشاہ نے مجبور ہوکر حکم دیا۔ "جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد اور مختصر لفظوں میں کہہ گزرو۔"

اسی وقت چند خوب صورت عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ بادشاہ نظام الدین کی موجودگی کو نظرانداز کرکے ان لعینان یگانہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ بادشاہ کی آغوش وا ہوگئی اور دونوں بازوؤں میں دوگداز جسم سما گئے۔ بادشاہ نے نظام الدین سے کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اپنے مسئلے کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔"

نظام الدین نے کہا۔ "میں تو حضور کا خانہ زاد ہوں، جیسا حکم دیں گے اسی پر عمل کروں گا۔ سردست مختصراً میں یہ بتانے آیا ہوں کہ اس ناچیز نے ملک قوام الدین سے کیخسرو کو جواب لکھوادیا ہے، میں نے اسے دہلی بلوالیا ہے۔"

"یہ کیوں، وہ یہاں آکر کیا کرے گا؟"

ایک لڑکی نے بادشاہ کے سیب جیسے سرخ و سفید اور شاداب رخساروں پر ہاتھ پھیرنا شروع کردیا۔ نظام الدین نے پہلی بار ان عورتوں کو اپنے مرتبے اور حیثیت سے روشناس کروایا۔ اس نے ان سب کو جھڑک دیا۔ "حضور ذرا سی دیر کے لیے ان دل فریب و حسین پیکروں کو اپنی حدود میں رہنے کا حکم دیں کیونکہ اگر تاج و تخت سلامت ہے اور حضور اس پر جلوہ فرما ہیں تو یہ گرمی محفل بھی باقی رہے گی ورنہ کچھ بھی نہ رہے گا۔ یہ دل فریب پیکرِ ہرجائی کسی اور کا دل بہلانے لگیں گی۔"

بادشاہ سنبھل گیا۔ اس نے دونوں عورتوں کو اپنے بازوؤں سے ہٹا کر آس پاس بٹھالیا۔ بے دلی سے پوچھا۔ "ہاں جو باتیں باقی رہ گئی ہیں، انہیں بھی کہہ ڈالو۔"

فروری 2014ء کے شمارے کی ایک جھلک

سرگزشت
ماہنامہ

طلوعِ مہر
اس اہم قلم کار کی داستان جس نے ادب کی خدمت کے لیے زندگی وقف کردی

کہرے کا قہر
دھند نے برطانیہ میں تباہی مچادی
12000 انسانوں کو موت کی نیند سلادیا

معذور مسیحا
ایک ایسے معروف ڈاکٹر کی سوانح جس نے شہرت کی بلندی کو چھولیا

پاپا رازی
دنیا کے متنازع ترین فوٹو گرافر کے حالاتِ زندگی

نفسیاتی
ایک ایسی لڑکی کی سچ بیانی جو خود میں منفرد تھی

اس کے علاوہ
لہو کی گردش تیز کردینے والی طویل کہانی "سراب" فلمی و ادبی دنیا کی یادداشتیں "فلمی الف لیلہ" انتہائی دلچسپ سفر کہانی "ترکی نمی دانم" اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے، تاریخی واقعات اور معلومات

اگر آپ علم و دانش بھرے مضامین، ادب، تاریخ اور سبق آموز سچ بیانیاں پسند کرتے ہیں تو آپ ہی کے لیے یہ شمارہ ترتیب دیا گیا ہے۔ بس ایک بار پڑھ کر دیکھیں آپ خود ہی گرویدہ ہوجائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

نظام الدین نے کہا۔ ”میں نے کیخسرو کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ بلبنی عہد کے چند امیر اس سے خفیہ مراسلت کررہے ہیں اور اسے اس بات پر آمادہ کررہے ہیں کہ وہ حضور کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔ بلبنی امرا اس کا ساتھ دیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ آپ کے دادا بلبن نے اپنی نیابت کے لیے کیخسرو ہی کو نامزد کیا تھا۔“

بادشاہ بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ ”لیکن ان حالات میں اس کا چلے آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”اگر حضور اجازت دیں تو اس کانٹے کو راستے سے ہی نکال پھینکا جائے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں نے کہہ تو دیا کہ مصالح ملکی کے لیے جو اقدام بہتر ہو، بلاتوقف کرگزرو۔“

نظام الدین نے اپنی عبا میں سے ایک کاغذ نکال کر بادشاہ کے سامنے پیش کردیا۔ ”تب پھر حضور اس پر دستخط اور شاہی مہر ثبت فرمادیں۔“

بادشاہ نے سرسری طور پر اس فرمان کو پڑھا۔ اس میں کیخسرو کو راستے ہی میں قتل کردینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس نے بلاتامل اس پر دستخط کردیے اور شاہی مہر لگادی پھر نظام الدین سے پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”یہ بہت کافی ہے، آج یہ غلام آرام کی نیند سو سکے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ہاں ان امرا کی فہرست بھی تیار کرو جو کیخسرو سے خفیہ مراسلت کرتے رہے ہیں۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”اسے بھی بہت جلد پیش کردیا جائے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اور ہاں جنہیں اس فرمان کی تعمیل پر متعین کیا جائے انہیں یہ حکم بھی دے دیا جائے کہ قتل کردینے کے بعد کیخسرو کا سر ہمارے ملاحظے کے لیے ضرور پیش کیا جائے۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔“

بادشاہ فوراً ہی عورتوں کی طرف متوجہ ہوگیا، بولا۔ ”کاروبار مملکت سنبھالنا اور امور ملکی کا سرانجام دیا جانا، ایسا ہی ہے جیسے کہ پل صراط سے گزرا جائے تاج شاہی کانٹوں کا تاج ہے اور تخت فرماں روائی تختۂ گور ہے۔“

نظام الدین چلا گیا۔ ایک ماہ رو نظام الدین سے جلی بیٹھی تھی، اٹھلا کر بولی۔ ”ان امرا کو اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے کہ تیری میری موت کے فرمان جاری کرواتے رہیں۔ مجھے تو ان کی صورتوں میں ملک الموت کی شبیہہ دکھائی دیتی ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”یہ حاسد ہیں، بادشاہ سلامت کو عیش وعشرت مناتے دیکھ کر کڑھتے ہیں۔“

اسی وقت سنبل بادشاہ کی مطلوبہ لڑکی کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور بادشاہ کو مطلع کیا۔ ”حضور سے ملک خطیر اسی وقت ملاقات کرنا چاہتا ہے۔“

بادشاہ نے غصے میں اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ ”سنبل! آخر یہ کیا مصیبت ہے۔ ابھی ابھی ملک نظام الدین میرا بھیجا چاٹ کر رخصت ہوا ہے۔ اب ملک خطیر نازل ہوگیا ہے، آخر یہ امرا چاہتے کیا ہیں؟“

سنبل نے جواب دیا۔ ”یہ تو میں جانتی نہیں کہ یہ امرا چاہتے کیا ہیں لیکن فی الحال میں ان کی پیامبری کا فریضہ انجام دے رہی ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ملک خطیر سے کہہ دو کسی اور وقت حاضر ہو اس وقت ہم بہت مصروف ہیں۔“

سنبل نے کہا۔ ”میں حضور کا فرمان ملک خطیر تک پہنچا تو دوں گی لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ اس جواب سے ٹل جائے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں اس وقت اس سے ہرگز نہیں ملوں گا۔“ پھر بے چینی سے اٹھ کر بارہ تیرہ سالہ لڑکی کو گود میں اٹھالیا۔ اس کے گالوں پر بوسوں کی بھرمار کردی، پیار کرتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

”اے آفت فروا، تو کہاں چلی گئی تھی۔ تو مجھ سے خفا ہوگئی تھی؟ آخر کیوں، کیا میں تیرے معیارِ حسن پر پورا نہیں اترتا؟“

سنبل باہر جاکر واپس آگئی، بولی۔ ”ملک خطیر کہتا ہے کہ اگر اسے اس وقت نہ بلایا گیا تو اس کا دوبارہ آنا سودمند رہے گا کیونکہ وہ جس لیے یہاں آیا ہے اس کا وقت گزر چکا ہوگا؟“

”وقت، وقت، وقت، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان امرا کا وقت کیا ایک بادشاہ کے وقت سے زیادہ قیمتی ہے؟ بلاؤ اس بدبخت کو، دیکھوں تو یہ کیا کہتا ہے؟“

کچھ دیر بعد ملک خطیر بھی آگیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”ملک خطیر! تم تو ہمیں پریشان نہیں کرتے آخر آج کیا افتاد آپڑی ہے کہ بے وقت زحمت حاضری دی؟“

ملک خطیر نے جواب دیا۔ ”جب سے حضور کے روبرو چند خودغرض اور مطلب پرست امرا دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں اس ناچیز کو شرم اور خطرے کا احساس

ہونے لگا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ملک خطیر! تم ہمارے مشیر اور وزیر ہو لیکن ہمیں یاد نہیں آتا کہ تم نے ایک دن بھی ہمیں کوئی مشورہ دیا ہو اور جہاں تک امور وزارت کا تعلق ہے ملک نظام الدین اور قوام الدین مل جل کر انجام دے رہے ہیں، اب ان حالات میں تم ہمیں یہ بتاؤ کہ تم ہماری حکومت کے لیے کتنے مفید اور موزوں انسان ہو؟“

ملک خطیر نے جواب دیا۔ ”یہ ناچیز ملک نظام الدین کی عیاری کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس لیے اپنی عزت وآبرو سنبھال کے گوشہ نشیں ہوگیا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اس وقت کیوں آئے ہو؟“

ملک خطیر نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ نظام الدین حضور کے عم زادے کیخسرو کے فرمانِ قتل پر حضور کے دستخط لینا چاہتا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”کیخسرو باغی ہے، وہ اس سزا کا مستحق ہے۔“

ملک خطیر نے دلیری سے کہا۔ ”کیخسرو باغی نہیں ہے حضور کو ورغلایا گیا ہے۔“

بادشاہ نے غصے میں جھڑک دیا۔ ”تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ، میں نظام الدین کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔“

”حضور کی مرضی۔“ ملک خطیر نے کہا۔ ”ورنہ حضور کے نمک خواروں کا یہ فرض ہے کہ حضور کو اصل واقعات سے باخبر رکھیں اور سازشوں سے بچائے رہیں۔“

بادشاہ نے ملک خطیر کو بالکل نظرانداز کردیا، نوعمر لڑکی سے رجوع کیا، بولا۔ ”لڑکی! تیرا کیا نام ہے؟“

”میرا نام کچھ بھی نہیں۔ حضور جو رکھ دیں گے اسی سے معروف ہوجاؤں گی۔“

”غضب کی ذہانت ملی ہے تجھے۔ تیری باتیں تیری صورت سے زیادہ لاجواب ہیں اور تیری صورت تیری باتوں سے زیادہ معصوم۔“

گردوپیش موجود پری چہرے بادشاہ کی باتوں پر داد دینے لگے۔ ”کیا بات کہی ہے حضور نے ایسی باتیں زمانۂ قدیم میں یونانی عقلا کیا کرتے تھے۔“

ملک خطیر مایوس اور دل شکستہ وہاں سے چلا گیا۔ کافی دور چلے جانے کے بعد بڑبڑایا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ مملوک بادشاہوں کی آخری شمع جھلملا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا روغن کم ہوتا جارہا ہے۔ خالی اور خشک ہی تند وتیز ہواؤں کا کس طرح مقابلہ کرے گی۔“

وہ جیسے ہی باہر نکلا، ملک نظام الدین کو اپنا منتظر پایا۔ ملک خطیر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے بے ساختہ سوال کیا۔ ”تم یہاں کھڑے کیا کررہے ہو؟“

نظام الدین نے تحقیر آمیز لہجہ اختیار کیا، بولا۔ ”میں یہاں تیرا انتظار کررہا ہوں۔“

”کیوں، کوئی خاص بات؟“

ملک نظام الدین نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”تو غدار کیخسرو کی وکالت کرنے گیا تھا؟“

ملک خطیر نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”نظام الدین! اپنا مرتبہ پہچانو، تم کیا ہو اور میں کون ہوں، اسے مت بھولو۔ میں بادشاہ کا مشیر اور وزیر ہی نہیں، ایک سپاہی بھی ہوں اور تم محض ایک کارندے ہو۔ ایک ایسے کارندے جس کے ہاتھ ہتھیاروں سے ناآشنا ہوں اور جس نے کسی رزم گاہ کا خواب میں بھی مشاہدہ نہ کیا ہو۔“

ملک نظام الدین نے بے پروائی سے کہا۔ ”ملک خطیر! اپنا ہاتھ تلوار کے دستے سے ہٹالو۔ اب اسے نیام ہی میں رہنے دو۔ اس وقت تم نے اپنے غدار آقا کیخسرو کی بے گناہی کی صفائی پیش کرکے اس کا حق نمک ادا کردیا ہے، مجھے سب معلوم ہوچکا ہے۔“

ملک خطیر نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تمہیں کیا سب کچھ معلوم ہوچکا ہے؟ میرا آقا کیخسرو، اس کا حق نمک؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ صاف صاف کہو؟“

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میری باتوں کا مطلب تم سے بہتر کوئی اور ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔“

ملک خطیر نے احتجاج کیا۔ ”واللہ یہ میرے خلاف تیری بدترین سازش معلوم ہوتی ہے۔“

”کون سازشی ہے اور کون پاک دامن، دنیا کو بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔“

ملک خطیر نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”ملک نظام الدین! تم بھی کان کھول کر سن لو اگر تم نے میرے خلاف سازش کا کوئی جال بچھایا تو میں بھی کوئی معمولی شکار نہیں ہوں، دانتوں پسینا آجائے گا، جو کچھ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔“

ملک نظام الدین نے کہا۔ ”میں نے تیرے خلاف اب تک کچھ بھی نہ کیا تھا لیکن تو نے میرے خلاف پہل کرکے دعوتِ مبارزت دے دی ہے۔ تو وار کر میں دفاع کروں گا اور میں وار کروں گا تو اس کا دفاع کر۔“

ملک خطیر نے متنبہ کیا۔ ”ملک نظام الدین! میں تنہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ہوں لیکن تم تنہا ہو۔"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "مجھے محض اپنی ذات پر اعتماد ہے تو دوسروں پر تکیہ کرسکتا ہے۔"

ملک خطیر نے کچھ سوچ کر نصف تلوار نیام سے کھینچ لی، نظام الدین فوراً سامنے سے ہٹ گیا، بولا۔ "ملک خطیر! میں ایک علمی انسان ہوں اور جامع الحکایات اور محمد عوفی کا تذکرۂ شعرا میرے ہی نام منسوب کیا گیا ہے۔ میں تلوار کے بجائے عقل استعمال کرتا ہوں۔"

ملک خطیر دانت پیستا ہوا چلا گیا۔ ملک نظام الدین نے کیخسرو کا فرمان قتل اپنے چند خاص آدمیوں کے حوالے کردیا اور انہیں ہدایت کی کہ کیخسرو جیسے ہی رہتک میں داخل ہو، اسے قتل کردیا جائے اور اس کا سر میرے حوالے کیا جائے۔

☆☆☆

نوجوان بادشاہ کا باپ بغرا خان لکھنوتی میں اپنے بیٹے کی رنگ رلیوں اور عیاشیوں کی داستانیں سن رہا تھا اور پریشان ہورہا تھا، ادھر چالاک نظام الدین ان لوگوں پر کڑی نظریں رکھے ہوئے تھا جو دہلی اور لکھنوتی کے درمیان خبر رسانی اور بغرا خان سے مراسلت کا ذریعہ بن سکتے تھے۔

نظام الدین نے اپنی بیوی کو محل سرا میں پہنچادیا۔ بادشاہ نے ازراہ عقیدت اسے اپنی ماں بنالیا اور اندر کا سارا نظام اس کے سپرد کردیا۔ انہی دنوں گنگا اور جمنا کے دوآبے سے ایک طائفہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس طائفے میں جو بھی تھا اپنے کسی نہ کسی ہنر میں بے مثال تھا۔ طائفے کی ہر حسینہ حسن وشباب کا عدیم النظیر نمونہ تھی، ان کی چال ڈھال ایسی تھی کہ ان کی صورت دیکھے بغیر ہی دیکھنے والا اپنا سب کچھ ان پر قربان کردینے کو تیار ہوجاتا۔ ان کے اعضا کا تناسب اس غضب کا تھا گویا انہیں صناع ازل نے بڑی محنت اور توجہ سے تخلیق فرمایا ہو۔ آنکھیں ایسی کہ بغیر سرمے کے سیاہ نظر آتیں اور ان میں ہر وقت نشہ اور نیند کا خمار طاری محسوس ہوتا۔ چہرے سے لے کر سینے اور پیروں تک جنسی کشش اس بلا کی تھی کہ نہایت مضبوط ارادوں کا زاہد شب بیدار اور تارک الدنیا بھی فکر عقبیٰ اور پندار تقویٰ کا دل میں خیال لائے بغیر ان کے قدموں میں جبیں سائی کو عبادت تصور کرنے لگتا۔ ان کے نیم عریاں اور باریک لباس سے سرخ وسپید جسم شباب کی آنچ سے تپ کر یوں جھلک رہے تھے کہ بادشاہ کی نظریں جھلس کر رہ گئیں اور دل میں ہوس اور خواہش نفسانی کے بخارات اٹھ اٹھ کر سارے رگ وپے میں سرمستی اور کیف واختلال پیدا کرنے لگے۔ حرم سرا میں موجود عورتیں رشک وحسد سے خراب وخوار ہونے لگیں۔ ان میں سنبل سب سے زیادہ چالاک اور ضبط وبرداشت رکھتی تھی۔ اس نے ان دلربایان دوآبہ کا مسکراتے ہوئے خوش دلی سے استقبال کیا۔ بادشاہ کی خواہش پر نوعمر لڑکی کو سامنے موجود رکھا گیا۔ لڑکی بڑی جذباتی تھی، اس نے بادشاہ سے شکایت کی۔

"ایسی محفلوں میں اگر مجھے نہ شریک کیا جائے تو بڑی نوازش ہوگی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "کیوں، وجہ اعتراض، سبب گریز؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں حضور کی خاص نظر التفات ہی کی خواست گار رہتی ہوں، ان بہت ساری لڑکیوں اور عورتوں میں، میں ایک عام سی لڑکی بن کر رہ جاتی ہوں۔"

بادشاہ نے اسے چمٹالیا، بولا۔ "کیا تیرے لیے یہ اعزاز کی بات نہیں کہ میری نظر التفات تجھ پر اس وقت پڑی جب تو اس لائق بھی نہیں تھی کہ تجھے آسانی سے برتا اور نوازا جائے۔ میری ان مجلسوں میں تیری شرکت اور موجودگی یوں بہت ضروری ہے کہ تو ان کے رموز اور اسرار سے خوب اچھی طرح واقف ہوجائے گی اور یہاں تیری خوب اچھی طرح تربیت ہوجائے گی۔ تو یقین رکھ، میرا دل تیرے لیے محفوظ ہے اور تو اسے اس وقت بے تامل حاصل کرلے گی جب تو قیامت بن چکی ہوگی اور تیرے شباب کی سربند کلیاں گلاب کی طرح کھل کر اپنی جانفزا، خوشبو سے میرے دل ودماغ کو معطر وشاداب کررہی ہوں گی۔"

نوجوان بادشاہ اتنا جیالا نہیں تھا کہ ایک ہی وقت میں ان سب کو سیراب اور مطمئن کردیتا۔ رفتہ رفتہ توانائی اور جوش میں کمی آتی گئی اور آخر میں اس کی حالت اس سگِ ناتواں جیسی ہوگئی جو اپنے حرص وہوس کا اظہار زبان اور لعاب دہن سے کررہا ہو، وہ بے سدھ ہوکر پڑ رہا لیکن اس عالم میں بھی ایک نوخیز حسینہ اس کی بغل میں تھی، بقیہ لڑکیاں اور عورتیں بادشاہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر ذرا دور ہٹ گئیں۔

پہلو میں لیٹی ہوئی نوخیز لڑکی نے اپنے زیریں لباس سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ بادشاہ بدستور آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ اس لڑکی کو جب خوب اچھی طرح یہ اندازہ ہوگیا کہ اس وقت اس کے قریب کوئی بھی نہیں تو اس نے بادشاہ کے رخسار کو چوم لیا۔ بادشاہ نے آنکھیں کھول دیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "مایوس مت ہو میری جان بس ذرا صبر کر۔ میں ایک بادشاہ ہوں، بادشاہ

عادل اور منصف ہوتا ہے، میں تیرے ساتھ بھی انصاف کروں گا اور تو اس وقت تک میرے پہلو میں موجود رہے گی جب تک میں اپنا حق انصاف ادا نہ کردوں۔"

لڑکی نے کاغذ کا پرزہ بادشاہ کی ناک پر رکھ دیا، آہستہ سے بولی۔ "اسے اسی وقت ملاحظہ فرمالیں۔"

بادشاہ نے چونک کر پرزہ لے لیا، پوچھا۔ "یہ کس کا خط ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "یہ ایک انتہائی اہم خط ہے اسے پڑھ لیجیے اور راز میں رکھیے۔ یہ لکھنوتی سے لکھا گیا ہے اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں اسے آپ تک نہایت احتیاط سے پہنچادوں اور سب کچھ رازداری میں رکھوں۔"

بادشاہ نے لیٹے ہی لیٹے خط پڑھنا شروع کردیا۔

"بیٹے کیقباد! تم اس کو محسوس نہ کرنا کہ اس وقت تم بادشاہ ہو اور میں تمہارا ملازم، لکھنوتی کا حاکم۔ مجھے اپنے اور تمہارے مرتبے اور حیثیت کا پورا خیال اور التزام رکھنا چاہیے تھا لیکن میں ایک بادشاہ کو تم سے مخاطب کررہا ہوں اور ایسا اس لیے ہے کہ میں تمہیں یہ خط ایک باپ کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں تمہارا باپ بغرا خان ہوں اور تم میرے بیٹے کیقباد۔ مجھے یہاں تمہارے بارے میں بڑی افسوس ناک اور عجیب خبریں مل رہی ہیں۔ میں ان کا اس خط میں ذکر نہیں کرسکتا لیکن ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں کی ایک ملاقات ہوجائے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے خود غرض امرا ہم دونوں کو ملنے نہیں دیں گے لیکن پھر بھی اگر تم ہوشیاری اور دانائی سے کام لو تو ایسا ناممکن نہیں ہے اور اس ملاقات کے جو دوررس نتائج نکلیں گے اس کا تم شاید ہی اندازہ لگا سکو، بس اس خط میں، میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میرے اس خط کو جلا دو تاکہ یہ بات صیغۂ راز میں رہے۔"

بادشاہ اٹھ کر بیٹھ گیا، بولا۔ "تو ملک نظام الدین کا اندیشہ بالکل درست ہے کہ دربار کے بعض امرا میرے خلاف سازشیں کررہے ہیں۔ آخر یہ خبریں میرے باپ تک کس نے پہنچائیں؟"

ہم پہلو لڑکی نے جواب دیا۔ "کیا حضور اس کا جواب مرحمت فرمائیں گے؟"

بادشاہ نے پوچھا۔ "میرا جواب کون لے جائے گا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "سرائے کا کوئی تاجر جو لکھنوتی سے آیا ہے اور آپ کا مرحمت کردہ جواب لے کر چلا جائے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اس بکواس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں اور لڑکی! تو بھی کان کھول کر سن لے کہ اس خطرناک کھیل میں تو کوئی کردار ادا نہ کر کیونکہ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک نکلے گا۔"

لڑکی نے کہا۔ "حضور سے میں یہ درخواست ضرور کروں گی کہ میں نے یہ خط پہنچانے میں جو پرخلوص خدمت انجام دی ہے اس کی اگر جزا نہ ملے تو سزا بھی نہ ملے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "تو بے خوف رہ لیکن اس کا خیال رکھ کہ تو آئندہ اس قسم کی سازشوں سے دور رہے۔"

چند کنیزیں مقوی ادویات اور مشروبات لے کر حاضر ہوئیں۔ بادشاہ نے انہیں نوش فرمایا۔ ان کنیزوں کے پیچھے پیچھے بادشاہ کی منہ بولی ماں، ملک نظام الدین کی بیوی بھی وہیں پہنچ گئی۔ بادشاہ ... احتراماً کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ عورتیں اور لڑکیاں بھی کھڑی ہوگئیں۔ منہ بولی ماں کی نظریں بادشاہ کے ہاتھ میں دبے ہوئے پرزے پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر ضبط نہ کرسکی، پوچھا۔ "یہ خط کیسا ہے؟"

بادشاہ نے باپ کا خط اپنی منہ بولی ماں کی طرف بڑھادیا، کہا۔ "یہ میرے باپ بغرا خان کا خط ہے جو لکھنوتی سے آیا ہے۔ اسے نظام الدین کے حوالے کردیا جائے اور کہا جائے کہ اس پر مناسب کارروائی عمل میں لائی جائے۔"

منہ بولی ماں نے یہ خط اپنے قابو میں کیا اور کہا۔ "وہ حضور سے اس وقت ملنا چاہتے ہیں اگر اجازت ہو تو میں انہیں یہیں بلالوں اور یہ خط حضور اپنے ہاتھ سے ان کے حوالے فرمادیں۔"

"نہیں، اس وقت نہیں۔" بادشاہ نے کہا۔ "جب میں نے ملک نظام الدین کو غیر معمولی اختیارات دے رکھے ہیں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے ملنے پر اصرار کیوں کرتا ہے۔"

منہ بولی ماں نے جواب دیا۔ "حضور کے بے انتہا اعتماد اور غیر معمولی نوازشوں کا یہ مطلب تو نہیں کہ شاہی نمک خوار واقعی من مانی کرنے لگیں اور حضور کو واقعی نظر انداز کرکے رکھ دیں۔"

بادشاہ نے اپنی منہ بولی ماں کو سمجھایا۔ "آپ ملک نظام الدین کو سمجھائیں کہ وہ پوری خود اعتمادی سے کام لے اور کسی بھی معاملے میں جھجک اور مروت سے کام نہ لے۔"

منہ بولی ماں وہ پرچہ لیے چلی گئی۔ بادشاہ مقوی ادویات اور مشروبات نوش فرما کر پھر دادِ عیش دینے لگا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

رات کی محفل میں مسخرے اور بھانڈ بھی شریک کیے گئے۔ بادشاہ کے آس پاس جہاں عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا وہیں مسخرے، بذلہ سنج، لطیفہ گو اور داستان سرا بھی موجود تھے۔ اس مجلسِ خاص میں ملک نظام الدین اور قوام الدین کو بھی بلالیا گیا۔ اس میں ملک خطیر بھی موجود تھا۔ دوسرے امرا بھی موجود تھے۔ بادشاہ نے ان میں ملک نظام الدین کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس نے ملک خطیر سے پوچھا۔ ”ملک خطیر! یہ نظام الدین اب تک کیوں نہیں آیا؟“

ملک خطیر نے طنزاً جواب دیا۔ ”حضور! ملک نظام الدین اس ملک کی معروف ترین شخصیت ہے اس لیے اس کی عدم موجودگی کو تشویش کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا۔“

بادشاہ نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن اسے اس وقت یہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ یوں تو وہ بن بلائے مسلط ہوتا رہتا ہے لیکن جب اسے بلایا جاتا ہے تو وقت پر حاضری نہیں دیتا۔“

ملک خطیر نے دبے لفظوں میں مشورہ دیا۔ ”حضور کو چاہیے اس کی مشغولیات اور ذمے داریوں کی ایک حد مقرر فرمادیں اور اس کے فرائض کا کچھ حصہ کسی اور کو تفویض فرمادیں۔“

بادشاہ نے تعجب سے پوچھا۔ ”ملک خطیر! کیا تم مجھے یہ مشورہ ازراہِ دیانت وخلوص دے رہے ہو یا اس میں معاصرانہ چشمک اور حسد شامل ہے؟“

ملک خطیر نے جواب دیا۔ ”میں جو مشورہ بھی حضور کو دوں گا اس میں حضور کے ساتھ ساتھ تاج وتخت کی بہبود کا جذبہ ضرور کارفرما ہوگا۔“

بادشاہ نے تلخی سے کہا۔ ”لیکن میں خود یہ محسوس کررہا ہوں کہ تم ملک نظام الدین سے خوش نہیں ہو اور ہر وقت اس کی کاٹ میں لگے رہتے ہو۔“

ملک خطیر نے کہا۔ ”حضور نے میرے خلوص، تدبر اور دیانت کو پیش نظر رکھ کر ہی خواجہ جہانی کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ میں نے اور میرے خاندان نے حضور کا نمک کھایا ہے، اس لیے میں اپنا فرض تصور کرتا ہوں کہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر جو سچ ہے اسے حضور کے گوش گزار کرتا ہوں۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے، ذرا بیان تو کر۔“

بادشاہ کے طرزِ تخاطب پر ملک خطیر کو غصہ بھی آیا اور افسوس بھی ہوا لیکن صبر اور ضبط کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ بادشاہ نے پھر سوال کیا۔ ”تو خاموش کیوں ہوگیا، جواب کیوں نہیں دیتا؟“

ملک خطیر نے عرض کیا۔ ”حضور کو اصل معاملات سے نظام الدین لاعلم رکھتا ہے اور انہیں جس طرح پیش کرتا ہے ان میں جھوٹ اور مکر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور افسوس کہ حضور آنکھ بند کرکے ان پر یقین بھی کرلیتے ہیں اور فرمان جاری فرمادیتے ہیں جن کی بعد میں تلافی بھی نہیں ہوسکتی۔“

بادشاہ نے جوش میں کہا۔ ”ملک خطیر! تجھے اپنی بات کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ثبوت پیش کرنے ہوں گے۔“

ملک خطیر نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

بادشاہ کی نظریں سامنے اٹھ گئیں۔ دیکھا ملک نظام الدین چلا آرہا ہے۔ اس کے دائیں بائیں دو خدمت گار تھے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی دبی ہوئی تھی۔ خدمت گار ایک مقام پر رک گئے اور ملک نظام الدین بادشاہ کے روبرو جا کھڑا ہوا۔

بادشاہ نے ملک خطیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نظام الدین، بعض امرا ہم دونوں کی قربت اور یگانگت سے جلنے لگے ہیں اور ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی بھی طرح ہم دونوں میں اختلاف پیدا کروادیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”یہ زمانے کی پرانی ریت ہے۔ میں اس سے بددل یا دل برداشتہ نہیں ہوتا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”انہی امرا میں ملک خطیر بھی شامل ہے.....“

نظام الدین نے بات کاٹ دی، بولا۔ ”حضور! گستاخی معاف، اس خاکسار نے حضور کے فرمان کی پوری دیانت داری اور مستعدی سے تعمیل کروادی ہے اور اس کا ثبوت پوٹلی میں باندھ لایا ہوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اسے ہمارے روبرو پیش کرو۔“

نظام الدین نے پوٹلی والے خدمت گار کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ قریب آگیا تو نظام الدین نے پوٹلی کھولنے کا اشارہ کیا۔ پوٹلی کھلی تو اس میں سے ایک انسانی سر نمودار ہوا۔ نظام الدین نے اس سر کو بادشاہ کے قدموں میں رکھ دیا اور عرض کیا۔ ”غدار کا سر حضور کے قدموں میں ہے۔ یہ وہی سر ہے جس میں سودائے حکومت سما گیا تھا اور خوئے بادشاہی پرورش پارہی تھی۔“

ملک خطیر جوش میں چلّایا۔ ”حضور والا! شہزادہ کیخسرو باغی ہرگز نہ تھا۔ یہ اس پر ظلم کیا گیا ہے۔“

بادشاہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”خاموش نمک حرام۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ میرے درباری امرا میں سے کچھ میرے خلاف سازشیں کررہے ہیں، ان میں سے ایک تو بھی ہے۔“

ملک نظام الدین کو موقع مل گیا، بولا۔ ”حضور نے خود ہی ملاحظہ فرمالیا کہ ملک خطیر کیسا انسان ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس کی سازشوں کا بھانڈا پھوڑ دوں لیکن محض اس لیے خاموش رہا کہ کہیں اسے معاصرانہ چشمک اور حسد پر نہ محمول کیا جائے لیکن اب جبکہ حضور کو خود ہی اس کی غداری اور نمک حرامی کا علم ہوچکا ہے تو میں بھی چند باتیں گوش گزار کردینا چاہتا ہوں۔“

بادشاہ کا غصے سے برا حال تھا۔ ملک خطیر بدستور اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ ملک نظام الدین نے کہنا شروع کیا۔ ”میرے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ملک خطیر کی سازشوں کا حتمی ثبوت مل جاتا ہے۔ ان سازشوں میں حضور کے دادا بلبن کے عہد کے نومسلم امرا (مغل) بھی شامل ہیں اور یہ سب اس کوشش میں تھے کہ حضور کی جگہ کیخسرو کو دہلی کے تخت پر بٹھادیں۔ میں نے ان کی سازش کو ناکام بنادیا ہے اور اب یہ لوگ حضور کے والد سے رجوع کریں گے چنانچہ اس سلسلے کا ایک خط حضور کے علم میں بھی آچکا ہے۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”ملک خطیر کو گرفتار کرلیا جائے۔“

ملک خطیر کو کئی آدمیوں نے جکڑ لیا اور رسی سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔

اس وقت بادشاہ اتنا پریشان اور بدحواس تھا کہ اس نے تخلیہ کا حکم دے دیا۔ ملک نظام الدین کے علاوہ سبھی چلے گئے۔ ملک خطیر کو قید خانے پہنچادیا گیا۔ تنہائی میں بادشاہ نے نظام الدین سے دریافت کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ مذکورہ سازش میں نومسلم امرا بھی شامل ہیں؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں حضور کا بدخواہ نہیں ہوں۔ ان سب نے اتحاد کرکے حضور کے خلاف بغاوت کا نہایت خطرناک منصوبہ بنا رکھا ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”پھر اسے ختم کس طرح کیا جائے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضور والا محل میں ایک شاندار تقریب منعقد کریں اور اس میں ان نومسلم امرا کو شرکت کی دعوت دیں۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوجائیں، حضور انہیں گرفتار کرکے فرمانِ قتل جاری کردیں اور اس فرمان پر فوراً عمل بھی کروالا جائے۔ یہ ایک ایسا جامع اور موثر منصوبہ ہے کہ اس میں ناکامی کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”اور اس کے بعد؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضور کی اس کارروائی کی ایسی دہشت طاری ہوجائے گی کہ لوگ حضور کے خلاف سوچنے تک کی ہمت نہ کرسکیں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”لیکن ان امرا کے خاندانوں کا کیا ہوگا۔ یہ لوگ تو جذبۂ انتقام سے متحد ہوکر میرے خلاف بغاوت کرسکتے ہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”ہاں یہ بھی ممکن ہے لیکن میرے پاس اس کا توڑ بھی موجود ہے۔“

”یعنی؟ وہ کیا؟ ذرا بیان تو کرو۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں ان تمام خاندانوں کو، امرا کے قتل کیے جانے کے بعد جلاوطن کرکے پورے ملک میں منتشر اور آوارہ کردوں گا۔ نہ یہ کسی ایک شہر میں یکجا ہوں گے اور نہ متحد ہوکر حضور کے خلاف بغاوت کرسکیں گے۔“

بادشاہ نے بے تابی سے کہا۔ ”تب پھر اس پر فوراً ہی عمل درآمد ہونا چاہیے۔“

نظام الدین نے اسی وقت نومسلم امرا کے نام بادشاہ کے دستخط اور مہر شاہی سے ایک فرمان طلبی تیار کرلیا اور یہ فرمان دوسرے ہی دن جاری کردیا گیا۔

☆☆☆

جب تمام امرا شاہی محل میں داخل ہوگئے تو بادشاہ نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اچانک سخت لہجہ اختیار کیا اور ان سے ان کی نام نہاد سازش کے بارے میں بہت سارے سوال کرڈالے۔ ان سب نے اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے نظام الدین سے کہا۔ ”اب تم کیا کہتے ہو، یہ لوگ تو اس کا اقرار نہیں کررہے۔“

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ ”کوئی مجرم یا گناہ گار اپنے جرم یا گناہ کا اقرار کرتا ہے جو یہ کرلیں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”پھر جو تم مناسب سمجھو، ان کے خلاف کارروائی کرگزرو۔“

جواب میں ملک نظام الدین نے تالی بجائی اور اس آواز پر چاروں طرف سے سپاہی نمودار ہوئے جنہوں نے ان امرا کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ یہ امرا اس وقت بالکل بے دست وپا تھے کیونکہ ان کے ہتھیار پہلے ہی رکھوالیے گئے تھے۔ ایک تند مزاج امیر نے غصے میں کہا۔ ”ہمیں دھوکا دیا گیا ہے اور دھوکا دینے والوں کا حشر بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

بادشاہ نے نظام الدین کے کان میں کہا۔ ”ان امرا کو جو سزا دینا ہو فی الفور دے ڈالو کیونکہ یہ بہت جلد ہمارے خلاف کوئی سازش تیار کر سکتے ہیں۔“

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ ”انہیں شاہی محل کے ایک ایسے گوشہ میں نظر بند کر دیا جائے جہاں کسی اور کی رسائی تک نہ ہو پھر ان سے وہی سلوک کیا جائے جو غداروں اور باغیوں سے کیا جاتا ہے۔“

قیدی امرا نے بادشاہ کو ملامت کی۔ ”اے نوجوان فرماں روا! آخر تو یہ جو کچھ کر رہا ہے، کیا اس کے مابعد اثرات سے بھی واقف ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس مابعد اثرات کی جو قیاس آرائیاں ہیں ان کی رو سے اگر تم لوگ رہا کر دیے جاؤ تو میں تباہ و برباد ہو سکتا ہوں۔“

امرا نے کہا۔ ”نوجوانی اور ناتجربے کاری نے تیری عقل پر پردے ڈال دیے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ تیرے پاس آخر وہ کون سی عقل ہے جس نے وفاداروں کو غداراور غداروں کو وفادار اور جاں نثار بنا کے پیش کر دیا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میرے پاس ان فضول باتوں کا کوئی جواب نہیں۔“

امرا کو پہلے تو قید کر دیا گیا پھر ان کے قتل کے محضر پر بادشاہ نے دستخط کر دیے۔ ملک نظام الدین نے اس پر اسی عجلت اور مستعدی سے فرمان کی تعمیل بھی کروا دی یعنی ان تمام امرا کو قتل کر دیا گیا۔ جو امیر زندہ بچے تھے ان کے دلوں میں اس واقعے نے دہشت پیدا کر دی۔ اب کیقباد بہت خوش تھا۔ اس نے ملک نظام الدین سے کہا۔ ”اب تو اس ملک میں کوئی باقی نہ رہا جو تمہاری مخالفت پر کمر بستہ رہے۔“

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ ”بس حضور کی ملاقات اور دیدار ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ میں اپنے مخالفین سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر میں حق پر ہوں تو میدان میرے ہاتھ رہے گا اور اگر میں جھوٹا ہوں تو ناکام رہوں گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اب تم ان امرا کے خاندانوں کو جلد از جلد پورے ملک میں آوارہ و منتشر کر دو ورنہ یہ ہم سب کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔“

ملک نظام الدین نے کہا۔ ”حضور ذرا بھی نہ گھبرائیں۔ یہ سارے کام میرے ذمے ہیں۔ آپ جشن طرب منائیں اور اس میں اپنی حسرت نکالنے کا جو پہلو بھی نظر آئے اسے اپنانے کی کوشش کریں۔ یہ زندگی بار بار نہیں ملے گی اس لیے جو حاصل ہے اس سے بچ کر نہ نکل جایئے گا کیونکہ جو اس دنیا میں محروم ہے وہاں بھی محروم رہے گا۔“

بادشاہ نے حکم دیا۔ ”ہماری پریاں حاضر کر دی جائیں۔“

اسی وقت محفل میں حسینوں اور نوخیز لڑکیوں کے پرے داخل ہو گئے۔ بادشاہ نے خوش فعلیاں شروع کر دیں۔ نظام الدین نے اجازت چاہی۔ ”میرا خیال ہے اب مجھے چلے جانا چاہیے۔“

بادشاہ نے اچانک پوچھ لیا۔ ”کیا ان امرا کے ساتھ ملک خطیر بھی قتل کر دیا گیا؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”ملک خطیر ابھی تک قید میں ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”آخر وہ ابھی تک زندہ کیوں ہے۔ اسے کوئی سزا کیوں نہیں دی گئی؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا بلکہ ایک ایسی سزا دینا چاہتا ہوں جس سے اس کی ساری عزت و آبرو دہلی والوں کی نظروں میں خاک میں مل جائے۔“

”وہ کیا؟“

”قبل از وقت بتا دینا اچھی بات نہیں۔ حضور بہت جلد اسے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں گے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اچھا اب تم جاؤ، میں ذرا غم غلط کرنے کی کوشش کروں گا۔“

ملک نظام الدین چلا گیا اور بادشاہ شراب و شاہدان خرد دشمن کے جھرمٹ میں اپنا غم غلط کرنے لگا۔

☆☆☆

ملک نظام الدین کے رعب و دہشت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ذکر اور نام سے پورا شہر خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ محل سرا میں الگ اس کے غیر معمولی اثرات محسوس کیے جا رہے تھے۔ اب لوگوں کا ہجوم ملک نظام الدین کے گھر پر ہونے لگا تھا۔ بادشاہ کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ بادشاہ کے آس پاس عورتیں ہوتی تھیں یا پھر مسخرے، لطیفہ گو اور داستاں سرا۔ ملک نظام الدین بادشاہ کو پوری طرح قابو میں کر چکا تھا۔ ملک نظام الدین کا چچا اور سسر ملک فخر الدین امیر الامرا اور کوتوال تھا۔ یہ نہایت وفادار اور سمجھدار شخص تھا۔ یہ بھی اپنے داماد اور بھتیجے کے ارادوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ ملک نظام الدین کو سمجھانا اور خطرناک عزائم سے باز رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا مناسب موقع نہیں مل رہا تھا۔

محل کے آس پاس امرا کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان گھروں میں بھی بادشاہ کی محفل جیسا سماں پایا جاتا تھا۔ ہر گھر سے ساز و نغمات کے سوتے پھوٹتے تھے۔ شرابوں کے خم کے خم ٹھیلوں اور چھکڑوں پر لدے ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دیتے۔ کسی بھی گلی سے گزرتے ہوئے شراب کے بھپکوں کی لپٹیں ناک کی راہ سے دماغ میں گھس جاتیں۔ لوگوں کی شرم و حیا رخصت ہو چکی تھی۔ سر عام عشق و ہوس کے مظاہرے جاری تھے۔ ملک فخر الدین کوتوال تھا اور ایک دین دار بوڑھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھانوے سال کی رہی ہوگی۔ وہ اپنے ابلقی گھوڑے پر سوار ایک بازار سے گزر رہا تھا۔ اس نے ایک جگہ غیر معمولی ہجوم دیکھا۔ بوڑھا کوتوال سمجھا کہ شاید کسی کا کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ یہ گھوڑے کو دوڑاتا بھگاتا اس ہجوم میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک شخص گدھے پر الٹا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہی تھی اور سیاہی میں سے اس کی آنکھیں چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ کوتوال نے کسی سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے اور اسے یہ سزا کس نے اور کس جرم کی پاداش میں دی ہے؟“

کسی شخص نے جواب دیا۔ ”حضور کوتوال صاحب! آپ اس شخص کو واقعی نہیں پہچانتے یا پہچاننے میں تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں؟“

کوتوال نے کہا۔ ”بہ خدا میں اسے نہیں پہچان سکا۔“

اس مجمع میں لڑکے بھی شامل تھے جو گدھے کے آس پاس تالیاں بجانے میں مشغول تھے۔ اتنے میں ایک طرف سے ملک نظام الدین آتا دکھائی دیا۔ بوڑھے کوتوال نے آگے بڑھ کر بھتیجے سے سوال کیا۔ ”نظام الدین! یہ کون شخص ہے اور اسے یہ سزا کیوں دی گئی ہے؟“

ملک نظام الدین نے حیرت سے کہا۔ ”آپ نے اسے واقعی نہیں پہچانا؟ یہ خواجہ جہانی ملک خطیر ہے جسے غداری اور سازش کے جرم میں یہ سزا دی گئی ہے۔“

بوڑھے کوتوال نے اپنا سر پکڑ لیا۔ رقت زدہ لہجے میں بولا۔ ”نظام الدین! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اسے تم سب کہاں لیے جا رہے ہو اور ایسا کس کے حکم سے ہو رہا ہے؟“

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ ”سازش اور غداری کی سزا تو ملنی ہی چاہیے، اس وقت اس غدار کی سواری شاہی محل کے سامنے سے گزاری جائے گی جس کے ایک جھروکے سے بادشاہ سلامت اس کا نظارہ فرمائیں گے۔ اس کے بعد اسے شہر کے گلی کوچوں سے گزار کر شہر بدر کر دیا جائے گا۔“

بوڑھے کوتوال نے کہا۔ ”یہ سراسر ظلم ہے، زیادتی ہے۔ ملک خطیر اگر واقعی سازشی اور غدار ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا لیکن اتنے بڑے امیر کی یوں سر بازار گلی کوچوں میں عزت و آبرو کو نیلام کیا جانا نہ تو جائز ہے اور نہ کارِ شرافت ہے۔“

ملک نظام الدین نے کہا۔ ”عم محترم! آپ اپنی زبان بند رکھیں۔ آپ کا زمانہ گزر چکا۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وقت اور زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔“

ملک خطیر کی سواری جب شاہی محل کے سامنے سے گزری تو بادشاہ چند حسین عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اس نے ملک خطیر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پری وشوں کو مخاطب کیا۔ ”بادشاہوں کے ساتھ اگر اقبال مندی نہ ہو تو وہ دو دن بھی حکومت نہیں کر سکتے۔ ذرا سوچو تو کہ میرے چند روزہ دور حکمرانی میں سازشیں کس طرح ظاہر ہو رہی ہیں اور میں خدا کے فضل سے ان سب پر قابو پاتا جا رہا ہوں۔ یہ ملک خطیر جسے میں نے خواجہ جہانی کا خطاب دے کر اپنے مشیر اور وزیر ہونے کا شرف بخشا تھا، معلوم نہیں کس ہوس و حرص میں میرے خلاف سازشوں میں مشغول ہو گیا۔ آخر خدا نے حق کا ساتھ دیا اور باطل کو زبوں اور خوار کر دیا۔“

سنبل یہاں بھی موجود تھی۔ اس نے دبے لفظوں میں عرض کیا۔ ”لیکن حضور والا! خواجہ جہانی کی یہ سزا اس کے جرم سے زیادہ ہے۔ لوگ اپنی عزت و آبرو پر جانیں قربان کر دیتے ہیں لیکن اس غریب کو یہ موقع بھی نہیں مل سکا۔“

بادشاہ نے سنبل کو اپنے پہلو میں بٹھا کر گرم جوشی سے ایک طویل بوسہ دیا، کہا۔ ”تیرا کام ان ملکی اور سیاسی امور پر رائے زنی کرنا نہیں ہے۔ یہ نہایت نازک علم ہے لیکن اگر یہی بات تیری جگہ کوئی امیر کہتا تو وہ سزا کا مستحق قرار پاتا۔“ پھر پوچھا۔ ”وہ لڑکی فتنہ فردا آج بھی نظر نہیں آ رہی۔ آخر یہ چاہتی کیا ہے؟“

سنبل نے جواب دیا۔ ”حضور والا نے اسے ابھی تک نہیں سمجھا۔ بہ ظاہر تو وہ سردست بارہ تیرہ سالہ ایک معصوم سی لڑکی نظر آتی ہے لیکن اندر سے وہ بھرپور عورت ہے۔ حضور اسے فتنہ فردا سمجھتے ہیں لیکن وہ آج بھی خود کو فتنہ و عالم سمجھتی ہے۔ چنانچہ جب اس کے آتشیں جذبات کا حضور کی طرف سے سرد مہری اور بے پروائی سے جواب ملتا ہے تو وہ مایوس اور دل برداشتہ ہو جاتی ہے اور اس کا حضور کی محفل

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں دم گھٹنے لگتا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں اسے ٹٹول کر دیکھوں گا اور اس کے ساتھ اس کی خواہش اور مرضی کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ حالانکہ میں اسے یہ یقین دلا چکا ہوں کہ میرا دل اس کی امانت ہے جسے وہ دو سال بعد لے لے گی۔"

سنبل نے جواب دیا۔ "لیکن وہ تو حضور کو پہلے ہی بتا چکی ہے کہ وہ ادھار یا مستعار کی قائل نہیں۔ جب وہ عقبیٰ اور آخرت پر یقین نہیں رکھتی تو پھر دو سال پر کس طرح بھروسا کرلے گی۔"

بادشاہ نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو مجبوری ہے، میں اس کو انتظار کی زحمت میں نہیں ڈالوں گا۔"

ملک خطیر کی ذلت و رسوائی کی سواری گزر چکی تھی۔ بادشاہ کچھ دیر جھروکے میں داد عیش دیتا رہا، اس کے بعد محل سرا چلا گیا۔

☆☆☆

بوڑھا کوتوال بڑی شدت سے ملک نظام الدین کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے اپنے مصلّی سے ایک سائے کو اندر کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ بوڑھے کوتوال نے مصلّی ہی سے آواز دی۔

"نظام الدین، ادھر میرے پاس آؤ۔"

ملک نظام الدین اپنے چچا اور سسر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک چوکی بچھی ہوئی تھی۔ بوڑھے کوتوال نے چوکی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور اس کی انگلیاں تسبیح کے دانوں کو جلدی جلدی کھسکانے میں مصروف تھیں۔ آخر تسبیح ایک طرف رکھ دی اور پوچھا۔ "خواجہ جہانی ملک خطیر کو شہر بدر کرآئے؟"

ملک نظام الدین نے خوش ہوکر جواب دیا۔ "ہاں، اس مصیبت سے بہ مشکل پیچھا چھوٹا ہے اور اب میرا کوئی مدمقابل بھی باقی نہیں رہا۔"

بوڑھا کوتوال اپنے سازشی داماد سے مخاطب ہوا۔ "نظام الدین! میں نے تجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے۔"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "اس میں کیا شبہ۔"

کوتوال فخر الدین نے پوچھا۔ "تیرے خیال میں اس وقت میری کیا عمر ہوگی؟"

"غالباً نوے سال۔"

"کیا تجھے اس بات پر ذرا بھی حیرت نہیں کہ میں اتنے طویل عرصے تک محفوظ اور زندہ کیوں رہا؟"

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ "آپ عمر ہی طویل لکھا کے لائے ہیں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" بوڑھے کوتوال نے تردید کی۔ "میں نے کبھی بھی حکمرانی کا خواب نہیں دیکھا۔ میں کوتوالی کے فرائض اسی دہلی میں ایک عرصے سے انجام دے رہا ہوں لیکن آج تک کسی مصیبت میں نہیں پڑا۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ تیرے دماغ میں حکمرانی کا سودا سما گیا ہے حالانکہ تو اس کا اہل تک نہیں۔ ہم نے تو جنگ کی شکل تک نہیں دیکھی اور حکمرانی انہی کا حق ہے جو دشمن کی فوجوں کو تہ و بالا کرکے رکھ دیتے ہیں۔" اس کے بعد کوتوال نے ایک فارسی شعر پڑھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بہ جائے خویش
باشیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش
(اے لومڑی کے بچے تو اپنی جگہ پر کیوں نہیں بیٹھتا، تو نے شیر سے پنجہ لڑایا اور اپنی سزا کو پہنچا)

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ "لیکن اب میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ وہاں سے واپسی مشکل ہے۔"

بوڑھے کوتوال نے جھڑک دیا۔ "کیا تو اس پر نازاں ہے کہ تو تازہ کلاہ، سپید کمر بند اور زربفت کی قبا پہن کر، ایک سنہری ساز و سامان والے عربی گھوڑے پر سوار ہوجاتا ہے اور چند نشے باز چغل خور تیرے دائیں بائیں اور پیچھے موجود رہتے ہیں۔ یہ بہادری کی علامتیں تو نہیں ہیں۔" اس کے بعد اس نے پھر ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا۔ "بہادروں جیسی شکل بنا اور میدان میں اتر پڑ۔ محل کی دیواروں پر رستم و اسفندیار کی شکلیں بنانے سے کچھ بھی فائدہ نہیں۔"

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ "میں نے عرض تو کیا اب میں اتنی دور پہنچ چکا ہوں کہ وہاں سے میری واپسی ناممکن ہے۔"

"یہاں تو کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ تم اب بھی اگر کوئی نیک ارادہ کرلو تو مجھے یقین ہے خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

"افسوس کہ آپ کی نصیحتوں پر کوئی عمل نہیں کرسکتا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے، جو کچھ پڑے گی بھگت لوں گا۔"

کوتوال نے کہا۔ "کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ بادشاہ کا باپ بغرا خان اپنا لشکر لے کر لکھنوتی سے نکل چکا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ کیقباد کو دہلی کے تاج و تخت سے ہٹانے آرہا

ہے اور اس کی جگہ خود سنبھالنا چاہتا ہے۔"

ملک نظام الدین چونک پڑا، گھبرا کے پوچھا۔ "کیا یہ خبر بالکل درست ہے؟"

بوڑھے کوتوال نے جواب دیا۔ "چند دنوں بعد اس کی تصدیق بھی ہوجائے گی۔"

ملک نظام الدین کھڑا ہوگیا، بولا۔ "میں نے اپنی راہ کی ساری رکاوٹیں دور کردی ہیں۔ اگر بغرا خان واقعی میری رکاوٹ بننا چاہتا ہے تو میں اسے بھی دور کردوں گا۔"

کوتوال نے کہا۔ "آخر تو اپنے ارادوں سے باز کیوں نہیں آتا؟"

"عم محترم! میرے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ میں نے ایک زمانے کو اپنا دشمن بنالیا ہے اور اب واپسی کی کوئی راہ باقی نہیں رہی۔ اب میری بہتری اسی میں ہے کہ میں بغرا خان سے بھی نمٹ لوں۔"

بوڑھا کوتوال اسے روکتا ہی رہ گیا لیکن وہ نہیں رکا۔ وہ اسی وقت بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ رنگ رلیوں میں مشغول تھا لیکن جب اسے بغرا خان کی اپنے لشکر کے ساتھ اودھ کی طرف روانگی کا علم ہوا تو وہ بھی پریشان ہوگیا لیکن اس نے اپنی پریشانی چھپائے رکھی۔ ملک نظام الدین نے پوچھا۔ "اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ایک عظیم الشان فوج کو تم بھی تیار رکھو، میں اپنے حق کی حفاظت کروں گا۔"

ملک نظام الدین نے "بہت خوب۔" کہہ کر اسی وقت سے تیاری شروع کردی۔

"ان دنوں بادشاہ کی طبیعت میں ہر وقت ایک تڑپ، ایک خوف سا موجود رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ سے لرزاں تھا۔ گداز عورتوں اور الھڑ لڑکیوں نے پوری طرح یہ کوشش کرڈالی کہ بادشاہ کی توجہ اپنی طرف موڑ لیں لیکن وہ اپنے اس ارادے میں ناکام ہی رہیں۔ اب اسے بغرا خان کے ہونے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

اسی دوران بادشاہ کو اپنے باپ بغرا خان کا نہایت شفقت آمیز اور پیار ا خط موصول ہوا۔ اس میں باپ نے بیٹے کو لکھا تھا۔ "بیٹے! تو بادشاہ ہے اور عیش و طرب کو تجھ سے جدا نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کے ساتھ ہی تو میرے دیدار کو غنیمت سمجھ، اس لیے کہ اب میں تیری جدائی کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ کیا تو نے یہ شعر نہیں سنا۔

گرچہ فردوس مقام خوش است
ہیچ بہ از نعمت دیدار نیست

باتوں سے خوشبو آئے

☆ سحر کے وقت ایسے پیغام بھیجو جن کی روشنائی آنسو ہوں جن کے کاغذ رخسار ہوں جن کی ڈاک قبولیت ہو جن کا رخ عرش الٰہی کی طرف ہو پھر جواب کے منتظر رہو۔

☆ سحر کے وقت بیٹھو، اپنے ہاتھ پھیلاؤ آنکھوں کو چھوڑ دو اور کہو اے رب جلیل! تھوڑی سی پونجی لے کر حاضر ہوں پوری تول دے دے۔

☆ جب سجدہ میں جاؤ تو اللہ تعالیٰ کو چپکے چپکے راز بتاؤ۔ وہ ظاہر اور چھپے سب کو جانتا ہے۔ اپنے پڑوسی کو نہ بتانا کیونکہ محبت کے اسرار فاش نہیں کیے جاتے لوگوں میں حاسد اور خیر خواہ بھی ہوتے ہیں۔

☆ جو تقدیر میں لکھا ہے ہوکر رہے گا، موت آنا لازمی ہے۔ روزی لکھی ہوئی ہے لہٰذا حزن وملال کیوں؟ مرض ہو یا فقر یا مصیبت سب کا اجر ملے گا تو پھر فکر کی کیا بات؟

☆ دنیا میں مسافر کی طرح رہو، روٹی کا ایک ٹکڑا، پانی کا ایک گھونٹ، ایک چادر، چند دن اور راتیں یہی زندگانی ہے اس کے بعد قبر ہے جو مالدار ہو یا غریب سب کے لیے برابر ہوتی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے جو بھی کیا ہے اسی پر راضی رہو اور جس حال میں اس نے تمہیں رکھا ہے اس کے زوال کی تمنا نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں تم سے بہتر چاہتا ہے اور تمہاری ماں سے بھی زیادہ تم پر مہربان ہے۔

☆ ذکر سے رحمان راضی ہوتا ہے، انسان سعادت مند اور شیطان خوار، غم دور ہوتے ہیں اور نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔

☆ جب دل خوب صورت ہو تو وہ فجر کو چشمہ، رات کو دوست اور جھونپڑے کو بھی محل سمجھے گا۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

WWW.PAKSOCIETY.COM

(اگرچہ جنت اچھی جگہ ہے لیکن دیدار سے اچھی کوئی چیز نہیں)

نوجوان بادشاہ باپ کے خط سے بہت متاثر ہوا اور اس نے چند معتبر آدمی لکھنوتی روانہ کردیے۔ انہیں درپردہ ہدایت کی گئی کہ وہ نہایت ہوشیاری اور ذہانت سے بغرا خان کے اصل جذبات اور ارادوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ وفد چلا گیا اور نظام الدین کو اس کا علم ہوا تو بہت فکرمند ہوا۔ اس نے بادشاہ کو سمجھایا کہ یہ نہایت نازک کھیل ہے۔ اس بازی میں ایک طرف نہایت ہوشیار اور جہاں دیدہ فریق ہے اور دوسری طرف ایک نوجوان اور ناتجربے کار شخص ہے اور اس ناتجربے کار اور نوجوان فریق نے اگر اپنے سرد وگرم چشیدہ اور لائق مشیروں کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھایا تو مات ہوجانے کا خطرہ ہے۔ بادشاہ کے دل میں وہم پیدا ہوگیا لیکن وہ وفد کی واپسی تک کچھ سوچنا فضول سمجھتا تھا۔

وفد نے واپس آکر جو جائزہ دیا، اس سے بادشاہ کے شکوک اور خدشات دور ہوگئے۔ وفد کے ارکان نے بتایا کہ بادشاہ کا باپ بغرا خان اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے اور وہ عنقریب لکھنوتی سے چل کر اودھ میں دریائے گھاگرا کے کنارے بیٹے کا انتظار کرے گا۔ نوجوان بادشاہ بھی باپ کی محبت سے بے چین ہوگیا اور اس نے نظام الدین کو حکم دیا کہ روانگی کی تیاری کی جائے۔

ملک نظام الدین کو حکم کی تعمیل میں تامل ہوا۔ اس نے کہا۔ ”حضور! اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمالیں کیونکہ بادشاہوں کو کوئی کام عجلت میں نہیں انجام دینا چاہیے۔“

نوجوان بادشاہ باپ کی محبت سے سرشار تھا، جواب دیا۔ ”بہرحال میں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ دریائے گھاگرا کے کنارے والد سے ضرور ملاقات کروں گا۔“

ملک نظام الدین نے دریافت کیا۔ ”ہمارے ساتھ لشکر کتنا چلے گا؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”بہت تھوڑا کیونکہ ہم والد سے جنگ کرنے نہیں جارہے ہیں۔ اگر تم میرے دل کی بات جاننا چاہتے ہو تو میری خواہش تھی کہ میرے ساتھ چند امرا اور محافظین کے علاوہ کسی کو چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ملک نظام الدین نے عرض کیا۔ ”گستاخی معاف، میں ایک بار پھر حضور سے اختلاف کروں گا۔ دہلی سے اودھ تک تنہا یا چند امرا اور محافظین کے ساتھ سفر کرنا ہرگز قرین مصلحت نہیں ہے کیونکہ یہ معمولی فاصلے کا سفر نہیں ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا میں اپنے باپ سے جنگ کرنے جارہا ہوں؟“

”یہ بات بھی نہیں ہے۔ آپ ذرا غور تو فرمائیں کہ جب آپ ہندوستان کے مشرقی علاقے کی طرف تشریف لے جائیں گے تو اس علاقے کے راجا اور رانا قدم بوسی کے لیے دربار میں حاضری دیں گے۔ اس موقعے پر اگر ان کی آنکھیں شاہی شان وشوکت اور فرماں روائی کے جاہ وجلال نہ دیکھیں گی تو حضور کا سارا رعب ودبدبہ ان کے دلوں سے دور ہوجائے گا اور ان کی اطاعت ووفاداری، بغاوت اور سرکشی میں تبدیل ہوجائے گی۔“

نظام الدین کی باتیں اثر کرگئیں۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضور کو پورے جاہ وجلال، شاہی شان وشوکت اور مرتب ومستعد لشکر کے ساتھ مشرق کا سفر کرنا چاہیے۔ اگر حضور میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو پھر مجھے اجازت دیجیے کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں کسی مروت اور خوف کے بغیر صاف صاف عرض کردوں۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”ملک نظام الدین! میں سب سے زیادہ تم پر اعتماد کرتا ہوں، تم کسی خوف اور مروت کے بغیر ہر وہ بات کہہ گزرو جو میرے اور میری حکومت کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔“

ملک نظام الدین نے عرض کیا۔ ”حضور والا! حکومت کے معاملے میں باپ بیٹا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قدما نے کہا ہے، الملک عقیم (حکومت کے اولاد نہیں ہوتی) اس میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو ہلاک کردیتا ہے۔ اقتدار اور حکومت کا نشہ دشمنوں کو کافور کی طرح ہوا کردیتا ہے۔ ملک گیری کی ہوس میں اکثر باپ بیٹے آمنے سامنے نبرد آزما دکھائی دیے ہیں چنانچہ ایک زمانہ جانتا ہے کہ اس سفر میں بادشاہ کی ملاقات اپنے ایسے باپ سے ہوگی جو لکھنوتی میں حکومت کرتا ہے اور وہاں اس کا خطبہ وسکہ جاری ہے اور شاید اسے یہ احساس بھی ہے کہ دہلی کے تاج وتخت کا اصل وارث بھی وہی ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ جب دونوں لشکر آمنے سامنے جمع ہوں گے تو کیا صورت حال پیدا ہوگی اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔“

ملک نظام الدین کی ہر بات دل کو لگتی تھی۔ اس کا جادو چل گیا اور بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اودھ کی طرف روانگی پورے شاہی جاہ وجلال اور رعب ودبدبے سے عمل

میں لائی جائے۔

بغرا خان کو ایک ایک خبر لکھنوتی میں مل رہی تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ملک نظام الدین نے اس کے بیٹے کو ورغلا کر لاؤ لشکر کے ساتھ اودھ کا سفر کیا ہے تو وہ بھی ایک لشکر جرار اور ہاتھیوں کے ساتھ لکھنوتی سے اودھ کی طرف روانہ ہوگیا اور کچھ ہی دنوں میں دونوں لشکر دریائے گھاگرا کے دونوں کناروں پر اس طرح خیمہ زن ہوگئے کہ دونوں طرف کے لشکری اپنے مدمقابل خیموں کو خوب اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ شام کے وقت نوجوان بادشاہ دریا کے کنارے کنارے سیر کرتا ہوا دور تک چلا گیا۔ دوسری طرف سے اس کے باپ بغرا خان نے محبت اور اشتیاق سے بیٹے کو دیکھا۔ ملک نظام الدین نے فوج کو اس طرح مستعد اور تیار کھڑا کررکھا تھا جس سے بغرا خان کو جنگ وخوں ریزی پر آمادگی کا یقین ہوگیا۔ اس نے اپنے وزیر شمس الدین کو ملک نظام الدین کے پاس روانہ کیا۔ بغرا خان نے ملک نظام الدین کو سخت لفظوں میں لکھا تھا۔

”ملک نظام الدین! اگر تم مجھ سے جنگ کرنا چاہتے ہو تو گویا تم اپنی نمک حرامی کا ثبوت دینا چاہتے ہو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم میری اور کیقباد کی ملاقات میں مانع نہ ہو اور ہم دونوں کی جلد از جلد ملاقات کروادو، ورنہ اس کا جو نتیجہ نکلے گا تم اس سے واقف ہوگے۔“

ملک نظام الدین نے اس کا سیدھا سادہ جواب دے دیا۔ ”غلام اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کررہا ہے لیکن حضور جیسے ہی اس ناچیز کو نظر آئیں گے یہ ازراہ تعظیم سامنے سے ہٹ جائے گا۔“

بغرا خان اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہوگیا لیکن نظام الدین کا تیز دماغ پرامن فضا کو بگاڑنے کی تدبیریں سوچنے میں مشغول تھا۔

دوسرے دن بغرا خان نے اپنا حاجب اپنے بیٹے کے پاس بھیجا لیکن ابھی حاجب کی کشتی بیچ دریا میں تھی کہ ملک نظام الدین کے اشارے پر نامعلوم افراد نے اسے تیروں کا نشانہ بنادیا۔ کشتی کا عملہ ہلاک ہوگیا اور کشتی ڈوب گئی۔ خوش قسمت حاجب تیرتا ہوا بہ مشکل تمام بغرا خان کے پاس واپس پہنچا۔ بغرا خان یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے مفسدوں کی اس حرکت پر غصہ تو بے حد آیا لیکن مشتعل ہوکر کوئی ایسا حکم نہیں دیا کہ جنگ کے شعلے بھڑک اٹھتے۔

تیسرے دن بغرا خان اپنے پیامبروں کو کیقباد کے پاس بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس موقع پر نظام الدین سائے کی طرح موجود رہا۔ بغرا خان کے پیامبروں نے عرض کیا۔ ”حضور کے والد بزرگوار حضور سے ملنے کو تڑپ رہے ہیں اور ہمیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ حضور والا ملاقات کی جزئیات اور تفصیلات طے فرمادیں اور ہمیں بتادیا جائے کہ یہ ملاقات کب، کہاں اور کس طرح ہوگی تاکہ ہم ان تفصیلات سے اپنے آقا کو مطلع فرمادیں۔“

ملک نظام الدین نے بادشاہ کی نمائندگی میں جواب دیا۔ ”تم اور تمہارے آقا کو معلوم ہے کہ وہ جس ہستی سے ملنے آیا ہے وہ کس بلند مرتبے کی مالک ہے اور اس سے ملنے کے آداب کیا ہیں؟“

وفد کے سربراہ نے کہا۔ ”ہاں ہمیں معلوم ہے کہ لکھنوتی کا حکمراں اپنے بیٹے سے ملنے آیا ہے۔“

”نہیں۔“ نظام الدین نے جھڑک دیا۔ ”بلکہ ایک ادنیٰ صوبے دار اپنے آقا، دہلی کے عظیم المرتبت بادشاہ کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل کرنے آیا ہے۔“

بغرا خان کے پیامبر بے بسی اور بے چارگی سے نظام الدین کی لن ترانی سنتے رہے۔ نظام الدین کہتا رہا۔ ”تم واپس جاکر اپنے آقا کو مطلع کردو کہ وہ اسی شرط پر یہاں حاضری دے سکے گا کہ وہ ان تمام آداب شاہی اور خسروی رسوم کی عملاً پابندی قبول کرے گا جو تخت وتاج دہلی میں رائج ہیں۔ بغرا خان کو بادشاہ کے تخت کے سامنے زمیں بوس ہونا پڑے گا۔“

وفد کے امیر نے جواب دیا۔ ”آپ کی شرائط ملاقات اور آداب حاضری ہم اپنے آقا کے سامنے بیان کردیں گے۔“

ملک نظام الدین کا خیال تھا کہ بغرا خان اپنے بیٹے کے روبرو زمیں بوس ہونے کی ذلت گوارا نہ کرے گا اور باپ بیٹے کی ملاقات نہ ہوسکے گی لیکن موقع شناس بغرا خان نے ملک نظام الدین کی یہ چال بھی ناکام بنادی۔ اس نے جواب میں کہلا دیا۔ ”بادشاہ کے امرا اسے کہہ دو کہ اگرچہ کیقباد میرا بیٹا ہے لیکن یہ ملاقات اور حاضری باپ اور بیٹے کی حیثیت سے نہیں ہورہی ہے۔ اس وقت وہ جس تاج وتخت کا مالک ہے وہ میرے باپ بلبن سے اسے ملا ہے اور اس کا اصل وارث میں تھا لیکن میرے بعد یہ تاج وتخت کیقباد کے قبضے میں چلا جاتا۔ ان حالات میں میرا یہ سوچنا درست ہے کہ کیقباد کو اس کا ورثہ وقت سے پہلے ہی مل گیا ہے اور میں اس سے خوشی محسوس کرتا ہوں۔ اب اگر میں خود

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس عظیم تاج وتخت کی عزت نہ کروں گا تو اس کا دبدبہ جاتا رہے گا۔ اس کے علاوہ میرے مرحوم باپ غیاث الدین بلبن نے مجھے ہدایت کی تھی کہ بادشاہ دہلی کا ہمیشہ مخلص اور وفادار رہوں اور اس کے احترام کا پورا پورا حق ادا کروں۔"

بغرا خان نے نفی اور فرار کی ساری راہیں بند کردی تھیں۔ منجمین نے ملاقات کی نیک ساعت کا اعلان کردیا اور نوجوان بادشاہ کے خیمے کو کروفر کے ساتھ آراستہ کردیا گیا۔ بغرا خان اپنے امرا اور محافظین کے ساتھ دریا کے اس پار آگیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے اس کا استقبال کیا اور اسے ساتھ لے کر داخول میں آگئے۔ یہ داخول شاہی خیمے کی وہ جگہ ہوتی تھی جہاں بیٹھ کر لوگ باریابی کے منتظر رہتے تھے۔ یہ جگہ دربار شاہی کے سامنے پردے کے برابر دالان جیسی ہوتی تھی۔

کچھ توقف کے بعد شاہی امرا نے بغرا خان کو شاہی دربار میں حاضری کی اجازت دے دی۔ بغرا خان اندر داخل ہوا، سامنے تخت پر اس کا بیٹا کیقباد نہایت تمکنت سے بیٹھا تھا۔ باپ نے آداب شاہی ادا کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔ اس طرح رسم شاہی کے بموجب بغرا خان نے اپنے بیٹے کے سامنے تین بار سجدہ کیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور بیٹے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ کیقباد باپ کی اس ذلت کو مزید نہ برداشت کرسکا۔ وہ اچانک تخت سے اتر کر باپ کے قدموں میں گر گیا۔ بغرا خان نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ حاضرین دربار بھی رونے لگے لیکن ملک نظام الدین بہت پریشان تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے۔

کچھ دیر بعد باپ نے بیٹے کو حکم دیا۔ "کیقباد! تم تخت پر واپس جاؤ اور مجھے اپنے روبرو تخت شاہی کے سامنے تادیر مودب کھڑے رہنے کا موقع دو۔"

نوجوان بادشاہ نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اب ایسا نہیں ہوگا، اب یہ نہیں ہوسکتا۔"

بادشاہ تخت پر بیٹھا تو اپنے برابر ہی اپنے باپ بغرا خان کو بھی بٹھالیا۔ درباریوں نے خوشی کے اظہار میں سونے اور چاندی کے سکے نچھاور کرنا شروع کردیے۔ شعرا... مدح سرائی کرنے لگے اور مطربان خوش الحان نے خوشی کے گیت چھیڑ دیے۔ کچھ دیر بعد دربار برخاست ہوا اور دونوں تخلیے میں چلے گئے۔ ملک نظام الدین کے سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔

☆☆☆

کئی دن تک یہ سلسلہ جاری رہا کہ بغرا خان دریا عبور کرکے بیٹے کے پاس آتا، محفل جمتی، خوب خوب باتیں ہوتیں اور دونوں پھر جدا ہوجاتے۔ انہی ملاقاتوں کے درمیان یہ اعلان بھی کردیا گیا کہ باپ بیٹے میں کوئی اختلاف نہیں۔

ان ملاقاتوں سے تنگ آکر ملک نظام الدین نے نوجوان بادشاہ سے عرض کیا۔ "دہلی کو زیادہ عرصے لاوارث چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔"

کیقباد نے جواب دیا۔ "مجھے واپسی کے لیے والد محترم سے اجازت لینی ہوگی۔"

ملک نظام الدین نے دبے لہجے میں عرض کیا۔ "ذمے داریوں نے مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی شکی بنادیا ہے۔ خدانخواستہ ان طویل اور بے مقصد ملاقاتوں کے پیچھے کسی کا کوئی خاص منصوبہ تو کارفرما نہیں ہے؟"

بادشاہ نے برہمی سے کہا۔ "ملک نظام الدین! بے بنیاد شبہات سے بچو، اتنی بدظنی بھی مناسب نہیں ہے۔"

ملک نظام الدین نے جواب دیا۔ "نمک خواری اور نمک حلالی کا تقاضا تو یہی ہے کہ غلام اپنی جان کی پروا کیے بغیر حقیقت بیان کردے۔"

باپ کی موجودگی اور احترام میں عورتیں اور لڑکیاں خود کو گھٹا گھٹا محسوس کررہی تھیں۔ ملک نظام الدین نے اس کمزوری سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا، کہا۔ "غلام کو معلوم ہوا ہے کہ بعض شوخ اور سیماب صفت نازنین یہاں کی ناقص اور پرتکلف فضا سے اکتا گئی ہیں اور واپسی کی اجازت طلب کررہی ہیں۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "جو بھی جانا چاہے اسے چلا جانے دو۔ ابھی مجھے والد محترم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

ملک نظام الدین نے شکایتاً کہا۔ "اب حضور نے اپنے غلاموں سے مشورہ لینا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "میں تم لوگوں سے مشورے بھی لوں گا لیکن وہ وقت آنے تو دو۔"

اسی وقت بادشاہ کے سہم الحشم (محافظ) اور نقیبوں نے بہ آواز بلند بغرا خان کی تشریف آوری کی اطلاع دی۔ بیٹا استقبال کو بڑھا اور ملک نظام الدین اور دوسرے امرا نے بادشاہ کی اتباع کی۔

جب دونوں بیٹھ گئے تو بادشاہ نے امرا کو رخصت کردیا اور تخلیے میں باپ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کچھ نصیحتیں کریں۔"

بغرا خان اسے اصول حکمرانی سمجھاتا رہا اور ایران کے مشہور بادشاہوں کے اصولِ جہاں بانی بتاتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "کیقباد! میں خود بھی تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اب جو تو نے نصیحتوں کی فرمائش کی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے دونوں امیر ملک نظام الدین اور قوام الدین کو بھی یہیں بلالے۔ میں انہیں کسی غلط فہمی میں نہیں مبتلا کرنا چاہتا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے ان کے سامنے کہوں گا۔"

کیقباد نے اسی وقت دونوں کو طلب کرلیا۔ جب یہ دونوں آگئے تو بغرا خان نے کہنا شروع کیا۔ "بیٹے! میں دو سال سے تیرے عیش وعشرت کی کہانیاں لوگوں سے سن رہا ہوں اور حیران ہوں کہ آخر اب تک تو محفوظ کیوں ہے؟ میں نے تیرے آس پاس جن لوگوں کو دیکھا ہے انہوں نے اب تک تجھے معاف کیوں کررکھا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے جس دن سے تیری غفلت اور عیش وعشرت کی کہانیاں سنی ہیں حکومت دہلی کی تعزیت کرنے لگا ہوں اور تیرا اور تیری حکومت کا زوال آتا دیکھ رہا ہوں۔"

ملک نظام الدین کا غصے سے برا حال ہورہا تھا لیکن وہ ضبط کیے کھڑا رہا۔

بغرا خان نے کہا۔ "تو نے کیخسرو کو بے گناہ قتل کروادیا۔ بلبنی عہد کے جاں باز اور کارآمد امرا کو قتل کروادیا۔ ان مقتولوں کے غم میں میری آنکھیں خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ ان کے علاوہ جو کچھ ہورہا ہے وہ سب اصولِ جہاں بانی اور استحکام جہانگیری کے خلاف ہے۔" پھر دونوں امرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیقباد! یہ تیری خوش قسمتی ہیں۔ میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ ان دونوں امرا کی مرضی اور مشورے کے بغیر تم کوئی کام نہ کرنا ورنہ تو پریشان ہوجائے گا۔ ہاں، یہ تجھے انہی جیسے دو امرا اور تلاش کرلینے چاہئیں تاکہ کاروبار مملکت نہایت اچھی طرح انجام دیا جاسکے۔ اگر تو نے کوئی کام بھی ان امرا کی مرضی کے خلاف کیا تو اس کی خطرناک سزا بھی بھگتے گا اور اگر تو ان کے مشوروں پر عمل کرے گا تو کامرانیاں تیرے قدم چومیں گی۔"

ملک نظام الدین بہت خوش تھا۔ اسے محسوس ہوا گویا بغرا خان نے خود ہی کیقباد کو اس کے حوالے کردیا ہے۔

بغرا خان کہتا رہا۔ "بیٹے! کیا تو نے آئینے میں اپنی شکل بھی کبھی دیکھی ہے؟ کیا تو نے اپنے چہرے کی شادابی کو رخصت ہوتے ہوئے نہیں محسوس کیا؟ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں وہ باتیں بھی صاف صاف کہہ گزروں جن کو زبان سے ادا کرتے ہوئے بھی شرم سی محسوس کررہا ہوں۔ تو اپنی زندگی کی خاطر حسینوں سے دور رہ، عیش وعشرت کو چھوڑ دے۔ میں بار بار یہی کہوں گا کہ تیری جان خطرے میں ہے۔ تیری یہ جان یا تو حسین عورتیں لے لیں گی یا پھر تیرے خود غرض امرا یہ کام کرگزریں گے۔ ہوش مندی کو کام میں لا۔ بلاوجہ امرا کے قتل سے باز آجا۔ عورتوں سے دور رہ۔"

جس دن ان دونوں کو الوداعی ملاقات کرنا تھی۔ وہ بڑا دلدوز نظارہ تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہی فارسی کا ایک شعر پڑھا۔ جس کا مطلب تھا۔ "مجھے چھوڑ دے کہ میں ابر بہار کی طرح رولوں اس لیے کہ دوست سے رخصتی کے وقت پتھر کو بھی رونا آجاتا ہے۔"

دونوں آپس میں بغل گیر ہوگئے۔ بغرا خان نے بیٹے کے کان میں کہا۔ "نظام الدین کو زندہ نہ چھوڑنا ورنہ یہ تجھے ہلاک کردے گا۔"

اس کے بعد بغرا خان کشتی میں بیٹھ کر گھاگرا کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ کیقباد اور اس کے امرا اس کنارے سے بغرا خان اور اس کے لشکر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بغرا خان نے بھی انہیں حسرت ویاس سے دیکھا اور اپنے امرا سے کہا۔ "میں نے اپنے بیٹے اور سلطنت دہلی، دونوں ہی کو الوداع کہہ دیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب یہ لڑکا رہے گا اور نہ اس کی سلطنتِ دہلی۔"

ادھر نوجوان بادشاہ نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ شراب اور شاہدان حرم سرا اور خوبرویان جہاں سے واقعی کنارہ کشی اختیار کرلے گا اور باپ کی نصیحتوں پر پوری طرح عمل کرے گا۔

☆☆☆

نوجوان بادشاہ کی حسن پرستی کا پورے ملک میں شہرہ تھا۔ اس لیے پورے ملک سے منتخب حسین عورتیں اور لڑکیاں بادشاہ کی طرف کھنچی چلی جارہی تھیں۔ جب بادشاہ اودھ سے دہلی واپس جارہا تھا تو راستے میں نازک اندام نے اس کا پیچھا کیا۔ بادشاہ کی گزرگاہوں میں حسین عورتیں زلف پریشاں اور نیم عریاں سینوں کی نمائش کرنے کھڑی ہوجاتیں۔ ان کے چہروں کی کشش اور ملاحت کا جادو مرد دلوں میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ ان کے غمزے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

نازو انداز اور جان لیوا ادائیں ایسی نہ تھیں کہ کوئی ان کے پاس سے سرسری گزر جاتا لیکن نوجوان بادشاہ پر باپ کی نصیحتوں کا سحر چھایا ہوا تھا۔ اس نے ان کی طرف نظر تک نہ اٹھائی اور دہلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بادشاہ کے دل میں حسن پرستی اور جذبۂ شہوانی کی لہریں سرکش موجوں کی طرح سر اٹھاتیں اور مایوس اور ناکام ہو کے وہیں کہیں دب سہم کر روپوش ہو جاتیں۔ اس نے کئی بار مضبوط ارادوں کے باوجود ان دشمنان زہد و ایمان کو کن انکھیوں سے دیکھ بھی لیا اور ہر بار یہی محسوس ہوا کہ اس کے صبر و ضبط اور برداشت اور عہد کی مضبوط دیواریں کاہ خشک کی طرح لرز رہی ہیں۔ ہوس نے اسے ترغیب دی کہ اعتدال کی راہ اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، ہاں بے اعتدالیوں سے بچنا چاہیے۔

بادشاہ نے ایک جگہ پر پڑاؤ کیا اور سیر و شکار کا منصوبہ بنایا۔ فوراً شکار کی تیاری کی گئی۔ نوجوان بادشاہ کے آس پاس آگے پیچھے چاؤش اور نقیب گرز لیے چل رہے تھے۔ بادشاہ کا گھوڑا شان و تمکنت سے قدم اٹھا رہا تھا۔ املی، آم، جامن، پیپل اور شیشم کے درختوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی عالم میں اچانک ایک طرف سے ایک سوار نمودار ہوا اور بادشاہ کے محافظ دستے کے پاس سے گزر کر سیدھا بادشاہ کی طرف بڑھا۔ اس کی زرنگار قبا اور ریشمی رومال نے دیکھنے والوں کو بہت متاثر اور سحر زدہ کر دیا۔ رومال سر پر بندھا ہوا تھا جس سے اس کی خوب صورت، سیاہ اور ریشم جیسی زلفیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سنہری کام کی ترکش کمر سے بندھی تھی۔ سفید و سیاہ رنگ کا گھوڑا ملیح کاری کے ساز و سامان سے سجا ہوا تھا۔ اس کے حسین اور حور شمائل چہرے نے ہر ایک چہرے کو سحر زدہ کر دیا اور وہ نہایت آسانی سے چتر سلطانی کے سامنے پہنچ گیا۔ محافظ اس کے حسن سے مرعوب اور حیرت زدہ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ یہ پراسرار سوار بادشاہ کے گھوڑے کے سامنے پہنچ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا اور شاہی سواری کے آگے لیٹ گیا۔ اس نے نہایت سریلی اور نغمہ بار آواز میں کہا۔

"اے حسین و خوبرو بادشاہ! میں نے خود کو تیری راہ میں گرا دیا ہے اب اگر تو اپنے قدموں کو میری آنکھوں پر رکھے گا تو یہ آنکھیں وہاں تک بچھی رہیں گی جہاں تک تیرا سفر جاری رہے گا۔"

بادشاہ نے دھڑکتے دل سے اس پراسرار نوجوان کو دیکھا۔ مترنم آواز نے اس کی نسوانیت کا پردہ چاک کر دیا تھا۔ بادشاہ کے ارادوں میں شگاف پڑنے لگا اور توبہ کی عمارت متزلزل ہونے لگی۔

ملک نظام الدین بادشاہ سے ذرا فاصلے پر اپنے گھوڑے پر سوار پرلطف منظر کو نہایت دلچسپی اور انہماک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

بادشاہ نے دلربا حسینہ سے سوال کیا۔ "تو کون ہے اور ہم سے کیا چاہتی ہے؟"

وہ نہایت پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بادشاہ کی رکاب کے پاس کھڑے ہو کر اپنی غزالیں آنکھوں کا نشہ بادشاہ میں منتقل کرنے لگی۔ اس نے نہایت التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"سرد سیمینا بہ صحرا می روی نیک بدعہدی کہ بے ما می روی"

(چاندی جیسے جسم والے سرو! تو جنگل کی طرف جا رہا ہے تو بہت بے مروت ہے کہ ہمارے بغیر جا رہا ہے)

بادشاہ کے لیے مزید ضبط و برداشت سے کام لینا ناممکن ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اس توبہ شکن نازنین کی طرف بڑھا دیا اور سراپا اشتیاق سے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس سفر میں تیری ہم نشینی سے گریز کیا جائے۔"

اس بے باک اور عاشقوں کے دلوں پر سرعام ڈاکا ڈالنے والی شوخ و شریر حسینہ نے بادشاہ کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا اور کہنے لگی۔ "حضور نے غور ہی نہیں کیا کہ ہم کتنی دور سے بادشاہ کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ ہم نے بادشاہ کی گزرگاہوں میں اپنی پلکیں بچھا دیں اور زلفوں کو شانوں پر بکھیر کر اپنے سینوں کو نیم عریاں کر دیا کہ شاید بادشاہ کا دل ٹھہر جائے لیکن بادشاہ نے تو اس نوجوانی میں ان رفتہ کار و نارکارہ بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل درآمد شروع کر دیا ہے جو اب اس دنیا میں کام کے نہیں رہے اور جن کی نصیحتوں میں عقل و خلوص کے بجائے رشک و حسد کارفرما ہے۔"

بادشاہ گھوڑے سے اتر پڑا اور حکم دیا۔ "یہیں پڑاؤ کیا جائے اور شراب حاضر کی جائے۔"

ملک نظام الدین نے اطمینان کی سانس لی اور پوری سرگرمی سے خیموں کی تنصیب کا کام شروع کرا دیا۔

بادشاہ نے حسین فتنہ کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس حالت میں اپنے خیمے میں داخل ہوا۔ توبہ شکن حسینہ نے شراب کا جام اپنے ہاتھ سے بادشاہ کو پیش کیا۔ بادشاہ نے

بے جھجک جام لے لیا اور ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اس مفہوم کا فارسی شعر پڑھا۔

"معشوقوں کے نازو انداز کے خوف سے رات کو میں شراب سے توبہ کر لیتا ہوں لیکن صبح کو ساقی کا مدبھرا چہرہ پھر کام جاری کروا دیتا ہے۔"

شریر حسینہ نے بادشاہ کے جواب میں شعر سنایا۔

"میرا عابد فریب و غمزہ زاہد و سالہ کو بھی پیشانی کے بال پکڑ کر شراب فروش کے پاس کھینچ لاتا ہے۔"

بادشاہ نے محفل شراب جمالی اور اس حسینہ کو ساقی گری کی خدمت سونپی۔ اس نے شکریے کے ساتھ بادشاہ کی پیشکش قبول کرتے ہوئے فارسی کا ایک شعر پڑھا جس کا مطلب تھا۔ "اگرچہ ہم چاند سے زیادہ حسین ہیں مگر بادشاہ کے غلاموں کے غلام ہیں۔"

اس کے بعد بصد نازو ادا اس نے شراب کا جام بادشاہ کی طرف بڑھایا۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے شراب کا جام لے لیا اور جواب میں فارسی کا شعر پڑھا۔

قدح چون دور من آید بہ نزدیکاں مجلس دہ
مر بگزار تا جران بہ مانم چشم در ساقی

(جب پیالے کی میری باری آئے تو مجلس میں جو لوگ میرے نزدیک بیٹھے ہیں، پیالہ ان کو دے دے اور مجھے چھوڑ دے تاکہ میں ساقی کی آنکھوں کے دیکھنے میں مست ہو جاؤں)

اس نے نہایت دلربایانہ انداز میں شراب کا پیالہ ہاتھ میں لیا اور شوخ و شریر نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھا ترچھی نظروں نے بادشاہ کے دل کو اور زیادہ گھائل کر دیا۔ اس نے نخرے سے کہا۔ "شاہ عالم! نوش فرمائیں، میرے سر کی قسم شاہ عالم نوش فرمائیں۔"

بادشاہ نے شراب غٹا غٹ حلق سے اتاری اور کہا۔ "اگر تو ہماری ساقی ہے تو کون کہتا ہے کہ شراب حرام ہے۔"

دیر تک یہ محفل جمی رہی اور شریک محفل پی پی کر دھت ہو گئے۔ بادشاہ نے نشے کی حالت میں حکم دیا۔ "ہزار چاندی کے سکے اس گلستان حسن و جمال پر سے نچھاور کیے جائیں۔"

اس پری پیکر نے نازو ادا سے عرض کیا۔ "حضور والا! یہ نچھاور میرا نہیں ان کا حق ہے جنہوں نے مجھے تربیت دے کر حضور کی محفل میں شریک ہونے کے قابل بنا دیا ہے۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

اس نے کہا۔ "اگر حکم ہو تو انہیں بھی یہیں بلا لیا جائے۔"

ڈاکٹر کی شادی

ڈاکٹر کی شادی اس طرح ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر ہی کی شادی نظر آئے۔

ابٹن کی جگہ Poly fax اور مہندی کی جگہ Iodex استعمال کی جائے، برات ایمبولینس میں آئے اور نکاح اسپتال میں ہو۔

تصویروں کی جگہ X.ray لیے جائیں اور کیا خوب ہو اگر کھانے میں وٹامن سی اور وٹامن بی کے ٹیبلیٹ ہوں۔

مہمانوں کو چائے یا کولڈ ڈرنکس کی جگہ O.R.S. دیا جائے اور دلہا کے گلے میں ہار کی جگہ Sethoscope لٹکایا جائے۔

اور مزہ تو تب آئے کہ ڈاکٹر نکاح کے بعد بولے Next پلیز۔

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سنتا کون ہے؟

میری بیوی روزانہ پھولوں سے باتیں کرتی تھی۔

ایک دن میں نے گلاب سے پوچھا۔

تم تین گھنٹے تک اس کی باتیں کیسے برداشت کر لیتے ہو؟

گلاب نے جواب دیا۔ "سنتا کون ہے۔"

مرسلہ: اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

افسوس

ایک ڈھلتی عمر کی ہیروئن نوجوان اداکار سے

"آپ کے پروگرام بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں آپ کے پروگرام تب سے دیکھتی ہوں جب میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی۔"

نوجوان اداکار افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بہت شکریہ، میرا پروگرام دیکھنے کا، لیکن مجھے افسوس ہے کہ مجھے علم ہی نہ ہو سکا کہ آپ نے اپنی ساری جوانی پاگل خانے میں کھیلتے ہوئے گزار دی۔"

مرسلہ: اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ضرور ضرور، بلکہ اسی وقت ابھی ،یہیں فوراً، بلاتاخیر۔''

اسی وقت اس کے طائفے کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ اس میں ایک سے ایک حسین شکل موجود تھی۔ بادشاہ نے جسے بھی دیکھا اس پر اپنا دل قربان کردیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کس کو پسند کرے اور کسے مسترد کردے۔ وہ سبھی چاند کے ٹکڑے تھے۔ وہ ان کو لے کر دہلی روانہ ہوگیا۔

ان کے ساتھ وہ طائفے بھی تھے جو بادشاہ کے بجائے اس کے امرا اور لشکریوں پر ہاتھ صاف کررہے تھے۔ ایک سیلاب حسن وشباب میں لوگوں کی پارسائی اور زہد تنکے کی طرح بہنے لگی، حسن پرستوں نے اپنی تھیلیاں ان پر نثار کردیں۔ جب کچھ پاس نہ رہا تو انہوں نے اپنے ہتھیار، گھوڑے، غلام، کنیزیں اور خیمے تک فروخت کرڈالے۔ جب ان کے پاس یہ بھی نہ رہا تو سروں کی ٹوپیوں اور ایک چادر کے سوا جو کچھ ہوتا ان حسینوں کی بارگاہ میں نچھاور کردیا جاتا، کسی کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ سیلاب حسن وبلا کس لایا ہوا ہے۔ ملک نظام الدین جو باپ بیٹے کی ملاقات سے گھبرا گیا تھا، ایک بار پھر مطمئن ہوگیا۔

بادشاہ اپنی سابقہ محبوباؤں کو فراموش کرچکا تھا۔ سنبل بادشاہ کے سامنے سے گزرتی تو بادشاہ کے انداز میں یہ محسوس ہوتا گویا وہ اسے پہچانتا تک نہیں، وہ لڑکی جو کبھی بادشاہ کے لیے فتنہ فرو اتھی اب فتنہ بن چکی تھی لیکن بادشاہ کو اب اس کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ اس نے کئی بار بادشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اسے سرد مہری اور بے نیازی کا زخم سہنا پڑا۔ ایک دن اس نے جسارت وجرأت سے کام لیتے ہوئے بادشاہ کا ہاتھ پکڑلیا اور دردناک لہجے میں پوچھا۔

''کیا حضور کو وہ اپنا وعدہ یاد ہے جو دو سال قبل فرمایا تھا۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''وعدے کی بات مت کر معصوم لڑکی۔ میرے آس پاس جتنے بھی ہیں انہوں نے عہد وپیمان کے بغیر ہی میرے دل میں جگہ بنالی ہے، تو بھی قسمت آزمائی کر۔''

لڑکی کو بادشاہ کا جواب پسند نہ آیا۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بادشاہ کے پاس سے اٹھ کر محل سرا میں روپوش ہوگئی۔

ملک نظام الدین نے سنبل کو ملانے کی کوشش کی کیونکہ وہ نہایت ہوشیاری سے مشاہدہ کررہا تھا کہ بادشاہ کی سابقہ محبوبائیں ان دنوں حسد اور رقابت کی آگ میں جل رہی ہیں۔ اس نے سنبل کو نہایت ہوشیاری سے پیش کش کی۔ ''سنبل کیا تو پسند کرے گی کہ محل سرا کا اندرونی نظام تیرے سپرد کردیا جائے اور تجھے اس ملک کی ملکہ بنادیا جائے۔''

سنبل میں اتنی ہمت نہیں تھی لیکن ملک نظام الدین کو اپنا دشمن بھی نہیں بناسکتی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟ میری قسمت میں یہ سرفرازیاں کہاں؟''

ملک نظام الدین نے کہا۔ ''میں نے باہر سارے معاملات درست کررکھے ہیں۔ میں تجھے ایک پڑیا سفوف کی دوں گا تو ایک مقررہ اور معینہ وقت پر اسے بادشاہ کے پیالے میں نہایت ہوشیاری سے ڈال دے گی، اس کے بعد کی ساری ذمے داریاں میرے ذمے۔''

سنبل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کا واقعی مجھے کیا صلہ ملے گا؟''

ملک نظام الدین نے کہا۔ ''میں تجھے اپنی بیوی بنا کر ملک کی ملکہ بنادوں گا۔''

سنبل نے کہا۔ ''میں تیار ہوں لیکن مجھ میں اس کام کی ہمت نہیں ہے، اگر اس موقع پر آپ بھی وہاں موجود رہیں تو میں یہ کام پورے اعتماد سے انجام دوں گی۔''

ملک نظام الدین نے ذرا پس وپیش سے کہا۔ ''کوشش کرو کہ تم یہ کام میری عدم موجودگی ہی میں انجام دے ڈالو کیونکہ اس نازک موقع پر میری باہر موجودگی ضروری ہے۔''

سنبل نے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ آپ بادشاہ کی باتوں میں لگائیں اور میں اس کی شراب میں آپ کا سفوف ملا کر اس کا کام تمام کردوں۔''

قدرے تامل کے بعد ملک نظام الدین نے سنبل کی بات مان لی۔

☆☆☆

بادشاہ کو اچانک ایسا لگا جیسے سامنے کی ہر شے دھندلی ہوتی جارہی ہے۔ حسین چہرے دھوئیں کی طرح مدھم مدھم نظر آرہے تھے۔ اس نے کسی کو آواز دی۔ ''ارے کوئی مجھے سنبھالو، مجھے یہ کیا ہوگیا ہے۔ میری بینائی کو کیا ہوگیا ہے؟''

محفل عیش وطرب درہم برہم ہوگئی، آغوش اور پہلو گرم رکھنے والی مہ وشیں ادھر ادھر سرک گئیں۔ ملک نظام الدین بادشاہ کی مزاج پرسی کو پہنچ گیا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی بادشاہ کو باپ کی نصیحت یاد آگئی۔ اس وقت بادشاہ کو پہلی

ملک نظام الدین کے چہرے پر بے مروتی اور درندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ ملک نظام الدین نے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضور پر لقوے یا فالج کا اثر ہوگیا ہے۔ اس خطرناک بیماری میں حضور نظم ونسق مملکت کیسے چلائیں گے اس لیے بہتر یہ ہے کہ شاہی اقتدار اور مہر عارضی طور پر اس وفادار اور جاں نثار غلام کے سپرد کردیا جائے۔''

بادشاہ نے آہستہ سے کہا۔ ''ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ ملتان کے حالات بہت خراب ہیں تم وہاں روانہ ہوجاؤ۔''

ملک نظام الدین بادشاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا حضور اس نازک موقع پر اپنے جاں نثاروں کو خود سے دور کردینا چاہتے ہیں؟''

بادشاہ نے لکنت زدہ آواز میں کہا۔ ''جاں نثاری کا تقاضا یہ ہے کہ تم میرے حکم کی تعمیل کرو۔''

ملک نظام الدین نے سرد مہری سے کہا۔ ''بہتر ہے، میں ملتان جانے کی تیاری کرتا ہوں۔''

واپسی میں سنبل سے ملاقات ہوگئی۔ اس سے کہا۔ ''سنبل، کل اسی وقت میں بادشاہ کے پاس آرہا ہوں، تم اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار رہنا۔''

سنبل نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے۔''

دوسرے دن ملک نظام الدین اس وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے مطلع کیا کہ وہ ملتان جانے کی تیاری مکمل کرچکا ہے۔

سنبل وہیں موجود تھی، اس نے بادشاہ سے کہا۔ ''میری خواہش تھی کہ اس موقع پر حضور ملک نظام الدین کو نہایت عزت سے روانہ فرمائیں تو مناسب ہوگا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟''

سنبل نے کہا۔ ''میری مراد شراب نوشی سے ہے، کیا حضور ملک نظام الدین کے ساتھ الوداعی شراب نوشی پر آمادہ نہ ہوں گے؟''

بادشاہ نے بادل نخواستہ کہا۔ ''گو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن اگر ملک نظام الدین بھی اسے پسند کرتا ہے تو میں یہ زہر بھی حلق سے اتارنے کو تیار ہوں۔''

لفظ زہر پر نظام الدین پریشان ہوگیا۔ اس نے سنبل کو آنکھ دکھائی۔ دو پیالوں میں شراب انڈیلی گئی۔ ملک نظام الدین نے بادشاہ کو باتوں میں لگالیا اور سنبل نے نہایت چالاکی سے ایک پیالے میں ملک نظام الدین کا دیا ہوا سفوف شامل کردیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں نے ایک ساتھ شراب پی لی۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ملک نظام الدین! ہم دونوں آخری بار ایک ساتھ شراب نوشی کررہے ہیں، آخری بار۔''

بادشاہ کی مسکراہٹ میں طنز کی آمیزش تھی۔ ملک نظام الدین کی زبان اینٹھ رہی تھی۔ اس نے سنبل کو قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ''دغاباز، یہ فریب۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''دغاباز سنبل نہیں تو ہے، تو نے جو کنواں میرے لیے کھودا تھا تو خود اس میں گر گیا۔''

ملک نظام الدین نے نکل بھاگنے کی کوشش کی لیکن اسے پکڑ لیا گیا اور اسے اس وقت تک پکڑے رکھا گیا جب تک کہ تڑپ تڑپ کر اس نے جان نہ دے دی۔

اس کے مرتے ہی بادشاہ نے حکم دیا۔ ''میر جامدار اور نائب سمانہ ملک جلال الدین فیروز کو حاضر کیا جائے۔''

حکم کی تعمیل میں ایک ستر سالہ بوڑھا بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ بادشاہ نے ملک نظام الدین کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جلال الدین یہ نمک حرام کیفر کردار کو پہنچ چکا ہے۔ میری حالت اندر ہی اندر بگڑتی جارہی ہے شاید یہ مرض مجھے جاں بر نہ ہونے دے اس لیے میں تمہیں عارض ممالک کا عہدہ سونپتا ہوں۔''

ملک جلال الدین کے لیے یہ بہت بڑا منصب تھا۔ عارض ممالک کے ذمے فوج کی ترتیب وتنظیم کا کام ہوتا تھا اس طرح ملک جلال الدین کے ہاتھ میں وہ سب کچھ تھا جس کے لیے ملک نظام الدین زندگی بھر کوشاں اور محروم رہا۔

☆☆☆

لقوے اور فالج نے بادشاہ کو مخبوط الحواس کردیا۔ حسینوں کے طائفے راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ شاہی اطبا نے بادشاہ کے امراض کو لاعلاج قرار دے دیا۔ اب وہ اس لائق بھی نہیں رہ گیا تھا کہ سلطنت کے کاموں میں برائے نام ہی حصہ لے سکتا۔ بادشاہ کے امرا دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک حصہ یہ کہتا تھا کہ بادشاہ کے تین سالہ بیٹے کیومرث کو تخت نشین کردیا جائے اور ارکان سلطنت کیومرث کے لیے اپنے فرائض منصبی انجام دیں لیکن کچھ لوگ اس تجویز کے مخالف تھے اور وہ حکومت پر قبضہ جمانے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

تین سالہ کیومرث کو سلطان شمس الدین کا خطاب دے کر تخت نشین کردیا گیا۔

ترکی امرائے دربار نے جلال الدین اور اس کے خاص امرا کو یہ کہہ کر نظر انداز اور مسترد کردیا کہ یہ غیر ترکی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں اس لیے انہیں حکومت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ انہوں نے غیر ترکی امرا کی ایک فہرست تیار کی اور یہ طے کیا کہ انہیں ایک جگہ دھوکے سے بلا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس فہرست میں سرفہرست جلال الدین کا نام تھا۔

جلال الدین بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا، اسے ترکی امرا کے ارادوں کی اطلاع مل چکی تھی چنانچہ ترکی امرا کی طرف سے ملک ایتمر جلال الدین کو بلانے کے لیے جیسے ہی پہنچا اس کے ٹکڑے کردیے گئے۔ اس کے بعد جلال الدین اپنے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ تین سالہ بادشاہ کیومرث کے خیمے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے کمسن بادشاہ کو حراست میں لے لیا اور اپنے مستقر کو واپس ہوئے۔ ترکی امرا نے ان کا راستہ روکنا چاہا لیکن ناکام رہے اور تقریباً سبھی مقابلے میں مار دیے گئے۔

جلال الدین فیروز کے حریف اس سے شکست کھا چکے تھے۔ اب تاج و تخت دہلی اس کے قبضے میں تھا۔ جلال الدین فیروز شاہانہ انداز میں نوجوان بادشاہ کیقباد کے پاس پہنچا۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کیے پڑا تھا اور شاہی اطبا کے بقول وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھا۔ سنبل اس کے سرہانے بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔

جلال الدین نے پوچھا۔ ”اب اس کا کیا حال ہے؟“

سنبل نے جواب دیا۔ ”بہت کم ہوش میں آتے ہیں اور اگر ہوش میں آتے بھی ہیں تو کسی کو پہچان نہیں پاتے۔“

جلال الدین نے کہا۔ ”اس نااہل اور نالائق انسان کے لیے یہی بہتر ہے کہ کسی کو پہچان نہ سکے کیونکہ زندگی بھر یہ اس عارضے کا شکار رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اب یہ مرض اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔“

سنبل سسکیاں لے کر رونے لگی۔

جلال الدین قریب المرگ بادشاہ کو مار کر خوامخواہ اپنے ہاتھ رنگین نہیں کرنا چاہتا تھا، اس نے ملک خطیر کے بیٹوں کو بلایا اور ان سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں اپنے باپ کی ذلت و رسوائی کا انتقام لینا ہے؟“

بیٹوں نے جواب دیا۔ ”ہاں، اگر موقع مل جائے۔“

جلال الدین نے کہا۔ ”ملک نظام الدین تو جہنم رسید ہوچکا ہے۔ قریب المرگ بادشاہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اگر تم اس سے انتقام لینا چاہو تو محل کے دروازے کھلے ہوئے ہیں، اندر جاؤ اور انتقام کی آگ بجھا کر واپس آجاؤ۔“

محل کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ملک خطیر کے بیٹے قریب المرگ بادشاہ کے پاس پہنچے۔ سنبل ان کے تیور سے ان کے ارادے بھانپ گئی۔ پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم لوگ یہاں بے اجازت کیسے آگئے؟“

ایک نوجوان نے کیقباد کو گدی سے پکڑ کر اٹھالیا۔ سنبل کی چیخ نکل گئی۔ دوسرے نے فرش پر ایک چادر بچھادی۔ کیقباد کو اس چادر پر پٹخ دیا گیا۔ بادشاہ کے چہرے پر کرب سے کھنچاؤ پیدا ہوا۔

سنبل چیخی۔ ”کم بختو! ذرا توقف کرو، یہ اپنی موت آپ ہی مرجائیں گے۔“

بادشاہ نے آنکھیں کھول دیں لیکن شاید اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک نوجوان نے اس کی کنپٹی پر ایک سخت گھونسا رسید کردیا۔ بادشاہ ذرا کسمسایا۔ دوسرے نے اسے چادر میں لپیٹ دیا اور پھر اسے کئی بار فرش پر اس طرح پٹخنا شروع کردیا جس طرح دھوبی لکڑی کے پاٹے پر کپڑے پٹکا کرتے ہیں۔ سنبل روتی چیختی رہی۔

اس کمرے کی ایک بالکنی سے جمنا کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان نوجوانوں نے نیچے جھانک کر دیکھا اور پھر اس چادر کو اٹھا کر دریائے جمنا کی نذر کردیا۔ چادر میں لپٹی ہوئی خاندان غلاماں کی آخری شمع دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئی اور ان کے تاج و تخت کو ایک ستر سالہ بوڑھے نے اپنے برف کے گالوں جیسے بالوں اور فرسودہ کھال کے اعضا سے زیب و زینت بخشی اور دہلی کے جہاں دیدہ حضرات نے دولت و اقبال کے اس منظر کو نہایت عبرت کی نظر سے دیکھا جس میں اس نے ایک نہایت حسین اور خوبرو نوجوان کی جگہ بوڑھے جلال الدین خلجی کو پسند کرلیا تھا۔

ماخذات

قرآن السعدین، خسرو۔ بزم مملوکیہ، صباح الدین عبدالرحمٰن۔ تاریخ فیروز شاہی، ضیاالدین برنی۔ تاریخ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایوانی۔ آثارو الصنا دید، سر سید احمد خان۔

چھٹکارا

کاشف زبیر

مغربی دنیا کا ہر انداز جدا ہے... چاہے کسی کے ملن کی بات ہو یا مخالف سمت محوِ سفر مسافروں کا قصہ ..... مذہبی پاسداری ہو یا جرائم کی دنیا کے انقلابات... وہ بھی ایسے ہی مجرم تھے جو دنیا کو چونکانے کے جنون میں مبتلا ہوکر گھر سے نکلے اور واپسی کے ہر رستے کو بند کرتے چلے گئے۔ بالآخر زندگی بھی ان سے عاجز آگئی اور دھیرے دھیرے چھٹکارے کی طرف گامزن ہوگئی ... مگر انہیں تو زندگی اب بھی کسی محبوبہ سے کم نہیں لگتی تھی اور یہی خوش فہمی انہیں رفتہ رفتہ انجام کی طرف دھکیل رہی تھی۔

تاریک راہوں پر لرزاں سائے اور...... مجرمانہ سرگرمیوں کا احوال

سیلی مارٹن ورلڈ کارپوریشن کی عالی شان عمارت میں داخل ہوئی۔ لابی شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ لابی کے آغاز میں سیکیورٹی کاؤنٹر تھا یہاں سے عمارت میں داخل ہونے والے ہر فرد کو گزرنا پڑتا تھا چاہے وہ کارپوریشن کا سربراہ نک کامپٹن ہی کیوں نہ ہو۔ واک تھرو گیٹ سے گزرنے پر کمپیوٹر خودکار انداز میں ڈی این اے میچ کرتا تھا اور پھر آگے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ اندر لابی میں درجن بھر کاؤنٹرز تھے جہاں آنے والوں کی رہنمائی کی جاتی تھی یا ان

کے سوالوں کے جوابات دیے جاتے تھے۔ ہر کاؤنٹر کارپوریشن کے الگ حصے کے لیے تھا۔ سیلی سائنس اینڈ ٹیکنالوجی والے کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ اس نے اپنا کرسٹل ٹیب آگے کیا اور کاؤنٹر پر موجود میگی نے اس کا ٹیب اسکینر پر رکھا، کمپیوٹر نے شناخت کر کے خود کار انداز میں سیلی کی آج سارے دن کی ذمے داریاں اس میں فیڈ کر دیں۔

"ہیو اے نائس ڈے۔" میگی نے ٹیب واپس کرتے ہوئے کہا۔

سیلی مسکرائی اور لفٹ کی طرف بڑھ گئی اسے دو سو بارھویں فلور پر جانا تھا۔ لابی کے آخر میں درجن بھر جیٹ لفٹس لوگوں کو اوپر نیچے لا، لے جا رہی تھیں۔ سیلی جانتی تھی اس کے پاس دس منٹ ہیں اور اس دوران میں اسے اپنے کاموں کی لسٹ دیکھ لینی تھی، اس کا باس جیک اس کا خیال رکھتا تھا مگر کام کے معاملے میں ذرا سی غلطی برداشت نہیں کرتا تھا۔ لفٹ بارہ کے سامنے سب سے کم لوگ تھے سیلی اسی کے سامنے آ گئی۔ نمبر ون لفٹ لوگوں کو نیچے لانے پر مامور تھی۔ باقی گیارہ لفٹیں اوپر لے جا رہی تھیں، شام کے وقت ترتیب الٹ جاتی تھی۔ دوپہر میں لفٹ سات پانچ کے تناسب سے لانے لے جانے پر مامور ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ لنچ کے وقت لوگ آ جا رہے ہوتے تھے۔ اچانک سیلی کے رسٹ موبائل نے وائبریٹ کیا اور اس کے کان میں لگے جھوٹے سے بُندے نما مائک نے اعلان کیا کہ ہیری کی کال تھی۔ اس نے تھری ڈی ہولوگرام آن کرنے سے گریز کیا اور کلائی اوپر کر کے آہستہ سے بولی۔ "ریسیو۔"

"ہائے ہنی۔" فوراً ہیری کی آواز سنائی دی، ڈائل پر اس کی ٹو ڈی ویڈیو آ رہی تھی۔ "آج شام کا کیا پروگرام ہے؟"

"تم بتاؤ۔" سیلی نے مسکرا کر کہا، آج ویک اینڈ تھا اور اسے توقع تھی کہ ہیری کی کال آئے گی۔

"سی ورلڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سیلی خوش ہو گئی۔ سی ورلڈ نیویارک کے ساحل سے کوئی تیس میل دور سمندر کی تہ میں ایک چھوٹا سا انٹرٹینمنٹ سٹی تھا وہاں زیر آب بے شمار ریستوران، ہوٹلز، نائٹ کلبس اور بار تھے۔ سیلی بہت دن سے وہاں جانا چاہ رہی تھی مگر کسی نہ کسی وجہ سے رہ جاتی تھی، اس نے کہا۔

"اچھا خیال ہے۔"

"بس تو تم سات بجے تیار رہنا میں پک کر لوں گا۔" ہیری نے کہا۔

"میں تیار ملوں گی۔" سیلی نے سرگوشی میں چہک کر کہا۔ کیونکہ آس پاس سارے افراد کے کان اسی پر لگے ہوئے تھے۔ صرف کان ہی نہیں بہت سی آنکھیں بھی اس پر مرکوز تھیں۔ گلابی سانچے میں ڈھلا بدن جو اسکرٹ کوٹ میں بہت دلکش لگ رہا تھا۔ ہلکی نیلی آنکھیں، سنہری بال اور سبک سے نقوش مردوں کو بار بار اسے دیکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ دو مہینے پہلے پچیس برس کی ہوئی تھی لیکن دیکھنے میں بیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ چار سال پہلے یونیورسٹی سے ہائی ٹیک میں گریجویشن کر کے وہ ورلڈ کارپوریشن میں آئی تھی۔ اسے اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسے ورلڈ کارپوریشن میں جاب ملی ہے جو دنیا کی حکمران کمپنی تھی۔

پچاس سال پہلے دنیا کے لوگوں نے جنگوں اور سیاسی اختلافات سے تنگ آ کر ملکوں کی سرحدیں ختم کر دی تھیں۔ ملٹی نیشنل کارپوریشنز نے ان لوگوں کا ساتھ دیا اور ایک تحریک چلی۔ سیاست دان آسانی سے اپنے اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے، انہوں نے سیکیورٹی فورس کا بے دریغ استعمال کیا اور لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر ورلڈ کارپوریشن نامی تحریک منظم ہوئی اور دنیا کے طاقتور ترین سرمایہ دار اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ پھر دنیا سے سیاست دانوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ ورلڈ کارپوریشن نے ایسا نظام قائم کیا جس میں ہر فرد حکومت میں شامل تھا۔ انتظامی فیصلے ورلڈ کارپوریشن کا بورڈ کرتا تھا لیکن پالیسی سازی براہ راست عوام کے ہاتھ میں تھی۔ سرحدیں ختم کر دی گئی تھیں لیکن قوموں اور مذہبی گروہوں کی آزادی برقرار رکھی گئی تھی۔ ہر شخص کسی بھی مسئلے پر فوری اور براہ راست ووٹ ڈال سکتا تھا اور اس کا نتیجہ بھی فوری سامنے آ جاتا تھا۔ اس نظام کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگیں ختم ہو گئیں۔ جو رقم دفاع پر خرچ کی جاتی تھی وہ تعلیم اور سائنس و ٹیکنالوجی پر خرچ کی جانے لگی اور تیس برس کے اندر دنیا سے بھوک، افلاس، جہالت اور متعدی بیماریوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

جدید ٹیکنالوجی کے استعمال سے دنیا میں خطرناک پلوشن کا خاتمہ کر دیا گیا۔ زمین کے ماحول کو بہتر کرنے کے لیے جنگل اُگائے گئے تھے اور سمندروں کو آلودگی سے پاک کیا گیا تھا۔ زمین پر دباؤ کم کرنے کے لیے زیر سمندر بستیاں بسائی گئی تھیں۔ اب سمندر میں کئی میگا سٹی بن چکے تھے اور دنیا کی تیس فیصد آبادی سمندر میں رہ رہی تھی۔ جب سیلی پیدا ہوئی تو دنیا بہت حسین بن چکی تھی۔ اتنی حسین کہ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ کبھی اس دنیا میں جنگ، بھوک، افلاس اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ اب تو ہر شخص کو روزگار،

صحت، تعلیم اور زندگی کی بنیادی سہولتوں کے مساوی مواقع حاصل تھے۔

سیلی کے ماں باپ فلاڈلفیا کے رہنے والے تھے لیکن سیلی کی پیدائش سے پہلے وہ نیویارک منتقل ہو گئے۔ سیلی کے تین بہن بھائی اور بھی تھے۔ اس کی ایک بہن نے شادی نہیں کی تھی اور وہ ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی، دو بھائیوں میں سے ایک نیویارک میں تھا اور دوسرا ٹورنٹو میں جاب کر رہا تھا، دونوں شادی شدہ تھے۔ سیلی نے شادی نہیں کی تھی لیکن وہ الگ رہتی تھی۔ اس کی جاب ورلڈ کارپوریشن کے ہیڈ کوارٹر میں تھی اور اسے نزدیک ہی ایک اسکائی اسکریپر میں فلیٹ ملا ہوا تھا۔ یہ اسکائی اسکریپر ورلڈ کارپوریشن کے ملازمین کے لیے مخصوص تھا تاکہ انہیں جاب پر آنے جانے میں دقت نہ ہو۔ سیلی کے پاس ایک بیڈ روم والا بہت خوب صورت فلیٹ تھا۔ لاؤنج میں کچن تھا اور بالکونی سے دور سمندر کا نظارہ بہت دلکش لگتا تھا۔ فلیٹ ایک سو توّے ویں منزل پر تھا۔ سیلی کو فلیٹ سے اپنے دفتر پہنچنے میں صرف بیس منٹ لگتے تھے اور وہ پیدل آتی جاتی تھی۔ حالانکہ اس کے پاس تقریباً نئی کار تھی۔ مگر اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کار میں ٹریفک میں پھنس کر جانے کے بجائے اسے ہائی رائز سے گزرنا اچھا لگتا تھا، سڑک سے اوپر پورے مین ہٹن میں گلاس پیڈسٹرین کا جال بچھا ہوا تھا جس سے گزرتے ہوئے شہر کا نظارہ کرنا اور تازہ ہوا کے جھونکے محسوس کرنا ایسا خوشگوار عمل تھا جس کے لیے سیلی بیس منٹ کیا ایک گھنٹے کا سفر بھی کر سکتی تھی۔

ہیری سے بات کر کے وہ اوپر آئی تو اس کا موڈ زیادہ ہی خوشگوار ہو گیا تھا لیکن جب اس نے اپنے کیبن کی طرف جاتے ہوئے گلاس وال کے پیچھے اپنے باس جیک کا چہرہ دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ جیک فکرمند اور سوچ میں گم لگ رہا تھا۔ سیلی اس کی نائب تھی۔ جیک سائنس اینڈ ٹیکنالوجی رپورٹ سیکشن کا انچارج تھا۔ یہاں اس پورے شعبے سے متعلق رپورٹس کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور اس میں بعض انتہائی خفیہ رپورٹس بھی شامل ہوتی تھیں۔ رپورٹس کاغذات کے بجائے مکمل طور پر کمپیوٹر میں محفوظ کی جاتی تھیں۔ جیک کی فکرمندی اور پریشانی کا مطلب تھا کہ جلد یا بدیر اس کے ماتحتوں کو بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سیلی اپنے کیبن میں آئی، اس نے کمپیوٹر آن کیا اور کام میں مصروف ہو گئی۔ ایک گھنٹے بعد جیک نے اسے پکارا۔

"سیلی تم ذرا میرے کمرے تک آنا۔"

آواز سیلی کے ٹاپس سے آئی تھی۔ آفس میں آنے کے بعد اس کا موبائل فون دفتر کی حد میں انٹرکام بھی بن جاتا تھا۔ سیلی اٹھ کر جیک کے کمرے تک آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ سیلی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔"

حالانکہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ سیلی نے صرف اتنا کہا۔ "یس مسٹر جیک۔"

"تم جانتی ہو دو سال پہلے ہمارے پاس ایک میگا اسٹار شپ کا ڈیزائن آیا تھا۔ انجینئرز کے ایک گروپ کی طرف سے اسے ڈیزائن اور تجویز کیا گیا تھا۔"

سیلی نے ذہن پر زور دیا لیکن اسے ایسا کوئی پروجیکٹ یاد نہیں آیا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "سوری مسٹر جیک مجھے یاد نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے یاد ہے۔" جیک نے کہا۔ "یہ ڈمپ پروجیکٹ تھا اور نامنظوری کے ساتھ ہمارے پاس آیا تھا اس لیے اسے ڈمپ سیکشن میں بھیج دیا گیا تھا۔"

بات مکمل نہیں ہوئی تھی اس لیے سیلی بہ دستور سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ جیک سوچ میں گم تھا پھر بالآخر اس نے کہا۔ "سیلی وہ رپورٹ اور ڈیزائن ڈمپ سیکشن سے غائب ہے۔"

سیلی اچھل پڑی تھی۔ "غائب ہے مسٹر جیک... لیکن یہ کس طرح ممکن ہے؟"

"یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔" جیک نے سر تھام کر کہا۔ "لیکن ابھی اصل بات تو تم نے سنی نہیں ہے۔"

سیلی خود کو اصل بات سننے کے لیے تیار کرنے لگی۔ "یس مسٹر جیک۔"

"رپورٹ کی گم شدگی کی ذمے داری میری اور ڈمپ سیکشن کی ہے لیکن جب میں نے پلاننگ ڈویژن کو اس بارے میں اطلاع دی جہاں سے یہ رپورٹ آئی تھی تو انہوں نے ایسی کسی رپورٹ کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔"

یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ سیلی نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کی ہماری پاس انٹری تو ہو گی۔"

اس بار جیک کا لہجہ رو دینے والا ہو گیا تھا۔ "یہی تو مسئلہ ہے، ہمارے سسٹم میں اس کی انٹری بھی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ بالکل بلینک ہے سوائے میرے کسی کو نہیں پتا کہ ایسی کوئی رپورٹ ہمارے پاس آئی تھی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈمپ کی گئی تھی۔"

پلاننگ ڈویژن کے انکار اور شعبے میں انٹری نہ ہونے کا سن کر سیلی کے تاثرات بھی بدل گئے تھے، اس نے کسی قدر بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تب مسٹر جیک آپ کو یاد کرنے میں کوئی غلطی..."

"مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔" جیک غرایا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"بات دو سال پرانی ہے۔" سیلی نے دبے لہجے میں کہا۔ "پھر ہر جگہ سے ریکارڈ کیسے غائب ہوسکتا ہے؟"

"یہ ہوا ہے، یہ کوئی چکر ہے۔" جیک نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "ایک یہی معاملہ نہیں ہے۔ بحرالکاہل کی ایک تحقیقی سائٹ جو کہ متروک ہوگئی تھی، اس سے متعلق ریکارڈ بھی غائب ہے۔"

سیلی ایک بار پھر سنجیدہ ہوگئی۔ "مسٹر جیک آپ کھل کر بات کریں۔ اگر ایسی کوئی چیز تھی اور غائب ہے اور پلاننگ ڈویژن بھی اس کی موجودگی سے انکار کررہا ہے تو ہمارا مسئلہ کہاں بنتا ہے؟"

جیک میز کے پیچھے سے گھوم کر سیلی کے پاس آیا اور اس کے کان کے پاس منہ لاکر بولا۔ "ایک صحافی ہے روڈی وولف، اس کا کہنا ہے کہ یہ میگا اسٹار شپ بن رہا ہے۔"

سیلی نے اپنے باس کو دیکھا۔ "اس کے پاس اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کچھ ہے؟"

"اس کا کہنا ہے بہت کچھ ہے۔" جیک بولا اور واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ "تم سوچ سکتی ہو کہ یہ بات کھلی اور معاملہ عدالت تک گیا تو میرا کیا ہوگا۔"

سیلی سوچ سکتی تھی غفلت اور نااہلی پر جیک کو فارغ کردیا جائے گا مگر سوال یہ تھا کہ ان کے سسٹم سے یہ رپورٹ کیسے نکلی اور پلاننگ ڈویژن کیوں انکار کررہا تھا۔ اس نے سوال کیا۔ "ٹھیک ہے پلاننگ ڈویژن والے رپورٹ بھیجنے سے انکار کررہے ہیں لیکن یہ رپورٹ ان کے سسٹم میں تو ہوگی۔"

جیک نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسی کوئی رپورٹ ان کے سسٹم میں بھی نہیں ہے۔"

"انجینئرز کا گروپ..... جس نے یہ ڈیزائن اور رپورٹ تیار کی تھی؟"

جیک کراہا۔ "وہ ایک سال پہلے مختلف وجوہات کی بنا پر کارپوریشن کی جاب چھوڑ گئے اور اب ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔"

سیلی نے پھر بے یقینی سے جیک کی طرف دیکھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے، آج دنیا کی آبادی پندرہ ارب افراد پر مشتمل ہے اور ورلڈ کارپوریشن کے سسٹم میں ایک ایک فرد کے بارے میں مکمل معلومات ہوتی ہیں حتیٰ کہ یہ بھی کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے اور کس کے ساتھ ہے۔"

یہ درست تھا، جرائم اور دہشت گردی کی روک تھام اور عدالتوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے ساری دنیا کے انسان ایک چپ کی ذریعے ورلڈ کارپوریشن کے مرکزی کمپیوٹر سے منسلک رہتے تھے اور ان کی سرگرمیوں کی مکمل نگرانی کی جاتی تھی لیکن یہ معلومات معدودے چند افراد کے علم میں رہتی تھیں اور جب ضرورت پڑتی تو یہی لوگ معلومات آگے متعلقہ اداروں کو فراہم کرتے تھے، اس سے نجی آزادی کا قانون متاثر نہیں ہوتا تھا۔ پوری دنیا میں کروڑوں ڈی این اے میچر کام کررہے تھے، ان سے جو فرد گزرتا یہ وقت کے ساتھ اس کا ڈی این اے کوڈ محفوظ کر لیتے اور ضرورت پڑنے پر ایک منٹ میں معلوم ہوجاتا تھا کہ مطلوبہ شخص کس وقت کہاں تھا؟ اس نظام کے لاگو ہونے کے بعد جرائم کی شرح میں حیرت انگیز کمی آئی تھی۔

دہشت گردی کی وارداتیں تو سرے سے ختم ہوگئی تھیں۔ اب پوری دنیا میں سال بھر میں بس اتنے جرائم ہوتے تھے جتنے کسی زمانے میں صرف امریکا میں ہوتے تھے۔ اس نظام کی نگرانی سے بچنے کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نہیں تھا کہ دماغ میں نصب کی جانے والی چپ نکال دی جائے مگر یہ نمک کے دانے سے بھی چھوٹی ہوتی تھی اور اسے خفیہ انداز میں پلانٹ کیا جاتا تھا جسے لگائی جاتی تھی وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مذکورہ چپ کہاں تھی؟ مگر جیک بتا رہا تھا کہ میگا اسٹار شپ کا ڈیزائن اور رپورٹ تیار کرنے والے انجینئرز کا پورا گروپ غائب تھا۔ حالانکہ ایسا عملی طور پر ممکن نہیں تھا۔ سیلی نے پوچھا۔

"یہ بھی روڈی نے بتایا ہے۔"

"ہاں۔"

"وہ جھوٹ بول سکتا ہے؟"

"بول سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔"

سیلی کے لیے اس بات پر یقین کرنا مشکل ہورہا تھا، ورلڈ کارپوریشن ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ اس کے ایک ہزار سرمایہ دار ڈائریکٹرز بے شک آج بھی دنیا کے امیر ترین لوگ تھے مگر انہوں نے کسی کو غریب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گھر، گاڑی اور تفریح اتنی سستی تھی کہ ہر شخص کی پہنچ میں تھی۔ لوگ

بہترین ماحول میں کام کرتے تھے اور بہترین گھروں میں رہتے تھے۔ انہوں نے دنیا کو جنت بنا دیا تھا۔ اس لیے لوگوں کو اس کی پروا نہیں تھی کہ ورلڈ کارپوریشن کے ڈائریکٹرز خود کس قدر دولت کما رہے تھے اور گزشتہ تیس سال میں ان کے اثاثے کہاں سے کہاں جا پہنچے تھے۔ سیلی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"مسٹر جیک آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

"کیونکہ میں دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔" جیک نے گہری سانس لے کر کہا۔ "تم اچھی لڑکی ہو اور مجھے امید ہے کہ یہ بات خود تک ہی محدود رکھو گی۔ میں تمہیں اپنی کسی ذمے داری میں شریک نہیں کرنا چاہ رہا۔"

"تھینک یو سر۔" سیلی نے سکون کا سانس لیا تھا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں، یہ سب مجھ تک محدود رہے گا۔"

جیک نے سر ہلایا۔ سیلی شام کو اپنے وقت پر آف کر کے نکلی تو اسے جیک نظر نہیں آیا تھا شاید وہ پہلے ہی جا چکا تھا۔ ٹھیک سات بجے ہیری اپنی سپر ہائیر ڈ کار کے ساتھ بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود تھا۔ سیلی تیار تھی وہ نیچے آئی اور وہ دونوں سی ورلڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سمندر کے نیچے بہت چوڑی اور خوب صورت سرنگ تھی۔ اس میں نہ صرف آٹھ لین کی ہائی وے تھی بلکہ اس میں ٹرین بھی چلتی تھی۔ سرنگ میں حد رفتار کم سے کم دو سو کلومیٹر فی گھنٹا تھی۔ سرنگ میں داخل ہو کر ہیری نے ڈرائیونگ کو آٹو پر لگا دیا اور خود سیلی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے غور سے سیلی کو دیکھا اور بولا۔ "کیا بات ہے ڈیئر، تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟"

"آں ہاں..." سیلی ہچکچائی۔ اسے جیک کی بات یاد آئی اس نے سیلی پر اعتماد کر کے اسے سب بتایا تھا۔ "کچھ دفتر کے مسائل ہیں۔"

"ڈارلنگ، دفتر کے مسائل دفتر میں چھوڑ کر آیا کرو۔" ہیری نے اسے بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا تو سیلی سچ مچ سب بھول گئی۔ ہیری صرف خوش شکل اور ہینڈسم ہی نہیں بلکہ کردار اور مزاج کا بھی اچھا تھا، وہ سیلی سے بہت محبت کرتا تھا، اس کی خوشنودی کا خیال رکھتا تھا اور اس سے بہت نزاکت اور نرمی سے پیش آتا تھا۔ ہیری بھی ورلڈ کارپوریشن میں کام کرتا تھا اور وہ آئی ٹی کے شعبے میں تھا۔ انہیں زیادہ موقع نہیں ملا اور دس منٹ بعد کار کے کمپیوٹر نے خبردار کیا کہ وہ سی ورلڈ پہنچنے والے ہیں بادل ناخواستہ ہیری اس سے دور ہوا اور اس نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔ سی ورلڈ شیشے کے گنبد تلے بنا ہوا تھا، دن میں اوپر کی روشنی اسے منور کرتی تھی لیکن رات کو نیچے جلنے والی تیز روشنیاں اوپر سمندر کو روشن کر دیتی تھیں۔ اس وقت بھی سی ورلڈ کی دنیا اوپر سمندر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

ہیری نے کسی نائٹ کلب کا رخ کرنے سے پہلے ڈنر کی تجویز پیش کی جو سیلی نے مان لی۔ انہوں نے اپنے پسندیدہ ریستوران کا رخ کیا۔ یہاں میز پر ٹی وی کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ آنے والے کھانے کی میز کی سطح پر اپنی پسند کا پروگرام دیکھ سکتے تھے۔ سیلی اور ہیری کو ٹی وی سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے انہوں نے ایک نیوز چینل لگا کر چھوڑ دیا اور ایک دوسرے سے باتوں میں لگ گئے۔ کھانے سے پہلے ہیری نے ڈرنک منگوائی تھی۔ ڈنر آدھے گھنٹے بعد آیا اور وہ کھانے میں لگ گئے۔ اچانک سیلی کی نظر ٹی وی پر گئی اور وہ چونک گئی، اس پر جیک کی تصویر آ رہی تھی اور لائیو منظر میں ایک حادثہ شدہ کار دکھائی جا رہی تھی۔ سیلی نے ہیری کی توجہ دلائی اور اپنے موبائل فون کا وائی فائی ٹی وی کے ساتھ کنیکٹ کیا، اب وہ آواز سن سکتی تھی۔

رپورٹر بتا رہی تھی کہ جیک ایڈگر نامی شخص کی کار ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ کار کے دفاعی سسٹم کو حرکت میں آنے کا موقع نہیں ملا اور جیک اس حادثے میں موقع پر ہلاک ہو گیا۔ ٹرک کے ہٹتے ہی کار کے خود کار مرمت کے نظام نے اسے ٹھیک کر دیا تھا مگر اتنی دیر میں جیک مر چکا تھا۔ سیلی نے اپنی چیخ روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ہیری نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے ٹی وی آف کر دیا اور سیلی کو تسلی دینے لگا مگر وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ ان کا ڈنر تقریباً مکمل ہو گیا تھا۔ ہیری نے بل ادا کیا اور سیلی کو لے کر باہر آ گیا۔ سیلی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پلیز گھر چلو، میں اب کچھ نہیں کر سکوں گی۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" ہیری نے نرمی سے کہا۔ "بہتر ہے تم میرے ساتھ چلو۔"

ہیری شہر سے باہر ایک مضافاتی بستی میں رہتا تھا، یہاں کھلا ماحول تھا اور نزدیک ہی قدرتی جنگل اور ایک بڑا پارک بھی تھا۔ ہیری کا دو منزلہ مکان سیلی کو اتنا ہی پسند تھا جتنا کہ اپنا فلیٹ، وہ ایک اتوار یہاں گزارتی تھی اور ایک اتوار ہیری اس کے فلیٹ میں ہوتا تھا۔ گھر آ کر انہوں نے ٹی وی لگا کر خبر دیکھی۔ پولیس کے مطابق نیویارک شہر میں گزشتہ پانچ برسوں میں یہ خوفناک ترین حادثہ تھا۔ لاش کا حال برا تھا۔ اس لیے اس کی کوئی فوٹیج جاری نہیں کی گئی۔ سیلی خبر دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا یہ اتفاق ہے کہ آج جیک نے

اسے بہت بڑا راز بتایا اور آج ہی ایک حادثے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ سیلی نے جیک کی بیوی کیتھرین کو کال کی۔ وہ بھی رو رہی تھی اور سیلی کی آواز سن کر مزید پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ سیلی اس کا ساتھ دے رہی تھی، جب دونوں کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو سیلی نے پوچھا۔ "حادثے کے بارے میں کیا بتایا گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" کیتھرین سسکتے ہوئے بولی۔ "اس کے بجائے ورلڈ کارپوریشن کا ایک آدمی آیا تھا اور وہ پوچھ رہا تھا کہ پچھلے دنوں میں جیک کن کن لوگوں سے ملا تھا۔"

"وہ کیوں پوچھ رہا تھا؟"

"یہ سوال میں نے بھی کیا تھا لیکن اس نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا وہ کہہ رہا تھا کہ دفتر میں بھی انکوائری ہو رہی ہے کہ جیک نے آج کن کن لوگوں سے بات یا ملاقات کی تھی۔"

سیلی کے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی شاید وہی آخری فرد تھی جس سے جیک نے بات کی تھی۔ اب وہ اکیلے یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھی، اس نے کیتھرین سے بات کرتے ہی ہیری کو پکڑا اور اسے سب بتا دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"کیونکہ میں نے جیک سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا راز کسی کو نہیں بتاؤں گی مگر اب وہ مر چکا ہے اور مجھے شبہ ہے اسے قتل کیا گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" ہیری ہڑبڑا گیا۔ "یہ ایک حادثہ تھا۔"

"جب تک کیتھرین سے بات نہیں ہوئی میں بھی ایسا ہی سمجھ رہی تھی۔" سیلی نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اب مجھے یقین ہے، یہ سازش ہے اور اس میں بہت بڑے درجے کے لوگ ملوث ہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اوّل یہ کہ ہمارے سسٹم سے کوئی چیز کیسے غائب ہو سکتی ہے۔ دوسرے پلاننگ ڈویژن نے رپورٹ سے کیوں انکار کیا اور سب سے اہم بات..... میگا اسٹارشپ کا ڈیزائن اور رپورٹ تیار کرنے والے انجینئرز کیسے اور کہاں غائب ہو گئے؟"

ہیری سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی اندر کا آدمی اس میں ملوث ہو اور وہ اتنے بڑے لیول کا ہو کہ یہ سب کر سکے۔ بلکہ میرا خیال ہے ایک سے زیادہ آدمی ملوث ہو سکتے ہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔" سیلی نے ہراساں ہو کر کہا۔ "اگر جیک کی موت حادثہ نہیں ہے تو پھر میرے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"سیلی، ڈونٹ بی سلی۔" ہیری ہنسا۔ "یہ نئی دنیا ہے وہ وقت گزر گیا جب حکومتیں اس قسم کی سازشیں کرتی تھیں اور خفیہ ایجنسیاں لوگوں کو قتل کرتی تھیں۔"

"میں جانتی ہوں لیکن پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"جیک نے کسی صحافی کا ذکر کیا تھا روڈی وولف....."

"ہاں، اصل میں اسی نے جیک کو یہ سب بتایا تھا۔"

"اگر ہم اس سے بات کریں؟"

"وہ کہاں ملے گا؟"

ہیری نے اپنے کمپیوٹر پر روڈی وولف کو تلاش کیا تو اس کا پتا اور فون نمبر دونوں مل گئے مگر جب سیلی نے اسے کال کی تو

کترنیں

لڑکے والے۔ "ہمیں ایسی لڑکی چاہیے جو زیادہ کھاتی پیتی نہیں ہو اور ہمیشہ چپ رہے اور شوہر کی سنے۔"

لڑکی والے۔ "ایسی لڑکی تو آپ کو اسپتال کے آئی سی یو میں ہی ملے گی کستوری لگا کے۔"

❁❁❁

غیرت

ایک ہاتھی نے رومانٹک موڈ میں ایک چیونٹی کو چھیڑا۔

چیونٹی غصے میں ہاتھی کی بیوی کے پاس جا کے بولی۔ "اپنے آوارہ شوہر کو سمجھا لو۔ ورنہ مرد ہمارے بھی چھچھورے ہیں اور باہر تم بھی نکلتی ہو۔"

❁❁❁

نطلے پہ دھلا

استاد کے ہاتھ سے کوا گوشت چھین کر اڑ گیا۔ استاد نے کوے کو آواز دی کہ گوشت واپس کر دو ورنہ لاؤڈ اسپیکر میں آج اعلان کر دوں گا کہ کوا حلال ہے۔

کوا واپس آیا اور بولا۔ "آپ تو سیریس ہی ہو گئے جی، میں نے تو مذاق کیا تھا۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ مجبوراً سیلی نے اس کے لیے میسج چھوڑ دیا کہ وہ جیک کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتی ہے وہ اسے کال بیک کرے۔ ہیری ابھی تک شک میں تھا، اس نے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے یہ میگا اسٹار شپ بکواس ہے۔ ٹھیک ہے ہم خلا میں بہت تحقیق کر رہے ہیں مگر ہمارے انسان بردار خلائی جہاز ابھی زیادہ دور تک نہیں جا سکے ہیں اور ہم نے مشکل سے ایک درجن ہی ایسے سیارے دریافت کیے ہیں جن میں کوئی انسان رہ سکتا ہے، ان میں سے سب سے نزدیک بھی بیس نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ ابھی ہم روشنی کی رفتار کا نوّے فیصد ہی حاصل کر سکے ہیں اس لیے اس سیارے تک جانے میں بھی بائیس سال کا عرصہ لگے گا اس لحاظ سے اسٹار شپ ابھی قبل از وقت ہے۔“

”اس کے باوجود کسی نے ورلڈ کارپوریشن کے محفوظ ترین سسٹم سے اس کا پروجیکٹ چرا لیا ہے۔“

ہیری کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیلی کے موبائل نے بیل دی، اس نے دیکھا کال کے ساتھ کوئی نام نہیں آ رہا تھا، اسے حیرت ہوئی کیونکہ کال کے ساتھ لازمی نام آتا تھا فرد کا یا ادارے کا۔ اس نے ہیری کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”یہ کیا ہے کوئی نام نہیں آ رہا۔“

”کال ریسیو کرو۔“

سیلی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک کھردری آواز آئی۔ ”مس مارٹن تم اور ہیری فوری طور پر وہاں سے نکل جاؤ.... ورلڈ کارپوریشن کے ایجنٹ کچھ دیر میں وہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”تم کون ہو؟“

”روڈی وولف۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم لوگ ہائی وے انیس کے ساتھ شکاگو کی طرف آؤ پھر سیدھے ہاتھ پر مڑ جانا۔“

”لیکن....“

”دیر مت کرو۔“ روڈی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”دیر کی تو پکڑے اور جیک کی طرح مارے جاؤ گے۔“

کال کٹ گئی اور سیلی نے ہیری کی طرف دیکھا، وہ گفتگو سن رہا تھا کیونکہ سیلی نے اسپیکر آن کر لیا تھا۔ سیلی نے کہا۔ ”ہیری.... یہ کیا کہہ رہا تھا؟“

”میرا خیال ہے یہ بکواس کر رہا ہے۔“ ہیری نے مشکوک انداز میں کہا لیکن اسی لمحے سیلی نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا تو اسے دور روشنیاں جھلملاتی دکھائی دی تھیں، اس نے گھبرا کر کہا۔

”پولیس اس طرف آ رہی ہے۔“

ہیری نے اس کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں گھر سے نکل آئے۔ ابھی وہ سڑک کراس کر کے دوسری طرف موجود درختوں میں داخل ہوئے تھے کہ ان کے گھر کے آگے دو پولیس کاریں رکیں، ان کے پیچھے ایک سیاہ وین تھی اور اس سے ورلڈ کارپوریشن کے ایجنٹس نکل کر مکان کے چاروں طرف پھیلنے لگے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے محاصرہ مکمل کیا ایک پولیس کار سے اعلان ہوا کہ مکان کا محاصرہ کر لیا گیا ہے اور اندر موجود افراد ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائیں۔ ہیری نے سیلی کا ہاتھ پکڑا اور وہ تیزی سے ہائی وے کی طرف چل پڑے۔ سیلی پریشان تھی مگر وہ خوش بھی تھی کہ وہ بروقت مکان سے نکل آئے، اس نے کہا۔ ”روڈی ٹھیک کہہ رہا تھا۔“

”اس سے رابطہ کرو۔“

”کیسے..... وہ کال ریسیو نہیں کر رہا ہے۔“

”تم اسے کال کرو گی تو اسے پتا چل جائے گا، اس مصیبت سے نکلنے کے لیے ہمیں اس کی مدد کی ضرورت ہے۔“

سیلی نے اسے کال کی اور پہلے کی طرح اس نے کال ریسیو نہیں کی لیکن ایک منٹ بعد ہی پہلے کی طرح بغیر کسی نام کے اس کی کال آئی تھی۔ ”تم لوگ نکل آئے؟“

”ہاں....“ سیلی نے کہا۔ ”پولیس نے میرے بوائے فرینڈ کے گھر کا محاصرہ کر لیا ہے۔“

”تم لوگ ہائی وے تک پہنچو وہاں ایک نیلی کار جس پر پیلی روشنی ہو گی تمہاری منتظر ہو گی۔“

”ہم ہائی وے سے کچھ دور ہیں۔“

”اب موبائل آف کر دو ورنہ وہ اس کی مدد سے تمہارا پیچھا کریں گے۔“

سیلی نے کال کٹنے کے بعد موبائل آف کر دیا۔ ہیری نے کہا۔ ”وہ چپ سے بھی پتا چلا سکتے ہیں۔“

”نہیں، اس میں وقت لگتا ہے یہ کام آسان نہیں ہے۔“

”ان کے لیے مشکل بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ان کا بنایا ہوا سسٹم ہے۔“ ہیری تلخ لہجے میں بولا۔ ”ہم بہت بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔“

سیلی چلتے چلتے رک گئی۔ ”ہیری اگر تم اس بات پر پچھتا رہے ہو تو تم واپس جا سکتے ہو اور ان لوگوں کو سب بتا سکتے ہو، تم اس معاملے میں کسی طرح سے شامل نہیں ہو۔“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ ہیری نے کہا۔ ”میں تم سے الگ نہیں ہوں۔ وہ مجھے بھی نہیں چھوڑیں گے۔“

”ہمیں پہلے روڈی تک پہنچنا ہو گا اس کے بعد سوچیں گے کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔“

وہ آدھے گھنٹے بعد ہائی وے پر نکلے تو وہاں ایک کار موجود تھی۔ اس کی چھت پیلے رنگ میں روشن تھی اور باقی باڈی نیلا رنگ دکھا رہی تھی۔ یہ بغیر بجلی کے چمکنے والی روشنی تھی جسے بہ وقتِ ضرورت بند بھی کیا جا سکتا تھا۔ وہ کار تک پہنچے جس میں ایک ادھیڑ عمر لمبے بالوں والا شخص بیٹھا تھا اور بے نیازی سے سگریٹ پی رہا تھا، انہیں دیکھتے ہی اس نے جلتا سگریٹ بے پروائی سے گھاس پر پھینک دیا۔ سیلی نے بے ساختہ اپنے جوتے سے سگریٹ بجھائی اور خفگی سے بولی۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”سوری۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”میرا نام روڈی وولف ہے، جلدی آؤ ابھی تمہاری چپ بھی آف کرنی ہے فی الحال یہ کیپ پہن لو۔“ اس نے سیلی اور ہیری کو پی کیپ دیں۔

”ان سے کیا ہو گا؟“

”تمہارے سروں میں لگی چپس کا سگنل رک جائے گا۔ بعد میں اس کو مکمل طور پر نکالنا ہو گا۔“

”مگر کیوں؟“ سیلی بولی تو روڈی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”تاکہ ورلڈ کارپوریشن کے ایجنٹس تم تک نہ پہنچ سکیں، کیا تم نے جیک کے انجام سے سبق حاصل نہیں کیا؟“

ہیری اور سیلی نے پی کیپس پہن لیں اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ روڈی نے بٹن دبا کر کار کی روشنیاں بند کیں اور وہ آگے روانہ ہو گئے۔ اس نے کہا۔ ”مجھے لگا تم لوگ خود سے ہائی وے اُنیس تک نہیں پہنچ سکو گے اس لیے میں خود یہاں چلا آیا۔“

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ ہیری نے پوچھا۔

”ایک جگہ ہے۔“ روڈی نے مبہم انداز میں کہا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ جنگل میں ایک کیبن میں تھے۔ اندر آ کر روڈی نے اپنے اور ان کے لیے ڈرنک نکالی اور وہ آتش دان کے سامنے آ بیٹھے تھے..... کھلے علاقے میں سردی زیادہ تھی جب کہ شہروں میں باہر کا درجۂ حرارت بھی معقول رکھا جاتا تھا تاکہ لوگوں کو باہر نکل کر اپنے کام کرنے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ ٹھٹھر رہے تھے، آتش دان کے سامنے آ کر سکون کا سانس لیا۔ سیلی نے روڈی وولف کی طرف دیکھا۔ ”اب بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ جیک نے ایسی کون سی چیز جان لی تھی جس کی وجہ سے اس کی جان لے لی گئی۔“

روڈی نے سر ہلایا۔ ”یقیناً.... اسٹار شپ.... اس کی وجہ تھی۔“

”اگر کوئی اسٹار شپ ڈیزائن کیا گیا تھا اور اس کا ڈیزائن چرا لیا گیا تو اس سے کسی کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟“

روڈی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”تم اس دنیا کے حکمران ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرتی ہو اور میں تمہیں اتنا معمولی عقل والا نہیں سمجھتا ہوں۔ تم غور کرو یہ سب کیا ہے تو تمہیں نتیجے پر پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔“

سیلی سوچتی رہی لیکن اس وقت وہ کچھ شاک میں تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہی ہوں یہ سب اندر سے ہو رہا ہے۔ ورلڈ کارپوریشن کے سسٹم سے چیز غائب کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور سب سے حیرت انگیز بات پلاننگ ڈویژن کا ایسی کسی رپورٹ سے انکار کرنا ہے۔“

”جیک کا قتل اور اس کے بعد ورلڈ کارپوریشن کا ہیری کے گھر چھاپہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہر اس فرد کو مٹانے پر تل گئے ہیں جو اس بارے میں ذرا سا بھی جانتا ہو۔“

”سوال اب بھی وہی ہے کہ کیوں؟“

روڈی نے سر ہلایا۔ ”اسی سوال کا جواب تو ہم تلاش کر رہے ہیں۔“

”ہم....؟“ ہیری نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں ہم.... اس دنیا کے حریت پسند جو اس مشینی نظام کے خلاف ہیں۔“

”تم لوگ اس نظام کے خلاف ہو؟“ سیلی کو یقین نہیں آیا۔ ”مگر کیوں..... اسی نظام نے تو جنگیں ختم کر کے دنیا کو ایک کیا ہے۔“

”ایک نہیں کیا، ان چند ہزار سرمایہ داروں کی غلامی میں دیدیا ہے جو دنیا کی تقریباً ساری دولت کے مالک ہیں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو کہ صرف ورلڈ کارپوریشن دنیا کے کل بزنس کے ساٹھ فیصد کی مالک ہے۔ گویا ساٹھ فیصد نفع اس کی جیب میں جا رہا ہے اور باقی چالیس فیصد بزنس بھی ان ہی لوگوں کا ہے۔ عام آدمی یا تو ان کی نوکری کر سکتا ہے یا اپنا سرمایہ ان کمپنیوں میں لگا سکتا ہے۔ وہ کتنی ہی کوشش کر لے ایک حد سے اوپر نہیں جا سکتا۔ پہلے عام آدمی بھی اوپر جا سکتا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں جتنے لوگ بھی ارب پتی بنے وہ سارے شروع میں عام آدمی تھے۔ کیا اب یہ ممکن ہے..... گزشتہ پچاس سال میں کوئی عام آدمی اوپر گیا ہے؟“

ہیری اور سیلی نے کبھی ان باتوں پر غور ہی نہیں کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ واقعی گزشتہ پچاس سال سے وہی لوگ دولت اور اقتدار میں اوپر تھے جو شروع سے تھے۔ اگر وہ نہیں رہے تو ان کی اولاد اوپر تھی۔ گزشتہ پچاس برس میں کوئی عام فرد بزنس یا اقتدار کی سیڑھی کے اوپر نہیں گیا تھا۔ ہیری نے سر ہلایا۔ ”بات سمجھ میں آرہی ہے۔“

”لیکن یہ تو دیکھو کہ ان لوگوں نے دنیا سے بھوک، غربت اور جہالت کا خاتمہ کر دیا، اب ساری دنیا کے عام لوگوں کو ایک جیسی سہولتیں میسر ہیں۔“ سیلی نے کہا۔

”سہولتیں۔“ روڈی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ سہولتیں تو کسی زمانے میں کسان اپنے قیمتی مویشیوں کو بھی دیتا تھا، کیونکہ وہ اسے نفع پہنچاتے تھے۔ ہم بھی ان کے لیے قیمتی مویشی ہیں اس لیے ہمیں بہتر ماحول اور سہولیات دی گئی ہیں لیکن خود یہ کس طرح رہ رہے ہیں کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا ہے؟“

سیلی نے اعتراف کیا۔ ”نہیں.... ہمیں نہیں معلوم کہ ہمارے حکمران کس طرح رہ رہے ہیں؟“

”میں دکھاتا ہوں۔“ روڈی نے ریموٹ دیوار کی طرف کر کے بٹن دبایا تو وہ ٹی وی بن گئی۔ اسکرین پر ایک جزیرے کا منظر نمودار ہوا یہ خاصا بڑا جزیرہ تھا جو میلوں رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ پورا جزیرہ سرسبز باغات سے ڈھکا ہوا تھا۔ جہاں سبزہ نہیں تھا وہاں بڑے بڑے عالی شان محلات تھے۔ ان محلات میں سوئمنگ پول، اسپورٹس کورٹ، گولف کورس اور ہیلی پیڈ کی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ روڈی نے کہا۔ ”یہ ہے ہمارے حکمرانوں کا اصل طرز رہائش جو وہ عام لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ عام لوگ اب شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں لیکن یہ لوگ ان جزائر میں رہتے ہیں۔ اسی طرح عام تحقیقاتی لیب شہروں میں ہیں لیکن خاص تحقیقاتی لیب ایسے ہی جزائر پر ہیں۔ ہم لوگوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ جزائر کو ممنوع کیوں قرار دیا گیا ہے؟“

پھر محلات کے اندر کا منظر دکھایا جانے لگا۔ وہاں جو سہولیات اور آسائشیں تھیں انہیں دیکھ کر سیلی اور ہیری کو لگا جیسے وہ اب تک جنگل کی زندگی گزارتے آئے تھے۔ یہ ایسی پرتعیش زندگی تھی جس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہاں دروازوں کے ہینڈل اور فانوس تک سونے سے بنے تھے۔ یہاں ستونوں پر چاندی کی پلیٹنگ کی گئی تھی۔ یہی نہیں عام استعمال کی ہر شے اتنی جدید تھی کہ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔ ایک ایک چیز سے بے انتہا امارت ٹپک رہی تھی۔ اس ایک گھنٹے کی مووی میں اوپری طبقے کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ ان کے پاس آمدورفت کے جدید ترین ذرائع تھے، ان کے ذاتی استعمال میں ایسے طیارے تھے جو ہیلی کاپٹر کی طرح پرواز کرنے کے بعد محض ایک گھنٹے میں دنیا کے کسی بھی کونے میں پہنچنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کا حفاظتی معیار اتنا اعلیٰ تھا کہ آج تک ان طیاروں کا ایک بھی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ روڈی کہہ رہا تھا۔

”یہی وجہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں اوپری طبقے کے ایک درجن لوگ بھی غیر فطری موت کا شکار نہیں ہوئے ہیں یہی نہیں طبی سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ان کے لیے ہر مرض کا علاج نکل آیا ہے۔ ان میں سے ہر فرد کے کلون تیار کر کے رکھے گئے ہیں کہ اگر کسی کو جسم کے کسی عضو کو تبدیل کرانے کی ضرورت پڑے تو اسی کے کلون سے وہ عضو لے لیا جائے۔ عام آدمی کو یہ سہولت نہیں ہے اسے آج بھی کینسر، ہارٹ اٹیک اور دوسری بیماریوں سے مرنا پڑتا ہے۔ ہمیں وائرل انفکشن ہوتے ہیں، ان کو وائرس سے بچاؤ کی خصوصی ویکسین دی جاتی ہے۔“

”میرے خدا۔“ ہیری کراہا۔ ”میری ماں صرف بیالیس سال کی عمر میں کینسر سے مر گئی۔“

”کینسر کا مکمل علاج آج سے بیس سال پہلے دریافت ہو گیا تھا، چاہے کینسر کسی بھی اسٹیج کا ہو لیکن انتہائی مہنگا ہونے کے سبب اسے صرف اوپری طبقے کے لیے رکھا گیا اور اب تو مہنگا بھی نہیں ہے اس کے باوجود صرف اوپری طبقے کے لیے مخصوص ہے۔“

”یہ ظلم ہے۔“ سیلی نے بے ساختہ کہا۔

”ہم اسی ظلم کے خلاف تو لڑ رہے ہیں۔“ روڈی نے بھی بے ساختہ کہا۔ ”اسی لیے میں نے جیک سے رابطہ کیا تھا اور وہ اپنی حماقت سے مارا گیا۔“

”حماقت؟“ سیلی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، اسے دفتر میں اس بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہاں منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ پھر اس نے تم سے بات کی اور یوں تم بھی لپیٹ میں آنے والی تھیں۔ اگر تم مجھ سے بروقت رابطہ نہ کرتیں تو یقین کرو اس وقت کسی مردہ خانے میں پڑی ہوتیں۔“

سیلی نے جھرجھری لی۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”یہ حقیقت ہے، گزشتہ پچاس سال میں لاکھوں افراد ان کی وحشت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اور یہ بات بھی

منظر عام پر نہیں آئی۔ جس فرد سے یہ ذرا سا خطرہ محسوس کرتے ہیں اسے مردانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔ اوپری طبقے کا ہر فرد ورلڈ کارپوریشن کی پولیس کو براہ راست آرڈر کر سکتا ہے اور پولیس بلاچوں چرا اس حکم کی تعمیل کرتی ہے۔“

ہیری نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔ ”یہ .... یہ سب بہت خوفناک ہے.... ناقابل یقین۔“

روڈی نے سر ہلایا۔ ”جب میں پہلی بار ان حقائق تک پہنچا تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا لیکن رفتہ رفتہ میں جان گیا کہ حقیقت اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ ان لوگوں نے ہمیں سیاست دانوں کی غلامی سے نکال کر اس سے کہیں زیادہ بدترین غلامی میں جکڑ دیا ہے۔ جب ملک اور قومیں تھیں تو انسان بے شک اتنا ترقی یافتہ نہیں تھے وہ آپس میں لڑتے تھے، دنیا میں بھوک، جہالت اور غربت تھی لیکن انسان کا ذہن آزاد تھا، وہ اپنے طور پر سوچتا اور عمل کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ہم سے ہماری سوچ چھین کر ہمیں ایک طرح کی مشین بنا دیا۔ ہم اپنے دائرہ کار سے باہر نہیں جا سکتے کیونکہ ہمیں عمل کی آزادی نہیں ہے، اس لیے رفتہ رفتہ ہم نے سوچنا بھی چھوڑ دیا۔“

”لیکن کیسے.....؟ ہمیں آزادی حاصل ہے۔“ سیلی نے اس بار اعتراض کیا۔ ”ہم اپنی مرضی سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، اپنی مرضی کا کیریئر چنتے ہیں، اپنی مرضی کی جگہ جاب کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے اپنا جیون ساتھی چنتے ہیں۔ ہمیں رہائش اور سفر کی آزادی ہے، ہم اپنی مرضی کی تفریح کر سکتے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے، نہایت چالاکی سے ہمارے ذہنوں میں بچپن سے ڈالا جاتا ہے کہ ہم نے بڑے ہو کر فلاں پیشہ اختیار کرنا ہے، ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اب بزنس مین بننے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کے بغیر ہی ہمیں سب مل جاتا ہے۔ پھر ہمیں جاب کی ترغیب دی جاتی ہے جہاں جاب ملتی ہے وہاں اتنی سہولتیں اور تنخواہ ملتی ہے اور ساتھ ہی ترغیب بھی کہ سو میں سے ایک ہی آدمی جاب چھوڑ کر کہیں جاتا ہے۔ رہائش اور جیون ساتھی کی آزادی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے، جب آپ جاب کے غلام ہوں آپ کو لازمی وہیں رہائش رکھنی پڑتی ہے۔ یہ ایک طرح سے چارہ ہے کہ آدمی خود کو آزاد سمجھتا رہے اور وہی کرے جو اوپر والے چاہتے ہیں۔ کیا ہم لوگ واقعی ایسا ہی نہیں سمجھتے ہیں؟“

سیلی اور ہیری کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا، وہ جس چیز کو آزادی سمجھ رہے تھے روڈی بتا رہا تھا کہ یہ بدترین قسم کی غلامی تھی۔ وہ کسی بھی معاملے میں پوری طرح آزاد نہیں تھے اور جہاں خود کو آزاد سمجھ رہے تھے وہاں بھی وہ لاشعوری طور پر اپنے آقاؤں کی پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ روڈی نے ان کو کئی ویڈیوز اور دکھائیں جن میں لوگوں کو بیگار کرتے دکھایا گیا تھا، یہ وہ لاوارث انسان تھے جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور ان کو اغوا کر کے ان سے خصوصی صنعتوں اور لیبارٹریوں میں کام کرایا جاتا تھا، یہ چاند اور نظام شمسی کے دوسرے سیاروں پر کان کنی کرتے تھے اور ان سے اتنی مشقت لی جاتی تھی کہ وہ دس پندرہ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہتے تھے، ان کے مرنے کی کسی کو پروا نہیں تھی کیونکہ ان کی جگہ دوسرے لوگ آجاتے تھے۔ یہ سارے کام اتنی صفائی سے ہو رہے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ اس کی واحد وجہ دنیا کا ایک ہی نظام ہونا تھا، سب کچھ ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ ان کا کوئی مد مقابل نہیں تھا، انہیں واحد خطرہ عوام کے خبردار ہونے سے تھا اور وہ عوام سے ہر وہ چیز چھپاتے تھے جس سے لوگ سوچنے پر مجبور ہوں۔ سیلی نے پھر جھرجھری لی۔

”یہ سب بہت خوفناک ہے۔“

”ان کا اگلا منصوبہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔“ روڈی نے کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق یہ انسانی کلوننگ کے اس مرحلے کے پاس پہنچ گئے ہیں جس میں ایک انسان کی ہزاروں لاکھوں کاپیاں تیار کر سکتے ہیں۔ یہ کلون شدہ انسان سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوں گے اور یہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔ اس کے منصوبے کی کامیابی کے بعد انہیں ہم جیسے عام لوگوں کی ضرورت نہیں رہے گی جنہیں بہت ساری تنخواہ اور سہولتیں دینا پڑتی ہیں۔ تب یہ معمولی سے اخراجات پر اپنی مرضی کے غلام رکھیں گے اور ساری دنیا کے وسائل پر خود قابض ہو جائیں جس کا بڑا حصہ ابھی انہیں عام لوگوں کو دینا پڑتا ہے۔ تم سوچ سکتے ہو اس کے بعد یہ کیا کریں گے..... یہ سب انسانوں کو ختم کر دیں گے۔“

”جب تم اس حد تک جان چکے ہو تو عام لوگوں کو کیوں نہیں بتاتے ہو؟“

”عام لوگوں کو بتانا اور سمجھانا آسان نہیں ہے جب کہ سارے ذرائع ابلاغ ان لوگوں کے قبضے میں ہیں۔“ روڈی نے جواب دیا اور اٹھ کر اپنے لیے دوبارہ ڈرنک نکالی۔ ”ہم انفرادی سطح پر کام کر رہے ہیں۔ بہت سے سابق سیاست دان

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہمارے ساتھ ہیں اور دنیا کے ہر ملک اور ہر خطے میں ہمارے پوائنٹ کام کر رہے ہیں، ہم پہلے لوگ تلاش کرتے ہیں اور پھر انہیں غیر محسوس انداز میں اپنی جانب راغب کرتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ وہ اس معاملے میں ہمارے ہمنوا ہو گئے ہیں تب ان سے کھل کر بات کرتے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ کتنے لوگ ہیں؟"

"لاتعداد، شاید لاکھوں میں اور ہمارے ہمدرد بھی کم نہیں ہیں۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ جب تمہیں ضرورت پڑی تو میں بروقت تمہاری مدد کے لیے پہنچ گیا، یہ کام میں اکیلا کیسے کر سکتا تھا۔ یہ ہمارا عارضی ٹھکانا ہے کل صبح ہم اس علاقے میں اپنے مرکز میں جائیں گے اور وہاں تم لوگوں کے سروں میں موجود چپ نکالی جائے گی، اس کے بعد تم ان کی غلامی سے آزاد ہو جاؤ گے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا، ہم کیا کریں گے؟" سیلی نے پوچھا۔ یہ سوچ کر اسے عجیب لگ رہا تھا کہ اسے اپنی جاب، خوب صورت فلیٹ اور تمام چیزوں سے دور ہونا پڑے گا صرف اسے ہی نہیں بلکہ ہیری کو بھی۔ روڈی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"کیا مطلب کیا ہوگا؟"

"مطلب ہماری زندگی....؟" ہیری نے کہنا چاہا۔

"اسے بھول جاؤ کیونکہ وہاں تمہارے لیے زندگی نہیں موت منتظر ہوگی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا..... وہاں جانے کا مطلب زندگی سے ہاتھ دھونا ہوگا۔"

یہ بات سیلی اور ہیری سمجھ رہے تھے اس کے باوجود ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔ روڈی نے کھانے کے لیے انہیں فرائی آلوؤں کے ٹن دیے اور پھر سونے کے لیے گدے اور کمبل دیے۔ وہ خود کاؤچ پر لیٹ گیا تھا۔ سیلی اور ہیری برابر لیٹے تھے۔ سیلی نے سرگوشی کی۔ "ہیری کیا سچ مچ ہم سب چھوڑ چکے ہیں؟"

"لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔" ہیری نے سرد آہ بھری۔ "ہم نے خود دیکھا تھا پولیس کاروں کے ساتھ ورلڈ کارپوریشن کے ایجنٹ بھی ہمارے گھر پہنچے تھے۔"

اچانک سیلی کو خیال آیا کہ انہوں نے روڈی سے اسٹار شپ کے بارے میں تو پوچھا ہی نہیں جو اس سارے فساد کی اصل جڑ تھا۔ اس نے اٹھ کر روڈی کو آواز دی جو غنودگی میں تھا، اس نے پوچھا۔ "کیا ہے مس مارٹن؟"

"تم نے اسٹار شپ کے بارے میں تو بتایا نہیں۔"

"یہ اسی جزیرے پر تیار کیا جا رہا ہے جسے ممنوعہ قرار دیا گیا تھا اور یہ کام بہت خفیہ انداز میں کیا جا رہا ہے۔"

"اس کی وجہ؟" ہیری نے پوچھا۔

"سچی بات ہے، اس کی اصل وجہ تو ہم بھی نہیں جان سکے ہیں، لیکن ہمارے جاسوس لگے ہوئے ہیں، آخری اطلاعات کے مطابق اسٹار شپ تیاری کے آخری مراحل میں تھا اور یہ اتنا بڑا ہے کہ اس پر لاکھوں لوگ سفر کر سکتے ہیں۔"

وہ دنگ رہ گئے تھے۔ "لاکھوں لوگ....؟"

"بالکل..... شاید اس سے بھی زیادہ۔" روڈی نے کہا۔ "سنا ہے یہ ٹیکنالوجی کا شاہکار ہے اور کائنات میں سفر کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔"

"لیکن لاکھوں لوگ....." سیلی نے کہنا چاہا۔

"اس پر صبح بات ہوگی۔" روڈی نے کہا اور دوبارہ لیٹ گیا۔

صبح سیلی کی آنکھ کھلی تو کچن سے روڈی اور ہیری کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سیلی اٹھ کر واش روم سے ہو کر آئی تو روڈی نے اس کی طرف دیکھا۔ "جلدی سے ناشتا کر لو ہمیں یہاں سے جانا ہے۔"

"تم نے اپنا پروفیشن چھوڑ دیا ہے؟" سیلی نے ناشتے کی میز پر پوچھا۔

اس نے شانے اچکائے۔ "کرنے کو کچھ ہے ہی نہیں سب ان لوگوں کے قبضے میں ہے اس لیے میں اب اپنی بات دوسرے طریقوں سے لوگوں تک پہنچاتا ہوں، ہمارے اپنے اخبار اور رسائل چھپتے ہیں وہ خفیہ طریقے سے لوگوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔"

ناشتا کر کے وہ روانہ ہوئے تو اس بار ہائی وے کے بجائے روڈی نے کچی سڑکوں کا انتخاب کیا۔ "ہائی وے پر کیمروں میں تم لوگوں کے آتے ہی پولیس ہمارے پیچھے لگ جائے گی۔"

"اس طرح مشکل نہیں ہوتی ہے؟"

"آزادی کی راہ آسان نہیں ہوتی ہے۔" روڈی نے کہا۔ "ہمیں بہت مشکل ہوتی ہے لیکن جب ہم اس گروہ سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے تو ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی۔"

سیلی کو شبہ تھا کہ وہ کامیابی حاصل کر سکیں گے، وہ ورلڈ کارپوریشن کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرتی تھی اور کسی عام آدمی کی نسبت اسے کہیں بہتر معلوم تھا کہ دنیا کے ایک ایک فرد پر ان کی گرفت کس قدر مضبوط تھی۔ وہ اتنی آسانی سے اپنے اقتدار سے دست بردار نہیں ہو سکتے تھے۔ ہیری کچھ اور سوچ

رہا تھا اس نے روڈی سے کہا۔ "دنیا میں پھر وہی قوموں کے درمیان لڑائی جھگڑے والا دور واپس آ جائے گا؟"

"یہ ضروری ہے۔" روڈی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "سوچ کی آزادی ہی انسانی ترقی کی بقا کے لیے ضروری ہے اسی طرح آپ فطرت کے خلاف جا کر انسان کو صرف روبوٹ بنا سکتے ہیں۔ ماضی میں زمانۂ قدیم سے انسان جنگجو ہے لیکن کیا اس سے نسل انسانی ختم ہوئی۔ نہیں..... اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ترقی کرتی رہی اور آج ہم جس مقام پر ہیں وہ اسی وجہ سے ہیں۔"

"لیکن ورلڈ کارپوریشن نے بھی بہت کام کیا۔"

"انہوں نے سائنسی ایجادات کو استعمال کیا جو پہلے ہو گئی تھیں، انہوں نے لوگوں کی زندگی کو منظم اور آسان کر دیا۔ روزگار اور صحت کی سہولت ہر فرد تک پہنچا دی۔ اس سے آگے انہوں نے جو کیا وہ اپنے لیے کیا اور میں نے بتایا کہ ان کا اصل منصوبہ کیا ہے یہ انسانوں کو فنا کرنے والے ہیں، صرف اوپری طبقہ باقی رہے ہیں۔ باقی سب جذبات اور احساسات سے عاری ان کے غلام ہوں گے۔"

"اس صورت میں انہیں اسٹار شپ بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جس میں ایک وقت میں لاکھوں انسان سفر کر سکتے ہیں؟" سیلی کا ذہن اسی میں اٹکا ہوا تھا۔

"اس کا جواب تو شاید جان کینیڈی بھی نہ دے سکے۔"

سیلی خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"تم اتنے سفاک لوگوں کے خلاف کام کر رہے ہو؟"

"ہاں، کیونکہ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کو بچانا ہے۔"

سیلی اور ہیری کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر گہری راستے سے زیر زمین دنیا میں لے جایا گیا تھا۔ جب ان کی آنکھیں کھلیں تو انہوں نے خود کو ایک وسیع ہال میں پایا جہاں کئی سو افراد میزوں کے گرد بیٹھے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ روڈی انہیں براہ راست جان کے پاس لے آیا۔ سیلی نے دیکھا وہ حیرت انگیز طور پر جان ایف کینیڈی سے ملتا تھا۔ وہ گرم جوشی سے ان سے ملا۔ "مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم لوگ آ رہے ہو۔"

"سچی بات ہے ہم اب تک ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ہیں کہ یہ کیا چکر ہے۔" سیلی نے اس سے کہا۔ "اپنی پیدائش سے لے کر آج تک میں جو سمجھتی آئی تھی یہ سب اس کے بالکل برعکس ہے۔"

"تم سمجھ چکی ہو بس قبول کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" جان نے بے تکلفی سے کہا پھر ہیری سے ہاتھ ملایا۔

فرق

دو لڑکیاں ملاقات ہونے پر ایک دوسرے سے کہتی ہیں۔

پہلی لڑکی۔ "ہائے سوئٹ ہارٹ"

دوسری لڑکی۔ "لو یو (Love u)

اور پیٹھ پیچھے کہتی ہیں۔

پہلی لڑکی۔ "یہ سست چھپکلی تھی۔"

دوسری لڑکی۔ "یہ کمینی تھی۔"

دو لڑکے ملاقات ہونے پہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

پہلا لڑکا۔ "کیسا ہے کمینے، لال شرٹ میں تو پورا امیراتی لگ رہا ہے۔"

دوسرا لڑکا۔ "اپنے ابو سے مذاق؟"

اور ایک دوسرے کی پیٹھ پیچھے کہتے ہیں۔

پہلا لڑکا۔ "بندہ بہت گریٹ ہے یار۔"

دوسرا لڑکا۔ "جگر ہے اپنا۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ایسی زندگی سے....

استاد۔ "بچو وعدہ کرو کبھی بھی لڑکیوں کی طرف نہیں دیکھو گے۔"

بچے۔ "نہیں دیکھیں گے۔"

استاد۔ "لڑکیوں کا پیچھا نہیں کرو گے؟"

بچے۔ "نہیں کریں گے۔"

استاد۔ "لڑکیوں سے بات نہیں کرو گے۔"

بچے۔ "نہیں کریں گے۔"

استاد۔ "اور اپنے پیارے وطن پہ زندگی قربان کرو گے۔"

بچے۔ "کر دیں گے ایسی زندگی سے مر جانا ہی بہتر ہے۔"

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

"سوال یہ ہے کہ ہم ان کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہم ان کے خلاف پہلے ہی بہت کچھ کر رہے ہیں۔" جان نے تصحیح کی۔ "وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب ہم ان سے نجات حاصل کر لیں گے۔"

"کیسے....؟" ہیری نے بحث کرنے کے انداز میں کہا۔

"یہ آنے والا وقت بتائے گا۔" جان نے ٹالنے کے انداز میں کہا اور سیلی کی طرف دیکھا۔ "تم جانتی ہو جیک کیوں مارا گیا؟"

سیلی نے سر ہلایا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسی کیا بات ہے۔ اگر اس اسٹار شپ کو بنایا جا رہا ہے اور روڈی کے مطابق یہ مکمل ہونے والا ہے تب بھی اس میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کے لیے جیک کو مار دیا گیا اور اب مجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

"اس میں ورلڈ کارپوریشن کا ایگزیکٹو ڈائریکٹر نک کامپٹن ملوث ہے، وہ اسٹار شپ پروجیکٹ کا باس بھی ہے۔"

نک کامپٹن ورلڈ کارپوریشن کا طاقتور ترین شخص بھی تھا۔ اگرچہ اس کا تعلق ایک چھوٹے بزنس مین خاندان سے تھا لیکن وہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچا تھا۔ روڈی نے جان سے کہا۔ "ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ اس اسٹار شپ میں ایسی کیا خاص بات ہے جو اسے یوں خفیہ رکھا جا رہا ہے؟"

"ہمارے آدمی کوشش میں ہیں۔" رین مارش نے کہا۔

"میں بھی معلوم کر سکتی ہوں۔" سیلی نے اچانک کہا۔

وہ سب چونک گئے۔ "تم کیسے معلوم کر سکتی ہو؟" جان نے پوچھا۔

"میں جس شعبے میں تھی وہاں ہر قسم کی رپورٹس آتی ہیں۔"

"تم بھول رہی ہو وہاں سے اسٹار شپ کی رپورٹ نہ صرف غائب کر دی گئی بلکہ پلاننگ ڈویژن والوں نے بھی اس کی موجودگی سے انکار کر دیا تھا۔" ہیری نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں لیکن میں سوچ رہی ہوں اس دوران میں کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی جس کی بنیاد پر اسٹار شپ کی رپورٹ غائب کی گئی ہوگی۔ میں ریکارڈ چیک کروں گی تو ممکن ہے اس کی وجہ سامنے آجائے۔"

"نہیں، تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہوگا تم جانتی ہو وہ تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔" ہیری نے فوراً انکار کر دیا۔

"اس پر بعد میں بات ہوگی۔" جان نے کہا۔ "تم لوگ ابھی آرام کرو اور بستی دیکھو.... یہاں کے لوگ تمہیں ورلڈ کارپوریشن کے بارے میں بہت کچھ بتائیں گے۔"

اس زیر زمین بستی میں سہولیات تھیں لیکن ویسی نہیں جیسی سیلی اور ہیری کو اپنے گھر میں میسر تھیں۔ یہاں سب لوگوں کو کمرے ملے ہوئے تھے۔ ان کی گزر اوقات اوپر والوں کے تعاون سے ہوتی تھی اور انہیں بہت احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ کھانا پینا، بجلی، پانی گیس اور تمام سہولتوں کا استعمال کم سے کم کرنا پڑتا تھا کیونکہ اگر یہ قصبے کی آبادی کی نسبت زیادہ ہو جاتا تو ورلڈ کارپوریشن والے چونک سکتے تھے۔ اوپر والوں کو بھی ایثار سے کام لینا پڑتا تھا۔ وہ اکثر کھانے پینے کا سامان دوسری جگہوں سے بھی لاتے تھے جس کا ریکارڈ الگ سے ہوتا تھا۔ سیلی اور ہیری وہاں موجود لوگوں کی کہانیاں اور ورلڈ کارپوریشن کی کارستانیاں سن کر حیران رہ گئے تھے۔

بعض حقائق چونکا دینے والے تھے، وہ افراد جو کسی وجہ سے کام کے قابل نہیں رہتے تھے اور معاشرے کے لیے بوجھ بن جاتے تھے انہیں خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا اور انہیں دواؤں اور بیماریوں پر تحقیق کرنے والی تجربہ گاہوں میں براہ راست تجربات کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ایسے ہی دو افراد اس بستی میں موجود تھے۔ وہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے پہلے نفسیاتی اسپتال منتقل کیے گئے اور پھر ایک رات خاموشی سے انہیں بے ہوش کر کے ایک تجربہ گاہ منتقل کر دیا گیا جہاں ان جیسے سیکڑوں افراد قید تھے اور انہیں تجربات کا نشانہ بنایا جا رہا تھا جو لوگ ان تجربات کے دوران مر جاتے تھے انہیں بھٹی میں جلا کر ان کی راکھ بہا دی جاتی تھی۔ یہ دونوں کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کی طرح اور لوگ بھی یہاں پناہ گزین تھے جو ورلڈ کارپوریشن سے بھاگ کر آئے تھے۔

سیلی اور ہیری کو یہاں ایک چھوٹا سا کمرا ملا تھا اس میں سہولتیں تھیں مگر یہ ویسا نہیں تھا جیسا ان کا اپنا گھر تھا۔ تنہائی میسر آتے ہی سیلی نے پوچھا۔ "اب ہم ہمیشہ یونہی چھپ کر رہیں گے؟"

ہیری نے سرد آہ بھری۔ "لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ آج سے پہلے مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ ہم اتنی محکوم زندگی بسر کر رہے ہیں، واقعی ہماری حالت ان جانوروں جیسی ہے جن کی ذرا اچھی طرح دیکھ بھال ہوتی ہے۔"

"اب وہ اس سے بھی نجات حاصل کر رہے ہیں۔" سیلی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "انسانوں کے کلون بنا کر .... ہمیں اپنی بقا کی جنگ لڑنا ہوگی۔"

ہیری نے نفی میں سر ہلایا۔ "مشکل ہے، وہ بہت طاقتور ہیں، یہ لوگ ان سے نہیں لڑ سکتے۔"

"جیسے ہم ان کے ساتھ ملے ہیں اسی طرح دوسرے بھی ملیں گے اور شاید پھر ہم ورلڈ کارپوریشن پر غلبہ پا لیں۔" سیلی نے کہا۔ "سنو ہیری تم کمپیوٹر پروگرامنگ کے ماہر ہو کیا تم مدد نہیں کر سکتے؟"

"کیسی مدد؟"

"یہی کہ اسٹار شپ کیوں بنایا جا رہا ہے اور ورلڈ کارپوریشن لوگوں سے یہ بات کیوں چھپا رہی ہے؟"

ہیری سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "میں معلوم تو کر سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ورلڈ کارپوریشن کے کمپیوٹر سسٹم تک رسائی ضروری ہے۔"

"ہم روڈی اور جان سے بات کرتے ہیں۔"

"نہیں، پہلے ہمیں یہاں کا ماحول دیکھنا ہوگا۔" ہیری نے کہا۔ "اس کے بعد ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ عجلت میں فیصلہ کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

اس زیر زمین بستی میں کوئی تین سو افراد تھے اور یہ سب ورلڈ کارپوریشن کے مطلوب تھے یہ مل جاتے تو انہیں فوری سزائے موت دیدی جاتی۔ ان میں چالیس کے قریب بچے بھی تھے، ان کا قصور بس اتنا تھا کہ ان کے ماں باپ باغی تھے اس لیے وہ بھی سزا پانے والوں میں شامل ہوتے۔ سیلی اور ہیری جیسے جیسے جان رہے تھے ویسے ویسے ان کی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک ہفتے بعد اچانک ہی ایک صبح ایمرجنسی الارم بجا اور سب لوگ چند منٹ کے اندر ہال میں جمع ہو گئے۔ جان اور روڈی وہاں پریشان صورت موجود تھے۔ جان نے اعلان کیا۔ "ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

"کہاں.... کیوں....؟" آوازیں ابھریں۔

"اطلاع ہے کہ ورلڈ کارپوریشن والوں کو اس مرکز کی بھنک مل گئی ہے اور جلد یہاں چھاپا پڑے گا اس سے پہلے ہمیں تمام آثار مٹا کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

کیونکہ فیصلہ ہو گیا تھا اس لیے اسی وقت تیاری شروع ہو گئی۔ سب نے ایک ایک دو دو کر کے نکلنا تھا کیونکہ بڑی تعداد میں لوگ مشکوک ہو جاتے۔ عورتوں بچوں کو پہلے روانہ کیا گیا اس دوران میں مرد اس زیر زمین دنیا کو یوں اجاڑنے میں لگ گئے جیسے یہ ویران ہو اور یہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ فرنیچر اور چیزیں توڑ دی گئی تھیں اور جا بہ جا گرد اسپرے کی گئی تھی، پانی کی لائنیں اور دیواریں بھی توڑ دی گئیں۔ تیسرے دن یہ جگہ خالی کر کے باقی لوگ بھی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کا عارضی ٹھکانا کچھ دور پہاڑوں میں موجود خفیہ غار تھے جو پہلے سے متبادل پناہ گاہ کے طور پر رکھے گئے تھے، ان غاروں کو بند کر کے ان کے خفیہ دروازے بنا لیے تھے جن سے صرف وہی لوگ واقف تھے۔ عورتیں اور بچے یہاں پہنچ گئے تھے۔ بہت سے قصبے میں رہنے والے بھی ان کے ساتھ چلے آئے تھے کیونکہ ریڈ کی صورت میں وہ لازمی زیر عتاب آتے۔

البتہ کچھ نہیں آئے۔ ان کو یقین تھا کہ وہ زبان بند رکھیں گے اور ورلڈ کارپوریشن والے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ان کے ساتھ جو ہوا اس نے غار میں آنے والوں کو لرزا دیا تھا۔ آنے والی رات ہیلی کاپٹروں سے ورلڈ کارپوریشن کی پولیس قصبے میں اتری۔ اس نے آنے جانے کے سارے راستے بند کیے اور پھر قصبے کے چاروں طرف رسی لگا دی۔ اس کے بعد انہوں نے کوئی ایسا بم استعمال کیا۔ کوئی دھماکا نہیں ہوا صرف زمین لرزی تھی اور دھنس گئی۔ قصبے کے لوگ اور مکانات بھی اس گڑھے میں غائب ہو گئے۔ اگلے دن ٹی وی اور دوسرا میڈیا اسے قدرتی حادثہ قرار دے رہا تھا جس میں تقریباً سولہ سو افراد موت کا شکار ہوئے تھے۔ وہ سب ٹی وی پر دیکھ رہے تھے کل تک جہاں قصبہ تھا اب وہاں سوائے ایک گڑھے کے اور کچھ نہیں تھا۔

سیلی گم صم سی اس گڑھے کو دیکھ رہی تھی، ایسی درندگی کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ روڈی نے اس سے کہا۔ "اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ جب یہ انسانوں کو ختم کرنا چاہیں گے تو شہروں اور قصبوں کو اسی طرح زمین میں دھنسا دیں گے۔ اس کے بعد جو کچھ لوگ بچیں گے انہیں یہ تلاش کر کے ختم کر دیں گے پھر انہیں کسی بغاوت کا خوف نہیں رہے گا۔"

سیلی نے جھرجھری لی۔ "ہمیں روکنا ہوگا انہیں۔"

روڈی نے سر ہلایا۔ "تمام دنیا کے حریت پسند آپس میں رابطہ کر رہے ہیں۔ اب پانی سر سے اوپر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اچھی خبر یہ ہے کہ وسطی ایشیا میں بغاوت کا آغاز ہو گیا ہے لیکن اس بات کو چھپایا جا رہا ہے۔ حریت پسندوں نے بہت بڑے علاقے کا کنٹرول سنبھال لیا ہے اور اب وہاں ورلڈ کارپوریشن کا عمل دخل نہیں ہے۔"

سیلی یہ سن کر خوش ہوئی مگر پھر اسے خیال آیا۔ "باقی دنیا تو ابھی ان کے قبضے میں ہے۔"

"ہم بھی کوشش کریں گے۔" روڈی نے کہا۔ "تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کہا تھا کہ تم ورلڈ کارپوریشن کے سسٹم تک رسائی حاصل کر کے ہماری مدد کر سکتی ہو۔ اب مجھے بھی یقین ہے اسٹار شپ والا معاملہ بہت اہم ہے اگر ہم اس تہ تک پہنچ گئے تو شاید ورلڈ کارپوریشن سے چھٹکارا آسان ہو جائے۔"

"لیکن اس کے لیے مجھے ہیڈ کوارٹر جانا ہوگا۔"

جان نے مداخلت کی۔ "یہ بہت رسکی ہوگا۔ اگر یہ پکڑی گئی تو ہمارا ٹھکانا بھی نظر میں آجائے گا۔"

"میں اس بارے میں نہیں بتاؤں گی۔" سیلی نے کہا۔ "میں اپنی زبان بند رکھنا جانتی ہوں۔"

"تم نہیں جانتیں، ورلڈ کارپوریشن کے جلادوں کے پاس ایسے حربے ہیں کہ پتھر بھی بول اٹھیں۔" جان نے کہتے ہوئے اپنی جرسی اتار دی۔ سیلی اور ہیری اس کا جسم دیکھ کر کانپ اٹھے تھے، گردن سے پیٹ تک کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو زخموں سے خالی ہو۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" روڈی نے کہا۔ "اس سے بچنے کا ایک ہی حل ہے۔"

"وہ کیا؟"

روڈی نے ایک شیشی نکال کر دکھائی جس میں سرخ رنگ کی گولیاں تھیں۔ "آدمی ایک گولی کھالے تو چند سیکنڈ کے اندر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔"

"سیلی تم نہیں جاؤ گی۔" ہیری نے جلدی سے کہا۔

"میں جاؤں گی۔" سیلی نے کہا۔ "میرے لیے اپنی زندگی سے زیادہ اہم تمہاری، اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی زندگی ہے۔"

"تم اندر بھی نہیں جا سکو گی۔" ہیری مضطرب ہو گیا۔ "تم جانتی ہو وہاں کا حفاظتی نظام کیسا ہے؟"

"میں جانتی ہوں لیکن ہو سکتا ہے کہ میرا ڈی این اے بلاک نہ کیا گیا ہو۔"

"لوگ تمہارا چہرہ پہچانتے ہیں۔"

"میں حلیہ بدل لوں گی، ہیر اسٹائل اور سن گلاسز کی مدد سے۔" سیلی کا اصرار جاری رہا۔ ہیری نہیں مان رہا تھا لیکن سیلی نے اسے اکیلے میں لے جا کر منا لیا تو اس نے شرط رکھی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تم اندر نہیں جا سکتے۔"

"میں باہر رہوں گا۔" ہیری نے کہا تو سیلی کو اس کی بات ماننا پڑی تھی۔

☆☆☆

سیلی دھڑکتے دل کے ساتھ ورلڈ کارپوریشن کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوئی، اس بار اس نے فرنٹ لابی کے بجائے عقبی لابی کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں اس کے جان پہچان والے بہت کم تھے۔ پھر وہ اس واک تھرو گیٹ کی طرف بڑھی جس پر سب سے زیادہ رش تھا اور نگران لوگوں کو جلدی جلدی گزرنے دے رہا تھا وہ صرف اتنا دیکھ رہا تھا کہ ڈی این اے میچ ہو رہے تھے، وہ لوگوں کی صورتوں پر غور نہیں کر رہا تھا اور نہ اس کی توجہ سامنے اسکرین پر آنے والی تصویر پر تھی۔ یہ سخت مرحلہ تھا اگر اس کا ڈی این اے بلاک ہو گیا تھا تو وہ یہیں پکڑی جاتی دوسری صورت میں امید تھی کہ وہ بچ کر اوپر پہنچ جائے گی۔ اس کا نمبر آیا اور وہ واک تھرو گیٹ سے گزری اس کے کان بپ کی مخصوص آواز پر تھے اور جب یہ آواز آئی تو اس نے غیر محسوس انداز میں سکون کا سانس لیا۔ وہ چہرہ گھماتے ہوئے آگے بڑھی حسب توقع نگران نے اس پر توجہ نہیں دی اور وہ لفٹس کے پاس آگئی۔

سیلی نے لفٹ دو فلور پہلے رکوالی اور نکل کر سیڑھیوں کے راستے اوپر بڑھی۔ اسے توقع تھی کہ دفتری اوقات کی وجہ سے کوئی سیڑھیوں پر نہیں ملے گا اور وہ آسانی سے اوپر ریکارڈ روم تک پہنچ جائے گی بس اسے مسز جارڈن کے سامنے سے گزرنا ہوگا۔ اگر اس کا سر اپنے کمپیوٹر پر جھکا ہو تو وہ سیلی کو نہیں دیکھ پاتی۔ اس بار بھی اس کی توقع پوری ہوئی تھی۔ مسز جارڈن سر جھکائے کام کر رہی تھی اور وہ دبے قدموں ریکارڈ روم کے دروازے تک آئی۔ اس نے کو ملایا اور دروازہ بے آواز کھل گیا۔ وہ اندر آئی یہاں ایک سپر کمپیوٹر تھا، سارا ریکارڈ اسی میں رکھا جاتا تھا۔ اسے جیک پاس ورڈ معلوم تھا، اس نے جیک کے پاس ورڈ سے آن کیا اور اسٹار شپ رپورٹ تلاش کرنے لگی۔ لیکن سسٹم نے ایسی کسی رپورٹ کی موجودگی سے انکار کیا تھا۔ سیلی نے سوچا اور جس دوران میں جیک نے اسٹار شپ رپورٹ کے آنے کا بتایا تھا اسی دوران میں کتنی رپورٹس آئی تھیں۔ اس نے ان میں ریٹنگ کے اعتبار سے دس اہم ترین رپورٹس کا انتخاب کیا اور انہیں دیکھنے لگی۔

تیسری رپورٹ پر وہ چونک گئی۔ یہ زیر زمین کھولتے میگما کی سرگرمی کی رپورٹ تھی اور اس کے مطابق آنے والے دو سالوں میں زمین کے اندر کا درجہ حرارت اتنا بڑھ جائے گا کہ جگہ جگہ آتش فشاں پھوٹ پڑیں گے، تباہ کن ترین زلزلے آئیں گے اور بھیانک سونامی اٹھیں گے۔ ارض کی انسانی تہذیب ان آفات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی

فنا ہو جائے گی۔ صرف وہی بچیں گے جو زمین کی حد سے باہر ہوں گے۔ کرۂ ہوائی بھی انسانوں کو تحفظ نہیں دے سکے گا کیونکہ کئی سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے طوفان آئیں گے جو طاقتور ترین ہوائی جہاز کو بھی تنکے کی طرح اڑا لے جائیں گے صرف خلا ہی انسان کو تحفظ دے سکے گا۔ سیلی دم بہ خود تھی اتنی اہم رپورٹ یہاں سرد خانے میں ڈال دی گئی تھی اور انسان آنے والی تباہی سے بے خبر تھے۔ لیکن نہیں وہ باخبر تھے جو اس سے بچنے کی تیاری کر رہے تھے۔

اب سیلی جان گئی تھی کہ اسٹارشپ کا پروجیکٹ اتنا خفیہ کیوں رکھا گیا تھا؟ ورلڈ کارپوریشن کے کرتا دھرتا عام لوگوں کو آنے والی آفت کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود زمین سے فرار کی تیاری کر رہے تھے۔ اسٹارشپ اتنا بڑا تھا کہ وہ سب اس میں آرام سے سالوں رہ سکتے تھے اور جب زمین اس تباہی سے گزر جاتی تو وہ دوبارہ یہاں آ کر آباد ہو سکتے تھے مگر اس وقت تک عام انسان فنا کے گھاٹ اتر جاتا اور یہ بھی ان کے لیے اچھا ہوتا کیونکہ وہ پہلے انسانوں کی جگہ کلون بہ طور غلام لانے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ سیلی نے رپورٹ ایک ڈیوائس میں محفوظ کی۔ یہاں بھیجنے سے پہلے روڈی نے اس کے سر میں موجود چپ کو ناکارہ کر کے اس کی جگہ ایک اور ڈیوائس لگا دی تھی، اس نے رپورٹ اسی میں محفوظ کی تھی۔

مگر ابھی وہ اٹھ رہی تھی کہ ریکارڈ روم کا دروازہ کھلا اور نک کامپٹن اندر آیا۔ اس کے ساتھ دو گارڈز تھے لیکن سب سے حیرت انگیز موجودگی ہیری کی تھی وہ آزاد تھا اور نک کے پیچھے مودبانہ انداز میں کھڑا تھا جب کہ دونوں گارڈز کی گنوں کا رخ سیلی کی طرف تھا۔ نک مسکرایا۔ ”مس مارٹن، ہم یہاں تمہاری آمد کی توقع کر رہے تھے۔“

سیلی نے ناقابل یقین نظروں سے ہیری کی طرف دیکھا۔ ”تم ان کے ساتھ ہو؟“

ہیری مسکرایا۔ ”ہاں شروع سے....“

سیلی کا دل نفرت سے بھر گیا۔ ”غدار....“ اس نے دانت پیس کر کہا اور اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف گیا تھا کہ ایک گارڈ نے لپک کر اسے قابو کر لیا اور زہریلا کیپسول نکال کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر اسے ہتھکڑیاں لگا دی تھیں۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے باہر لائے جہاں سب موجود تھے اور سیلی کو اجنبی نظروں سے دیکھ رہے تھے، اس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”مجھے ایسے مت دیکھو جلد تم لوگ آنے والی تباہی کو دیکھو گے۔“

مگر کسی نے کچھ نہیں کہا اور رین مارش کے ساتھ اسے ہیڈ کوارٹر کی چھت تک لائے جہاں ہیلی کاپٹرز کھڑے تھے۔ اسے ایک ہیلی کاپٹر میں سوار کرایا گیا۔ نک کامپٹن، ہیری اور گارڈز بھی اس کے ساتھ تھے۔ سیلی نے ہیری کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ ”اسے ساتھ لے جاؤ گے یا پھر آنے والی تباہی کا نشانہ بننے کے لیے یہیں چھوڑ جاؤ گے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ ہیری نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”بس اتنا یاد رکھو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔“

”میں تھوکتی ہوں تم پر۔“ سیلی نے کہا ہی نہیں سچ مچ اس پر تھوک بھی دیا۔ ہیری نے بغیر کسی ردعمل کے رومال سے چہرہ صاف کیا۔ البتہ نک کامپٹن مسکرا رہا تھا۔ برق رفتار ہیلی کاپٹر نے انہیں ایک گھنٹے سے پہلے اس جگہ پہنچا دیا جہاں اسٹارشپ تیار کھڑا تھا اور اس وقت بے شمار گاڑیوں اور لفٹرز کی مدد سے اس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ سیلی اس کی وسعت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ یہ بلاشبہ دو میل لمبا اور ایک میل سے زیادہ چوڑا تھا۔ اس کا مرعوب کر دینے والا جسم پورے پورٹ پر محیط تھا۔ ایک طرف اعلیٰ درجے کی گاڑیوں کی قطاریں یکے بعد دیگرے ایک درجن راستوں سے خلائی جہاز کے اندر جا رہی تھیں۔ ان گاڑیوں میں یقیناً ورلڈ کارپوریشن کے کرتا دھرتا اپنے خاندانوں سمیت موجود تھے۔ دوسری طرف کارگو والے حصے میں ان کا بیش قیمت سامان لادا جا رہا تھا۔ سیلی نے نیچے دیکھا۔ ”کیا اسٹارشپ پرواز کے لیے تیار ہے؟“

”تقریباً۔“ نک کامپٹن نے تصدیق کی۔ ”دو گھنٹے بعد یہ پرواز کر جائے گا۔“

”اس دنیا کے باقی لوگوں کا کیا ہوگا؟“

”وہ سکون سے رہیں گے۔“ نک کے بجائے ہیری نے جواب دیا۔ اب ایسا لگ رہا تھا جیسے ہیری اور نک ایک جیسے رتبے کے لوگ ہوں جب کہ ہیڈ کوارٹر میں ہیری نک کے پیچھے تھا۔ وہ اب اپنی مرضی سے بول رہا تھا۔ وہ سیلی کو لے کر ایک کنٹرول روم میں آئے یہاں چند ہی افراد تھے جو اسکرینوں کے سامنے بیٹھے ہوئے پورٹ کے معاملات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نک کامپٹن نے اپنی سیٹ سنبھال لی اور پھر اس کے اشارے پر گارڈز نے سیلی کے ہاتھ کھول دیے تھے۔ اس نے حیرت سے نک اور ہیری کی طرف دیکھا۔

”تم دونوں اس جہاز میں نہیں جاؤ گے؟“

”نہیں مس مارٹن۔“ نک نے کسی قدر بدلے لہجے میں کہا اور پھر اسٹارشپ کی روانگی کے معاملات دیکھنے لگا۔

وہ مختلف لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ روانگی سے ایک گھنٹا پہلے لوڈنگ اور بورڈنگ کا سارا کام مکمل ہو گیا تھا۔ تقریباً چار لاکھ افراد جو سب کے سب اوپری طبقے سے تھے مع اپنے سامان اور دوسری چیزوں کے اسٹارشپ میں جا چکے تھے اور اب اس کے آس پاس سے گاڑیاں اور دوسرا سامان ہٹایا جا رہا تھا۔ بالآخر اس کی روانگی کا وقت آیا۔ اسٹارشپ کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور ایک زبردست گونج کے ساتھ وہ بتدریج اوپر اٹھنے لگا۔ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر جا کر اس نے اچانک رفتار پکڑی اور روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا آسمانوں میں غائب ہو گیا۔ نک کامپٹن کا اس کے کپتان سے ریڈیائی رابطہ تھا۔ سیلی نے نک سے پوچھا۔

”اب تم لوگ کیا کرو گے عام لوگوں کی طرح مرو گے؟“

”نہیں ڈارلنگ۔“ ہیری نے نرمی سے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی نہیں مرے گا۔“

سیلی ان کے اس رویے سے چڑ گئی۔ ”تم لوگ کس خیال میں ہو، وہ رپورٹ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔“

”وہ رپورٹ غلط ہے۔“ نک کامپٹن نے کہا تو سیلی ششدر رہ گئی۔

”غلط ہے تو پھر یہ لوگ اسٹارشپ کی مدد سے کیوں نکل گئے؟“

”کیونکہ انہیں اس رپورٹ پر پورا یقین تھا۔“ نک کامپٹن نے کہا تو سیلی کے ساتھ اسٹارشپ کا کپتان بھی چونک گیا تھا۔ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”مسٹر ڈائریکٹر تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں کہہ رہا ہوں زمین کے کور میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے تبدیلی ہمارے دل و دماغ میں آئی ہے۔“ نک کامپٹن نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہم لوگوں نے غلامی کی زنجیریں توڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ وقت آ گیا ہے جب یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔“

اسٹارشپ کے کنٹرول روم میں ورلڈ کارپوریشن کے بڑے موجود تھے وہ سب بیک وقت بولنے لگے۔ نک کامپٹن نے ہاتھ اٹھایا۔ ”تم لوگوں کے پاس وقت کم ہے کیونکہ اب یہ اسٹار.... شپ سورج کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر رہا ہے۔“ نک نے کہتے ہوئے اپنے سامنے موجود کمپیوٹر کا ایک بٹن دبایا اور اسٹارشپ کا کیپٹن بوکھلا گیا، اس نے کہا۔

”اسٹارشپ کی کمانڈ بدل گئی ہے اب یہ کہیں اور سے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ اس کا رخ بدل کر سورج کی طرف ہو گیا۔“

”بس چند منٹ کی بات ہے تم لوگ سورج کے پاس پہنچ کر فنا ہو جاؤ گے اور زمین تمہارے وجود سے ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے گی۔“ نک کامپٹن نے کہا تو سیلی کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ہیری مسکرا رہا تھا، وہ سیلی کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”ہم انسان کتنے ہی برے سہی لیکن ہم میں ایک خوبی ہے ہمیں کوئی تادیر اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔ آزاد رہنا ہماری فطرت ہے اور یہی فطرت ہمیں انسان بناتی ہے۔“

اسٹارشپ سے زمین کا رابطہ ختم ہو گیا تھا اور اب اس کا سورج کی طرف سفر ایک طاقتور دوربین سے دکھایا جا رہا تھا، بے پناہ رفتار سے وہ چند منٹ میں سورج کے پاس پہنچ گیا اور پھر اس کی حدت سے خود بھی دہکتے گولے میں بدل گیا۔ کچھ دیر بعد یہ گولہ غائب ہو گیا تھا۔ نک کامپٹن نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”مجھے اس جہاز میں سوار عورتوں اور بچوں کا غم ہے لیکن اس ڈرامے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے یہ سب ضروری تھا۔ اب دنیا ان لوگوں سے آزاد ہے لوگ اپنا فیصلہ خود کریں گے۔“

سیلی ہیری کے گلے لگ کر رو رہی تھی۔ ”آئی ایم سوری میں تمہیں غلط سمجھی۔“

”اوپر والوں کو پوری طرح بے وقوف بنانے کے لیے یہ ڈراما ضروری تھا۔“ ہیری نے کہا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ اس ڈرامے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے ہمیں کتنی محنت کرنا پڑی اور کتنی رازداری سے کام لینا پڑا۔“

سیلی نے آنسو صاف کیے۔ ”کیا روڈی اور جان بھی واقف ہیں؟“

”نہیں، ان کو کچھ دیر بعد ٹی وی اور میڈیا سے پتا چل جائے گا۔ یہ ڈراما کامیاب ہی اس لیے ہوا کہ ہم نے اسے آخر تک خفیہ رکھا، چوٹی کے ارضی سائنس دان اور ماہرین ہمارے ساتھ تھے اور انہوں نے رپورٹ تیار کی تھی جس کی بنیاد پر اسٹارشپ کی تیاری کا فیصلہ ہوا تاکہ آفت آنے سے پہلے وہ لوگ دنیا سے نکل جائیں۔“

سیلی نے سکون کا سانس لیا پھر نک کامپٹن کی طرف دیکھا۔ ”تم باس تھے؟“

”ہاں لیکن میں ایک انسان ہوں اور میں نے انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔“

سیلی اور ہیری واپس روانہ ہوئے تو خوش تھے اب وہ زندہ بھی تھے اور آزاد بھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پسِ زنداں

طاہر جاوید مغل

عکس منظر کا ہو یا پس منظر کا، بعض اوقات اتنا پُرکشش ہوتا ہے کہ سوچ کے انداز بدل جاتے ہیں مگر... یہ بھی حقیقت ہے کہ عکس بن کر تعاقب کرنے والے کبھی سانس کی ٹھنڈک نہیں دیتے۔ ان سے تنہائی دور ہوتی ہے اور نہ ہی اذیتوں میں کمی آتی ہے۔ ایسے میں جب ہجر کا موسم طاری ہو اور پل پل دل پر بھاری ہو تو ان بھید بھرے لمحات میں کوئی دریافت کرتا ہے یا کسی کو برباد کرتا ہے۔ لیکن اس کا شمار دریافت کرنے اور تسخیر کرنے والوں میں ہوتا تھا کیونکہ اسے کٹھن کام کا جنون تھا جبکہ کسی انسان کو سمجھنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور اگر وہ انسان عورت ہو جو پہیلی بن کر جستجو بھڑکاتی ہے اور جو لفظوں میں بند ہو کر کتاب کی صورت کسی کے من میں گھر کر جائے تو کیسے ورق ورق کر کے لفظ بہ لفظ اسے کھوجنے کی لگن اس میں پیدا نہ ہو... مگر ایسا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب آپ کی سوچ کے زندان میں کوئی قید ہو جائے... وہ بھی منظر اور پس منظر کے درمیان الجھ گیا تھا... جو کچھ اس نے دیکھا اس کی تہ میں اترنا چاہتا تھا مگر... حدود و قیود حامی آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ایسے میں بے بسی نے اسے آنسوؤں کے سمندر میں دھکیل دیا جہاں وہ تنکا تنکا بہتا رہا اور وحشتوں کے طوفان اسے اپنے گھیرے میں لیتے رہے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ چڑھنے والا سورج اپنے دامن میں کیا کچھ سمیٹ لایا ہے۔ بالآخر پتھر سے ٹکراتے ٹکراتے اسے یہ ادراک ہوا کہ جہاں عمل ہے وہاں کہیں ردِعمل بھی چھپا ہوا ہے... بس اسی فراست نے اسے مطمئن کر دیا... یہ اور بات کہ اس اطمینان نے بہت سوں کا چین برباد کر ڈالا تھا۔

دیارِ غیر میں اپنوں سے دور کسی اپنے کی تلاش میں سرگرداں محبتوں کی کرم فرمائیاں اور رقیبوں کی عنایتوں کی داستان

ہادی ٹرین میں تھا۔ ٹرین ایک ایسی پٹڑی سے گزر رہی تھی جس کی دونوں جانب پانی تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک سہانی شام تھی اور وینس کا شہر تھا...... وہ شہر جو پانی میں رہتا ہے اور تاریخ جس کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ یہ وہ بے مثال بستی ہے جس کی خوب صورتی اور ندرت دنیا بھر کے سیاحوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کشش کرتی ہے۔
ہادی بھی آج شام اسی شہر ہفت رنگ میں اتر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک حسین رات تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے تھوڑی دیر اپنے کیمپ میں آرام کرنا تھا۔ پھر چائے پی کر اور تازہ دم ہو کر وینس کے خوب صورت گلی کوچوں میں گم ہو جانا تھا لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ اس رات میں اس کے لیے کیا چھپا ہے۔ یہ بہ ظاہر ایک عام سی تفریحی شب اس کے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی ہے، اسے ہرگز معلوم نہیں تھا۔
ٹرین وینس کے شاندار اسٹیشن پر رکی۔ وہ اپنے سامان سمیت اترا اور پیدل ہی بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ایک مقامی شخص کے مطابق بس اسٹینڈ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وینس شہر میں پانی کی سڑکیں، پانی کی گلیاں تھیں اور ان سارے آبی راستوں پر تیرنے والی گاڑیاں یعنی چھوٹی بڑی کشتیاں اور بجرے وغیرہ رواں تھے۔ موسم میں تھوڑا سا حبس محسوس ہوتا تھا لیکن یہ کچھ زیادہ ناخوشگوار نہیں تھا۔ شام کی مست ہوا کے جھونکے اس حبس کو قابل قبول بنا رہے تھے۔ اس حبس کی وجہ یقیناً وہ پانی ہی تھا جو اس شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وینس کی عمارتوں میں چمکنے والی یہ روشنیاں ہر طرف سمندری پانی میں اپنا عکس دے رہی تھیں۔ ہادی نے تھکاوٹ دور کرنا چاہی۔ وہ سرِراہ واقع ایک جدید ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اطالوی میوزک کی گونج تھی۔ تمباکو اور الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی اور کچھ نوجوان اونچے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے پاؤں تھرکا رہے تھے۔ ان میں چند نیم عریاں سیاح لڑکیاں بھی تھیں۔ ہادی نے اپنا سامان ایک طرف کونے میں ڈھیر کیا اور سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے قدرے لمبے بالوں کو اس نے کانوں کے عقب میں اڑسا اور سگریٹ سلگا کر کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔ آرڈر لینے والی ایک خوش پوش ویٹرس تھی۔ پہلے ویٹرس ... اٹالین زبان میں کچھ بولی پھر شکستہ انگلش میں بات کی۔ پتا نہیں کہ آرڈر دینے میں کیا گڑبڑ ہوئی کہ کچھ دیر بعد کولڈ کافی کے بجائے شمپین سے بھرا ہوا گلاس اس کے سامنے تھا۔ ایک پلیٹ میں آلو اور مچھلی کے تلے ہوئے گول قتلے تھے۔ وہ ٹپٹایا لیکن پھر مسکرا کر رہ گیا۔ وہ الکحل نہیں لیتا تھا لیکن آج کل جس موڈ سے گزر رہا تھا، اس نے اسے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا چلو اب آ ہی گئی ہے تو پھر...... آ جائے۔ شاید گناہ کے کھاتے میں بھی کچھ نرمی لکھی جائے کیونکہ یہ خود بخود آئی تھی۔
اس نے اپنا سگریٹ سلگایا اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ سیال آگ دھیرے دھیرے معدے میں اترنا شروع ہوئی تو سڑک کے مناظر کچھ اور بھی رنگین نظر آنے لگے۔ دور پانی میں ڈولتی ہوئی تفریحی کشتیاں، ان کی روشنیاں اور روشنیوں میں تھرکتے ہوئے جسم، مزید دلچسپ محسوس ہونے لگے۔
اس نے ایک کے بعد دوسرا گلاس منگوا لیا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہوتے چلے گئے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے اٹھا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اس کے سامنے 30 یورو یعنی قریباً 3200 پاکستانی روپے کا بل تھا۔ ایسے موٹے بل ہادی کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے بل چکتا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ جسم میں حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ الکحل کے ساتھ ساتھ آلو اور مچھلی کے لذیذ قتلوں نے بھی کام دکھایا تھا۔ اس کے بال ہوا میں لہرانے لگے۔ وینس کی روشنیاں ہزارہا جگنوؤں کی طرح اس کے اردگرد دمک رہی تھیں۔ یہ جگنو جیسے موسیقی کی لہروں پر رقصاں تھے۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک تنگ سڑک سے گزرتے ہوئے اسے اپنے پہلو میں خوب صورت منظر دکھائی دیا۔ شہر کی ایک آبی سڑک کے اوپر سے گزرنے والا محرابی پل، اس پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ نیچے سے کشتیاں گزر رہی تھیں۔ اس نے اپنے گلے سے Nikon کا ڈیجیٹل کیمرا اتارا اور تصویر اتارنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنا شولڈر بیگ نیچے فٹ پاتھ پر رکھ دیا تھا۔ رک سیک اور دیگر اشیا اس کی کمر پر تھیں۔ وہ دوسری یا تیسری تصویر اتارنے کے لیے ذرا سا آگے چلا گیا۔ یہی وقت تھا جب اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا شولڈر بیگ ابھی تک فٹ پاتھ پر ہی پڑا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی اس بیگ پر جھپٹا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا کہ اب وہ سوئٹزرلینڈ میں نہیں اٹلی میں ہے اور اٹلی میں امن و امان کی صورت حال زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سایہ سا اس کا بیگ اٹھا کر واپس

رہا تھا۔
"پکڑو...... پکڑو۔" ہادی پہلے اردو میں چلایا پھر انگلش میں پکارا۔ "تھیف...... تھیف" اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اٹھائی گیرے کے پیچھے دوڑا۔ اس کی کمر پر رک سیک اور دیگر سامان کا بوجھ تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں دوڑ سکا۔ اردگرد اکادکا لوگ تھے اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ فوری طور پر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ شخص ہادی سے بیس پچیس قدم آگے تھا اور کسی بھی وقت اس تنگ سڑک کی کسی بغلی گلی میں گم ہو سکتا تھا۔ اچانک ہادی نے دیکھا کہ ایک خاتون نے اٹھائی گیرے کے راستے میں ایک بانس نما شے پھینک دی۔ اٹھائی گیرا اس بانس نما شے سے الجھ کر اوندھے منہ پختہ سڑک پر گرا۔ بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دو تین افراد اس کی طرف جھپٹے، ان میں ہادی بھی شامل تھا۔ اس جواں سال اٹھائی گیرے کو پکڑ لیا گیا۔ اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ کی گئی۔ اسی دوران میں پھرتیلے شخص نے خود کو چھڑایا اور تیزی سے جھکائی دے کر ایک نیم تاریک گلی میں دوڑ لگا دی۔ دو افراد اس کے پیچھے لپکے لیکن ایک دو منٹ بعد ہی ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔ وہ خبیث گلیوں کے جال میں کہیں گم ہو گیا تھا۔
ہادی کی بائیں کلائی سے خون ٹپک رہا تھا۔ اٹھائی گیرے کو دبوچنے کے دوران میں یہ چوٹ اس کی کلائی پر لگی تھی۔ خاتون نے جو بانس اٹھائی گیرے کے راستے میں گرایا تھا وہ دراصل ایک طویل چھتری تھی جو سرِراہ ایک ریسٹورنٹ سے باہر ایک میز پر تانی گئی تھی۔ ہادی کو اسی چھتری کا کوئی راڈ وغیرہ لگا تھا۔
حاضر دماغی کا مظاہرہ کر کے اٹھائی گیرے کی راہ میں چھتری گرانے والی خاتون دراصل ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگر تھے، بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ہادی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ انڈین یا پاکستانی ہے۔
"بہت بہت شکریہ۔" ہادی نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ مدد نہ کرتیں تو میرا بیگ ملنا مشکل تھا۔"
حسبِ توقع اردو میں ہی جواب ملا۔ "شکریہ تو آپ اس ریسٹورنٹ والوں کا ادا کریں جنہوں نے فٹ پاتھ پر یہ چھتری لگا رکھی تھی۔" اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اچھی لگی تھی۔ تب اس کی نگاہ ہادی کی کلائی پر پڑی۔ ہادی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے کلائی کو تھام رکھا تھا۔
چوٹ اچھی خاصی لگی تھی لیکن صورت حال کے تناؤ کی وجہ سے ہادی کو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ "آپ کو مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔" لڑکی نے کہا۔
ریسٹورنٹ کے دو باوردی ملازم اپنی چھتری کا معائنہ کر رہے تھے۔ وہ کسی طرح کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ رہی تھی۔ ان میں سے ایک شکستہ انگلش میں بولا۔ "وہ سامنے گلی کے سرے پر ایک میڈیکل اسٹور ہے۔ وہاں سے بینڈیج کا سامان مل جائے گا۔"
لڑکی ہادی کے قریب آ کر مدھم آواز میں بولی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر اوقات ان راہزنوں کے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ وہ بدلہ لینے پر تل جاتے ہیں۔ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ کہیں آگے جا کر پٹی وغیرہ کرا لیجیے گا۔"
"آپ کا مشورہ ٹھیک لگتا ہے۔ آپ پاکستانی ہیں؟"
"جی ہاں۔ اسی لیے نیک مشورہ دے رہی ہوں۔ آپ کو...... سامان اٹھانے میں دقت تو نہیں ہو رہی؟"
ہادی نے دائیں ہاتھ سے اپنی زخمی کلائی تھام رکھی تھی۔ ظاہر ہے دقت تو ہونا تھی۔ وہ چند سیکنڈ سوچتی رہی پھر اس نے جھک کر ہادی کا ایک بیگ اٹھایا اور بولی۔ "چلیں آئیں، میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"
شکریے کے الفاظ ہادی کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا سا لڑکی کے ساتھ چل دیا۔ لوگ یہاں وہاں کھڑے تماشائی کی حیثیت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ لڑکی کے انداز میں اعتماد اور وقار تھا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس کی طرح یہاں نوارد نہیں ہے۔ شاید یہیں کی رہنے والی تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک تنگ سڑک پر مڑے اور پھر مین روڈ پر آ گئے۔ مین روڈ کے ساتھ ساتھ آبی سڑک بھی تھی اور دونوں سڑکیں روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ ہادی کی نگاہیں ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں مگر ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک بس دکھائی دی۔ "اس میں بیٹھ جائیں؟" ہادی نے کہا۔
لڑکی نے نگاہیں سکیڑ کر بس کا نمبر پڑھا اور بولی۔
"ہاں ٹھیک ہے۔"
دونوں سوار ہو گئے۔ انہیں نشستیں بھی مل گئیں۔ بس روانہ ہوئی تو دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہادی نے پہلی بار لڑکی کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ عمر یہی کوئی تئیس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ خوش شکل تھی۔ ہادی کے اندازے کے مطابق اس کے چہرے کی سب سے جاذب نظر شے اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیشانی تھی جو مسکراتے ہوئے کچھ اور بھی خوب صورت ہوجاتی تھی۔ بے شک وہ جدید لباس میں تھی تاہم اس کے انداز میں ایک طرح کی مشرقیت اور معصومیت تھی۔

"یہ بس کہاں جائے گی؟" ہادی نے پوچھا۔

"ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں، لیکن فی الحال یہ مین بس اسٹینڈ کی طرف جارہی ہے۔ وہاں جاکر اتر جائیں گے۔ پھر آپ کی مرضی چاہے جس بس میں بیٹھ جائیں۔ ویسے آپ نے جانا کہاں ہے؟"

"جانا تو کہیں بھی نہیں۔ بس کسی ٹھکانے پر سامان رکھنا ہے اور پھر ساری رات ادھر ادھر گھومنا ہے۔ یہ ویک اینڈ کی رات ہے۔ میں اسے کہیں سو کر گزارنا نہیں چاہتا۔"

"کتنے دن کے لیے یہاں ہیں آپ؟"

"زیادہ سے زیادہ پانچ دن۔"

"پھر کہاں جائیں گے؟"

"فلورنس یا روم، لیکن زیادہ چانس ہے کہ روم۔ روم مجھے ہمیشہ سے بہت زیادہ کشش کرتا ہے۔"

"آپ اکیلے ہی نکلے ہوئے ہیں پاکستان سے؟"

"ہاں..... جناب ابن انشا صاحب نے کہا تھا کہ سیاحت کا اصل مزہ اکیلے میں ہی ہے۔ میرا اپنا بھی خیال ہے کہ انسان کسی کی کمپنی میں جو کچھ دیکھتا ہے، اکیلا رہ کر اس سے دس گنا زیادہ دیکھ سکتا ہے۔"

"اوہو۔ پھر تو میں نے بہت غلط کیا آپ کے ساتھ آکر۔" وہ ایک ادا سے بولی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی پیشانی کو روشن تر کررہی تھی۔

"نہیں، میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ نے تو بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔" وہ تہِ دل سے بولا۔

وہ اس سے اس کے بارے میں کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔ "ویسے آپ نے رہنا کہاں ہے؟"

"آپ نے میرے سامان میں خیمہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کیمپ سائٹ پر خیمہ لگاؤں گا۔"

"ونڈرفل۔ بڑا رومانی آئیڈیا ہے۔ مجھے بھی کیمپنگ بہت پسند ہے لیکن افسوس کہ ایک دفعہ کے سوا کبھی کسی "کیمپ پلیس" میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"تو اب چلیے۔ کیمپ پلیس کی سیر ہوجائے گی۔ بڑی شاندار جگہ ہے۔ میرے پاس اس کی تصویریں بھی ہیں۔" ہادی نے کہا اور شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے چند پکچر کارڈز نکال لیے۔ ان میں وینس کی ایک معروف کیمپ پلیس "وینزیا" کی تصویریں موجود تھیں۔ دو تین معلوماتی پمفلٹ بھی تھے۔ درختوں کے درمیان حدِ نگاہ تک رنگ برنگے ٹینٹ لگے تھے اور چلتے پھرتے گھر یعنی کیروینز (Caravans) موجود تھے۔ لڑکی محویت سے دیکھنے لگی۔ چہرے پر اشتیاق تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔" ہادی نے کہا۔

وہ ذرا اٹک کر بولی۔ "حلیزا..... علیزا باسط۔"

"آپ یہیں رہتی ہیں؟"

"نہیں، ہماری رہائش روم میں ہے۔ میں یہاں اپنی ایک فرینڈ کے پاس آئی ہوئی ہوں۔"

اس نے مختصر جواب دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کچھ آگے بتانا نہ چاہتی ہو۔

اس سے پہلے کہ ہادی کچھ کہتا وہ پھر بول اٹھی۔ "اور آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"مجھے ہادی کہتے ہیں۔ کراچی کا رہائشی ہوں۔ شاعری میں منہ مارتا ہوں۔ فلموں کے لیے بھی شاعری کی ہے۔ آج کل ٹی وی ڈراموں کے تھیم سانگ وغیرہ بھی لکھ رہا ہوں۔"

اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اشتیاق سے بولی۔ "اچھا تو آپ شاعر ہیں، لیکن شکل سے تو نہیں لگتے۔ ویسے..... ویسے مجھے بڑا شوق ہے فن کار ٹائپ لوگوں سے ملنے کا..... میرے ایک ماموں بھی نعتیہ شاعری کرتے تھے اور مشاعروں وغیرہ میں بھی پڑھتے تھے، ترنم کے ساتھ۔ اب وہ کافی عرصے سے بیمار ہیں۔ اکثر فن کاروں کی طرح وہ بھی بالکل مختلف اور الگ قسم کے ہیں۔ کیا آپ بھی ایسے ہی ہیں؟"

"آپ خود بتائیے۔ میں آپ کو کیسا لگ رہا ہوں؟"

"اس کے لیے تو پھر تھوڑا سا وقت آپ کے ساتھ گزارنا پڑے گا..... اچھا کیا بتایا تھا ابھی آپ نے؟ آپ کو کون سی کیمپ پلیس پر جانا ہے؟"

"وینزیا..... میرا خیال ہے کہ سٹی سینٹر سے ذرا ہٹ کر ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ میں کیمپ پلیس تک آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ ویسے....." وہ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔" ہادی نے کہا۔

اس نے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں تلے دبایا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "ویسے تو آج میں بھی شہر میں گھومنا چاہ

رہی ہوں، پرسوں صبح مجھے واپس چلے جانا ہے۔ آپ بھلے آدمی لگ رہے ہیں، ہم اکھٹے گھوم سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے پہلے مجھے ماریہ کو فون کرنا ہوگا۔ ماریہ میری فرینڈ کا نام ہے۔"

"کیا وہ بھی آئے گی؟"

"نہیں، اس کے ساتھ تو بہت گھومی ہوں میں۔ آج اکیلے نکلنا چاہتی تھی۔" وہ من موجی انداز میں بولی۔

"پھر اس کو فون کیوں کررہی ہیں؟"

"بھئی، میزبان کو انفارم تو کرنا ہوتا ہے نا۔" اس نے کہا۔

ہادی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ وہ جیسے اپنی ہی کسی لہر میں بہے چلی جارہی تھی۔

ایک اسٹاپ پر وہ بس سے اترے۔ وینزیا کی کیمپ پلیس تک پہنچنے کے لیے انہیں ایک اور بس پکڑنا پڑی لیکن اس سے پہلے ایک میڈیکل اسٹور سے ہادی نے اپنی کلائی کی بینڈیج کروائی۔ ہادی نے دیکھا تھا کہ سوئٹزرلینڈ میں بغیر ڈاکٹری نسخے کے اسپرین تک لینا مشکل تھا لیکن یہاں اٹلی میں ایسا نہیں تھا۔ کم از کم وینس میں تو میڈیسن مل رہی تھی بلکہ اسٹور میں موجود ایک ملازم ٹائپ لڑکے نے اس کی بینڈیج بھی کردی تھی۔

بینڈیج کے بعد وہ جس بس پر سوار ہوئے اس کا نمبر پانچ تھا۔ اس بس نے دس پندرہ منٹ کے خوشگوار سفر کے بعد انہیں کیمپنگ سائٹ پر پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر علیزا بچوں کی طرح خوش ہوئی۔ واقعی جگہ بھی خوب صورت تھی۔ بلند وبالا درختوں کے نیچے دور تک خیموں اور "چلتے پھرتے گھروں" کا شہر آباد تھا۔ سامنے ہی ایک شاندار ریسٹورنٹ نظر آیا۔ اس میں بار بھی تھا۔ درجنوں جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ وہ دونوں استقبالیہ پر پہنچے۔ یہاں خیمہ لگانے کی فیس 40 یورو روزانہ یعنی قریباً 4200 پاکستانی روپے تھی۔ ہادی کو یہ ہرگز زیادہ محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ اس سے پہلے وہ سوئٹزرلینڈ میں دو مہنگے ہوٹلوں میں قیام کر چکا تھا..... زیورخ جھیل کے کنارے ایک ہوٹل کا کرایہ تو اس نے قریباً پندرہ ہزار روپے یومیہ ادا کیا تھا۔ حسب دستور استقبالیہ پر ہادی کا پاسپورٹ رکھ لیا گیا اور اسے ایک سلپ جاری کردی گئی جو دراصل خیمہ لگانے کا اجازت نامہ تھی۔

ہادی نے ریسٹورنٹ کے عقب میں ایک جگہ خیمے کے لیے منتخب کی۔ خیمے کو جوڑنے اور پھر کھڑا کرنے میں علیزا نے بھی ہادی کا ساتھ دیا اور اس کام میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ واقعی بچوں کی طرح خوش نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بڑی جلدی بے تکلف ہوجانے والی لڑکی ہے یا پھر وہ اس سلسلے میں ہادی کو خاصی رعایت دے رہی تھی۔ بہرحال اس کے رویے میں کسی طرح کا رومانوی لچ ہرگز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہادی کے ساتھ ایک دوست کی طرح ہی برتاؤ کررہی تھی۔

خیمہ کھڑا کرنے کے دوران میں ہادی کا دل بار بار چاہا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرے، مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ علیزا نے خاموشی کی زبان میں اسے باور کرادیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش نہ کرے، ورنہ یہ خوب صورت ساتھ کسی بھی وقت ختم ہوسکتا ہے اور وہ اسے "بائی" کہہ کر وینس کی روشنیوں میں گم ہوسکتی ہے اور ہادی اسے کھونا نہیں چاہتا تھا، کم از کم آج رات تو نہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں وہ اکیلا ہی گھومتا رہا تھا اور اب اس "تنہا گردی" سے قدرے اکتایا ہوا تھا۔

خیمہ ایستادہ کرنے کے بعد اور اس میں سامان رکھنے کے بعد وہ نکل کھڑے ہوئے، دونوں اجنبی تھے لیکن ہم زبانی اور ہم وطنی نے انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا تھا۔ وینس شہر کی اس پرفسوں شب میں گم ہونے کے لیے وہ یوں روانہ ہوئے جیسے مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ "کہاں جانا ہے؟" علیزا نے بس اسٹاپ پر پہنچ کر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ آپ تین چار دن سے یہاں موجود ہیں..... وینس کو مجھ سے زیادہ جانتی ہیں۔"

"تو پھر کسی "امیوزمینٹ پارک" میں چلتے ہیں۔ جھولے وغیرہ لیں گے، کشتی چلائیں گے۔" اس کی آواز میں بھاری پن تھا جو ہادی کو شروع سے ہی محسوس ہورہا تھا۔

ہادی نے کہا۔ "یہ آپ کی آواز بھرائی ہوئی کیوں ہے، کیا گلا خراب ہے؟"

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں، مجھ جیسی اسمارٹ لڑکی کی آواز اتنی بھدی ہوگی۔" وہ مسکرائی..... اور اس کی قدرے ابھری ہوئی پیشانی دمک اٹھی۔ یہ پیشانی اس کی مسکراہٹ کو یک دم دیدہ زیب بنا دیتی تھی۔

وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "دراصل میں کل بھی ایک تفریحی پارک میں تھی۔ وہاں پاکستانی انڈین کھانے بھی تھے۔ مزے کی بات یہ کہ گول گپے بھی تھے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

گول گپوں کو دیکھ کر میری وہی حالت ہوتی ہے جو صحرا میں لیلیٰ کو دیکھ کر مجنوں کی ہوتی تھی۔ میں نے ضرورت سے زیادہ کھا لیے۔"

"کوئی دوا لی؟"

"نہیں۔ اگر کہیں نظر آ گئے تو آج پھر گول گپے کھاؤں گی۔ کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔"

"بڑی مستقل مزاج ہیں آپ۔"

"اسی لیے تو آپ کے ساتھ چل رہی ہوں، ورنہ جس طرح کی باتیں کرتے ہیں آپ، اب تک ہم دو مختلف بسوں میں بیٹھ گئے ہوتے۔"

"میری باتیں پسند نہیں آئیں آپ کو؟"

"سچی بات ہے کہ ابھی تک تو نہیں۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ پہلے ہولے سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سر جھک گیا اور پونی ٹیل لہرانے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "نہیں، مذاق کر رہی ہوں۔ آپ کی کمپنی بہت اچھی ہے۔"

اسی دوران میں سٹی سینٹر جانے کے لیے ان کی مطلوبہ بس پہنچ گئی۔ یہ وہی پانچ نمبر تھی۔ دونوں سوار ہوئے۔ اس دفعہ نشستیں نہیں ملیں اور وہ دونوں کھڑے رہے، بالکل آمنے سامنے۔ علیزا کی خوشگوار سانس ہادی اپنے بالکل پاس محسوس کر رہا تھا۔ ان کی دائیں جانب سمندر تھا۔ یہاں بڑے بڑے لگژری جہاز کھڑے تھے۔ جیسے شاندار کثیر المنزلہ عمارتیں جن کے اندر زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔

مین بس اسٹینڈ پر پہنچ کر انہوں نے ٹیکسی لی اور تفریحی پارک "اوساوا" کی طرف چل دیے۔ یہ ایک آرام دہ کشادہ کار تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور..... ڈرائیور کم اور جہاز کا کپتان زیادہ نظر آتا تھا۔ وہی دبدبہ..... وہی اکڑفوں، کرایہ بھی کافی زیادہ تھا۔ ہادی نے کرایہ ادا کیا۔ علیزا نے اس میں شیئر کرنے کی کوشش کی مگر ہادی بولا۔ "اس وقت آپ کی حیثیت ہم سفر سے زیادہ میرے محترم گائیڈ کی ہے۔ اس لیے ادائیگیوں میں زیادہ تیزی نہ دکھائیں۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ رہ گئی۔ ہادی نے سمجھا کہ وہ مان گئی ہے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کا پتا اسے آگے جا کر چلا۔

وہ دونوں پارک میں داخل ہوئے۔ یہاں تفریح کے لیے بہت کچھ تھا۔ جھولے، کشتیاں، رولر کوسٹر ٹائپ گاڑیاں، تھیٹر..... سرکس..... اور نجانے کیا کیا۔

"چلیں، پہلے یہ جھولا لیتے ہیں۔" اس نے کہا اور بے تکلفی سے ہادی کا ہاتھ تھام کر ایک چکردار جھولے کی طرف لے آئی۔ یہاں قطار لگی ہوئی تھی۔ دونوں قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی اس جھولے میں بیٹھ چکی ہے اور "ایکسائیٹڈ" ہے۔ ان کے آگے قطار میں کھڑا ایک جوڑا گاہے بگاہے بغلگیر ہوتا تھا اور دیگر حرکات میں مصروف ہو جاتا تھا۔ یہ وتیرہ تو پورے یورپ میں عام ہے اور اب لوگ ایسے مناظر کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دیتے۔ شاید انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ ہر طرح کے ماحول سے جلد مانوس ہو جاتا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ دوسروں کو چونکانا چاہتا ہے۔ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے رومانی جوڑے عوام الناس کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے نئی حرکات اور نئے "ونیرے" ڈھونڈ لیتے ہیں۔

قطار آگے کو سرکتی رہی۔ چکردار جھولا کافی بڑا تھا اور اس کی لہراتی ہوئی "موومنٹ" بھی کافی سنسنی خیز لگتی تھی۔ اس پر بیٹھے ہوئے مرد و زن جوش اور خوف کے عالم میں چلا رہے تھے۔ ان میں حسب رواج بچے کم ہی نظر آتے تھے۔ اچانک علیزا نے ہادی سے پوچھا۔ "آپ یہ گیت وغیرہ کس طرح لکھ لیتے ہیں؟"

"جس طرح یہ جھولا چل رہا ہے۔" ہادی نے رواں لہجے میں کہا۔ "اس جھولے کو چلانے کے لیے بجلی درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی تخلیقی کام کے لیے اندر کی تحریک اور توانائی درکار ہوتی ہے۔ جب یہ توانائی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو تخلیق کا جھولا خود بخود چل پڑتا ہے۔"

"اور یہ توانائی آتی کہاں سے ہے جناب؟"

"اپنے اردگرد سے۔ کوئی پھول کھلتا ہے، کوئی آنسو گرتا ہے، کوئی صبح ہوتی ہے، کوئی آپ جیسی لڑکی مسکراتی ہے، تو یہ توانائی خود بخود تخلیق کے سوتوں میں داخل ہوتی ہے اور انہیں رواں کر دیتی ہے۔"

"اب مجھے یقین آ گیا۔ آپ یقیناً شاعر ہوں گے۔ آپ بہت گاڑھی گفتگو کرتے ہیں۔" وہ مسکرائی اور اس کی پیشانی پر پھر چودھویں کا چاند روشن ہو گیا۔

"یعنی اس سے پہلے آپ کو میرے شاعر ہونے پر شک تھا؟"

"زیادہ نہیں..... تھوڑا تھوڑا تھا۔" وہ ادا سے بولی۔ پھر موضوع بدل کر کہنے لگی۔ "اچھا آپ اپنا کوئی مشہور گیت بتائیں۔ گیت یا کوئی غزل وغیرہ۔"

"آپ شناخت پریڈ کررہی ہیں۔"

"اوہو، آپ ناراض ہوگئے۔"

"ناراض ہونے کا حق تو مجھے نہیں ہے۔ ابھی ہماری جان پہچان ہی کتنی ہے۔"

"تو پھر بتائیں گیت۔"

"ہادی نے ٹی وی چینلز سے نشر ہونے والے اپنے ایک گیت کا مکھڑا سنایا تو علیزا کی آنکھیں بے ساختہ پھیل گئیں۔ اس نے غیر یقینی نظروں سے ہادی کو دیکھا، یہ گیت تو میں نے سنا ہوا ہے..... کیا یہ واقعی آپ نے گایا..... میرا مطلب ہے کہ لکھا ہے؟"

"اب آپ ثبوت یا گواہی مانگ رہی ہیں۔ آپ تو مجھے پولیس والی لگ رہی ہیں۔"

"نہیں نہیں، ہادی صاحب! میں تو بس حیران ہورہی ہوں..... اگر یہ واقعی آپ نے لکھا ہے تو پھر تو آپ مشہور آدمی ہوئے۔ مجھے میوزک وغیرہ سے بہت زیادہ دلچسپی تو نہیں لیکن پھر بھی ٹی وی اور ایف ایم پر کبھی کبھی سن لیتی ہوں۔ میرے لیے..... بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج وینس کی ان خوب صورت روشنیوں میں ایک مشہور پاکستانی فن کار میرے ساتھ ہے۔" وہ ایک دم خوشی سے نہال نظر آئی۔

"خیر ایسا مشہور فن کار بھی نہیں۔" ہادی نے متانت سے کہا۔ "اصل مشہوری تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اسکرین پر نظر آتے ہیں، یا پھر جن کی آواز عوام کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ ہم تو بیک اسٹیج کے لوگ ہیں، ہمیں کوئی نہیں پہچانتا، نہ کوئی آٹوگراف لینے کے لیے ہماری طرف لپکتا ہے۔"

"لیکن بھئی! اصل بنیاد اور سوچ تو آپ لوگ ہی دیتے ہیں نا۔ اسی پر کسی شہ پارے کی عمارت بنتی ہے۔"

"سب لوگ تو آپ کی طرح نہیں سوچتے۔ کسی مشہور ہوجانے والے گیت کے گلوکار کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اگر وہ گیت کسی ڈرامے یا فلم میں ہو تو گیت گانے والے اداکار کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ایوارڈ ملتے ہیں، سندیں عطا ہوتی ہیں..... اس گیت کو سیکڑوں ہزاروں بار چلا کر اور اس کے ری میکس بنا کر روپیا کمایا جاتا ہے۔ وہ کمرشلز میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پڑوسی ملکوں کی فلموں اور ڈراموں میں بھی داخل ہوجاتا ہے مگر اسے لکھنے والا بے چارا، گمنام اور الگ تھلگ رہتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے ہادی صاحب! اس بارے میں، میں نے بھی کئی بار سوچا ہے اور افسوس کے ساتھ سوچا ہے۔ کسی شاندار فلم یا ڈرامے کے لکھنے والے کا نام چھوٹے موٹے تکنیک کاروں کے ناموں کے ساتھ اسکرین پر آتا ہے اور تیزی سے گزر جاتا ہے۔ جبکہ ہدایت کار اور پروڈیوسر وغیرہ کے ناموں کو خوب "ہائی لائٹ" کیا جاتا ہے۔ دراصل ہم کسی بھی شعبے میں حق دار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شعبے زوال کی طرف جارہے ہیں، لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا؟" ہادی نے پوچھا۔

"معاف کیجیے گا۔ آپ تو اتنے زیادہ بے چارے دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے کہ آپ کما رہے ہیں..... اور خرچ بھی کررہے ہیں۔"

"ہاں علیزا! کمانے کے حوالے سے تو میں کسی حد تک مطمئن ہوں لیکن ہم گیت نگاروں کی آمدن میں تسلسل نہیں ہوتا۔ کوئی اچھی چیز لکھ لی اور وہ "ہٹ" بھی ہوگئی تو کافی پیسے آگئے لیکن اس کے بعد دو تین ماہ مندے کے گزرے اور حساب برابر ہوگیا۔"

"تو آپ کوشش کیا کریں کہ بس ہٹ چیزیں ہی لکھیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ کرکٹر محمد یوسف سے کہیں کہ وہ ہر بال پر چھکا کیوں نہیں مارتا یا پھر میراڈونا سے پوچھا جائے کہ وہ ہر پندرہ منٹ بعد گول کیوں نہیں کردیتا تھا۔"

"مثالیں تو آپ اچھی دیتے ہیں، لگتا ہے کہ گیت بھی اچھے ہی لکھتے ہوں گے۔"

"بس گزارہ کرلیتا تھا۔" ہادی نے پھر لمبی سانس لی۔

"کیا مطلب؟ اب نہیں لکھتے آپ؟" اس نے دیدے گھمائے۔

"نہیں، لکھتا ہوں۔ مگر کچھ زیادہ اچھے نہیں۔ جس طرح کھلاڑی آؤٹ آف فارم ہوتے ہیں، اسی طرح میں بھی خود کو محسوس کررہا ہوں۔"

"آؤٹ آف فارم۔" وہ ہنسنے لگی۔ "یہ اچھی اصطلاح استعمال کی ہے آپ نے۔" اس کی پیشانی حسب معمول دمک اٹھی۔ ہادی پیشانی کی اس دمک میں کھو سا گیا۔ اس کی "شاہکار" مسکراہٹ کی بنیادی وجہ تو اس کے غیر معمولی طور پر سفید اور ہموار دانت تھے لیکن پیشانی بھی اس میں بھرپور کردار ادا کرتی تھی، اسی دوران میں جھولے پر ان کی باری آگئی۔

وہ جھولے پر سوار ہوگئے۔ بڑا جدید اور شاندار جھولا تھا۔ اس کی موومنٹ نے بار بار علیزا کو چلّانے اور ہادی کا

بازو پکڑنے پر مجبور کردیا۔ یہ سب کچھ بڑے بے ساختہ انداز میں ہوا۔ ہادی نے کن انکھیوں سے علیزا کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں، کیا لڑکی تھی یہ۔ کسی اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ چہرے سے شرافت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ مگر خبر نہیں کہ وہ کس موڈ میں تھی کہ اس وقت ہادی کے ساتھ ایک تفریحی پارک میں تھی اور بچوں کی طرح چہکاریں مار رہی تھی۔ اس کے بقول وہ یہاں اپنی کسی سہیلی کے پاس آئی ہوئی تھی لیکن رات کی اس سیر و تفریح میں وہ سہیلی بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے اسے بس ایک فون کیا تھا اور بالکل بے فکر ہوگئی تھی۔ اس جھولے سے اترتے ہی علیزا نے ہادی کی دائیں کلائی پکڑی اور ایک دوسرے جھولے کی طرف لپکی۔

"دوڑو بھئی" وہ پکاری۔

دراصل ایک گروپ اس دوسرے جھولے کی قطار میں لگنے کے لیے آرہا تھا۔ وہ اس گروپ سے پہلے ہی قطار میں لگ جانا چاہتی تھی۔ وہ خود دوڑی اور اس نے ہادی کو بھی دوڑا دیا۔ دونوں کسی کالجیٹ جوڑے کی طرح بھاگتے ہوئے لائن میں لگ گئے۔ بھاگنے سے اس کے گال شہابی ہوگئے اور وہ ذرا ہانپ گئی۔ بھاگنے سے اس کے بال بھی ذرا ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اس نے پونی ٹیل کا بینڈ اتارا اور بازو اوپر اٹھا کر بال کسنے میں مصروف ہوگئی۔ وہ بڑے متناسب جسم کی مالک تھی۔ پتا نہیں کیوں، ہادی اس میں عجیب سی کشش محسوس کررہا تھا۔ وہ کوئی دل پھینک نوجوان نہیں تھا۔ اس کی شاعری کے پرستاروں میں بہت سی خواتین اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ کئی لڑکیوں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان میں سے دو تین ایسی بھی تھیں جن کے ساتھ اس کی دوستی پروان چڑھی تھی۔ نوجوان جوڑوں کی طرح اکھٹے گھوما پھرا گیا تھا۔ ریستورانوں میں کھانا کھایا گیا تھا۔ شاعری اور شاعری کی "وجوہات" پر لمبی چوڑی باتیں ہوئی تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی لڑکی بھی تادیر ہادی کی سوچوں پر قابض نہیں رہ سکی تھی۔ یہ تعلق جس طرح شروع ہوئے اسی طرح بتدریج ختم ہوگئے مگر اس لڑکی میں ہادی کو کوئی جداشے نظر آرہی تھی۔ اس کی قربت اور اس کے لمس میں کچھ ایسی بات تھی جو ہادی نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ جیسے کوئی ان دیکھی چیز اسے اس سیلانی سی لڑکی کی طرف کشش کررہی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ آبی گزرگاہوں کے شہر وینس کا کمال تھا، اس دلفریب رات کا فسوں تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

دوسرا جھولا بھی بڑا سنسنی خیز قسم کا تھا۔ اس نے جھولا سواروں کو اٹھایا، گھمایا، اٹھایا اور دہلایا۔ چلّا چلّا کر لوگوں کے گلے بیٹھ گئے۔ علیزا کی آواز تو پہلے ہی بھرائی ہوئی تھی کچھ اور بھرا گئی۔

اس نے بہ مشکل کہا۔ "بہت مزہ آیا۔"

"آپ کی آواز تو مزید بیٹھ گئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب گول گپے کھا لینے چاہئیں۔"

"کیا بالکل خاموش ہونے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں آپ دیکھیے گا، گول گپے کھانے سے میری آواز بہتر ہوجائے گی۔"

"یہ تو مذاقیہ سی بات کہی ہے آپ نے..... اور اگر مذاقیہ نہیں بھی تو..... گول گپے ملیں گے کہاں سے۔ یہاں تو کوئی ایسے آثار نظر نہیں آرہے۔"

"آثار ہیں، بلکہ باقاعدہ گول گپے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ آلو چنے، سموسے، جلیبیاں اور شاید دہی بڑے بھی مل جائیں۔ یہاں باقاعدہ ایک فوڈ اسٹریٹ ہے جناب۔ ہر ملک کے کھانے ہوتے ہیں۔"

"لیکن گول گپوں کے لیے تو "کھانے" کا لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی چیزوں کو تو سیانے لوگ "بدپرہیزی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے ڈھیلے بال کس کر باندھے..... اور ہادی کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے انگ انگ سے توانائی اور خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جلد ہی وہ دونوں فوڈ ہاؤس کے اندر تھے۔ ایسی جگہوں پر سیاحوں کا رش ہوتا ہے اور ہر ملک و نسل کے لوگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ غالباً اپنی فرینڈ کے ساتھ پہلے بھی یہاں آچکی تھی۔ تیر کی طرح سیدھی انڈین پاکستانی اسٹال تک جا پہنچی۔ گول گپے اسے دور ہی سے نظر آگئے تھے۔ وہ باقاعدہ ان پر جھپٹی۔ ہادی نے آخری بار اسے منع کیا۔ "دیکھیں، آپ اپنے گلے کے ساتھ ظلم کریں گی۔"

وہ تڑ سے بولی۔ "یہ بھی تو مجھ پر ظلم کررہا ہے۔ کبھی کبھی ظلم کا جواب ظلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔"

اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے تھے۔ ہادی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اب بڑے خشوع خضوع سے گول گپوں کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ اپنا مرمریں انگوٹھا ایک گول گپے میں چبھو کر اس نے گول گپے میں سوراخ کیا پھر اس میں کھوڑے سے کالے چنے ڈالے۔ اسے املی والے پانی میں ڈبویا اور بڑی مہارت سے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی سر کے اشارے سے اس نے ہادی کو بھی

ہدایت کی کہ وہ بھی اس نیک کام میں دیر نہ کرے۔

ہادی کو کھٹی میٹھی چیزوں کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ پھر بھی اپنی ساتھی کی دلجوئی کے لیے اس نے گول گپوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ کھاتی جارہی تھی اور سی سی بھی کرتی جارہی تھی۔ اس کی خوب صورت ناک قدرے سرخ دکھائی دینے لگی۔

ہادی کے کانوں میں ابھی تک اس کا لہجہ اور اس کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے..... کبھی کبھی ظلم کا جواب ظلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔

کہیں اس پر بھی تو کوئی ظلم نہیں ہو رہا تھا، جس کے ردعمل کے طور پر وہ یوں رات گئے اس آبی شہر میں بے مہار گھوم رہی تھی۔ اگر یہ ردعمل تھا تو کس کے خلاف تھا؟ اس کے والدین کے خلاف؟ کسی دوست کے خلاف یا پھر..... کیا وہ شادی شدہ تھی؟ ہادی ابھی تک اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا..... اس سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

گول گپوں کے بعد وہ آلو چنے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ہادی کوشش کے باوجود اس مرتبہ اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔ بس ایک اونچی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ محویت سے کھا رہی تھی۔ اس کی ایک لٹ بار بار اس کے ہونٹوں کی طرف آتی تھی جسے وہ اپنے الٹے ہاتھ سے یا اپنی کہنی کے ساتھ پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ عجب متلون مزاج لڑکی تھی۔ ہادی کو چند لمحوں کے لیے ڈر محسوس ہوا۔ کہیں اس دیار غیر میں وہ اسے کہیں پھنسا ہی نہ دے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہونے کو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ ''غلط لوگوں'' کی ساتھی بھی ہوسکتی تھی۔ یا پھر گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی جس کے پیچھے اس کے اہل خانہ یا پولیس والے لگے ہوں..... یا ایسا ہی کوئی اور معاملہ۔ بہرحال ہادی کے اس ڈر کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے اس نوجوان لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں شرافت اور خاندانی نجابت جھلک دکھلاتی تھی۔ بے شک وہ فی الوقت ایک شوخ اور ترنگ بھرے موڈ میں تھی اس کے باوجود ایک طرح کا وقار بھی اس کے اندر سے پھوٹتا تھا اور دیکھنے والوں کو اس سے فاصلے پر رکھتا تھا۔

آلو چنے کھانے کے بعد وہ مصنوعی جھیل میں تیرتی کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے..... وینس رنگ اور مستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ تفریحی پارک بھی اسی مستی کا حصہ تھا۔ ان ملکوں کی تفریحی جگہوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے جیسے یہاں صرف جوڑے ہی بستے ہیں۔ نوعمر جوڑے، جوان جوڑے، ادھیڑ عمر اور بوڑھے جوڑے۔ اور یہ جوڑے ہر جگہ اور ہر وقت اپنی محبت کا برملا اظہار کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ ہر نسوانی کمر کے گرد ایک بازو نظر آتا تھا اور ہر مردانہ کندھے پر کسی خاتون کا سر ٹکا ہوتا تھا۔ بہت سے زیبا اور نازیبا مناظر بھی ہادی دیکھتا رہتا تھا۔

ٹکٹوں کے حصول کے بعد دونوں ایک پیڈل بوٹ پر سوار ہوئے اور نیم تاریک جھیل میں بوٹ چلاتے ہوئے آگے نکل گئے۔ کنارے کی روشنیاں جھیل میں جھلملا رہی تھیں اور ایک خوشگوار ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ یہ اگست کا مہینا تھا۔ ہادی جانتا تھا کہ اگر اس ہوا سے جنوری فروری میں واسطہ پڑا ہوتا تو وہ دونوں چند منٹ میں برفاب ہوجاتے۔

علیزا کے ریشمی بال ایک بار پھر ڈھیلے ہوچکے تھے۔ اس نے انہیں باندھنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے لیکن پھر باندھنے کا ارادہ بدل دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کسی ایسے آبشار کی طرح جس کا پانی ہولے ہولے ہوا میں لہراتا ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے روانی سے پوچھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ آپ پونی ٹیل میں زیادہ اچھی لگتی ہیں یا اس طرح۔'' ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے ذرا ٹھٹک کر ہادی کو دیکھا پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، آپ نے بتایا نہیں کہ آپ پاکستان سے کسی گھوڑے کی طرح دگڑ دگڑ دوڑتے ہوئے یہاں کیوں تشریف لائے؟ کیا اسے گھاس نہیں ملتی تھی۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''پتا نہیں کہ ''گھاس'' سے آپ کا کیا مطلب ہے لیکن میرا مسئلہ اور تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ میں ایک فن کار کی حیثیت سے خود کو اندر سے بالکل خالی محسوس کر رہا تھا۔ خالی اور بنجر۔ مجھے دو مشہور میوزک کمپنیوں کی طرف سے البم لکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ خاصی موٹی رقمیں بھی آفر کی جارہی تھیں لیکن میرا دل کام کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔ میں نے ایک جگہ سے تو ایڈوانس بھی پکڑ رکھا تھا۔ وہ بھی واپس کردیا۔ قریباً تین چار ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ گیت نگاری کی طرف مائل ہوسکوں، لیکن نہیں ہوسکا۔ پھر بہتر سمجھا کہ برا بھلا لکھنے کے بجائے نہ لکھوں۔ ویزا لگوایا، کچھ سامان اٹھایا اور نکل پڑا۔ یہ تین ماہ کا "Schengen"

ویزا ہے۔ یورپ کے ڈھیر سارے ملکوں میں جاسکتا ہوں..... چند دن سوئٹزرلینڈ میں گزرے ہیں۔ پہلے زیورخ گیا پھر انٹرلاکن۔ اب بذریعہ یوریل (ٹرین) اٹلی آگیا ہوں۔ چند ہفتے یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ پھر ہوسکتا ہے کہ آسٹریا یا جرمنی کا راؤنڈ لگالوں۔''

وہ مسکرائی۔ ''اس سے کیا ہوگا۔ گھوڑے کی اداسی ختم ہوجائے گی اور وہ پھر سے گیت لکھنے شروع کردے گا؟''

''ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔''

''بس آپ فن کاروں کی یہی غیر یقینی باتیں ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو کشش کرتی ہیں، جب آپ سگریٹ کا کش لے کر اور بالوں میں انگلیاں پھیر کر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتے ہیں تو دوسروں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ ''مختلف پن'' کبھی کبھی لوگوں کو بیزار بھی کرتا ہے اور الجھاتا بھی ہے۔''

''آپ بتائیں، آپ کشش محسوس کر رہی ہیں یا بیزار ہو رہی ہیں؟''

''بیزار ہو رہی ہوتی تو اس وقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔ خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں کہیں گم ہوگئی ہوتی۔ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے مرد و زن مجھے ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میرے ایک ماموں بھی بڑے اچھے نعت گو شاعر ہیں۔ کچھ ملی نغمے بھی لکھے تھے انہوں نے۔''

ہادی نے لمبی سانس لی۔ ''مجھے پتا ہے خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں گم ہوجانے کا آپشن آپ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مجھے کچھ بتایا ہی نہیں اپنے بارے میں۔''

''کیا یہ ضروری ہے کہ چند گھنٹے ایک ساتھ گزارنے کے لیے ہم اپنا اپنا تجزیۂ نسب ایک دوسرے سے بیان کریں۔ کیا اس طرح مزہ نہیں آتا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں جھانکے بغیر بس دو انسانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ وقت بتائیں۔''

''چلیں جیسے آپ کی مرضی۔''

''اچھا..... آپ مجھے اپنی شاعری کے بارے میں بتا رہے تھے۔ مجھے سمجھائیں کہ آپ کس طرح لکھ لیتے ہیں؟ کیا واقعی یہ کوئی آمد وغیرہ کا چکر ہوتا ہے یا پھر کوشش کرکے آمد والا موڈ بنایا جاتا ہے؟''

''دونوں کام ہی ہوتے ہیں۔'' ہادی نے کہا۔

''اپنی مرضی سے لکھا جائے اور اپنی خواہش کے ساتھ تو پھر آمد ہوتی ہے..... ورنہ دیہاڑی دار مزدور کی طرح زور لگانا پڑتا ہے.....''

''تو پھر آپ کبھی کبھی لکھا کریں نا۔''

''بڑی بھولی ہیں آپ..... کبھی کبھی لکھیں گے تو پھر معاوضہ بھی کبھی کبھی ہی ملے گا اور زندگی تو ہر روز ہی نئے تقاضوں کے ساتھ آن کھڑی ہوتی ہے نا، پروفیشنل لکھاریوں کو آمد کے حساب سے نہیں خرچے کے حساب سے لکھنا پڑتا ہے۔''

''اچھا، اپنی کوئی ایسی چیز بتائیں جو آمد والی ہو۔'' اس نے پھر موضوع بدلا۔

''نہیں، اس وقت موڈ نہیں۔''

''موڈ بنالیں نا بھئی۔ آپ کی ایک پرستار آپ سے فرمائش کر رہی ہے بلکہ التجا۔''

ہادی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے تحت اللفظ میں اپنی ایک آزاد نظم سنائی۔ اس نظم میں ایک پہاڑی لڑکی کا ذکر تھا۔ وہ شبنم کی طرح شفاف اور جھرنوں کی طرح الھڑ تھی۔ وہ چیڑ کے بلند و بالا درختوں کے نیچے کھڑی ہوکر روز ڈاکیے کی راہ دیکھتی تھی۔ اسے ایک خط کا انتظار تھا۔ یہ خط کس نے لکھنا تھا؟ اسے کچھ پتا نہیں تھا، کہاں سے آنا تھا یہ بھی پتا نہیں تھا۔ یہ کہیں سے بھی آسکتا تھا۔ جنوب کے سرسبز میدانوں سے، شمال کے بلند ترین برفیلے پہاڑوں سے..... مشرق کی نیلی جھیل سے یا مغرب کی کسی بے نام بستی سے..... مگر اسے یقین تھا کہ وہ خط ضرور آئے گا۔ لکھنے والا اس کے نام ضرور لکھے گا اور وہ روز ڈاکیے کی راہ دیکھتی تھی۔

''زبردست..... زبردست!'' نظم ختم ہوئی تو علیزا نے دل کھول کر داد دی اور باقاعدہ تالی بجائی۔

کشتی کے پیڈل چلا چلا کر وہ ذرا ہانپ گئی تھی۔ ہادی نے اسے پیڈل چلانے سے روک دیا اور خود ہی کشتی کھینچنے لگا۔ اس نے ممنونیت سے ہادی کی طرف دیکھا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں اڑ کر ہادی کے چہرے سے ٹکرائیں اور اس کی حس شامہ کے ساتھ ساتھ پورے جسم نے خوشبو کی لہر محسوس کی۔ علیزا نے جلدی سے شریر لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور کانوں کے پیچھے اڑسا، جیسے وہ لٹیں نہ ہوں، شریر بچے ہوں جو اس کی مرضی کے خلاف اٹھکیلیاں کر رہے ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد ان کی پیڈل بوٹ کنارے لگ گئی۔ ہادی پہلے اترا۔ پھر علیزا کو اتارنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ ذرا جھجکی پھر ہادی کی آفر قبول کرلی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھول جیسے نرم ہاتھ کے لمس نے ہادی کا دل بے طرح دھڑکا دیا۔ اس نے بہ مشکل اپنے تاثرات پر قابو پایا اور علیزا کو کنارے پر لے آیا۔

دونوں جھیل کے ساتھ ساتھ چلتے تفریحی پارک سے باہر آگئے۔ باہر کی گہما گہمی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ نے آبی راستے کے کنارے کنارے دور تک میزیں سجا رکھی تھیں۔ یہاں جام حرکت میں تھے اور کھانے کھائے جا رہے تھے۔ آرکسٹرا زور شور سے دھنیں بکھیر رہا تھا۔ سامنے والے پل پر اتنا ہجوم تھا کہ گزرنا مشکل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ویک اینڈ کی رات نہیں بلکہ کوئی اہم تہوار ہے۔ بدمست جوڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ فضاؤں میں نشیلے قہقہوں کی گونج تھی۔ وہ پل کے پار جانا چاہتے تھے۔ رش کی وجہ سے وہ دوسرے پل کی طرف بڑھے۔ اچانک گارڈنیا کی ایک باڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے دونوں ٹھٹک گئے۔ انہیں سسکیوں کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو کسی باغیچے کی سیڑھیوں پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے۔ وہ کراہ رہی تھی اور اپنا ایک ٹخنہ بار بار دباتی تھی۔

"کیا ہوا سسٹر؟" علیزا نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے چہرہ اٹھایا جو آنسوؤں سے تربتر تھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ پھر اپنے اوپر اٹھے ہوئے گھٹنوں پر جھک گئی۔ تاہم اس کے رونے میں تھوڑی سی تیزی آگئی۔ ہادی اور علیزا نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر علیزا لڑکی کے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور اس کے رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک بنگلا دیشی لڑکی ہے۔ اس کا نام انیسہ ہے۔ اس کی سخت مزاج ساس نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔

انیسہ نامی یہ لڑکی چوبیس پچیس سال کی رہی ہوگی۔ وہ بنگالی لہجے میں اردو بول رہی تھی۔ بیچ میں کہیں کہیں انگلش کا فقرہ بھی بول جاتی تھی۔ علیزا نے پوچھا۔ "شوہر کہاں ہے تمہارا؟"

"وہ فلورنس گئے ہوئے ہیں۔ کوئی دفتری کام تھا انہیں۔" وہ بنگالی لہجے میں بولی۔ "فلورنس ایک قریبی شہر تھا۔"

علیزا نے کہا۔ "یہ تو اور بھی بری بات ہے۔ تمہارا شوہر یہاں نہیں اور اس عورت نے مار پیٹ کر تمہیں نکال دیا ہے۔ وہ بھی رات کے وقت۔ اس کی تو پولیس رپورٹ ہونی چاہیے۔"

لڑکی کی سیاہ آنکھوں کے کٹورے پھر آنسوؤں سے بھر گئے۔ اس کا ٹخنہ ذرا سوج گیا تھا اور نیلگوں ہو رہا تھا۔ کراہتے ہوئے بولی۔ "بس کسی ٹائم بہت غصے میں آجاتی ہیں وہ۔ میں نے ہاتھ جوڑے، منت کی لیکن ایک نہیں سنی۔ مجھے باہر دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔"

"بات کیا ہوئی تھی؟" ہادی نے پوچھا۔

"کسی بات کا ہونا ضروری نہیں۔ بس میں اچھی ہی نہیں لگتی ان کو۔ شادی کو سات ماہ ہوئے ہیں۔ بس پہلے ایک دو ماہ ہی ٹھیک گزرے پھر میری بدنصیبی شروع ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر میری مصیبت آجاتی ہے۔"

"شوہر ساتھ نہیں دیتا تمہارا؟" علیزا نے پوچھا۔

"کبھی تھوڑا بہت دیتے ہیں کبھی نہیں۔ انہیں بھی اپنی والدہ کی ناراضی کا ڈر رہتا ہے۔"

"اب کیا بات ہوئی تھی؟"

"انہیں میری ہر بات ہی بری لگتی ہے، میرے والدین ڈھاکا میں رہتے ہیں، اگلے مہینے مجھے ان کے پاس جانا ہے، اپنے بھتیجوں کے لیے کچھ چیزیں بازار سے لے کر آئی تھی۔ بس اسی بات پر ان کو غصہ آگیا، کہنے لگیں کہ مجھے اپنے میکے والوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ مجھ سے بہت سخت بولنے لگیں۔ میرے باپ کو گالیاں دیں۔ میں نے بس اتنا کہا کہ وہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں انہیں کیوں برا کہتے ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہوں، میرے ساتھ جو چاہے کر لیں۔ بس اسی بات پر اور بھڑک اٹھیں۔ کہنے لگیں، میں آج تمہیں گھر سے نکال کر ہی چھوڑوں گی۔ دھکے دیے۔ میرا پاؤں مڑ گیا۔ مجھے بالوں سے کھینچتی ہوئی باہر لے آئیں۔ میں نے بہت منت کی لیکن مجھے باہر نکال دیا۔"

علیزا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ تمہیں گھر واپس لے جاتے ہیں، تمہاری "مدران لا" سے بات کرتے ہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ بیٹے کی غیر موجودگی میں تمہیں رات کے وقت اس طرح نکالیں۔"

"نہیں، وہ نہیں مانیں گی اور زیادہ غصے میں آئیں گی۔ میرے ساتھ مار پیٹ شروع کر دیں گی۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟" علیزا نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میری ایک فرینڈ ہے یہاں پاس ہی "ڈورزبرگ" میں۔ میں وہاں چلی جاؤں گی۔ ایک دو دن وہاں رہوں گی۔ پھر توفیق آجائیں گے۔ توفیق میرے شوہر کا نام ہے۔

میری ساس کو پتا ہے اور توفیق کو بھی کہ میں گھر سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم فرینڈ کی طرف کیوں نہیں جاتیں۔ یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" ہادی نے سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "بس اپنی بے بسی پر رونا آرہا ہے۔ میرے پاس ٹیکسی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ میں کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لا سکی۔"

علیزا، انیسہ کی بھرپور مدد پر آمادہ تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ وہ اسے اس کی فرینڈ کے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔

انیسہ نے پہلے تو انکار کیا پھر علیزا کا اصرار دیکھ کر مدد لینے پر آمادہ ہوگئی۔ پاؤں کی چوٹ کے سبب اس سے چلنا محال ہو رہا تھا۔ علیزا نے اسے ایک طرف سے سہارا دے کر چلنے میں مدد دی۔ وہ تینوں اس تنگ سڑک پر چلتے ہوئے مین روڈ پر آگئے۔ کچھ دیر بعد انیسہ کا پاؤں گرم ہو کر رواں ہوگیا اور وہ سہارے کے بغیر خود ہی قدم اٹھانے لگی۔ اس مرتبہ وہ ایک واٹر ٹیکسی یعنی چھوٹی کشتی پر بیٹھے۔ اس ٹیکسی پر بیٹھنے کا یہ ہادی کا پہلا اتفاق تھا۔ آبی راستے یعنی وینس کی نہریں، سڑکوں کی طرح تھیں۔ بڑی سڑکوں سے بغلی سڑکیں نکلتی تھیں اور پھر تنگ آبی گلیاں تھیں۔ ٹریفک ویسے ہی رواں تھی جیسے پختہ سڑکوں پر ہوتی ہے۔ تفریحی بجرے، بڑی بڑی آبی بسیں، آبی ٹیکسیاں، چھوٹی بڑی لانچیں اور بالکل چھوٹے ڈونگے جن پر دو یا تین افراد سوار ہوتے تھے۔

انیسہ یکسر خاموش تھی۔ وہ بار بار اپنی ساڑی کے پلو کو درست کرتی اور بال سمیٹتی تھی۔ علیزا کا دل جیسے اس کے لیے درد سے بھرا ہوا تھا۔ ہادی کو لگا کہ اگر اس وقت انیسہ کو کسی دوسرے شہر بھی لے جانا پڑتا تو شاید علیزا آمادہ ہو جاتی۔ وہ بار بار انیسہ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی جیسے اسے سمجھانے اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

جلد ہی وہ ایک اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ ٹیکسی کا کرایہ علیزا نے ادا کیا پھر وہ پختہ سڑک پر چلتے ہوئے ایک رہائشی گلی میں داخل ہوئے اور ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رک گئے۔ وینس شہر کی بیشتر عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی قدیم طرز تعمیر کی تھی، تاہم دیگر عمارتوں کی طرح اس کی بالکونیاں بھی پھولوں سے سجی ہوئی تھیں۔ انیسہ نے دو تین بار ڈور بیل بجائی آخر پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا پھر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ یہ بھی ایک ساڑی پوش لڑکی ہی تھی۔ اس کی جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ حاملہ ہے۔ ماتھے پر بندیا کا نشان اسے ہندو ظاہر کر رہا تھا۔ اپنے حلیے سے بھی وہ انڈین نظر آتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی انیسہ اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

"کیا ہوا انیسہ؟ کیا پھر لڑائی ہوئی؟" انیسہ کی سہیلی نے انگریزی میں پوچھا۔ انیسہ نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔

"بے رحم عورت۔" انیسہ کی سہیلی نے دکھی آواز میں کہا۔ پھر انیسہ کی کمر سہلاتے ہوئے بولی۔ "اور وہ توفیق کہاں ہے؟"

"وہ باہر ہیں۔" انیسہ نے مختصر جواب دیا۔

نووارد لڑکی اب سوالیہ نظروں سے ہادی اور علیزا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انیسہ نے مختصر لفظوں میں اسے بتایا کہ ان دونوں نے اس کی مدد کی ہے اور ٹیکسی کا کرایہ دے کر اسے یہاں تک لائے ہیں۔ نووارد نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اس نے علیزا کو کرایہ دینے کی بھرپور کوشش کی جو اس نے ناکام بنا دی۔

وہ دونوں ان دونوں سہیلیوں سے رخصت ہو کر ایک بار پھر روشنیوں سے جگمگاتے وینس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ لیکن اب علیزا کے موڈ میں وہ پہلے جیسی شوخی اور ترنگ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی واٹر ٹیکسی میں بیٹھی اور دونوں سٹی سینٹر کی طرف چل دیے۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "علیزا، کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ عورت ہی عورت کا برا سوچتی ہے، وہ جب بیوی یا بہو ہوتی ہے تو خود پر ہونے والی سختیوں کا رونا روتی ہے لیکن جب بڑی عمر میں اختیار حاصل کر لیتی ہے اور ساس وغیرہ بن جاتی ہے تو وہی کرنے لگتی ہے جسے وہ ظلم قرار دیتی تھی۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔" علیزا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک انیسہ کے دکھ میں الجھی ہوئی تھی۔

"شاید یہ چکر ہمارے معاشروں میں زیادہ ہے یعنی برصغیر میں۔" ہادی نے کہا۔

"وہی کلچر کا معاملہ ہے نا۔ ہمارے ملکوں میں عورت جب تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوتی، اسے پاؤں کی جوتی ہی سمجھا جائے گا۔ کبھی مذہب کے نام، کبھی رسم ورواج کے نام پر اور کبھی رشتوں کے جکڑ بند سے اسے لاچار کیا جاتا رہے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"بہر حال تھوڑی بہت تبدیلی تو اب نظر آنا شروع ہوگئی ہے علیزا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ وہ گھروں سے نکل رہی ہیں۔ عملی زندگی میں قدم رکھ رہی ہیں۔ بے شک ڈری ڈری ہیں، سہمی سہمی ہیں لیکن آگے تو بڑھ رہی ہیں نا۔"

"ہاں، ایسا ہو تو رہا ہے لیکن رفتار بڑی سست ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو سچ یہ ہے کہ عورت کے پاؤں پر کھڑے ہونے سے مرد کی حاکمیت پر زد پڑتی ہے۔ خاص طور سے ہمارے ہاں کا مرد تو یہی سمجھتا ہے کہ عورت آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کے اثر سے نکلنے اور اس کو نکو بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اس عمل کو اپنی مردانگی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ ڈکٹیٹر بن جاتا ہے اور عورت کے پر کاٹ کر اسے پنجرے میں پھینکنے کے لیے اپنے پورے اختیار استعمال کرتا ہے۔"

ہادی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "لیکن علیزا! ہمیں تصویر کا بس ایک رخ ہی تو نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہم یہ بھی تو دیکھ رہے ہیں کہ جو لڑکیاں یا عورتیں برسر روزگار ہو جاتی ہیں، وہ اپنے گھروں کی طرف سے غفلت برتنے لگتی ہیں۔ اپنے والدین اور شوہروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتیں۔ سسرالیوں کو شکنجے میں کسنے لگتی ہیں۔ بعض اوقات ان کی پوری ازدواجی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔"

علیزا نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے بالوں کو پونی ٹیل میں کسا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سراپا مزید جاذب نظر ہو جاتا تھا۔ اس کی شرٹ کا گریبان ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا، وہ ذرا ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کرتی ہادی صاحب کہ کہیں کہیں ایسا ہو رہا ہے۔ لیکن یہ دونوں طرف سے ہے۔ کہیں مرد سے زیادتی ہوتی ہے کہیں عورت سے۔ مگر ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اس حوالے سے ایک ابتدائی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ عورت عملی زندگی میں پہلے پہلے قدم رکھ رہی ہے۔ دوسری طرف مرد کو بھی عورت کی اس آزادی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا ہے۔ دونوں ایڈجسٹمنٹ کے دور میں ہیں۔ لیکن اگر کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم تبدیلی کے اس پورے عمل کو ہی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ پھر وہی سوچ اپنا لیں کہ عورت اور گائے بکری میں زیادہ فرق نہیں۔ دونوں کا کام بس اپنے مالک کی خدمت کرنا ہے۔ اپنی جان، اپنے گوشت اور اپنی کھال کو ان کے لیے وقف کرنا ہے اور خدمت کرتے کرتے مر جانا ہے۔"

ہادی خاموشی سے علیزا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے خیالات علیزا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن وہ جان بوجھ کر اختلافی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے کریدنا چاہ رہا تھا اور اسے اس میں تھوڑی بہت کامیابی ہو رہی تھی۔

دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہادی کو اندازہ ہوا کہ یا تو علیزا خود شادی شدہ ہے اور اس کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں ہیں، یا پھر اس کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ اپنے ہونے والے شوہر اور سسرالیوں سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ علیزا کی کسی بڑی بہن یا قریبی عزیزہ کی ازدواجی زندگی تلخ ہو اور ان تلخیوں نے علیزا کے اندر بھی خدشے اور بیزاریاں بھر دی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے علیزا نے اپنی کسی شادی شدہ بہن کا ذکر بھی کیا تھا جو اب بہت کم اس سے ملتی تھی۔

وہ واپس سٹی سینٹر پہنچے۔ اب رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا مگر گرد و پیش کی رونق میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ فضا میں موسیقی کی لہریں تھیں اور رومانی مناظر پانی میں اور کناروں پر بکھرے ہوئے تھے تاہم اس لڑکی انیسہ والے واقعے کے بعد ہادی کو علیزا میں وہ شوخی اور ترنگ نظر نہیں آئی۔ ان دونوں نے ایک دو تفریحات میں حصہ لیا۔ ایک جگہ سے پیزا لے کر بھی کھایا۔ پھر ہادی نے محسوس کیا کہ علیزا اب واپس جانا چاہتی ہے۔ وہ ایک دم خالی خالی سا ہو گیا۔ یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی اس کے لیے خاصی اہم ہو گئی تھی اور اب وہ جانا چاہ رہی تھی۔

"کیا دوبارہ ملاقات ہوگی؟" ہادی نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔ "اگر آپ چاہیں گے تو ہو جائے گی۔"

ہادی نے جرأت کر کے کہا۔ "میں تو اس ملاقات کو اتنا لمبا کرنا چاہتا ہوں کہ تین چار ہفتے ہنسی خوشی گزر جائیں۔"

"خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ پرسوں تو مجھے ویسے ہی واپس چلے جانا ہے۔"

"تو پھر جانے سے پہلے کب آئیں گی آپ؟"

"کل دوپہر کو چکر لگا لوں گی آپ کی طرف۔ میں نے کیمپ دیکھ لیا ہے اور آپ کا خیمہ بھی۔"

"یہ میرا سیل نمبر بھی لے لیجیے۔ اگر کوئی کنفیوژن ہو تو....."

"نن..... نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ میں گیارہ سوا گیارہ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

صاف ظاہر تھا کہ دیگر معلومات کی طرح وہ سیل نمبرز کا تبادلہ بھی نہیں چاہتی۔ ہادی نے فی الحال اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شیشہ صفت لڑکی ہے۔ ذرا سے دباؤ سے چھناکے سے ٹوٹ جائے گی۔ وہ اسے کسی بھی طرح دوبارہ ملنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے آنا تھا تو خود ہی آنا تھا۔

بڑے بس اسٹینڈ کے قریب وہ اس سے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے وہ مڑی اور بولی۔ "صبح اپنی پٹی بدل لیجیے گا۔ انفیکشن نہ ہو جائے۔"

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ علیزا کی فکرمندی کی یہ ادا اسے بھلی لگی اور اس کے دل میں امید جاگی کہ وہ کل ضرور آئے گی۔

عام ٹیکسی اور آبی ٹیکسی کے کرایے ہوشربا تھے۔ خوامخواہ زرمبادلہ ضایع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہادی پیدل ہی وینیزیا کیمپ پلیس کی طرف روانہ ہو گیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ اپنے ٹینٹ کے اندر تھا۔ وہ چٹائی پر لیٹ گیا اور ٹینٹ کی مخروطی چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں بار بار علیزا کی شبیہ ابھر رہی تھی۔ اس کی روشن پیشانی جو اس کی دلنشین مسکراہٹ کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ کوئی خاص بات تھی اس معاصفت لڑکی میں، ورنہ وہ اس طرح کسی کے بارے میں سوچنے والا تو نہیں تھا..... اس نے اپنا نام علیزا بتایا تھا۔ پتا نہیں یہ نام بھی درست تھا یا نہیں۔ وہ سوچتا رہا، نجانے اسے کب تھکاوٹ کے سبب نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وینیزیا کیمپ میں سرخ و سپید جوڑوں کی چہل پہل تھی۔ زیادہ تر نوجوان لڑکے لڑکیاں ہی نظر آتے تھے۔ وہ نہا نہا کر نکل رہے تھے اور نکل نکل کر نہا رہے تھے۔ کچھ ناشتا کر رہے تھے، کچھ اس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایک علیحدہ جگہ صاف ستھرے پختہ واش رومز بنے ہوئے تھے۔ ہادی نے شیو کی۔ منہ ہاتھ دھویا اور فریش ہو کر ناشتا کرنے کے لیے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ یہ ریسٹورنٹ اس کے خیمے کے بالکل پاس ہی واقع تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے علیزا کا انتظار شروع کر دیا۔ کبھی دل کہتا تھا کہ وہ آئے گی، کبھی کہتا تھا نہیں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہوتا اور ایک دم پیچھا نہ چھڑانا ہوتا تو کم از کم اپنا کوئی کانٹیکٹ تو اسے دیتی۔ وہ ادھر ادھر گھومنا چاہ رہا تھا۔ رنگ برنگے خیموں کے اس شہر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ ڈر تھا کہ کہیں علیزا خیمہ خالی دیکھ کر واپس نہ چلی جائے۔

وہ واپس خیمے میں آ گیا اور ادھر ادھر بکھری اشیا درست کرنے لگا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہ اپنی رسٹ واچ کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ پورے سوا گیارہ بج گئے تو وہ اٹھ کر خیمے سے باہر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب کوئی اس پر جھپٹا اور ساتھ ہی زوردار نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ بدک کر رہ گیا اور گرتے گرتے بچا۔ یہ علیزا تھی۔ وہ خیمے کے در کے پاس ہی موجود تھی اور اس نے ہادی کو کامیابی سے ڈرا دیا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر دُہری ہونے لگی۔ اس کا چہرہ گلنار تھا۔

ہادی کھسیانے انداز میں ہنسا۔ علیزا کے ڈرانے پر جب وہ پیچھے ہٹا تو اس کا ہاتھ لکڑی کے ایک پول سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کی زخمی کلائی پھر دکھ گئی۔ اس نے ذرا تکلیف محسوس کی۔ علیزا نے فوراً یہ بات نوٹ کی۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"اوہو" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ہادی کی کلائی پر جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہادی کا ہاتھ دبایا۔ "اوہ ساری..... آئی ایم ویری ساری..... میں نے آپ کی کلائی دکھا دی۔ تکلیف ہو رہی ہے آپ کو؟"

"نہیں، کچھ زیادہ نہیں۔" ہادی نے کہا۔

"ویسے آپ بہت برے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ سویرے سب سے پہلے یہ پٹی بدلیں۔ یہاں ہوا میں رطوبت ہوتی ہے۔ انفیکشن کا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

وہ ہادی کو کھینچ کر خیمے کے اندر لے آئی۔ خیمے کی ایک باکٹ میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ اس نے فوراً پٹی کھولی۔ وہ ذرا چپٹی ہوئی تھی۔ ہائیڈروجن کے استعمال سے اس نے پٹی کو زخم سے علیحدہ کیا۔ پھر کاٹن کے استعمال سے اچھی طرح زخم کو صاف کیا اور "آنٹمینٹ" لگا کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔

یہ کام اس نے بڑے انہماک سے کیا۔ اتنے انہماک سے کہ اسے ہادی کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ علیزا کا لمس، اس کا محبت بھرا انداز، اس کی فکرمندی، یہ سب کچھ مل کر ہادی پر عجیب سا اثر کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں ہادی کا دل چاہا کہ اس کا زخم شدت میں زیادہ ہوتا اور وہ دیر تک بند خیمے میں اسی طرح اسے اپنی انگلیوں کے مہربان لمس سے نوازتی رہتی۔

ہادی نے اس کے لیے ناشتا منگوانا چاہا لیکن اس نے بتایا کہ وہ ناشتا کر کے گھر سے چلی تھی، کیونکہ سیر و تفریح کا یہ قیمتی وقت کہیں بیٹھ کر ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ استعمال کی عام چیزیں مثلاً کیمرا، ٹیلی اسکوپ، چھتری اور تھرماس وغیرہ لے کر کیمپ پلیس سے نکلے اور وینس کی سڑکوں پر آ گئے۔ علیزا کے ہاتھوں میں ایک نقشہ بھی تھا جس سے وہ گاہے بگاہے مدد لے رہی تھی۔ گرمی توقع سے کچھ زیادہ تھی۔ موسم کی مناسبت سے علیزا نے ہلکے رنگوں کی ہاف سلیو شرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے بال ایک خوب صورت ربن سے بندھے تھے۔ اس کے پاس شرٹ کا ہم رنگ شولڈر بیگ تھا۔ دھوپ کے سیاہ چشمے میں اس کے چہرے کی رنگت کچھ اور نکھری نظر آئی۔

ان دونوں نے قریبی اسٹاپ پر پانچ نمبر بس کا انتظار کیا۔ اس میں زیادہ تر سیاح ہی ٹھسے ہوئے تھے۔ آج چھٹی کے دن یہ سب لوگ وینس کے گلی کوچوں میں آوارہ منڈلانا چاہتے تھے۔ پتا نہیں کیوں آج ہادی ایک ٹین ایجر لڑکے کی طرح سوچ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج پھر بس میں بہت رش ہو اور اسے علیزا کے ساتھ کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے۔ ایسی صورت میں وہ علیزا کی قربت کو زیادہ شدت سے محسوس کر سکتا تھا۔

ہادی کی یہ تمنا پوری ہوئی اور انہیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا..... لیکن کچھ دیر بعد علیزا ایک اٹالین خاتون سے اس طرح باتوں میں مصروف ہوئی کہ آخر تک اس نے ہادی کی طرف رخ نہیں پھیرا۔ وہ اپنے آپ میں کڑھتا رہا..... بس پرفیوم کی خوشبو علیزا کے جسم سے اڑ اڑ کر ہادی تک پہنچتی رہی۔ بس کی "نیک دل" لیڈی ڈرائیور نے بھی شاید ہادی کی اس کڑھن کو محسوس کر لیا۔ سفر کے آخری مرحلے میں اس نے ایک جگہ اتنے زور سے بریک پیڈل دبایا کہ علیزا تقریباً ہادی کے اوپر ہی آن گری۔ ہادی چند سیکنڈ کے لیے اس کے جسم کے گداز اور خوشبو میں ڈوب سا گیا۔ ہادی خود ایک معمر اٹالین خاتون کی آغوش میں گرتے گرتے بچا تھا۔

"ویری ساری۔" علیزا نے کہا۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا، مخاطب ہادی تھا۔

معمر خاتون مسکرائی اور علیزا کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولی۔ "کوئی بات نہیں..... میرے خیال میں تو تمہارے اس بوائے فرینڈ کو تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

علیزا کا چہرہ کچھ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معمر خاتون کے اس مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا اور بس سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ لوگ مین بس اسٹینڈ پر اترے اور پھر وہاں سے پیدل ہی ایک آبی سڑک کے کنارے کنارے چل دیے۔ علیزا چہک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ سے گزرے جہاں کل رات انیسہ نامی لڑکی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ دور سے اس باغیچے کی سیڑھیاں نظر آئیں جس پر وہ کل شب بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ علیزا ایک دم پھر بجھ سی گئی۔ ہادی نے صاف محسوس کیا۔ اس کی پیشانی کی غیر معمولی چمک کسی دھندلکے میں کھو گئی ہے۔

ہادی اس کا موڈ مزید خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ خود ہی ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اللہ کرے وہ خیریت سے ہو اور خیریت سے گھر واپس بھی چلی جائے۔"

"ہاں اچھی لڑکی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس کے شوہر کو اس کے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے۔"

"دل تو چاہتا تھا کہ پھر اس سے ملیں، لیکن اب اتنا وقت ہی نہیں ہے۔" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔

ہادی نے اس کی تائید کی۔ اب وہ ایک کشادہ نہر کے کنارے تھے۔ اس کو وینس کی شاہراہوں میں سے ایک شاہراہ کہا جا سکتا تھا۔ یہاں بڑی بڑی آبی بسیں اور بجرے وغیرہ تیر رہے تھے۔ وہ مشہور زمانہ کشتیاں بھی تھیں جنہیں گنڈولا یا وینز ٹیکسی کہا جاتا ہے۔ انہیں ایک لمبے چپو سے چلایا جاتا ہے۔ چلانے والے نے ایک خاص دھاری دار شرٹ اور ہیٹ زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ ان وینز ٹیکسیوں یا "گنڈولاز" کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے لہٰذا ہادی اور علیزا نے ان کی طرف رخ نہیں کیا۔ علیزا نے بتایا کہ وینس کا مقبول ترین ذریعۂ آمدورفت ACTV سروس ہے۔ اس سروس میں چھوٹی بڑی کشتیاں، پانی کی بسیں اور کرایے پر دی جانے والی کشتیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے بھی ACTV کی ایک بس کے ذریعے ہی سفر کیا اور ریالٹو سے کچھ فاصلے پر اتر گئے۔ یہاں نہروں کا جال تھا اور ان پر محرابی پل بنے ہوئے تھے۔ یہاں لوگوں کا اژدھام تھا۔ کئی لوگ ساز بجا رہے تھے۔ بہت سے کھا پی رہے تھے۔ یہاں وہاں بے فکرے ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے دلچسپ مصروفیات اپنائے ہوئے تھے۔ سامنے ہی دو نوجوان دوست ایک پل کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے ان کے گرد کچھ تماشائی موجود تھے۔ دونوں دوست شرط لگا کر کھیل رہے تھے۔ کھیل بے ہودہ لیکن دلچسپ تھا۔ وہ دونوں تھوک رہے تھے اور دیکھنا یہ تھا کہ کس کا تھوک زیادہ دور جاتا ہے۔

علیزا نے برا سا منہ بنایا۔ وہ چلتے رہے اور تصویریں

کھینچتے رہے۔ کبھی علیزا، ہادی کی تصویر کھینچتی تھی، کبھی وہ اس کی۔ لیکن دونوں کی تصویریں ان کے اپنے اپنے کیمروں میں تھیں۔ دونوں کی اکٹھے بھی کوئی تصویر نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بے خیالی میں ہادی نے اپنے کیمرے سے علیزا کی تصویر کھینچنا چاہی، تو وہ ایک دم بدک سی گئی۔

"نو..... نو..... نو" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

"سوری!" ہادی نے کہا اور ایک دم بجھ سا گیا۔

"فروٹ کھائیں گے۔" کچھ آگے جا کر علیزا نے ہادی کو آفر کی اور پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک ریڑھی کی طرف لپک گئی۔ اس خوب صورت ریڑھی پر شیشے کا بڑا بکس تھا اور اس میں مختلف قسم کا کٹا ہوا پھل پلاسٹک کے چھوٹے گلاسوں میں بھرا گیا تھا۔ چند ٹکڑے سیب کے، چند خربوزے کے، تھوڑی سی ناشپاتی، تھوڑا سا تربوز، دو چار دانے کالے انگور کے۔ ایک چھوٹا گلاس ڈھائی یورو میں آیا۔ سالم پھل کے مقابلے میں یہ کافی مہنگا تھا۔ علیزا نے ایک گلاس ہادی کو تھما دیا۔ ہادی نے تھوڑا سا کھایا..... پھر ہاتھ روک لیا۔ گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سامنے کھڑے غبارے والے کی طرف متوجہ تھا۔ یہ بہت بڑے بڑے رنگ برنگے غبارے تھے۔ خریدار بچے ارد گرد جمع تھے۔

"کیا بات ہے، آپ کھا نہیں رہے۔" علیزا نے ادا سے پوچھا۔ "کیا اچھا نہیں لگا؟"

"اچھا تو ہے..... لیکن ذرا ٹھہر کے کھاؤں گا۔"

"کیا بات ہے۔ آپ چپ سے ہو گئے ہیں۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"کوئی خاص بات نہیں..... بس سوچ رہا تھا کہ کل آپ تو چلی جائیں گی، میں اکیلا یہاں گھوم رہا ہوں گا۔ اس وقت گھومنا کیسا لگے گا۔"

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ تب اس نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور اس کی پیشانی پر مسکراہٹ چمکی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو برا لگا ہے۔"

"کیا برا لگا ہے؟" ہادی کا دل دھڑک اٹھا۔

"یہی جو میں نے آپ کو فوٹو بنانے سے منع کر دیا۔"

ہادی نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور دور پانی پر ڈولتی خوش رنگ کشتیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "برا نہ مانیے گا، مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی گرہ کٹ ہوں اور میرے ساتھ چلتے ہوئے آپ ہر وقت اپنی جیب پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"وہی جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ آپ کو اپنے بارے میں کچھ بھی بتانا پسند نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ نہیں ایک پہیلی کے ساتھ چل پھر رہا ہوں اور یہ پہیلی میرے ذہن کو ہر وقت تناؤ میں رکھ رہی ہے۔"

اس نے ہونٹ سکیڑے۔ "تو آپ میرے ساتھ نہیں ایک "تناؤ" کے ساتھ گھوم پھر رہے ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"تو پھر اس تناؤ کا کیا حل ہو؟" اس کا لہجہ اب سپاٹ تھا۔

"جوں جوں وقت گزرے گا یہ تناؤ بڑھتا جائے گا۔ بہتر ہے کہ اسے مزید نہ بڑھایا جائے۔ اگر آپ، آج اکیلے گھومنا پھرنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

اس نے غور سے ہادی کو دیکھا۔ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے ہادی صاحب اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔"

ہادی کے سینے پر گھونسا سا لگا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے یہ "خوب صورت ساتھ" اب آناً فاناً چھوڑنا پڑے گا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اور آپ؟"

"میں ابھی یہیں رکوں گی۔ اسی پُل پر..... یہاں چھاؤں ہے، اور ہوا بھی آ رہی ہے۔" اس کا لہجہ اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ "ٹھیک ہے میم، بہت مشکور ہوں کہ آپ نے کچھ اچھا وقت گزارنے کا موقع دیا اور مجھے یہاں گائیڈ بھی کیا....."

اگر ہادی کا خیال تھا کہ وہ کچھ بولے گی تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ بس سر ہلا کر رہ گئی۔ چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ہادی نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے جھلایا، کیمرا اٹھایا، دو تین مزید رسمی کلمات ادا کیے اور چل پڑا۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے آواز دے گی، بلائے گی۔ لیکن اس نے آواز نہیں دی۔ وہ چلتا آیا۔ پندرہ بیس قدم آگے گیا تھا کہ اس کے کان کے پاس ایک زوردار دھماکا ہوا۔ وہ بدک کر رہ گیا..... بلکہ ایک خوانچا فروش پر گرتے گرتے بچا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ علیزا تھی۔ اس کے ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ایک پھٹا ہوا سرخ غبارہ تھا۔ اسی غبارے کی آواز نے ہادی کو سرتاپا دہلا یا تھا۔ علیزا اب ہنس ہنس کر دُہری ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے تھے۔ چہرہ سرخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کھڑے تماشائی بھی علیزا کی اس شرارت پر مسکرا رہے تھے۔ شاید ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ علیزا کی شرارت کے جواب میں اب وہ بھی کوئی شرارت کرے گا۔ مگر ہادی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

ہادی کا شولڈر بیگ کندھے سے کھسک کر گر گیا تھا۔ ہادی نے اسے دوبارہ کندھے پر ٹکایا۔ ہنس ہنس کر علیزا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اب وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ویری ساری، آئی ایم رئیلی ویری ساری ہادی صاحب۔ خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ..... کہ غبارے سے اتنی زور کی آواز نکلے گی۔“

پھٹے ہوئے غبارے سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی بڑا تھا۔ علیزا نے اسے اپنی ہیئر پن کے ذریعے پھاڑا تھا۔ ہیئر پن بھی ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر لجاجت سے ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ انداز ایسا تھا کہ ہادی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بولا۔ ”میں نے صحیح کہا تھا کہ آپ ایک ”پہیلی لڑکی“ ہیں۔“

”میں شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..... پتا نہیں کیوں..... مجھے ایک دم آپ پر بہت غصہ آ گیا تھا۔ بہرحال میں ایک بار پھر غیر مشروط معافی چاہتی ہوں۔“

ہادی جب بدکا تو لڑکھڑا کر خوانچا فروش سے ٹکرایا تھا۔ اس کی ٹیلی اسکوپ کا ایک ڈھکنا بھی اتر کر نجانے کہاں گر گیا تھا۔ علیزا نے یہ ڈھکنا ڈھونڈنے میں ہادی کی مدد کی اور پھر خوانچا فروش کی ایک چوبی چوکی کے نیچے سے ڈھکنا ڈھونڈ نکالا۔ وہ دونوں قریب ہی ایک پل کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ علیزا بار بار اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتی تھی..... اس دوران میں اس نے ایک دو بار پھر معذرت کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ آخر ہادی نے لمبی سانس لے کر کہا۔

”معذرت کا عملی مظاہرہ تو آپ اس طرح کر سکتی ہیں کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ کس ستارے سے تشریف لائی ہیں آپ؟ کیا چیز ہیں اور کیونکر ہیں؟“

”اس سے آپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑنے والا۔“ وہ اپنی کلائی کے چمکیلے بینگل کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔

”لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کو پڑ جائے۔ میرا کوئی ناچیز مشورہ یا تجویز آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہو جائے۔“

”تو آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ واقعی میرے کوئی مسئلے مسائل ہیں؟“

”بس میری چھٹی حس کہتی ہے کہ..... آپ کے ساتھ کچھ انوکھا ضرور ہے اور آپ جو اس طرح اکیلی شہر میں گھوم رہی ہیں تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ..... کوئی الجھن ہے۔“

”آپ سیدھی طرح نفسیاتی الجھن کیوں نہیں کہتے۔ کوئی ذہنی صحت کا مسئلہ۔“ وہ مسکرائی۔

”میں یہ جسارت نہیں کر سکتا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے جو حرکت فرمائی ہے تو اس کے بعد تو یہ کہا بھی جا سکتا ہے۔“ ہادی نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا اور مسکرانے لگا۔

”دراصل مجھے بہت غصہ آیا تھا جب آپ اس طرح اچانک منہ پھیر کر چل پڑے تھے۔“

”مجھے بھی بہت آیا تھا، جب آپ نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔“

”چلیں، دونوں اپنا اپنا غصہ تھوک دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کس کا غصہ زیادہ دور جا کر گرتا ہے۔“ اس نے کہا اور دونوں بے ساختہ ہنس دیے۔

کچھ دیر بعد ہادی دوبارہ اصل موضوع پر آ گیا۔

”پھر کچھ بتائیں گی آپ؟“

”چلیں..... ٹھیک ہے..... اگر آپ کا اصرار ہے تو لیکن کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔ یہاں تو شور ہے..... اور دیکھیے، بہت سے لوگ بھی تاڑ رہے ہیں۔ وہ سامنے غبارے والا بھی انتظار کر رہا ہے کہ شاید اس کا ایک اور غبارہ بک جائے۔“

دونوں مسکرا دیے۔ ہادی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”او کے..... تو پھر گھوم پھر لیں تھوڑا سا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”لیکن میں بتاؤں گی تو پھر آپ کو بھی اپنے بارے میں بتانا پڑے گا۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔“ ہادی نے کہا۔

وہ دونوں ایک بار پھر خوشگوار ہوا کے جھونکوں کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ تفریحی موڈ میں تھے۔ علیزا میں وہ کھلنڈرا پن ایک بار پھر لوٹ آیا تھا جس کا تجربہ ہادی نے کل رات کیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ریالٹو کے

ایک دوست نے کہا تھا کہ اگر وینس جا کر اس نے ریالٹو اور مارکو وغیرہ نہ دیکھے تو سمجھو کہ آدھا وینس Miss کر دیا۔ یہ واقعی دلکش جگہ تھی۔ گنجان علاقے سے گزرتے ہوئے ایک دم کشادگی کا احساس ہوا۔ ایک بہت بڑا قدیم پُل جسے ''ریالٹو برج'' کے نام سے جانا جاتا تھا، ان کے سامنے تھا۔ اس کے نیچے سے شاید وینس کی سب سے بڑی شاہراہ گزرتی تھی۔ لیکن یہ تارکول کی نہیں پانی کی سڑک تھی۔ اس پر ACTV کی بڑی بڑی آبی بسیں چل رہی تھیں اور ہر طرح کا ٹریفک رواں تھا۔ اس شاہراہ کے دونوں کناروں پر وینس کی قدیم عمارتوں کا نظارہ دیدہ زیب تھا۔ سیاح یہاں ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سیکڑوں لوگ مسلسل تصویر کشی اور وڈیوز وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔ دھوپ تھی اور آبی بخارات کی وجہ سے گرمی بھی کچھ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک شاپنگ مال میں گھس گئے اور ونڈو شاپنگ کرنے لگے۔ علیزا نے اپنے لیے ایک خوب صورت اطالوی ہیٹ خریدا۔ یہاں چیزیں مہنگی لیکن کوالٹی میں بہتر تھیں۔ ہادی کو ایک پارکر قلم بہت پسند آیا۔ یہ دراصل ایک فونٹین پین اور ایک بال پوائنٹ کا Set تھا مگر قیمت ہوشربا تھی۔ وہ چھوٹی موٹی چیزیں خریدتے آگے بڑھ گئے۔ ان میں کی رنگ، کچھ دستی پنکھے تھے اور اسی طرح کے دیگر سوونیئرز تھے۔ پنکھے بڑے دیدہ زیب تھے۔ علیزا نے خوش رنگ ہیٹ پہن کر دستی پنکھا اپنے چہرے کے سامنے ہلایا اور بولی۔ ''میں خود کو ایک دم میڈان چائنا محسوس کر رہی ہوں۔''

''آپ کے محسوس کرنے سے کیا ہوگا۔ آپ ایسی ہیں نہیں۔''

ان تعریفی کلمات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا۔ غالباً اس موضوع کو مزید طول دینا نہیں چاہتی تھی۔

بازار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ تھک گئے تھے۔ ایک جگہ پتھریلے بینچ پڑے نظر آئے۔ یہاں چھاؤں بھی تھی۔ وہ بیٹھ گئے اور آئس کریم کھانے لگے۔ اچانک علیزا کو یاد آیا کہ اسے اپنی ایک بھانجی کے لیے ایک خاص طرح کا دستی پنکھا لینا ہے..... وہ اٹھ کر دوبارہ شاپنگ مال کی طرف چلی گئی۔ ہادی وہیں بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اس بازار کو دیکھ کر اسے ''انارکلی'' جیسے پاکستانی بازار یاد آ گئے، جو ہر قسم کے سامان سے بھرے رہتے ہیں۔ دکانوں کے آگے اسٹال اور اسٹالوں سے آگے ٹھیلے۔ شاپنگ مال کی علیزا کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کی چھتری، کیمرا اور شاپنگ والا لفافہ بھی ہادی کے پاس ہی پڑا تھا۔ ''کہاں چلی گئی؟'' ہادی نے سوچا۔

چار پانچ منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد وہ اشیا سمیت اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس شاپنگ مال کی طرف بڑھا۔ ایک دستی پنکھے کے لیے اس نے اتنی دیر لگا دی تھی۔ ابھی وہ پندرہ بیس قدم ہی چلا تھا کہ اس کی نگاہ علیزا پر پڑ گئی۔ وہ بازار کے موڑ پر موجود تھی۔ شاپنگ پلازا کے ایک گول ستون کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس اس کی ایک ہم عمر لڑکی تھی۔ لڑکی نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ درمیانی شکل وصورت کی تھی بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ قبول صورت بھی کہی جا سکتی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی کھڑی لمبی ناک تھی۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ علیزا نے دو تین بار تیزی سے انکار میں سر ہلایا۔ پھر لمبی ناک والی لڑکی نے اپنے شولڈر بیگ میں سے کوئی چیز نکالی اور علیزا کو تھما دی۔ یہ کوئی کاغذ تھا۔ علیزا نے اسے احتیاط سے اپنے بیگ کے اندرونی خانے میں رکھ لیا۔

علیزا کافی جلدی میں لگتی تھی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اب اسے خدا حافظ کہہ کر واپس آنے والی ہے۔ ہادی بھی واپس مڑا اور پتھریلے بینچوں کی طرف چلا آیا۔ پاس ہی ڈیکوریشن پیسز کی ایک شاندار دکان تھی۔ وہ اس کے ''ڈسپلے'' میں جھانکنے لگا۔

اسی دوران میں علیزا واپس آ گئی۔ ''ہیلو ہادی صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں؟''

ہادی نے چونکنے کی اداکاری کی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بھئی بڑی دیر کر دی آپ نے۔ دستی پنکھا خریدنا تھا یا ایئر کنڈیشنر؟''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''خریدا تو پنکھا ہی ہے لیکن جیسا چاہتی تھی ویسا نہیں ملا۔'' اس نے چائنیز طرز کا ایک ٹیکنی کلر پنکھا ہادی کو دکھایا۔

''آپ خواتین کی ہمت ہے بھئی، بازاروں میں تھکن سے بے ہوش ہو جاتی ہیں لیکن ہوش میں آنے کے بعد پھر گشت شروع کر دیتی ہیں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لڑکی کا ذکر بھی نہیں کیا جس سے وہ ابھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کچھ الجھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ہادی نے بھی کریدنا

مناسب نہیں سمجھا۔

وہ دونوں ریالٹو کی بارونق وسعت میں گھومنے لگے۔ وہ ایک بڑی سی قدیم بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ یہ انگریزوں کے زمانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں ریالٹو کی تاریخ بہ زبان انگلش دیواروں پر کندہ تھی۔ وہ گھومتے رہے اور مختلف آثار دیکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ تھوڑی بہت گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ علیزا روم میں (جسے وہ روما کہہ رہی تھی) شمالی جانب Cassia نامی کسی علاقے میں رہتی ہے۔ ہادی نے تفصیل پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تفصیل سے بات کرنے کا وعدہ تو علیزا خود ہی کر چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر لنچ کریں گے اور باتیں بھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں، کسی وقت ہادی کو لگتا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے جیسے سوچتی ہو کہ وعدہ ایفا کرے یا نہیں۔ یہاں پاس ہی کہیں تاریخی نوعیت کی مچھلی مارکیٹ بھی تھی۔ شور وغیرہ تو سنائی دے رہا تھا اور مچھلیوں کی باس بھی محسوس ہوتی تھی مگر مارکیٹ نظر نہیں آئی۔ وہ وینس کے قدیم و پرکشش گلی کوچوں میں گھومتے رہے..... چکراتے رہے اور پھر ''مارکو'' کی طرف نکل آئے۔ اس قدیم عبادت گاہ کی کشش نے علیزا کی ساری توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ وہ اس عمارت کا دیدار کر رہی تھی اور ہادی چپکے چپکے اس کا۔ وہ کسی بچے کی سی بے مہار ترنگ کے ساتھ ان در و دیوار میں کھو گئی تھی۔ ہادی کا دل چاہا کہ وہ چپکے سے اس کی ایک تصویر اتار لے۔ اس نے اپنے گلے میں آویزاں کیمرے کا رخ غیر محسوس طور پر علیزا کی طرف کیا اور بٹن دبا دیا۔ فلیش آن نہیں تھا، اس لیے علیزا کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔ بہرحال یہ ایک رسک تھا۔ علیزا کو پتا چل جاتا تو خبر نہیں کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ ہادی کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ تصویر کیسی آئی ہوگی اور..... آئی بھی ہوگی یا نہیں لیکن وہ دوبارہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا.....

علیزا نے کہا۔ ''آپ کو پتا ہے، اس جگہ کا پورا نام کیا ہے؟'' ہادی نے نفی میں سر ہلایا، وہ بولی۔ ''Besilica of San Marko''..... اور یہ جو سامنے چرچ نظر آ رہا ہے نا..... اس کی تعمیر 828ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر کی کہانی بھی بڑی مزیدار ہے۔ آپ نے سنی ہوئی ہے؟''

''نہیں۔''

''اُف۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر وینس میں گھوم رہے ہیں۔ بندۂ خدا جس شہر کی سیاحت فرمانی ہو پہلے اس کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھنا چاہیے۔''

''آئندہ خیال رکھوں گا میم۔'' ہادی نے کہا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتا تھا کہ آنکھوں پر پٹی تو آپ کی وجہ سے بندھ گئی ہے محترمہ۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ ''مارک نام کے بہت بڑے عیسائی بزرگ تھے۔ روایت کے مطابق وہ اسکندریہ میں رہتے تھے۔ ایک فرشتے نے سینٹ مارک کو بتایا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی آخری آرام گاہ وینس نام کے ایک شہر میں ہوگی جس میں ہر طرف نہریں بہتی ہوں گی۔ حالانکہ اس وقت وینس شہر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ صدیوں بعد جب وینس نے ایک بھرے پرے شہر کا روپ دھارا تو وہاں کے باسیوں کو سینٹ مارک کی پیش گوئی یاد آئی۔ انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ سینٹ مارک کے جسد خاکی کو اسکندریہ یعنی مصر سے لا کر وینس میں دفن کریں گے۔ وینس کے کچھ تاجروں نے یہ خطرہ مول لیا اور سینٹ کی لاش کو اسکندریہ سے اسمگل کر کے وینس پہنچا دیا..... تب یہاں یہ شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا اور دوسری عمارات بنائی گئیں.....''

شاندار گنبدوں اور دروازوں والی یہ عمارت ہادی کو بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے داخلی دروازے پر چار بہت بڑے گھوڑوں کے کلاسیکل مجسمے نصب تھے۔ مگر ان سارے مناظر سے زیادہ دلچسپی ہادی کو اس بات میں تھی کہ وہ جلد از جلد کہیں بیٹھ کر لنچ کریں اور علیزا اسے اپنے بارے میں کچھ بتائے۔

اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہادی کی گھڑی ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہادی کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک یقیناً علیزا کو بھی لگی ہوگی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جلدی کھانا نہیں چاہتی۔ یا پھر وہی تذبذب والی بات تھی۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ ہادی کو اپنے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ ہادی غور سے دیکھتا تھا تو یہ کشمکش اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھی۔

آخر ایک ریسٹورنٹ پر دونوں کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ علیزا بولی۔ ''چلیں پھر یہیں بیٹھتے ہیں۔''

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ ایک پیزا شاپ تھی۔ اٹلی کا پیزا پوری دنیا میں مشہور ہے لیکن علیزا اور ہادی کے سامنے حلال و حرام کا مسئلہ بھی تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس عام سی بنگلا دیشی پیزا شاپ میں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ پیزا یہاں آرڈر پر تیار کیا جاتا تھا۔ آرڈر دینے کے بعد وہ دونوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

میز کے مقابل کناروں پر خاموش بیٹھ گئے۔ علیزا کی اندرونی کشمکش اس وقت عروج پر نظر آتی تھی۔ ایک دو بار اس نے ہادی کی طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکالیں۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو حرکت دی مگر پھر ہونٹوں پر بس زبان پھیر کر رہ گئی۔

"ہاں جی۔ کچھ کہیے گا، یا پھر اسی طرح بس اسٹارٹ ہی لیتی رہیں گی؟"

"کیا کہوں؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ منمنائی۔

"جو بھی آپ کے دل میں آئے اور جو آپ اپنی خوشی سے بتاسکیں۔"

"چلیں..... پہلے آپ بتائیں۔" وہ خشک گلے کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں بتادیتا ہوں۔ پوچھیں آپ کیا جاننا چاہتی ہیں؟ لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے آپ تھوڑا سا کچھ پی لیں.....؟"

"بس..... سادہ پانی پلادیجیے۔"

پیاس تو ہادی کو بھی لگ رہی تھی اور سادے پانی کو ہی دل چاہ رہا تھا۔ اس نے ویٹر کو آواز دی مگر حسب اندیشہ ان لوگوں کے پاس صرف کوک اور لائم جوس وغیرہ تھے۔ سامنے سڑک کے پار ایک اسٹور نظر آرہا تھا۔ وہاں منرل واٹر کی بوتلیں موجود تھیں۔ "ابھی آیا۔" ہادی نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

سڑک پار کرکے وہ جنرل اسٹور تک پہنچا۔ منرل واٹر کی دو بوتلیں لیں، دو جوس لیے اور لہسن کی چٹنی جو پیزا کے ساتھ بہت اچھی لگتی تھی۔ جب وہ کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے لگا تو کیش مشین میں کچھ خرابی ہوگئی۔ مشین کے ٹھیک ہونے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ ہادی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کاؤنٹر پر اس کا نمبر چوتھا تھا۔ ادائیگی کرکے اور سڑک پار کرکے وہ پیزا شاپ میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ علیزا میز پر نہیں تھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ شاید واش روم تک گئی ہوگی..... مگر جب دھیان سے دیکھا تو اس کے سینے میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ علیزا کا شولڈر بیگ جو میز پر رکھا تھا وہاں نہیں تھا۔ نہ ہی کیمرا، نہ ہی وہ شاپرز جن میں اس کی شاپنگ موجود تھی۔ فقط ہادی والا شولڈر بیگ اور شاپر ایک خالی کرسی پر موجود تھے۔ "تو وہ چلی گئی؟" یہ خیال ایک زہریلے تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ وہ تیزی سے مڑا۔ پیزا شاپ سے باہر آیا۔ فٹ پاتھ پر دائیں بائیں دور تک دیکھا۔ قریبی دکانوں کے اندر جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ تب وہ دوبارہ پیزا شاپ کی طرف پلٹ آیا۔ دل میں امید تھی کہ شاید وہ دوبارہ میز پر موجود ہو اور مسکراتے ہوئے کہے..... سامنے گفٹ شاپ تک گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ وہ شاید جا چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ ہادی کو شدید تذبذب میں دکھائی دی تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ ایک قریبی دوست کی طرح سب کچھ ہادی کے گوش گزار کردے گی، کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نہیں بتائے گی اور یونہی پہلو بدلتی رہے گی۔ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتی رہے گی۔ پہلا امکان درست ثابت ہوا تھا۔ اسے موقع ملا اور وہ اچانک چلی گئی۔

ہادی قریباً ایک گھنٹے تک وہیں بیٹھا رہا۔ بڑے سائز کا انا لین پیزا آگیا جس پر "موسلی" کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں لہسن کی چٹنی بھی موجود تھی مگر اب ہادی کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے چند لقمے لیے اور بل ادا کرکے باہر آگیا۔ اب بھی امید کی موہوم کرن باقی تھی۔ شاید وہ لمبی ناک والی دراز قد فرینڈ اسے پھر مل گئی ہو اور وہ اس کے ساتھ فوراً کہیں جانے پر مجبور ہوگئی ہو۔ ہوسکتا ہے وہ دوبارہ یہاں آئے۔ پیزا شاپ سے نکلنے کے باوجود وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا اور دکانوں میں جھانکتا رہا..... شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ چرچ کے کلس اب نئے زاویے سے دمک رہے تھے۔ سورج کی ترچھی کرنیں وینس کی آبی شاہراہوں پر اشرفیاں سی بکھیر رہی تھیں۔

ہادی تھکے تھکے قدموں سے واپس روانہ ہوا۔ رات 8 بجے تک وہ اپنے کیمپ میں واپس پہنچ چکا تھا۔ وہ خیمے کی چٹائی پر چت لیٹ گیا اور علیزا کی اس عجیب حرکت پر غور کرنے لگا۔ اسے علیزا سے ایسی بدعہدی اور کج روی کی توقع نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی تو بھی صاف لفظوں میں ہادی سے کہہ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ اچھے طریقے سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ پاتے۔ انجانی چیزوں کے حوالے سے انسان زیادہ کشش محسوس کرتا ہے۔ علیزا بھی ایک انجان ہستی کے طور پر اس کے سامنے آئی تھی لیکن عین اس موقع پر جب وہ انجان سے شناسا بننے والی تھی، اسے اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھی، وینس نے اسے "ہڑپ" کرلیا تھا۔ وہ وینس کی ہزار ہا روشن اور نیم تاریک گلیوں اور آبی گزرگاہوں میں گم ہوگئی تھی۔ اب وہ اسے کیسے

دو جوڑے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ ایک ادھیڑ عمر اطالوی خاتون اپنے ننھے منے کتے کے ساتھ خراماں خراماں چلی جارہی تھی۔

ہادی نے در کا پردہ پھر گرادیا۔ کچھ دیر بعد وہ واش رومز کی طرف چلا گیا۔ فریش ہوکر واپس آیا۔ ناشتا کیا۔ کپڑے بدلے۔ اس دوران میں اس کی نگاہیں مسلسل علیزا کی منتظر رہیں۔ ٹورسٹ اب سیر سپاٹے کے لیے کیمپ سے نکلنا شروع ہوگئے تھے لیکن وہ خیمے میں ہی جما بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے..... بارہ بجے اور پھر ایک بج گیا۔ وہ نہیں آئی۔ ہادی کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ اگر اسے واقعی آج روم کے لیے نکلنا تھا تو پھر وہ اتنی دیر نہیں کرسکتی تھی۔ وہ نکل چکی تھی۔

اس نے ایک بار پھر بیگ میں سے پارکر کی خوب صورت ڈبیا نکالی۔ اسے محبت سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایک دم کیوں چلی گئی؟ اور اگر جانا ہی تھا تو پھر جاتے جاتے یہ امید کا دم چھلا کیوں چھوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے پرسوں رات اور کل کے سیر سپاٹے کا حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہو۔ گھومنے پھرنے کے دوران میں اکثر موقعوں پر ہادی نے ہی ادائیگی کی تھی اور علیزا کے اصرار کے باوجود اسے پرس کھولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

ہادی کے سینے میں مایوسی کی ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے بے دلی سے کینچ کیا۔ اپنی کلائی کی پٹی ایک فرنچ خاتون کی مدد سے بدلی۔ تھوڑے سے کالے انگور کھائے اور خیمے کے اندر ہی لیٹ گیا۔

اچانک اسے اپنی وہ حرکت یاد آئی جو اس نے کل علیزا کی بے خبری میں کی تھی۔ اس نے جلدی سے کیمرا نکالا۔ اسے آن کیا اور ڈیلیٹ، پر کل والی تصویریں دیکھنے لگا۔ جلد ہی وہ تصویر اسے مل گئی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ تصویر بہت اچھی تو نہیں تھی مگر علیزا کا سائڈ پوز واضح تھا۔ اس کا دلکش جسم کمان کی طرح خم کھائے ہوئے تھا۔ وہ چرچ کی ایک دیوار پر جھکی ہوئی تھی اور اس پر کندہ آرٹ ورک دیکھ رہی تھی۔ جھکنے سے اس کی روشن پیشانی کچھ اور بھی تمتماتی ہوئی نظر آتی تھی۔ وہ بالکل محو تھی۔

ہادی دیر تک تصویر کو کیمرے کی اسکرین پر چھوٹا اور بڑا کرکے دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں کیمپ کے داخلی راستے کی طرف بھی اٹھ رہی تھیں۔ وہ اسی گومگو کی

اور بال پوائنٹ نکالا۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کے ملائم لمس کو محسوس کیا۔ علیزا کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کی نگاہوں میں چمکا۔ اس کے دل میں امید جاگی کہ وہ پھر آئے گی۔ وہ اس خیمے کو ایک بار پھر رونق بخشے گی۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھولیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک انگڑائی لی اور آنکھیں موندلیں۔

اگلی صبح وہ زیادہ دیر تک نہیں سویا۔ اس نے آنکھ کھولی تو گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجے کا وقت بتارہی تھیں۔ سورج کی روپہلی کرنیں، درختوں میں سے چھن چھن کر رنگ برنگے خیموں تک پہنچ رہی تھیں۔ علیزا نے اسے بتایا تھا کہ کل یعنی آج اسے روم واپس چلے جانا ہے۔ مگر وقت کا نہیں بتایا تھا۔ ہادی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار ضرور یہاں آئے گی۔ عین ممکن تھا کہ صبح سویرے ہی پہنچ جاتی۔ پچھلی دفعہ جب وہ خیمے سے نکلا تھا تو وہ اچانک ایک طرف سے برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہادی کو ڈرا دیا تھا۔ اسی امید کے تحت ہادی نے خیمے کے در کی ڈوری کھولی اور گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ جاگنگ کرتے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیفیت میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ شام کے سائے طویل ہونے لگے۔ وہ نہیں آئی۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر بارہ بجے تک بھی ہادی اپنے خیمے کے آس پاس ہی رہا، پھر اسے یقین ہونے لگا کہ اب وہ نہیں آئے گی۔ اسے خود پر جھلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کیوں بے وقوفوں کی طرح بار بار اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ ''گوٹو ہیل'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے جوگر پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اب اس کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وینس میں کچھ اچھا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں جب وہ اپنے خیمے سے روانہ ہونے لگا تو اس نے ساتھ والے خیمے میں موجود فرنچ خاتون سے رابطہ کیا اور انگلش میں اس سے کہا۔ ''اگر کوئی لڑکی مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور آپ یہاں موجود ہوں تو اسے میرا یہ سیل نمبر دے دیجیے گا.....'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک چٹ فرنچ خاتون کی طرف بڑھادی۔

یہ وہی خاتون تھی جس نے کلائی کی پٹی بدلنے میں ہادی کی مدد کی تھی۔ وہ اپنے بھائی بہن کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''میں نے پرسوں دیکھا تھا، آپ کی فرینڈ بڑی پیاری ہے۔''

''شکریہ۔'' ہادی نے کہا اور کیمپ سے نکل کھڑا ہوا۔

آج ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے تھے۔ وہ چلتا رہا اور تصویریں لیتا رہا۔ پھر وہ آبی بس پر بیٹھ کر ریالٹو کی طرف آگیا۔ لیکن آج ریالٹو اسے نسبتاً اداس اور کم دلچسپ محسوس ہوا۔ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ چھوٹی موٹی خریداری کرتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں، وہ نہ چاہتے ہوئے بھی علیزا کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے دل میں امید ہے کہ شاید وہ اسے کہیں گھومتے پھرتے نظر آجائے۔ پہیلیاں ہمیشہ انسان کو الجھاتی ہیں۔ ان کے جواب نہ ملیں تو وہ اکثر ذہن سے چمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ سوچنے لگا، کتنا اچھا ہوتا کہ کل وہ پانی کی بوتلیں لینے کے لیے سڑک کے پار نہ جاتا۔ ویٹر سے ہی کچھ منگوالیتا۔ ہوسکتا تھا کہ اظہار کے وہ لمحے اس طرح گم نہ ہوتے اور علیزا اپنے تذبذب میں سے نکل کر اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیتی۔

وہ ایک دم ٹھٹکا۔ وہ اس جگہ کے پاس تھا جہاں کل دوپہر اس نے علیزا کو ایک لمبی ناک والی لڑکی سے بات کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں اس گول ستون کے پیچھے کھڑی تھیں۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ چند کبوتر فرش پر چونچیں مار رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل علیزا کے اچانک چلے جانے کی وجہ وہی لڑکی ہو۔ وہ دوبارہ آئی ہو۔ اس نے علیزا کو کوئی ایسی اطلاع دی ہو کہ اسے اچانک وہاں سے نکلنا پڑ گیا ہو۔ بے شمار امکانات تھے۔ بہرحال یہ بات تو طے تھی کہ علیزا اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس نے ہادی کے شولڈر بیگ میں پارکر پین والی ڈبیا ڈالی تھی۔ اپنا سامان اٹھایا تھا اور ہادی کے لوٹنے سے پہلے نکل گئی تھی۔

گزرتے گزرتے ہادی نے اس پیزا شاپ میں بھی جھانکا جہاں اس نے کل آخری بار علیزا کو دیکھا تھا۔ پھر وہ سیدھا نکلتا چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ وینس کی معروف سیرگاہ Doge,s palace میں تھا۔ یہ قدیم عمارت اپنے اندر ایک خاص قسم کی شان اور دبدبہ رکھتی تھی۔ ہادی نے سنا تھا کہ جب پرانے زمانے میں بحری جہاز وینس کے ساحل کی طرف آتے تھے تو مسافروں کو سب سے پہلے اسی شاندار پیلس کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ اس قلعہ نما محل کے دالانوں، راہداریوں اور چیمبرز میں گھومتا رہا۔ آرٹ ورک کے نادر نمونے اور پینٹنگز دیکھتا رہا۔ دل کے کسی بہت گہرے گوشے میں شاید یہ خیال بھی موجود تھا کہ ہوسکتا ہے اسی طرح چلتے پھرتے کہیں وہ مہ جبیں بھی نظر آجائے۔

شام تک آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ تھکا ہارا اسٹی سینٹر کی طرف آگیا۔ ایک سوڈانی ہوٹل سے رات کا کھانا کھایا اور کیمپ واپس آگیا۔

اگلے دو تین دن ہادی نے عجیب سی کیفیت میں گزارے۔ وہ اس پُر بہار شہر سے بیزار سا ہوگیا تھا۔ اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود اب وینس اسے زیادہ کشش نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل جگہ بدلنے کو چاہ رہا تھا اور جگہ عظیم الشان روما یعنی روم کے علاوہ اور کیا ہوسکتی تھی۔ عجائبات کے اس پرشکوہ شہر کو دیکھنے کی خواہش ہمیشہ ہادی کے دل میں رہی تھی اور اب تو اس شہر کو دیکھنے کی ایک اور ''وجہ'' بھی پیدا ہوچکی تھی۔

وینس چھوڑنے سے ایک دن پہلے وہ یونہی گھومتا پھرتا اور ACTV کی بس پر سفر کرتا اس بستی کی طرف نکل گیا جہاں وہ ایک رات علیزا کے ساتھ آیا تھا۔ مصیبت زدہ بنگلا دیشی لڑکی انیسہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ اسے اس کی فرینڈ کے گھر چھوڑ کر گئے تھے۔ آج پھر ہادی نے اس سہ منزلہ مکان کی درمیانی ڈور بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد کھڑکی میں اسی

کو پہچان کر نیچے چلی آئی۔ وہ آج بھی ایک ہلکی پھلکی ساڑی میں تھی۔ رسمی کلمات کے بعد ہادی نے اس سے پوچھا۔

''انیسہ کا شوہر اسے لے گیا؟''

لڑکی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ہندی لب و لہجے میں بولی۔ ''وہ فلورنس سے واپس آچکا ہے لیکن ابھی تک یہاں نہیں آیا۔ فی الحال اپنی والدہ کی سائڈ لے رہا ہے اور انیسہ سے کہہ رہا ہے کہ وہ خود ہی واپس آئے۔ لیکن.....'' وہ چپ ہوگئی۔

''لیکن کیا؟'' ہادی نے پوچھا۔

''ٹیلی فون پر بات چیت ہو رہی ہے۔ دوش تو صاف طور پر انیسہ کی ساس ہی کا ہے۔ اب وہ کہہ رہی ہیں کہ انیسہ نے بھی ان پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکتی ہوں کہ انیسہ ایسا نہیں کرسکتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔''

''انیسہ کا شوہر اس بارے میں کیا کہتا ہے؟''

''من تو اس کا بھی یہی کہتا ہے کہ انیسہ نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ سلجھنے کی آشا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو روز میں وہ آکر انیسہ کو لے جائے۔''

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''علیزا تو دوبارہ یہاں نہیں آئی؟''

''علیزا..... وہی لڑکی جو اس رات آپ کے ساتھ تھی؟'' ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''نہیں وہ تو نہیں آئی لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں..... بس وہ ایک دو دن سے رابطے میں نہیں تھی۔'' ہادی نے گول مول سا جواب دیا اور پھر چند رسمی کلمات کے بعد اس انڈین لڑکی سے رخصت ہوکر واپس آگیا۔ اگلے روز وہ بذریعہ ٹرین قریباً نو گھنٹے کا سفر کر کے روم جانے کے لیے تیار ہوچکا تھا۔

☆☆☆

روم حدِ نگاہ تک ہادی کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یہ بہت وسیع رقبے پر بسا ہوا شہر تھا۔ سات رنگوں سے سجا ہوا اور دنیا بھر کے سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز۔ ہادی نے اس شہر کو دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ یہاں ایک صاف ستھرے ہوٹل ڈولوے میں قیام پذیر تھا۔ علاقہ تھا ''پرائی'' یہ روم سینٹرم میں واقع تھا۔ ہادی کو آسانی سے من پسند سواری مل جاتی تھی اور وہ ہر طرف سفر کرنے کے قابل تھا۔

دو تین دن میں اس نے گھوم گھوم کر اپنے پاؤں پر ورم کرلیا۔ اسے لگا کہ اگر روم کے کچھ علاقوں کو میوزیم سے

ملاقات کے آداب

☆ مسکراتے چہرے سے ملاقاتی کا استقبال کیجیے۔

☆ السلام علیکم سے ملاقات کا آغاز کیجیے۔ یہ بہت جامع الفاظ ہیں۔

☆ ملاقات کے لیے جاتے وقت صاف ستھرے کپڑے پہن کر جائیے لیکن وہ ایسے نہ ہوں کہ دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ کوشش کریں کہ ملنے سے پہلے وقت طے کرلیں۔

☆ بلا اطلاع بلا اجازت جانا مناسب نہیں۔

☆ ملاقات میں مطلب کی بات کریں موضوع ختم ہوجائے تو خوامخواہ نہ بیٹھے رہیں۔

☆ کسی سے ملنے جائیں تو تحفہ ساتھ لے کر جائیں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔

☆ دوسروں کی بات زیادہ سنیے، خود کم بات کیجیے۔

☆ ایسے وقت کسی کے پاس نہ جائیں جو اس کے آرام کا وقت ہو۔

☆ گفتگو کے دوران دلچسپی ظاہر کریں تاکہ بیزاری نہ ہو۔

* * *

خوب صورت باتیں

☆ کبھی آپ دوسروں کے لیے دل سے دعا مانگ کر دیکھیں، آپ کو کبھی اپنے لیے دعا مانگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ اللہ کی ایک نہیں مانتے۔

☆ سوالی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ کیونکہ یہ اللہ کا آپ پر کرم ہے کہ اپنی مخلوق کو آپ کے دروازے پر بھیجتا ہے۔

☆ اگر تم موت کی رفتار دیکھ لیتے تو امید سے نفرت کرتے اور کبھی ان کو پورا کرنے میں مصروف نہ ہوتے۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تشبیہ دے دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں آثارِ قدیمہ اتنے پاس پاس ہوتے ہیں کہ سیاح کو پیدل چلنا ہی اچھا لگتا ہے..... اور جب وہ ایک بار پیدل چلتا ہے تو پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ پاؤں تھک جاتے ہیں لیکن آنکھیں نہیں تھکتیں۔

ہادی بھی بڑے اشتیاق سے روم کے طول و عرض میں گھوم رہا تھا۔ اسے مزہ آرہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ایک ''بونس'' کی طرح کا تھا کہ وہ سیلانی روح یعنی علیزا بھی اسی شہر میں کہیں رہتی ہے۔ انہی گلی کوچوں میں گھومتی ہے۔

تیسری رات جب وہ ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں انرجی ڈرنک کا ایک گلاس پینے کے بعد سگریٹ پھونک رہا تھا، پاکستان سے فون آیا۔ ایک والدہ اور بھائی کے سوا ہادی کا کوئی قریبی عزیز اس دنیا میں نہیں تھا اور یہ والدہ یا بھائی کا فون نہیں تھا۔ ان سے تو کل ہی لمبی بات ہوئی تھی۔ یہ اس کے ایک کلائنٹ کا فون تھا۔ وہی میوزک کمپنی کے ڈائریکٹر احتشام شیخ جنہیں وہ لوگ کبھی کبھی بے تکلفی اور پیار سے شیخو صاحب بھی کہتے تھے۔ احتشام شیخ کے ایڈوانس کی رقم چند ہفتے پہلے ہادی نے بہ مشکل انہیں واپس کی تھی اور البم کے لیے گانے لکھنے کے لیے فی الحال معذرت چاہی تھی۔ اب وہ پھر اصرار پر آمادہ تھے۔ فون نہ سنتا تو بداخلاقی ہوتی۔ ہادی نے بادلِ ناخواستہ فون ریسیو کیا۔ ''کیا حال ہے ہادی، کیسے ہو؟'' شیخو صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ٹھیک ہوں شیخو صاحب! لیکن اتنا نہیں جتنا آپ کو ضرورت ہے۔ ابھی کچھ بھی نہیں سوجھ رہا۔ دماغ بالکل خالی ہو رہا ہے، ایک دم پاکستانی سنیما گھروں کی طرح۔''

''یار! گولی مت دو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ لاہور والے مختار بھائی کے لیے کچھ لکھ رہے ہو تم۔''

''ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ جانتے ہی ہیں..... جو لکھوں گا پہلے آپ کے لیے ہوگا، پھر کسی اور کے لیے۔''

''یار! بھاؤ شاؤ بڑھانے کی بات ہے تو بتا دو۔''

''کانوں کو ہاتھ لگائیں شیخو صاحب! میں نے آج تک ایسی بات کی ہے آپ سے۔ ہمیشہ سب کچھ آپ پر ہی چھوڑا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

''آئندہ تو تب ہوگا نا جب لکھو گے۔ مجھے تو لگتا ہے تم نے ویسے ہی دکان بڑھا دی ہے۔ اب خوامخواہ نخرے اٹھوا رہے ہو اور مزے لے رہے ہو۔''

''اگر آپ واقعی اس طرح سوچ رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہے۔''

حسبِ معمول شیخو صاحب نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بولے۔ ''تم مجھ سے لاڈ کر لیتے ہو، میں تم سے کر لیتا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم دوسروں سے ذرا مختلف ہو۔ بہرحال اپنا خیال رکھو۔ وہاں اٹلی میں کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے کال کرنا۔ خاص طور سے روم میں۔ وہاں اپنے ایک دو یار ہیں۔''

گفتگو ختم کر کے ہادی بستر پر چت لیٹ گیا۔ دونوں بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیے۔ وہ واقعی کچھ لکھ نہیں پا رہا تھا اور اس علیزا والے واقعے کے بعد سے تو بالکل بھی نہیں۔ وہ خالی خالی تھا۔

وسطی روم میں فروغِ اردو ادب کے نام سے ایک انجمن قائم تھی۔ بڑے بڑے نام اس انجمن سے وابستہ تھے۔ ان کے مقابلے میں ہادی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن ایک لحاظ سے حیثیت تھی بھی۔ وہ پاپولر شاعری کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس کے گیت سنتے اور سر دھنتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انجمن والوں نے اس کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ایک چھوٹے پیمانے کی تقریب تھی اور کسی ہوٹل کے بجائے ایک مقامی ممبر کے گھر میں ہونا تھی۔ یقیناً وہاں اس سے تازہ کلام سنائے جانے کی فرمائش بھی کی جانی تھی۔ لیکن کوئی تازہ چیز اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ وہ رات گئے تک کوشش کرتا رہا اور بہ مشکل چار پانچ دوہے لکھ پایا۔ ان کا معیار بھی بس گزارے لائق ہی تھا۔

تقریب آٹھ بجے شروع ہوئی۔ مقامی نثر نگار اور شاعر حضرات بھی موجود تھے۔ اردو ادب کے مقامی پرستاروں کی معقول تعداد بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہادی نے صرف پرانی چیزیں سنانے پر اکتفا کیا۔ تازہ لکھے ہوئے دوہے وہ کوشش کے باوجود نہیں سنا سکا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ سے اس کا نظریہ تھا کہ کمزور چیز منظرِ عام پر لانے سے بہتر ہے کہ اسے ردی میں پھینک دیا جائے اور اچھی چیز کا انتظار کیا جائے۔

پرانی چیزوں پر ہادی کو خاطر خواہ داد ملی تاہم اس حوالے سے شرکا کو تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی کہ ہادی نے کوئی نئی چیز سرے سے سنائی ہی نہیں۔ اس نے جو کچھ پڑھا، وہی تھا جو وہ پچھلے پانچ چھ سال سے ایسی نشستوں میں پڑھتا آیا تھا۔ یہ محفل موسم کی خرابی کے سبب مقررہ وقت سے ایک گھنٹا پہلے ہی اختتام پذیر ہو گئی۔

اگلے چار پانچ روز تک ہادی نے خوب ''روم گردی''

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ اکیلا ہی رہے۔ وہی ابن انشا کا قول۔ اکیلا سیاح..... سیاحت کی اصل روح سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ واقعی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاید مزید ہوتا اگر اس کے ذہن میں علیزا والا کانٹا نہ چبھا ہوتا۔ وہ گھومتے پھرتے، سڑکیں ناپتے اور مختلف عمارتوں کے اندر آتے جاتے جیسے لاشعوری طور پر علیزا کو بھی دیکھتا رہتا تھا۔ کسی لڑکی پر اسے علیزا کا شبہ ہوتا تو وہ اس شبے کو رفع کیے بغیر آگے نہ بڑھتا۔

ایک دن اس کے ذہن میں آیا کہ روم میں آوارہ گردی تو کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس علاقے میں کی جائے جہاں علیزا سے مڈبھیڑ ہونے کا چانس موجود ہے۔ وینس کے ایک بازار میں ہونے والی گفتگو کے دوران میں علیزا نے روانی میں اسے بتایا تھا کہ وہ شمالی روم میں Cassia کے علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ اب ہادی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ''کاسیا'' کا علاقہ کتنا بڑا ہے..... اور کیا وہاں گھومنے پھرنے سے سیاحت کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ اس طرح گھوم پھر کر وہ کچھ حاصل بھی کر پائے گا یا یہ بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے والی بات ہی ہوگی۔ پھر ایک اور سوال بھی اس کے ذہن میں ابھرتا تھا۔ بالفرض محال علیزا اسے مل بھی گئی تو وہ اس سے کہے گا کیا؟ وہ تو ابھی تک خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس سے چاہتا کیا ہے۔

اگلے روز ناشتے کے فوراً بعد ہادی زمین دوز ٹرین کے ذریعے ''کاسیا'' کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ جان کر اسے تسلی ہوئی کہ یہاں بھی گلی کوچوں میں قدیم آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے جتھے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یوں یہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔ تنگ سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ لیکن ان تنگ سڑکوں اور گلیوں میں ہی چلتے چلتے ''سیاح'' اچانک خود کو کسی عظیم الشان ''مونومنٹ'' کے سامنے پاتا تھا۔ ایک دو ایسے کوچوں میں بھی ہادی گیا جہاں گاڑی کا داخل ہونا بھی دشوار تھا لیکن ان کوچوں میں ایک دو عظیم الشان چرچوں کے دروازے موجود تھے۔ اندر داخل ہو کر بندہ دنگ رہ جاتا تھا۔ اگلے تین دن ہادی نے اس علاقے کی بھول بھلیوں میں گھومتے گزارے۔ اس کے پاس علیزا کی تصویر موجود تھی۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اس تصویر کا پرنٹ نکلوائے۔ اسے ہاتھ میں تھام لے اور ہر راہ گیر کو تصویر دکھا کر پوچھے۔ آپ نے اس اول جلول لڑکی کو دیکھا ہے۔ یہ وینس کے ایک بازار میں مجھے چکما

چوتھے دن تک وہ شمالی روم میں کاسیا کے علاقے میں گھوم گھوم کر تھک گیا۔ اب یہاں دیکھنے والی کوئی قابل ذکر چیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے کیمرے میں سیکڑوں تصویریں جمع ہو چکی تھیں۔ یہ امید بھی تقریباً دم توڑ گئی تھی کہ اس علاقے میں چلتے پھرتے کہیں اچانک ڈرامائی انداز میں علیزا کی صورت نظر آجائے گی۔ یہ واقعی بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ چوتھے دن دوپہر کے کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ آج تقریباً دس بارہ کلومیٹر چلا تھا۔ اس کے شاندار جوگرز اسے چلنے میں زبردست مدد دیتے تھے۔ ایک بار پھر وہ قدیم روم کے گلی کوچوں سے گزرتا ہوا پیدل ہی انڈر گراؤنڈ میٹرو ٹرین کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا..... کاسیا کے علاقے سے نکلنے کے بعد اسے تقریباً دو کلومیٹر مزید پیدل چلنا تھا اور پھر اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ وہ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھا جب اسے ایک جگہ آئس کریم نظر آئی۔ گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آئس کریم بار کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اس نے ''کون آئس کریم'' لی۔ ''کون آئس کریم'' لینا اس کی غلطی تھی۔ آئس کریم زیادہ سخت نہیں تھی۔ پگھلتی جا رہی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لیے ہادی کو جلدی جلدی منہ چلانا پڑا۔ اس کا انداز دیکھ کر قریب کھڑے دو فربہ اندام لڑکے ہنسنا شروع ہو گئے۔ ہادی نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کی نظر آئس کریم بار کے اندر گئی۔ یہاں لوگ موجود تھے۔ اچانک ایک چہرہ دیکھ کر وہ بے طرح چونکا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ لمبی ناک والی وہی دراز قد لڑکی تھی جسے ہادی نے ریالٹو میں دیکھا تھا..... یہ وہی تھی۔ ہادی کو پتا ہی نہیں چلا کب اس کی ''کون آئس کریم'' پگھل کر نیچے گر گئی۔ اسے بس فربہ اندام لڑکوں کی مدھم ہنسی سنائی دی تھی۔ اسے اس ہنسی کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ کسی چیز کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ لڑکی کو قریب سے دیکھنے کے لیے بار کے اندر چلا گیا۔ اس کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ وہی علیزا کی دوست تھی۔ وہ فیملی کے ساتھ تھی۔ ایک طویل میز کے گرد چھ سات مرد و زن بیٹھے تھے۔ یہ سب ایشیائی بلکہ شاید پاکستانی تھے۔ دو تین پردہ نشین خواتین تھیں۔ ایک بھاری جسم کا خوش باش سا شخص تھا جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک بچہ بھی تھا۔ سیاہ ڈاڑھی والا ایک جواں سال شخص میز کے سرے پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال انگریزی تراش کے تھے۔ وہ شلوار قمیص میں تھا۔ اپنے لباس اور حلیے

سے یہ سارے لوگ کسی خوش حال فیملی سے لگتے تھے۔ وہ جس آئس کریم بار میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی خاصا مہنگا تھا۔

لمبی ناک والی لڑکی آج ساڑی میں تھی۔ پلو اس کے سر پر تھا۔ وہ محویت سے ایک چادر پوش معمر خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک میز خالی تھی۔ ہادی وہاں جا بیٹھا۔ اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے علیزا تو کہیں نظر نہیں آئی مگر اس کی سہیلی کا نظر آجانا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہادی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ وہ کیا کرے؟ کس طرح بات آگے بڑھائے۔ کیا اسے کھڑی ناک والی دراز قد لڑکی سے بات کرنی چاہیے، یا پھر خاموشی سے ان لوگوں کے پیچھے جانا چاہیے، ان کی رہائش معلوم کرنی چاہیے؟ یا کوئی اور طریقہ.....؟ وہ گاہے بگاہے چادر پوش خواتین کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ان میں سے دو تو بالکل جوان دکھائی دیتی تھیں۔ چادر کے نقابوں میں سے فقط ان کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں ان میں سے ہی تو کوئی علیزا نہیں؟ اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ یکایک وہ چونک گیا۔ اس نے پچیس چھبیس سال کے فربہ اندام شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہادی کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے ہادی بار بار ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہیں اس بات کا برا تو نہیں منا لیا گیا تھا۔

فربہ اندام شخص سیدھا اس کی میز پر آیا۔ ''السلام علیکم'' اس نے خوش اخلاقی سے ہادی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔

فربہ اندام شخص بولا۔ ''معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو..... آپ ہادی صاحب ہی ہیں نا؟ پاکستان سے؟''

''جج..... جی ہاں۔ میں ہادی ہی ہوں۔''

فربہ اندام شخص کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے ایک بار پھر گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ''ہم آپ کے پرستاروں میں سے ہیں جی۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پرسوں یہاں روزلیزے کے علاقے میں کوئی ادبی نشست بھی ہوئی تھی۔ اس کی تصویر آئی تھی یہاں کے اردو ہفت روزہ میں۔ اس تصویر کی وجہ سے ہی میں نے پہچانا ہے۔ اٹ از ونڈرفل۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں آپ کے پاس؟''

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔'' ہادی نے خوشی خلقی سے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ فربہ اندام شخص کا نام ظہیر الدین معلوم ہوا۔ فربہ اندام ہونے کی وجہ سے وہ ذرا بڑا نظر آتا تھا ورنہ بالکل نوجوان تھا۔ وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ بڑے بھائی وہی سیاہ ڈاڑھی والے بارعب سے صاحب تھے جو میز کے سرے پر بیٹھے تھے۔ ساتھ میں ان کی وائف بھی تھی۔ بچہ بھی اسی فیملی کا تھا۔

یہ جان کر ایک بار پھر ہادی کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ لوگ یہیں کاسیا کے علاقے میں رہتے ہیں۔ علیزا بھی تو یہیں کی رہنے والی تھی۔ تو کیا وہ بھی اسی فیملی کا حصہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ظہیر الدین کی چھوٹی بہن یا بھاوج وغیرہ ہو۔ لیکن اتنی جلدی وہ اس طرح کے نازک سوال نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ بس ایک دوسرے سے جان پہچان کی باتیں کرتے رہے۔ ظہیر الدین نے بتایا کہ وہ دونوں بھائی یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور چلاتے ہیں۔ اچھا خاصا اسٹور ہے۔ معقول آمدنی ہے۔ اپنا گھر، گاڑی، ملازمین بھی کچھ ہے۔ کشائش سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ اب یہ لوگ میلانو میں بھی ایک ایسا ہی اسٹور کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔

''آپ کا کتنے دن کا پروگرام ہے یہاں؟'' ظہیر نے اپنایت سے پوچھا۔

''بس ایک ڈیڑھ ہفتہ۔''

''کہاں رہ رہے ہیں آپ؟''

''ڈول وے ہوٹل۔ وائٹ اسکوائر کے علاقے میں ہے۔''

''نہیں جناب۔ ایسا تو نہیں چلے گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں نہیں رہیں گے۔ اتنا بڑا گھر ہے۔ آٹھ دس مہمانوں کے لیے تو گھر میں ہر وقت جگہ رہتی ہے.....''

ہادی کے سینے میں کھلبلی سی چھوٹ گئی، لیکن اس نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ''نہیں ظہیر صاحب! میں بہت آرام سے ہوں۔'' اس نے کہا۔

''آرام سے تو آپ یقیناً ہوں گے۔ ظاہر ہے اتنا مہنگا ہوٹل ہے مگر اکیلے بھی تو ہوں گے۔ ہمارے پاس ہوں گے تو اکیلا پن نہیں ہوگا۔ پردیس میں دیس کا مزہ پائیں گے اور پھر آپ روم کی ایسی ایسی جگہیں بھی دیکھ سکیں گے جو کوئی گائیڈ آپ کو نہیں دکھا سکتا۔ بس یہ طے ہے، اگر کوئی خاص مجبوری نہیں تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کی مہمان نوازی کر کے مجھے ''بے حد'' خوشی ہوگی۔'' ظہیر نے ''بے

WWW.PAKSOCIETY.COM

حد" پر اتنا زور دیا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"اچھا، مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔"
"آپ بے شک سوچ لیجیے، لیکن جناب فیصلہ ہماری پُرزور خواہش کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔"
پھر وہ ہادی کا جواب سنے بغیر اٹھا اور اپنی میز کی طرف چلا گیا۔ اس نے بڑے بھائی کے قریب جھک کر کچھ کھسر پھسر کی۔ بڑے بھائی صاحب بھی اٹھ کر ہادی کی میز کی طرف آ گئے۔ چھوٹے بھائی کی نسبت یہ قدرے خاموش طبع تھے۔ چہرے پر گہری کاروباری سنجیدگی تھی۔ براؤن شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ توانا جسم پر سج رہا تھا۔ ہادی نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ وہ تینوں بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی صاحب کا نام جلال الدین تھا۔ ظہیر نے بڑے بھائی سے ہادی کا تعارف ایک مشہور ملی نغمے کے حوالے سے کرایا۔ یہ ملی نغمہ اکثر ٹی وی اور ریڈیو سے نشر ہوتا رہتا تھا اور خاصا مقبول تھا۔
جلال صاحب نے نغمے کی تعریف کی اور اس طرح کے چند دوسرے گیتوں کو بھی سراہا۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعریف وتوصیف میں کفایت شعاری سے ہی کام لیتے ہیں۔
اسی دوران میں ان کے سیل فون پر کال آ گئی۔ وہ کال سنتے سنتے لابی کی طرف چلے گئے۔
ظہیر صاحب اور ہادی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کال سے فارغ ہونے کے بعد جلال صاحب نے ہادی کو بتایا کہ انہیں فوری طور پر واپس جانا ہے۔ انہوں نے ہادی سے ہاتھ ملایا اور خواتین کی طرف چلے گئے۔ ظہیر صاحب نے ہادی سے ہوٹل کا روم نمبر وغیرہ معلوم کر لیا تھا۔ جاتے جاتے انہوں نے کہا۔ "کل گیارہ بجے رابطہ ہوگا آپ سے بلکہ شاید میں خود ہی آ جاؤں۔" انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی ہادی کی طرف بڑھا دیا۔
صورت حال نے یہ عجب پلٹا کھایا تھا۔ نہ صرف علیزا کا کھوج ہاتھ آیا تھا بلکہ اس کھوج کو مزید کھوجنے کا موقع بھی خود بخود ہی مل رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا۔ کیا کل واقعی ظہیر کے گھر میں علیزا سے ملاقات ہو سکتی ہے اور اگر ایسا ہوا تو علیزا کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ تو اپنا نشان چھوڑے بغیر اوجھل ہو گئی تھی۔ اب اگر اس نے یکا یک ہادی کو اپنے سامنے پایا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سوچے گی کہ ہادی اس کا سراغ لگاتا ہوا اس کے پیچھے آیا ہے۔ اس نے جس تعلق کو ایک خوب صورت موڑ دے کر ختم کر دیا تھا۔ وہ پھر ایک بے ڈھنگا موڑ مڑ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔
ہوٹل کے کمرے میں وہ رات ہادی نے بڑی بے قراری میں گزاری۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ وسوسا سر اٹھا رہا تھا کہ کہیں ظہیر الدین اپنا ارادہ بدل ہی نہ ڈالے۔ وہ علیزا کو کم از کم ایک بار مزید دیکھنا چاہتا تھا..... اور ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ بے معنی سی خواہش اس کے دل میں کیوں جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ ایک سوال اور ہادی کے ذہن میں بار بار اٹھ رہا تھا۔ اس گھرانے کی خواتین تو پردہ نشین تھیں۔ اگر علیزا بھی اسی گھرانے سے تھی تو پھر وہ پردے کے بغیر کیوں نظر آئی تھی؟ اسے تو ہادی نے باقاعدہ پتلون شرٹ میں دیکھا تھا۔
اگلے روز گیارہ بجے تو ہادی سرتاپا ظہیر صاحب کی فون کال کا منتظر تھا۔ سوا گیارہ بجے کے قریب یہ کال آ گئی۔ یہ کال کمرے کے نمبر پر تھی۔ "جاگ گئے ہادی صاحب؟" ظہیر کی خوش باش آواز سنائی دی۔
"تقریباً۔" ہادی نے کہا۔
"تو ٹھیک ہے، آپ تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔"
"لیکن....."
"لیکن کی گنجائش نہیں۔" ظہیر نے کہا اور فون بند کر دیا۔
قریباً ایک گھنٹے بعد ہادی اپنے مختصر اسباب سمیت ظہیر صاحب کے گھر میں تھا۔ یہ ایک اچھا رہائشی علاقہ تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اور ولاز تھے۔ ہادی جس گھر میں آیا وہ بھی اندازاً دو ڈھائی کینال میں تھا۔ گھر کا رہائشی حصہ اور مہمان خانہ پاس پاس تھے۔ احاطہ کافی وسیع تھا اور یہاں بہت سے چھتری نما، اسٹون پائن کے درخت کھڑے نظر آتے تھے۔ ایک دو مور بھی چہل قدمی کرتے دکھائی دیے۔ پورچ میں دو شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ اٹلی کی خاص نشانی بڑے سائز کا ایک ویسپا اسکوٹر بھی یہاں موجود تھا، جو یقیناً شوقیہ رکھا گیا تھا..... ورنہ اس گھر میں اسکوٹر کس نے چلانا تھا۔ ظہیر نے ہادی کو جس کمرے میں ٹھہرایا وہاں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ ظہیر بڑی جلدی گھل مل جانے والا شخص تھا۔ اپنے بڑے بھائی جلال کی نسبت وہ زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ جب ہادی نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی ڈاڑھی بھی نہیں تھی۔ گھنی مونچھیں نفاست سے تراشی گئی تھیں۔ وہ جب مسکراتا تو دونوں گالوں کا گوشت اوپر کی طرف چڑھ جاتا تھا اور

آنکھیں چھوٹی نظر آنے لگتی تھیں۔
اس نے آتے ہی کہا۔ "ہادی بھائی! اس کو اپنا گھر سمجھنا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بول دینا ہے۔ میں صرف تین چار دن زیادہ مصروف ہوں کیونکہ بھائی میلانو گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کے ساتھ ساتھ گھوموں گا۔ لیکن ان تین چار دنوں میں بھی ایک ڈرائیور گاڑی سمیت آپ کے لیے اسٹینڈ بائی رہے گا۔"
"یار، آپ تو واقعی کرم فرمائی کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ میں سنگل پسلی اس کے نیچے دب کر مر جاؤں گا۔"
"کوئی کرم فرمائی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک نامی گرامی پاکستانی فن کار اس وقت میرا مہمان ہے۔ آپ روزانہ اپنے دو تین گیت اپنی زبان سے سنا دیا کیجیے گا۔ بس سمجھیے گا کہ اگر کوئی کرم فرمائی ہے بھی تو اس کا بوجھ اتر گیا۔ میرے لیے بونس یہ ہوگا کہ اپنے دو چار دوستوں سے بھی آپ کو ملواؤں گا اور ان پر اپنی دھاک بٹھاؤں گا۔" وہ ہنسا اور اس کی آنکھیں کسی جاپانی کی آنکھیں لگنے لگیں۔
"یار! اتنا نامی گرامی نہیں ہوں میں اور اگر آپ کے بڑے بھائی صاحب کو پتا چلا کہ میں نے صرف ملی نغمے ہی ارشاد نہیں فرمائے۔ گانے شانے بھی لکھے ہیں تو وہ مجھے کھڑے کھڑے روانہ کر دیں گے۔"
"آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ آپ شاعر ہیں یار..... اور یہ قابل فخر بات ہے۔ بھائی جان خود اقبال اور فیض کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"
"کانوں کو ہاتھ لگائیں ظہیر صاحب۔ مجھ ناچیز کو کن لوگوں سے ملا رہے ہیں۔ کسی باذوق بندے نے سن لیا تو ہتک عزت کا دعویٰ کر دے گا۔"
اسی دوران میں ظہیر کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اس نے ذرا تذبذب کے بعد کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ایک زنانہ آواز تھی۔ "ہیلو، خالہ جان! کیا حال ہے؟" ظہیر نے کہا۔
مدھم سی آواز ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں ظہیر بیٹا۔ مم..... میں ذرا آنا چاہ رہی تھی۔ حجاب سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں۔"
"مگر....." ظہیر نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔
عورت جلدی سے بولی۔ "مجھے پتا چلا تھا کہ جلال بیٹا شہر سے باہر ہے۔ دو تین دن تک آئے گا۔ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ مل لوں۔"
"پر خالہ جان! امی تو گھر میں ہی ہیں۔ پھر آپ سے تو، تو میں، میں ہو جائے گی ان کی۔"
"مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے بھی بازار جانا ہے آج....."
"لیکن وہ تو شام کو جائیں گی نا۔"
"بب..... بیٹا! کچھ کرو..... میرا دل بڑا اداس ہو رہا ہے....." عورت کی گھگیائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ اس نے شاید کچھ اور بھی کہا لیکن ظہیر کال سنتے ہوئے باہر چلا گیا تھا۔
ساتھ والے کمرے سے ظہیر کے بولنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ جس حجاب کی بات ہو رہی ہے وہ ظہیر کی بڑی بھابی یعنی جلال کی بیوی ہے۔ فون پر بولنے والی حجاب کی والدہ تھیں اور بیٹی سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہ رہی تھیں۔ یہاں سسرال میں حجاب کے حالات غالباً زیادہ اچھے نہیں تھے لہٰذا ظہیر تذبذب میں تھا۔ آخر میں بات ختم کرتے ہوئے ظہیر نے کہا۔ "ٹھیک ہے خالہ! میں کوشش کرتا ہوں کہ امی شام کے بجائے دوپہر کو چلی جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں آپ کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔"
گفتگو ختم کر کے ظہیر پھر ہادی والے کمرے میں آ گیا۔ اس موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہمان خانے کی ملازمہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں قہوے کی پیالیاں اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ اس درمیانی عمر کی ملازمہ کا نام شریفاں معلوم ہوا۔ لگتا تھا کہ اس گھر میں شریفاں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ کافی یا تو نی بھی تھی۔
دوپہر کا کھانا کافی پر تکلف تھا۔ پیزا تھا، بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت اور کھیر قسم کی سویٹ ڈش تھی۔ مصروفیت کی وجہ سے ظہیر کھانے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ لنچ ہادی نے اکیلے ہی کیا۔
لنچ کے بعد جب وہ واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا، اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ دو پردوں کی درز میں سے اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت ڈری ڈری سی گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ شکل وصورت سے کھاتے پیتے گھر کی لگتی تھی۔ رنگ سفید، چہرے سے نیکی اور شرافت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک خوش اخلاق اور نیک خو خاتون ہے۔ اس کے سر پر ایک لمبی چادر تھی جس نے جسم بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک ٹوکری لیے وہ کھڑکی کے عین سامنے سے گزری اور رہائشی

WWW.PAKSOCIETY.COM

حصے کی طرف چلی گئی۔ ٹوکری میں پھل وغیرہ تھے۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ یہی حجاب کی والدہ ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے دکھ ہوا کہ گھروں میں ایسے حالات کیوں پیدا ہوجاتے ہیں کہ والدین کو اپنی بیٹیوں سے ملنے کے لیے یوں مجرموں کی طرح آنا پڑتا ہے...... خوفزدہ، نادم اور سہمے سہمے انداز میں۔

کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ہادی سو گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جاگا تو خدمت گار شریفاں آواز پیدا کیے بغیر کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ اس کا تعلق وسطی پنجاب کے شہر گجرات سے تھا اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہی رہتے ہیں۔ شریفاں بھی غالباً ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اس گھر میں اپنا مقام بنا رکھا تھا۔

اتنے میں مین گیٹ کی طرف سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ملازم نے ہارن پہچان کر گیٹ کھولا۔ ایک شاندار سفید جیپ اندر داخل ہوئی۔ اسے باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک فربہ اندام عورت طمطراق سے بیٹھی تھی۔ ذرا چوڑے چہرے والی اس صحت مند عورت کو ہادی نے کل ظہیر کی فیملی کے ساتھ آئس کریم بار میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر شریفاں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہائے میں مرگئی۔ یہ اتنی چھیتی واپس آگئیں۔''

''یہ کون ہیں؟'' ہادی نے دریافت کیا۔

''ظہیر صاحب کی امی۔'' شریفاں نے بہ دستور کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ پھر وہ ہادی کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر تیزی سے باہر لپک گئی۔

صورت حال کچھ کچھ ہادی کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ظہیر نے اپنی والدہ کو وقت سے پہلے ہی شاپنگ کے لیے بھیج دیا تھا تاکہ اس دوران میں حجاب کی والدہ آکر حجاب سے مل لیں اور تسلی سے بات وغیرہ کرلیں۔ لیکن اب غیر متوقع طور پر ظہیر کی والدہ جلدی لوٹ آئی تھیں۔ حجاب کی والدہ ابھی گھر میں ہی تھیں۔ اب ملازمہ انہیں باخبر کرنے گئی تھی کہ ظہیر کی والدہ واپس آگئی ہیں۔

پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے۔ اندر نہ جانے کیا ہوا۔ کوئی جھگڑا ہوا یا نہیں۔ بہرحال ہادی نے اتنا ضرور دیکھا کہ وہ عورت جو یقیناً حجاب کی والدہ تھیں ذرا گھبرائی ہوئی سی باہر آئیں...... اور لڑکھڑاتی ہوئی سی مین گیٹ سے باہر نکل گئیں۔ ان کی لمبی چادر کا پلو ان کے پیچھے فرش پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ہادی کو اس عورت پر ترس آیا۔ نجانے کیا وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں اس طرح ڈری ہوئی آئی تھی اور سہمی ہوئی نکلی تھی۔

شام سے ذرا پہلے ہادی مہمان خانے سے نکلا اور خوب صورت گراسی لان میں چہل قدمی کرنے لگا۔ گلاب اور نرگس کے پھولوں کی مہک دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر جھلملا رہی تھیں۔ اکثر یورپی ملکوں کی طرح فضا گرد و غبار سے پاک تھی، اس لیے ہر شے دمکتی نظر آتی تھی۔ ہادی سوچنے لگا، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ علیزا واقعی اس گھر کے کسی کمرے میں موجود ہو، اسی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ اس نے دوپہر سے کئی بار سوچا تھا کہ ملازمہ شریفاں سے کچھ سن گن لے، لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ابھی شریفاں سے اس کی جان پہچان اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ایسے سوالات کرسکتا۔ ویسے بھی اسے اس گھر میں آئے ابھی سات آٹھ گھنٹے ہی ہوئے تھے۔

اچانک وہ ایک منظر دیکھ کر ٹھٹکا، اس کی نگاہ رہائشی حصے کی طرف گئی تھی۔ رہائشی حصے کو گارڈینیا کی ایک چار پانچ فٹ اونچی باڑ نے علیحدہ کر رکھا تھا۔ باڑ کے قریب پھول دار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ ان کیاریوں کے قریب ہادی کو کچھ گرد آلود پھل پڑے نظر آئے۔ یوں لگا جیسے یہ پھل باڑ کے اوپر سے باہر پھینک دیے گئے ہوں۔ چند گچھے سیاہ انگوروں کے تھے۔ انجیریں تھیں، کچھ کیلے اور تر و تازہ ناشپاتیاں تھیں۔ یقیناً یہ وہی پھل تھے جو حجاب کی والدہ ٹوکری میں لے کر آئی تھیں۔

ہادی سمجھ گیا۔ یہ پھل گرے نہیں بلکہ انہیں پھینکا گیا تھا۔ غالباً گھر کی مالکن کو اس پھل کی ''آمد'' پسند نہیں آئی تھی۔ شاید اب کسی نوکر کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس پھل کو سمیٹ کر کوڑے دان میں ڈال دیتا۔ وہ جہاں کا تہاں پڑا تھا۔

پتا نہیں کہ اس گھر میں کس طرح کا تناؤ چل رہا تھا۔ چھوٹا بھائی ظہیر جتنا خوش باش تھا، بڑا بھائی جلال اتنا ہی خاموش طبع تھا۔ گھر میں اس کا کافی رعب داب بھی نظر آتا تھا۔ اگر جلال کی بیوی اور ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا تھا تو ممکن تھا کہ اس میں جلال کا اپنا ہاتھ بھی ہو۔ بہرحال ہادی کو ان باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ کسی اور مقصد سے یہاں آیا تھا اور ابھی تک اس ''مقصد'' کی کوئی جھلک اسے نظر نہیں آئی تھی۔

88 جہانگیر بکس

معروف دانشور اور سیاسی رہنما راجہ انور کی سرگزشت حیات

معروف اسکالر سرفراز شاہ کی نئی کتاب

افغان جیل پل چرخی میں بیتے لمحات کی دردانگیز رُوداد موت کے منہ سے واپسی

دل کی گہرائیوں سے نکلی روحانی گفتگو

جہانگیر اردو لغت (جامع ترین)
مروجہ و قدیم الفاظ، مرکبات محاورات، ضرب الامثال اور فنی اصطلاحات کا مستند ترین لغت

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/350
اندھیری رات کے مسافر -/350
ثقافت کی تلاش -/150
قیصر و کسریٰ -/475
اور تلوار ٹوٹ گئی -/400
گمشدہ قافلے -/380
داستان مجاہد -/250
پردیسی درخت -/400
یوسف بن تاشفین -/350
معظم علی -/350
خاک اور خون -/450
کلیسا اور آگ -/350
قافلۂ حجاز -/425
محمد بن قاسم -/350
پورس کے ہاتھی -/199
انسان اور دیوتا -/350
پاکستان سے دیارِ حرم تک -/180
آخری چٹان -/350
سو سال بعد -/150
سفید جزیرہ -/240
شاہین -/350

Buy online:
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
042-37220879 051-5539609 061-4781781
041-2627568 021-32765086 022-2780128

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ظہیر الدین اپنے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے لوٹ آیا۔ وہ خاصا پرجوش تھا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کا ایک دوست اس سے ملنے آئے گا۔ وہ گلوکاری بھی کرتا ہے اور ہادی کے گیتوں کا پرستار بھی ہے۔

جو خاطر تواضع یہاں ہادی کی ہو رہی تھی اس کے عوض ظہیر کے دو چار دوستوں سے ملنا کوئی بڑی مشقت نہیں تھی۔

اگلے روز ظہیر ناشتے کے فوراً بعد اپنے کام سے نکل گیا۔ اس نے ہادی سے کہا کہ ایک ڈرائیور اور گاڑی اس کے لیے تیار رہیں گے۔ وہ کہیں بھی جانا چاہے شریفاں یا مقصود کو بتا دے۔ مقصود مہمان خانے کے ملازم لڑکے کا نام تھا۔

دس بجے کے قریب ہادی نکلا ضرور لیکن گاڑی پر نہیں۔ وہ اپنی مرضی اور آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈیڑھ دو کلومیٹر بس کے ذریعے طے کیے پھر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ کلائی کا زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا، بلکہ زخم کے اردگرد کی جلد کچھ سرخ ہو گئی تھی اور گرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ انفیکشن کی نشانی تھی۔ ہادی نے بہتر سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا کر اچھی طرح پٹی کروا لے اور کھانے کے لیے بھی کوئی دوا لے لے۔ اس نے ایک دو راہ گیروں سے پوچھا۔ پتا چلا کہ قریب ہی ایک کافی بڑا اسپتال موجود ہے۔ دو تین بڑے بڑے گیٹ تھے۔ دو منزلہ بلڈنگ کافی وسیع تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ ایمرجنسی میں کئی مرد و زن موجود تھے۔ کچھ بوڑھے جو سیڑھیوں یا مسل خانوں وغیرہ سے گر کر آئے تھے، وہیل چیئرز پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ چند افراد اسٹریچرز پر بھی تھے۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے آ کر ہادی کی چوٹ کا سرسری معائنہ کیا اور انتظار کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کا نظام کچھ ایسا قابل رشک نہیں ہے۔ مریض کراہ رہے تھے۔ بلند آواز میں بڑبڑا رہے تھے..... ڈاکٹروں کو پکار رہے تھے لیکن وہ اپنی روٹین کے مطابق کام کر رہے تھے۔ چالیس پچاس مریضوں کے لیے غالباً دو تین ڈاکٹرز ہی میسر تھے۔ ہادی بھی بیٹھ بیٹھ کر اکتا گیا۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہا تھا جب شور سن کر چونک گیا۔ ایک پارٹیشن کی دوسری جانب بھی مریض بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ایمرجنسی والے نہیں تھے۔ شور اسی جانب سے اٹھا تھا۔ کچھ دیگر افراد کی طرح ہادی نے بھی جا کر دیکھا۔ ایک خاتون انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے صوفے پر گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اسے سہارا دے کر پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔

اسے دیکھ کر ہادی بے طرح چونکا۔ یہ وہی نیک صورت خاتون تھیں جنہیں اس نے کل ظہیر کے گھر میں دیکھا تھا۔ ہادی کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی، یہ وہی تھیں۔ اتنے میں ایک تند مزاج ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور خاتون کا معائنہ کیا۔ انہوں نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ ہی مشورے کے کمرے میں لے گیا۔ ایک عورت انگریزی میں بڑبڑائی۔ ''اتنا طویل انتظار کروا دو گے تو پھر مریض ایسے ہی بے ہوش ہو ہو کر گریں گے۔''

اٹالین ڈاکٹر نے سن لیا۔ واپس مڑ کر اس نے بڑبڑانے والی خاتون سے تلخ لہجے میں کچھ کہا۔ الفاظ ہادی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ دو چار تند جملوں کے تبادلے کے بعد یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ادھیڑ عمر خاتون جو ہادی کی معلومات کے مطابق جلال الدین کی ساس تھیں اب ڈاکٹر کے ساتھ مشورے کے کمرے میں تھیں۔ ہادی انہیں یہاں دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔ عورت کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ اب پہلے سے بہتر نظر آتی تھیں، لیکن رنگ اب بھی ہلدی تھا۔ ایک نرس انہیں سہارا دے کر لائی اور صوفے پر بٹھا دیا۔

ایک بار پھر ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ ہادی عورت کے قریب جا بیٹھا۔ ''ماں جی! آپ کیا محسوس کر رہی ہیں؟'' وہ اردو میں بولا تو خاتون چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں اپنائیت نمودار ہو گئی۔

''اللہ کا شکر ہے، اب ٹھیک ہوں۔ بس ہلکا ہلکا چکر آ رہا ہے۔ تم کون ہو؟''

''میرا نام ہادی ہے۔ پاکستان سے ہوں۔ آپ بھی پاکستان سے ہیں؟''

''ہاں گجرات سے اور تم؟''

''میں لاہور سے ہوں۔''

''میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی، تم لاہور کے ہو گے۔'' انہوں خوش دلی سے بولیں اور پھر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ انہوں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس کو آواز دے کر بلانے کی کوشش کی لیکن وہ سنی ان سنی کرتی تیزی سے نکل گئی۔

''آپ نے کیا کہنا ہے اس سے؟''

''کچھ نہیں بیٹا! یہ میرا تھوڑا سا سامان ہے۔ کوئی کر کے مجھے ٹیکسی تک پہنچا دے تو.....'' انہوں نے ایک طرف رکھے شاپرز کی جانب اشارہ کیا۔ غالباً وہ شاپنگ کرتے ہوئے اس طرف آئی تھیں۔

''میں پہنچا دیتا ہوں ماں جی! کہاں جانا ہے آپ کو؟ میرا مطلب ہے رہائش کہاں ہے آپ کی؟''

''زیادہ دور نہیں۔ یہی ''ایون ٹینو'' کے علاقے میں رہتی ہوں۔'' انہوں نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

''چلیں، میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔ آپ کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔''

''نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ بس ٹیکسی.....''

''انھیں..... انھیں..... آپ آئیں۔'' ہادی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور انہیں سہارا دے کر اٹھا لیا۔

اس مہربان چہرے والی خاتون کے لیے وہ دلی ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں ان کے شاپرز اٹھا کر اس نے دوسرا بازو ان کی بغل کے نیچے رکھا اور انہیں سپورٹ دیتا ہوا اسپتال سے باہر آ گیا۔ باہر دواؤں کی بو سے پاک تازہ ہوا تھی۔ اب دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

چند قدم چل کر خاتون ہانپ گئیں لیکن کوشش کر کے چلتی رہیں۔ وہ دونوں ایک ٹیکسی تک پہنچے اور روانہ ہو گئے۔ خاتون نے کہا۔ ''ویسے تو ایک کلینک ہمارے گھر کے پاس بھی ہے لیکن میرا ہیلتھ انشورنس کا کارڈ اس اسپتال کا بنا ہوا ہے۔ اس لیے ہر تیسرے چوتھے روز یہاں آنا پڑتا ہے۔''

''مسئلہ کیا ہے آپ کا؟''

''بس بیٹا! وہی بڑھاپے کی بیماریاں، بلڈ پریشر ہے، کبھی کبھی سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے.....''

''آج تو آپ بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔''

''بس چکر سا آ گیا تھا۔''

ان کی باتوں کے دوران میں ہی ٹیکسی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ خاتون نے ایک سیاہ گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ ہارن دینے پر گیٹ کھل گیا۔ ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔ سبز گراسی لان میں سفید کرسیوں پر دو افراد بیٹھے تھے۔ ایک ملازم انہیں مشروب پیش کر رہا تھا۔ خاتون نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''کسی کو بتانا نہیں کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ خوامخواہ پریشان ہوں گے۔ بس کہہ دینا ذرا سانس خراب ہو گئی تھی، اس لیے چھوڑنے آ گیا۔''

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک قبول صورت نوجوان تیزی سے ٹیکسی کی طرف آیا۔ اس نے خاتون کی جانب والا دروازہ کھولا۔ ہادی کو دیکھ کر بھی وہ قدرے حیران ہوا۔ ''خیریت امی جی؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کچھ نہیں فیصل! بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔''

''آ..... آپ کا رنگ تو بالکل پیلا ہو رہا ہے۔'' نوجوان نے پریشانی سے کہا۔

''اب تم مجھے کہہ کہہ کر اور پیلا کر دو گے۔'' وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں۔

فیصل نامی اس نوجوان نے سہارا دے کر والدہ کو ٹیکسی سے اتارا۔ ہادی نے شاپرز نکالے۔ شاپرز میں ایک مٹھائی والا ڈبا بھی تھا۔ یہ پاکستانی ٹائپ مٹھائی تھی، ہادی کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر فیصل نامی نوجوان نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ خاتون کے اصرار پر ہادی بھی ان کے ساتھ ہی گراسی لان میں چلا گیا۔ ملازم نے پھرتی سے دو تین کرسیاں مزید وہاں رکھ دی تھیں۔

ہم وطنی کی طرح بول چال اور لب و لہجہ بھی ایک دوسرے کو قریب لانے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہادی کی طرح یہ لوگ بھی وسطی پنجاب کے رہنے والے تھے اس لیے تھوڑی ہی دیر میں آپس میں گھل مل گئے۔ خاتون کا نام صوفیہ تھا۔ بڑی بیٹی اپنے میاں کے ساتھ جرمنی میں تھی۔ دوسری بیٹی حجاب یہاں جلال الدین کی بیوی تھی۔ کھچڑی بالوں اور عینک والا ایک کمزور سا ادھیڑ عمر شخص فیصل اور حجاب کا والد تھا، ان کا نام بعد ازاں فیاض احمد معلوم ہوا۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ ہادی کے انکار کے باوجود فیاض صاحب نے اسے روکے رکھا اور کہا کہ وہ کھانا کھا کر جائے گا۔ پروگرام لان میں ہی کھانے کا تھا۔ مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے مطلع ابر آلود ہو گیا۔ وہ لوگ اندر سجے سجائے ڈرائنگ روم میں آ گئے، یہ لوگ بھی کھاتے پیتے گھرانے سے لگتے تھے، بہرحال ظہیر الدین اور جلال الدین والی نمایاں امارت یہاں نظر نہیں آتی تھی۔ ہادی نے اس بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی کہ وہ آج کل جلال الدین کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اپنی رہائش کے بارے میں سوال کا اس نے گول مول سا جواب دیا اور کہا کہ وہ پہلے ہوٹل میں تھا، پھر ایک قریبی دوست کے اصرار پر اس کے گھر میں شفٹ ہو گیا ہے۔ اس نے اٹلی میں اپنی آمد کا مقصد سیر و سیاحت ہی بتایا۔ اپنے پروفیشن کے بارے میں بھی اس نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

کھانے کے دوران میں ہی گھنگھور گھٹا آ گئی اور دن میں رات کا سماں محسوس ہونے لگا۔ روم میں ہادی کی یہ پہلی بارش تھی اور ایسی تابڑ توڑ کہ بس سماں بندھ گیا۔ کھانا بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مزیدار تھا۔ اس کے مزیدار ہونے کی ایک وجہ اس کا بالکل پاکستانی طرز کا ہونا بھی تھا۔ فیاض صاحب اور فیصل وغیرہ کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ وہ لوگ پندرہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنے رہن سہن میں پاکستانیت برقرار رکھی ہوئی تھی۔ فیاض صاحب نے بچوں کو دینی تعلیم بھی دلائی تھی اور اپنی ثقافت سے دور نہیں ہونے دیا تھا۔

کچھ موسم کا اثر تھا، کچھ ویسے بھی یہ فیملی آج کچھ خوش نظر آرہی تھی۔ مٹھائی بھی کھائی گئی اور ہادی کو بھی کھلائی گئی۔ غالباً ان لوگوں کے لیے یہ کوئی مسرت کا موقع تھا۔ مگر اس موقع کے بارے میں ہادی کو کچھ بتایا نہیں گیا۔ کھانے کے بعد قلفی آم رکھے گئے۔ یہ پاکستانی آم تھے۔ بالکل یہی لگا جیسے لاہور کی بارش ہے اور لاہور ہی کے آم ہیں۔ آم کھانے کے بعد ہادی ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف آیا مگر کسی وجہ سے وہاں پانی نہیں آرہا تھا۔ فیصل اسے ایک قریبی کمرے میں لے آیا۔ یہاں واش بیسن موجود تھا اور پانی بھی۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی تھی۔ یہ دراصل ایک شاندار پنسل اسکیچ تھا۔ بالکل فوٹو گراف کی طرح محسوس ہوتا تھا۔ اس بلیک اینڈ وائٹ اسکیچ نے فرش سے چھت تک پوری دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے بال نفاست سے بندھے ہوئے تھے، وہ مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو ہادی نے سمجھا شاید یہ حجاب ہی کا پورٹریٹ ہے۔ لیکن پھر اس کی نظر نیچے لکھے ہوئے ایک فقرے پر پڑی۔ انگلش کے اسٹائلش رسم الخط میں لکھا تھا۔ ''میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔'' اس فقرے کے نیچے لکھنے والی کا نام حجاب فیاض لکھا تھا۔

بس ایک نظر اس تصویر پر ڈالتا ہوا ہادی کمرے سے باہر آ گیا۔

بارش ایک بار شروع ہوئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ گرج چمک بھی جاری تھی۔ موسم کی گرمی ایک نہایت خوشگوار خنکی میں ڈھلتی جارہی تھی۔ اب ہادی بے تکلفی سے فیاض صاحب کو انکل فیاض اور ان کی بیوی کو خالہ جان کہہ کر بلا رہا تھا۔ خالہ صوفیہ اب چائے بنا رہی تھیں۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے کا وہ واقعہ قریباً بھول چکی تھیں جب انہیں اسپتال میں چکر آیا تھا اور وہ باقاعدہ بے ہوش ہوگئی تھیں۔ خاصی باہمت اور بردبار خاتون تھیں وہ۔ انہوں نے بڑی پرلطف دودھ پتی بنائی۔ روم کی موسلا دھار بارش میں بیٹھ کر لاہور کا چونسہ کھانے اور گجرات کی دودھ پتی پینے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ باتوں سے معلوم ہوا کہ فیاض صاحب یہاں ایک کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور ایک قریبی آفس میں جزوقتی کام کرتے ہیں۔ بیٹا فیصل ایم بی اے کرنے کے بعد ایک معقول جاب کر رہا تھا۔ یہ گھر ان کا اپنا تھا۔ ہادی نے بھی اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا سوائے اس کے کہ وہ آج کل حجاب کے سسرالیوں کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔

اتنے میں فون کی بیل ہوئی۔ فیاض صاحب نے جا کر فون سنا۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''خیریت ہے نا؟'' خالہ صوفیہ نے پوچھا۔

''واجدہ کا فون تھا، حجاب کی طبیعت خراب ہے۔''

''ہائے میں مرگئی۔'' خالہ صوفیہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا ہوا اسے؟''

''الٹی وغیرہ آرہی ہے۔ بلڈ پریشر بہت گر گیا تھا۔''

''ہائے اللہ، اب کیسی ہے؟''

''واجدہ تو یہی کہہ رہی تھی کہ بہتر ہے۔ آگے اللہ جانے۔''

''مم..... میں فون کروں حجاب کو؟''

''نہیں، ابھی نہ کرو۔ ہوسکتا ہے..... وہ کچھ دیر بعد خود ہی کرلے۔''

سب ایک دم گم صم نظر آنے لگے تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ خالہ صوفیہ کے ساتھ ساتھ فیصل بھی لپک کر فون کی طرف چلا گیا۔ ہادی اور فیاض صاحب کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ ''وہ..... پہلے سے بیمار تھیں؟'' ہادی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

فیاض صاحب بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ اب بھی انہوں نے واضح انداز میں بات کی۔ کہنے لگے۔ ''ہماری بیٹی کی شادی کو ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اب اللہ نے آس لگائی ہے۔ اسی سلسلے میں شاید طبیعت تھوڑی بہت خراب ہوئی ہے۔''

''اللہ بہتر کرے۔'' ہادی نے کہا۔

دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ فون پر بات کر رہی تھیں لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ حجاب کا یا اس کے سسرالیوں کا فون نہیں ہے۔ کوئی دوسری نوعیت کی بات ہو رہی تھی۔

زندگی کے نشیب و فراز، گھٹن زدہ ماحول اور حدود و قیود سے نبرد آزما باہمت حسینہ کی داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

رہے۔ میرے خالو اکرام الدین بلند شہر خرجہ سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے وہ اپنے والدین اور بڑے بھائی کے ساتھ ہجرت کے لیے نکلے تھے لیکن راستے میں قتلِ عام ہوا۔ ان کے والدین اور بڑے بھائی شہید کر دیے گئے۔ وہ بڑی مشکل سے چھپ کر جان بچا پائے اور لٹے پٹے کراچی پہنچے۔ وہ تقریباً اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے لیکن ایک ہمدرد شخص نے جو دہلی ہی کے تھے اور ان کے والد کو جانتے تھے، اپنی جھگی میں پناہ دی اور ان کے حسنِ سلوک کی وجہ سے خالو کچھ عرصہ میں ہی اس حادثے کے صدمے سے باہر نکل سکے۔ میرے خالو وہاں سے بارھویں جماعت پاس کر کے آئے تھے اس لیے ان کو ایک گورنمنٹ ادارے میں ملازمت بھی مل گئی۔ وہاں اوپر کی آمدنی تھی۔ زمینیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ خالو نے جلد ہی اچھا گھر بنا لیا اور اوپر کی آمدنی سے گھر کو بہت شاندار کرلیا۔ اس ہمدرد شخص نے جن کا نام بدرالدین تھا، ان کو اپنے گھر لے آئے۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی بیٹی سے اکرام الدین نے شادی کی اور ان کی چھوٹی بیٹی سے میرے والد کی شادی ہوئی۔ میرے والد ایک بینک میں ملازم تھے۔ دونوں ہم زلف بڑی محبت سے رہتے رہے۔

بدرالدین صاحب بہت نیک اور باوقار آدمی تھے۔ وہ اپنی دونوں بیٹیوں اور دامادوں کے بزرگ تھے اور سربراہ بھی۔ زندگی دونوں خاندانوں کی بہت اچھی تھی لیکن بدرالدین صاحب کو بڑے خالو کی اوپر کی آمدنی سے بہت نفرت تھی، وہ اکثر خالو کو

ایک باضمیر سوداگر کے بھید بھرے سفر کا مختصر احوال

چبھن

محمد خواجہ

دل کی خلش ہو یا ضمیر کی چبھن ہمیشہ حساس دلوں کو ہی بے چین رکھتی ہے۔ مردہ دل کبھی اس سے آشنا نہیں ہوسکتے... کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس کی بے کلی ہمیشہ اپنے فرض کی ادائیگی پر متوجہ کراتی رہی۔

گزارتے۔ نہ ہی وہ کوئی خاص رقم خرچ کرتے کیونکہ خالہ کو ان کی آمدنی کا پورا علم تھا۔ بہرحال یہ معما کھل نہ سکا۔ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے، اگر مذہبی معاملہ، چلہ کشی یا کسی درگاہ پر حاضری ہوتی تو خالو بتا کیوں نہیں دیتے۔ خالو کو اپنے بڑے بیٹے وسیم سے بہت محبت تھی اور دوستوں جیسے تعلقات، لیکن وسیم خود پریشان رہتا کہ آخر یہ کیا راز ہے۔ ہم تمام پڑھائی سے فارغ ہوگئے اور ملازمتیں کرنے لگے، وسیم کی میری بہن سے شادی ہوئی اور میری خالو کی بڑی لڑکی سے۔ خالو ملازمت سے ریٹائر ہوگئے اور ایک جنرل اسٹور کھول لیا جو کافی اچھا چل پڑا۔ وسیم اور چھوٹا بھائی کلیم ملازمت کرتے۔ وہ اسٹور پر نہیں بیٹھتے تھے، کبھی کبھار ہاتھ بٹا دیتے۔ خالو اور ایک ملازم کافی تھے لیکن اکتوبر میں ملازم کو چھٹی دیتے اور پھر اسٹور کو بند کر کے غائب ہوجاتے، واپس آنے کے بعد بھی دو تین دن اسٹور نہیں کھولتے اور تھکن کا بہانہ بنا دیتے۔

ایک دن وسیم، میں اور ہماری بیگمات نے خالو کو گھیر لیا اور اس راز سے پردہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ ہم نے خالو سے کہا کہ وہ اب کچھ بیمار رہنے لگے ہیں لہٰذا اب تو یہ راز وہ اپنی زندگی میں ہی کھول دیں، ورنہ ہم باقی عمر اس الجھن کو سلجھا نہ سکیں گے۔ انتہائی مشکل، منتوں اور ناراضی کے بعد خالو نے کہا کہ وسیم اور میں اگلی اکتوبر کو ان کے ساتھ چل کر خود دیکھ لیں۔ اب سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی کہ کہانی کا ڈراپ سین کیا ہونے والا ہے۔ بدرالدین صاحب کافی ضعیف تھے۔ انہوں نے کہا کہ شاید وہ ابھی تک زندہ ہیں اور یہ راز پتا کر کے رخصت ہوجائیں۔ اب اکتوبر کا اتنی بے چینی سے انتظار تھا کہ جیسے قیامت کا وقت ہو۔ آخر اکتوبر کی ابتدائی تاریخ میں خالو نے ہم کو آگاہ کیا کہ کل چلنا ہے۔ میں اور وسیم سو نہیں پا رہے تھے۔ خالو نے ہم کو ساتھ لیا اور ٹرین سے کھوکھرا پار روانہ ہوئے۔ جیسے جیسے سفر ختم ہوتا رہا۔ خالو کا چہرہ اترتا گیا۔ افسردگی اور نقاہت کا اثر چہرے پر واضح ہونے لگا۔ پھر ہم اسٹیشن پر اتر کر کنڈیارو کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہوٹل پر کھانا کھایا لیکن خالو نے برائے نام کھانا کھایا۔ کنڈیارو میں ایک جگہ ہم اتر کر پیدل چل پڑے۔ میدان اور جنگلی درختوں کے علاوہ کیکر کے درخت تھے۔ وہاں ایک قبرستان تھا۔ قبرستان میں پہنچتے ہی ایک سندھی گورکن خالو کو دیکھ کر لپٹ پڑا اور پھر اس کے ساتھ ہم ایک مقبرہ نما قبر پر پہنچے۔ اس کی خوب صفائی ستھرائی کی گئی تھی اور پانی کا چھڑکاؤ بھی کیا گیا تھا۔ غالباً اس گورکن کو خالو نے پیسے دے کر یہ انتظام کروایا تھا۔ چوکنڈی میں ایک پختہ قبر تھی جس پر زہرہ بیگم کا کتبہ لگا تھا۔ جس پر سن وفات اکتوبر 1947ء لکھا تھا لیکن تاریخ نہیں تھی۔ خالو نے فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد قبر سے لپٹ کر ایسا روئے کہ ہمیں ان کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ ہم نے اور گورکن نے ان کو لٹایا اور پانی پلانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان سے پانی بھی پیا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ان کی حالت سنبھلی تو وہ پھر قبر سے لپٹ گئے اور کہنے لگے ”میری بہن زہرہ اب زیادہ جدائی نہیں، میں تمہارے پاس جلد آؤں گا۔“ ہم نے بہ مشکل ان کو سنبھالا اور گورکن کے ساتھ سرکاری ڈسپنسری پر لے گئے۔ ڈاکٹر نے دوا دی اور کہا کہ ان کو اس صدمے سے بچاؤ، اب ان کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں۔ گورکن نے ہمیں بتایا کہ یہ ہر سال یہاں آتے ہیں اور دن رات یہاں بیٹھ کر روتے ہیں، معافی مانگتے ہیں۔ تلاوت کرتے ہیں، پھر مجھے نگرانی کرنے کا معاوضہ دے کر چلے جاتے ہیں، یہاں پر گاؤں گوٹھ کے لوگ بھی عقیدت سے آنے لگے ہیں۔

جب ہم واپس ہوئے تو خالو پر نقاہت طاری تھی، لیکن انہوں نے اپنی کہانی کچھ اس طرح سنائی کہ اکتوبر کے مہینے میں ہم فسادات کے کم ہونے کا سن کر ہجرت پر نکلے لیکن ہم کوئی 15، 20 آدمی تھے، کنڈیارو تک صحیح سلامت پہنچ گئے اور پاکستان پہنچنے کی خوشی محسوس کر رہے تھے کہ اچانک رات کے وقت ایک گروہ ہم پر ٹوٹ پڑا، سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ ڈاکو تھے یا کوئی بلوائی۔ انہوں نے بندوق سے اور کلہاڑیوں سے سب کو شہید کرنا شروع کیا۔ عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھا لیتے۔ یوں تو ہمارے ساتھ چند ہی عورتیں اور لڑکیاں تھیں، میری ایک ہی بہن زہرہ تھی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ والد، والدہ، بھائی سب شہید ہوگئے۔ ہم دونوں، بہن بھائی اس جنگل میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا۔ میں نے زہرہ کو کہا۔ ”میری بہن مجھے تیری عزت عزیز ہے۔ میں تجھے ان کے حوالے نہیں کروں گا۔“ میں نے زہرہ کا گلہ دبا کر اس کو اپنے ہاتھوں سے مار دیا اور ان کے سامنے کھڑا ہوگیا کہ اب میں بھی ختم ہوجاؤں گا۔ انہوں نے مجھ پر کلہاڑی سے وار کیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں، پھر صبح کچھ لوگوں نے یہاں پر مرنے والوں کو دفن کیا۔ میں اس وار سے زخمی تو ہوا لیکن مرا نہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو لوگوں نے بتایا کہ ایک لڑکی جو زخمی نہیں تھی لیکن ظالموں نے گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا، معلوم نہیں کیوں وہ اس کو چھوڑ گئے۔ میں نے قبر پر نشان لگایا اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا، کراچی کیسے پہنچا پتا نہیں، تاریخ یاد نہیں۔ پھر بدرالدین صاحب نے مجھے دیکھا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جب میں اچھا ہوا تو یہاں آکر قبر پکی کروائی چوکنڈی بنوائی اور جب بھی آتا کچھ نہ کچھ تعمیراتی کام کرواتا۔ خدا نے مجھے بلک بلک کر رونے کے لیے زندہ چھوڑ دیا اور میں اپنی بہن کو اپنے ہاتھوں سے مارنے کا مجرم بن گیا۔ کیا میں نے صحیح کیا؟ ایک مجرم اپنی کہانی کس کو سناتا۔ جب ہم واپس آئے اور یہ کہانی سب کو سنائی تو ایک ماتم سا مچ گیا۔ خالو نے آئندہ اکتوبر کا انتظار نہ کیا اور دنیا سے ہی رخصت ہوگئے اپنی بہن کے پاس۔

کلاؤن ڈے

سلیم انور

روپ چاہے جو بھی دھار لے انسان کہیں نہ کہیں اپنی اصلیت کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ اس نے بھی انتہائی ہوشیاری سے ہاتھ کی صفائی دکھائی مگر قانون کی گہری آنکھوں نے پھر بھی اس اجلے چہرے کے پیچھے چھپے من کے میلے انسان کو پہچان لیا اور یہی بات ثابت کرتی ہے کہ قانون کے اندھے پن میں بھی بینائی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ دیکھنا چاہے ورنہ... ہر سمت اندھیرا اور اندھیر ہے۔

پردیسی ماحول میں ایک شاطر کھلاڑی کا دلچسپ تماشا

وکٹر کے پڑوسی اسے ایک ٹریولنگ ہارڈ ویئر سیلز مین سمجھتے تھے۔ وہ اپنی گزر اوقات کے لیے یہی کام کرتا تھا۔ لہٰذا جب اس سے پوچھا جاتا کہ فلاں فلاں پروجیکٹ کے لیے کون سی آری استعمال کرنی چاہیے، بہترین ہتھوڑی کون سی ہے، مخالف سمت گھومنے والی ڈرل کا ہول سیل ریٹ کیا ہے تو وہ ان سوالات کے جوابات دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

یہ ایک ایسا جھوٹ تھا جس کو برقرار رکھنا اس کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سہل تھا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی لڑکی کی جانب راغب ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے پڑوس کی خواتین ہمیشہ اپنی کسی کنواری دوست یا رشتہ دار کو اس کی جانب دھکیلنے کی کوششیں کرتی رہتی تھیں کہ وہ ان کی جانب متوجہ ہوجائے۔ اس غیر اتفاقی کی واحد وجہ ایک ہی تھی۔ وہ بس اس بات کا حامل نہیں ہوسکتا تھا کہ کوئی اس کے اتنے قریب آجائے اور اس سے یہ سوال پوچھ بیٹھے کہ حقیقت میں وہ کیا کرتا ہے۔ وکٹر کا اصل کام کچھ اور ہی تھا۔

وہ بینک لوٹتا تھا۔

وہ اس کام میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ پانچ سال سے بھی کم عرصے میں وہ چودہ بینک لوٹ چکا تھا اور اسے ایک مرتبہ بھی کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کامیابی میں اس بات کا بڑا دخل تھا کہ وہ اپنی منصوبہ بندی نہایت احتیاط اور باریک بینی سے کرتا تھا۔ وہ صرف چھوٹے قصبوں کے بینکوں کا انتخاب کرتا تھا۔ اس لیے کہ وہاں گارڈ شاذونادر ہی ہوا کرتے تھے۔ پھر ان بینکوں میں کیشئر کی کھڑکیوں کے پارٹیشنز بھی زیادہ اونچے نہیں ہوتے تھے۔ اس سے بینکوں کے اس رویے کا اظہار ہوتا تھا کہ بینک لوٹنے والوں سے جس حد تک ممکن ہو کم سے کم الجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا امکان باقی نہ رہے۔ جو بھی بینک لوٹنے آئے اسے خاموشی سے رقم دے دی جائے اور جانے دیا جائے...... اس امید کے ساتھ کہ بعد میں پولیس اسے خود پکڑتی رہے گی۔

ایک اور کام جو اس کا پسندیدہ تھا وہ یہ تھا کہ جس بینک کو لوٹنے کی پلاننگ کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ترین ہی عارضی رہائشی جگہ کرائے پر لے لیتا تھا تاکہ بینک لوٹنے کے بعد تیزی کے ساتھ وہاں جا چھپے۔ اگر بینک کے نزدیک کوئی جگہ نہ ملتی تو واردات کے بعد وہ کسی ریسٹورنٹ یا موویی تھیٹر میں چلا جاتا تھا۔ پھر ضرورت پڑنے پر وہ کسی ایسی جگہ دبک جاتا جہاں اس وقت تک چھپا رہتا، جب تک بینک ڈکیتی کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑ جاتا تھا اور یقیناً اگر صورت حال کا تقاضا ہوتا تو وہ ہمیشہ اس بارے میں پیشگی آگاہی رکھتا تھا کہ قریب ترین ایکسپریس وے تک تیز رفتاری کے ساتھ پہنچنے کا آسان راستہ کیا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ ان تمام وارداتوں کا ایک بڑا کریڈٹ اپنے ریوالور کو دیتا تھا۔ یہ اعشاریہ تین پانچ سات کا میگنم ریوالور تھا جس کا بیرل ساڑھے چھ انچ کا تھا اور گرپ ربڑ کی تھی۔ ویسے تو اور بھی پاورفل گنز دستیاب تھیں لیکن اس کا میگنم ریوالور ایک بڑے بھاری بھرکم عفریت سے کم نہیں تھا۔ اسے بس یہ کرنا ہوتا تھا کہ اپنا ریوالور بینک کے کیشئر کو دکھا دے، پھر اس کا کام ہوجاتا تھا۔ یقیناً اس ریوالور کی جھلک دکھانے کے ساتھ وہ ایک تحریر بھی اس کی جانب کھسکا دیتا تھا جس میں تمام کیش کا مطالبہ ہوتا تھا۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ہوتی تھی کہ وہ کسی قسم کی چالاکی دکھانے یا کاؤنٹر کے پیچھے چھپے ہوئے رنگدار غباروں کو پھوڑنے کی کوشش نہ کرے، لیکن اس کی بھاری بھرکم میگنم کو دیکھتے ہی کوئی بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا چالاکی دکھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا اور اس کا کام آسانی سے ہوجاتا تھا۔

گیبل لیک بینک کو لوٹنے کا پروگرام اس نے ایک ماہ قبل اس وقت بنایا تھا جب اس نے اپنے مقامی اخبار کے بیک پیج پر کلاؤن ڈے کے بارے میں ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ یہ اسّی کے عشرے کی بات تھی جب فنی فریڈی نامی ایک نامور سرکس کلاؤن نے ریٹائرمنٹ کے بعد یونیز کریک، وسکونسن میں مسخروں کی ٹریننگ کا ایک اسکول کھول لیا تھا۔ چند سال گزرنے کے بعد اس اسکول سے گریجویشن کرنے والے سابق طلبا نے ایک ری یونین کا اہتمام کیا جو خاصا کامیاب رہا اور اسے خوب پذیرائی ملی۔ پھر یونیز کریک کی دیکھا دیکھی جلد ہی اسے قریبی قصبوں گیبل لیکس اور والٹرز فالز نے اپنا لیا اور یہ ایک سالانہ چیریٹی تہوار کا روپ اختیار کر گیا۔ اب یہ تینوں قصبے باری باری اس تہوار کا اہتمام کرتے تھے۔

اس سال مہمان نوازی کی باری گیبل لیکس کی تھی۔

اس تہوار کی خصوصیت یہ تھی کہ قصبے کے میئر سے لے کر ٹاؤن کا سینی ٹیشن انجینئر، اسکول کے بچے، اسٹور کیپرز اور تہوار میں شرکت کرنے کے لیے باہر سے آنے والے تمام سیاح مسخروں کے لباس پہنتے تھے اور اس روز کوئی بھی عام لباس میں نظر نہیں آتا تھا۔

اخبار کے اس آرٹیکل کو مکمل طور پر پڑھنے سے پہلے ہی وکٹر کے ذہن میں اس آئیڈیے نے جنم لے لیا تھا۔

کلاؤن ڈے پر کلاؤن کے ڈریس میں ایک بینک کو لوٹنا! یہ ایک ایسی بات تھی جس پر وہ آنے والے کئی برسوں تک ہنس سکتا تھا اور یہ ایک پرفیکٹ موقع تھا۔

قصبے کا لے آؤٹ پلان حاصل کرنے کے لیے اس نے گوگل سے گیبل لیکس کا نقشہ اتار لیا۔ پھر نقشے کی تصدیق کی خاطر اس نے کار میں پورے قصبے کا جائزہ لے لیا۔ اس کے بعد وہ واپس بینک آگیا اور سیونگ کے منصوبوں کے

پمفلٹس حاصل کرنے کے بہانے اس نے بینک کا اندر اور باہر کی جانب سے خوب معائنہ بھی کرلیا۔

بینک سے قریب ترین ہوٹل گیبل لیکس مینر تھا جو کہ مقامی ہوٹلوں میں سب سے بڑا شمار ہوتا تھا۔ اس نے ہوٹل کی کلرک سے کلاؤن ڈے کے بارے میں کچھ دیر تک گپ شپ بھی کی۔ کلرک نے اسے بتایا کہ اس روز ہوٹل میں ایک بڑی پارٹی کا اہتمام ہوتا تھا لیکن کاروبار بند نہیں ہوتا۔ ڈاک بھی تقسیم ہوتی ہے اور بچے بھی اسکول جاتے ہیں اور سب سے اہم یہ کہ بینک بھی کھلا رہتا ہے۔

وکٹر نے اسی وقت وہیں پر اپنے لیے کمرا بک کرالیا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں تمام کمرے بک نہ ہوجائیں۔ اس نے کلرک پر یہی ظاہر کیا جیسے یہ فیصلہ اس نے کلرک کے آئیڈیے پر کیا ہے۔

وکٹر نے اپنی ریزرویشن کی ادائی نقد کردی اور اپنی شناخت کے حوالے سے ان جعلی ڈرائیونگ لائسنسوں میں سے ایک پیش کردیا جو وہ اپنی شناخت کے طور پر ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔

اور پھر کلاؤن ڈے آگیا۔

وکٹر جب اپنی کار میں گیبل لیکس کے قصبے میں داخل ہوا تو اس وقت صبح کے نو بجکر چند منٹ ہی ہوئے تھے۔ اس نے یہ فورڈ سیڈان کار الی نائے سے کرائے پر حاصل کی تھی اور اس کے لیے ایک اور جعلی ڈرائیونگ لائسنس استعمال کیا تھا۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے فورڈ سیڈان کی اصلی نمبر پلیٹوں کی جگہ وہ نمبر پلیٹیں لگائی تھیں جو اس نے انڈیانا میں چوری کی تھیں۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی اسے ہر طرف مسخروں کی ایک بڑی تعداد دکھائی دی۔ کچھ فٹ پاتھوں پر چل رہے تھے، کچھ گاڑیوں میں تھے۔ پک اپ ٹرکوں سے لے کر کنورٹیبل کاروں کے اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا ہوا ہر فرد کلاؤن کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل کی لابی بھی مسخروں کے لباس پہنے ہوئے لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ وکٹر ہاتھ میں ایک چھوٹا سوٹ کیس اور کپڑوں کا ایک بیگ اٹھائے دھنک رنگ ملبوسات، گہرے رنگوں سے سجی مسکراہٹوں اور سرخ بلب جیسی ناکوں والے ہجوم سے بچتا بچاتا رجسٹریشن ڈیسک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اچانک کوئی اس سے ٹکرا گیا۔ وکٹر کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک اور کلاؤن سے جا ٹکرایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو تھام کر سنبھلنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے مضحکہ خیز انداز میں بغل گیر ہوگئے۔

”میرے خیال سے یہ انداز موسیقی کے ساتھ اپنایا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔“ ایک نسوانی آواز نے کہا اور ساتھ ہی ایک قہقہہ بھی سنائی دیا۔

کلاؤن کے بھیس میں اس سے ٹکرانے والی عورت کے سر پر سرخ رنگ کے لہریے دار بالوں کا ایک گچھا تھا جو کسی جھرنے کے مانند اس کے شانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کی پینٹ کی ہوئی آئی بروز ایک انچ چوڑی تھیں اور شوخ سرخ رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر معمول سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بائیں گال پر ایک بڑا سا گولڈن ستارہ بنا ہوا تھا جو کہ وکٹر کے خیال میں اس عورت نے بہ طور بیوٹی مارک سجایا ہوا تھا۔ پھر گھنی لانبی پلکوں نے اس کے چہرے کے میک اپ کو مکمل کردیا تھا۔

اس عورت نے فرش تک کی لمبائی کا ایک گولڈ ایوننگ گاؤن پہنا ہوا تھا اور اس لباس میں اس کا سینہ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ گاؤن میں رانوں تک کی تراش کے نیچے سرخ رنگ کا فلالین کا پورے پائنچوں کا زیر جامہ تھا جو اس کی لمبی جاذب نظر ٹانگوں اور ہائیکنگ جوتوں کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

”سوری۔“ وکٹر نے کہا۔

”اے، یہ میری غلطی تھی۔ میں ان کمبخت آئی لیشز کی وجہ سے کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ تم یہاں کلاؤن ڈے منانے کے لیے آئے ہو؟“

وکٹر نے لابی میں چاروں طرف دیکھا اور پھر بولا۔ ”کیا ہم سب یہ دن منانے کے لیے یہاں اکٹھا نہیں ہیں؟“

یہ سن کر اس عورت نے ایک بار قہقہہ بلند کیا۔ ”میرا خیال ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کیا تہوار منانے کا یہ تمہارا پہلا موقع ہے؟“

”ہاں۔ میں نے اس تہوار کے بارے میں اخبار میں ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ مجھے یہ تفریح سے بھرپور تہوار لگا۔ سو میں نے اس میں شرکت کا فیصلہ کرلیا۔“ وکٹر نے بتایا۔

”یہ موج مستی سے پُر ایک ایسا تہوار ہے جس میں شرکت کا تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوگا۔“ اس عورت نے کہا۔ ”تم نے ایک درست فیصلہ کیا ہے۔“

وکٹر یہ سن کر مسکرا دیا۔

”تو یہ تمہارا گیبل لیکس آنے کا پہلا اتفاق ہے؟“ اس عورت نے پوچھا۔

"ہاں۔ یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔"

"ویل۔ یہ ایک زبردست جگہ ہے اور ان سب میں سب سے زیادہ بہترین طریقے سے کلاؤن ڈے ہم مناتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہاں گھما پھرا سکتی ہوں؟"

"میں اپنے کمرے میں سکونت اختیار کرلوں اور اپنا کلاؤن کا کاسٹیوم پہن لوں تو پھر دیکھیں گے۔" وکٹر نے جواب دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ جس کام کے لیے یہاں آیا ہے اس میں کوئی مخل ہو۔ لیکن وہ غیر ضروری توجہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے دوستانہ رویہ اختیار کرنے کو ترجیح دی اور خوش اخلاقی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

"گڈ! بائی داوے میں این ہوں۔ میں بیشتر وقت معمول کی ایک دلکش زندگی گزارتی ہوں۔ لیکن کلاؤن ڈے پر میں رھونڈا ریڈ ہوتی ہوں..... دنیا کی سب سے زیادہ سیکسی کلاؤن!"

"تم واقعی ہو۔"

"ویل، تھینک یو مسٹر..... آں.....؟"

"ٹیڈ، ٹیڈ فوسٹر۔" وکٹر نے اسے اپنا وہی نام بتایا جو اس نے ہوٹل میں رجسٹریشن کراتے وقت درج کرایا تھا۔

"تو پھر بعد میں ملاقات ہوگی، ٹیڈ۔"

"یقیناً، کیوں نہیں؟ اگر میرے حلیہ تبدیل کرنے کے بعد تم نے مجھے پہچان لیا تو۔" وکٹر نے جواب دیا۔

"شرط لگاؤ میں تمہیں پہچان لوں گی۔ ان بھاری بھر کم آئی لینشز کے نیچے جو میری آنکھیں ہیں وہ نہایت تیز اور غیر معمولی ہیں۔"

جب وکٹر ریزرویشن کی ڈیسک پر پہنچا تو دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

رھونڈا ریڈ!

مختلف موقعوں پر اپنے سفر کے دوران اسے بہت سی عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ لیکن کلاؤن کے کاسٹیوم میں ملبوس کسی عورت سے مڈبھیڑ کا یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔

اسے جو کمرا دیا گیا وہ ہوٹل کی تیسری منزل پر تھا جس سے ہوٹل کے سامنے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ وکٹر نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا کہ قصبے کی سڑکیں اور فٹ پاتھ مسخروں کا لباس پہنے ہوئے لوگوں سے بھرتے جارہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کلاؤن یونی سائیکلوں، رولر بلیڈز اور اسکیٹ بورڈز پر بھی سوار تھے۔ کوئی کرتب دکھا رہا تھا تو کوئی جادوئی کمالات اور کوئی الٹی سیدھی قلابازیاں کھا رہا تھا۔

غرض یہ کہ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششیں کررہا تھا۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ اس کے تماشے پر سب سے زیادہ قہقہے بلند ہوں۔

وکٹر نے بھی اپنے طور پر ایک قسم کا جادوئی شعبدہ دکھانے کا ارادہ کررکھا تھا۔ ایک ایسا شعبدہ جس کا چرچا قصبے کے ہر ایک فرد کی زبان پر ہو اور وہ شعبدہ گیبل لیکس بینک سے ڈھیر ساری رقم کا غائب ہونا تھا۔

وکٹر نے اپنی جیکٹ اتار دی۔ پھر اپنے بائیں بغل میں موجود شولڈر ہولسٹر میں رکھے ہوئے بھاری بھر کم ریوالور کو ہولسٹر سے نکال لیا اور ہولسٹر کا بیلٹ کھول لیا۔ وہ جب اپنی کسی مہم پر ہوتا تھا تو اپنا یہ میگنم ریوالور ابتدا سے آخر تک اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ اس کا بہترین پارٹنر ہوتا تھا۔

البتہ جب وہ گھر واپس پہنچتا تھا تو اسے خود سے جدا کرکے الگ حفاظت سے رکھ دیتا تھا کیونکہ پھر وہ ایک بینک لوٹنے والے کے بجائے ایک دوستانہ مزاج کا حامل ہارڈ ویئر سیلز مین بن جاتا تھا۔

مسخروں کے اس خصوصی تہوار میں بہ طور ایک کلاؤن شامل ہونے کی تیاری کے سلسلے میں وکٹر نے مختلف قسم کے میک اپ آزمائے تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کون سا میک اپ نہ صرف آسانی سے ہوسکتا ہے بلکہ آسانی سے اتارا بھی جاسکتا ہے اور کون سا میک اپ اس کے اصل خدوخال کو بہترین طریقے سے چھپا سکتا ہے۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ کورا سفید چہرہ سب سے بہتر رہے گا جو پین کیک میک اپ کی دبیز تہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چہرے پر بڑی سی چڑھی ہوئی مونچھیں، سر پر گھنے بے ترتیب سنہری بالوں کی وگ اور ایک بوسیدہ سی ٹوپی ایک عمدہ اضافہ ہوگا۔ اورنج کلر کی شرٹ، ڈھیلی ڈھالی پیلے رنگ کی اوور آل، کاٹن کے سفید رنگ کے دستانے اور ایک بڑے سائز کی آرمی جیکٹ جو اس کے میگنم ریوالور کے ہولسٹر کو مکمل طور پر چھپا سکے، اس کی مکمل پوشاک ہوں گے۔

جب وکٹر نے اپنی ڈریسنگ مکمل کرلی تو اس وقت دوپہر ہورہی تھی۔ وہ تنقیدی نگاہوں سے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے سے پیشتر اس بات کا بھرپور یقین کرلینا چاہتا تھا کہ اس کے میک اپ اور کاسٹیوم میں کوئی کمی تو باقی نہیں رہ گئی۔

اس نے ایک آخری نگاہ آئینے میں اپنے عکس پر ڈالی۔

گیبل لیکس بینک ہوٹل سے قریب پہلے کارنر پر واقع تھا۔ وکٹر کا ارادہ تھا کہ وہ پیدل چلتا ہوا بینک تک جائے گا، بینک کو لوٹے گا اور پیدل چلتا ہوا واپس آجائے گا۔ اس کا پلان سیدھا واپس ہوٹل میں اپنے کمرے میں آنے کا تھا۔ پھر وہ بینک سے لوٹی ہوئی رقم کمرے میں کسی جگہ چھپا دے گا اور اس وقت تک انتظار کرے گا جب تک بینک ڈکیتی کا شور سرد نہیں پڑ جاتا۔ اس کے بعد ہی وہ ہوٹل سے چیک آؤٹ کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے اور کچھ وقت کے لیے مسخروں کی خلقت میں خود بھی شامل ہوجائے تاکہ وقت گزاری کا ایک بہانہ مل جائے۔ اگر بینک میں واردات کے دوران کوئی گڑبڑ ہوجاتی ہے اور اسے فوری طور پر قصبے سے فرار ہونا پڑتا ہے تو اس نے اس کی پیشگی تیاری بھی کی ہوئی تھی۔ کپڑوں کا ایک عام استعمال کا جوڑا اس کی کار کی ڈکی میں پہلے سے موجود تھا۔ اس کی حکمت عملی میں پیشگی تیاری اور میگنم ریوالور کلید کی سی حیثیت رکھتے تھے۔

وکٹر جب اپنے کمرے سے نکل کر لفٹ کی جانب بڑھا تو وہاں ایک اور کلاؤن پہلے سے لفٹ کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے جیل کے قیدیوں کا سا دھاری دار لباس پہنا ہوا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے کاسٹیوم کو سراہا اور لفٹ آنے پر اس میں سوار ہوگئے۔ لفٹ نیچے پہنچی تو باہر نکلتے وقت ان دونوں نے ایک دوسرے کے لیے اچھے الفاظ میں تہوار سے محظوظ ہونے کے لیے وش کیا۔

نیچے پہنچ کر وکٹر نے رھونڈا ریڈ کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی اس کا خیال نہیں تھا کہ رھونڈا ریڈ اس حلیے میں اسے پہچان پائے گی لیکن اس کے باوجود بھی وہ یہ رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ ان کی نگاہیں آپس میں اتفاقاً ٹکرا جائیں اور وہ اس سے چمٹ جائے اور وکٹر کے لیے جان چھڑانی مشکل ہوجائے۔ اس طرح اس کا منصوبہ خطرے میں پڑسکتا تھا۔

جب وہ ہوٹل سے باہر سڑک پر آیا تو اس نے وہاں مسخروں کو اور بڑی تعداد میں پایا۔ وہ سب رقص اور اچھل کود کررہے تھے۔ ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کرتب دکھانے والے الگ لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے۔ وکٹر بھی اس ہجوم میں شامل ہوگیا۔ البتہ وہ بہ ظاہر تو اس تماشے سے لطف اندوز ہورہا تھا، لیکن دھیرے دھیرے ہجوم میں راستہ بناتا، بینک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پھر وہ بینک میں داخل ہوگیا۔ بینک میں ملازمین سے لے کر وہاں موجود کلائنٹس سب کے سب مسخروں کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ بینک میں کیشئر کے دو کاؤنٹر تھے۔ دونوں کیشئر خواتین تھیں جنہوں نے اپنے کالر کھڑے کیے ہوئے تھے اور سر پر سفید رنگ کی نرم روئیں دار وگ پہنی ہوئی تھی۔ ان کے کاؤنٹر کی کھڑکی کے درمیان شیشے کا پارٹیشن تھا جن میں آٹھ انچ بلند خلا تھا۔

دونوں کاؤنٹرز کے سامنے لوگ قطار بنائے کھڑے تھے۔ وکٹر چھوٹی قطار میں لگ گیا۔ اس کی نظریں بینک کے ہر ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے گمان ہوا کہ جس کلاؤن کے ہمراہ وہ ہوٹل میں لفٹ سے نیچے آیا تھا وہ بینک میں داخل ہوکر اندر میزوں کی طرف چلا گیا ہے۔ لیکن اسے یقین نہیں تھا۔ تمام کلاؤن اور ان کے کاسٹیوم ایک دوسرے میں گڈمڈ سے ہورہے تھے۔

اپنی باری آنے پر جب وہ کاؤنٹر پر پہنچا تو اس نے کاغذ کا پرزہ کیشئر کی جانب کھسکا دیا جس پر یہ الفاظ تحریر تھے۔

"دوستانہ رویہ اپنائے رہو۔ صرف کیش چاہیے۔ رنگ دار غبارہ پھوڑنے کی کوشش مت کرنا ورنہ میں تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔"

ساتھ ہی وکٹر نے کپڑے کا ایک تھیلا اس کیشئر کی جانب بڑھا دیا اور اپنی جیکٹ کو پیچھے کھسکا دیا تاکہ وہ اس کے بغلی ہولسٹر میں موجود بڑے سے میگنم ریوالور کو بہ خوبی دیکھ لے۔ اس کی انگلیاں ریوالور کے دستے کو پیار کے سے انداز میں سہلانے لگیں۔

کیشئر نے اپنی مخصوص مسکراہٹ تو برقرار رکھی لیکن اس کی سبز مائل بھوری آنکھیں خاصی پھیل گئی تھیں جو اس کے اندرونی خوف کی عکاسی کررہی تھیں۔

جب وکٹر بینک سے باہر نکلا تو اس وقت سڑک پر ایک کلاؤن بینڈ مارچ کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ بینڈ کا لیڈر ایک بڑا سا ڈرم بجا رہا تھا جو اس کے کاندھوں پر بیلٹ سے کسا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ایک مسخرا پرجوش انداز میں اکارڈین کو پمپ کررہا تھا۔ اس کے بعد ایک الغوزہ نواز تھا۔ سب سے پیچھے ایک چھوٹا ٹیریئر تھا جس کے سر پر ایک نوکدار ٹوپی موجود تھی اور دم کے ساتھ گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وکٹر کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بینڈ کون سی دھن بجا رہا تھا البتہ ان سب کے مقابلے میں کتے کے دم ہلانے سے گھنٹیوں کی آواز ان سب میں سریلی لگ رہی تھی۔

وکٹر بھی اس مجمع میں شامل ہوگیا جو بینڈ والوں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیچھے چل رہا تھا۔ وہ ان کے ساتھ رقص کرتا، اچھلتا کودتا اپنے ہوٹل کے سامنے تک پہنچ گیا۔ پھر ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا ہوٹل کی لابی میں داخل ہوگیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وکٹر نے بینک سے لوٹی ہوئی تمام رقم بیڈ پر الٹ دی اور اسے گننے لگا۔

اب وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اگلے سال کلاؤن ڈے کے تہوار کا اہتمام کون سا قصبہ کرے گا۔ اسے کسی بھی بینک کو لوٹنے میں اتنا لطف کبھی نہیں آیا تھا جتنا کہ آج اس بینک کو لوٹنے میں آیا تھا۔

اتنے میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ وکٹر کا ہاتھ فوراً اپنے ہولسٹر میں رکھے ہوئے ریوالور کے دستے پر چلا گیا۔ لیکن جب اس کے کانوں میں ایک نسوانی آواز سنائی دی تو اس نے ریوالور کے دستے پر سے اپنا ہاتھ ہٹالیا۔

"اے ٹیڈ۔ کیا تم دن بھر اپنے کمرے میں پڑے رہو گے؟ میرا خیال تھا کہ ہم نے ملاقات طے کی ہوئی تھی۔"

یہ رھونڈا ریڈ تھی۔

پھر بھی وکٹر نے اپنی تسلی کی خاطر دروازے کے پیپ ہول سے جھانکا تو اسے رھونڈا ریڈ کی میک اپ سے تھوپی ہوئی شکل دکھائی دی۔

"ایک منٹ۔" وکٹر نے ہانک لگائی اور جلدی جلدی تمام رقم بیڈ کے نیچے کھسکا دی۔

بڑی پکے ارادے کی عورت ہے، وکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ ویل اس نے اپنا کام تو تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ سو اب تھوڑی سی تفریح کر لینے میں کیا مضائقہ ہے؟

پھر جب وکٹر نے دروازہ کھولا تو رھونڈا ریڈ تیزی سے کمرے میں گھستی چلی آئی۔ وکٹر اس کا سامنا کرنے کے لیے پلٹا تو اسے اپنی گردن میں کسی ریوالور کی نال کی چبھن سی محسوس ہوئی۔

"کسی قسم کی حرکت کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں۔" ایک درشت آواز نے اسے حکم دیا۔

پھر کسی اور نے اس کے بازو اپنی گرفت میں لے لیے اور اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر ان میں ہتھکڑی پہنا دی۔

تب رھونڈا ریڈ نے آگے بڑھ کر اس کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

رھونڈا ریڈ کے ہونٹوں سے ہلکی سی سیٹی کی آواز بلند ہوئی۔ "یہ تم نے خاصا مہلک ہتھیار اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے، ٹیڈ۔ میرا خیال ہے یہی مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا تھا جب ہم لابی میں ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ اس کے ابھار نے مجھے چونکا دیا تھا۔ کیا تم نے کبھی اس سے فائر کیا ہے؟ شرطیہ کہہ سکتی ہوں کہ اس کے فائر کا جھٹکا تمہارے بازو کو ادھیڑ کر رکھ سکتا ہے۔"

وکٹر کی گردن پر لگی ہوئی ریوالور کی نال ہٹالی گئی۔ اتنے میں کلاؤن کے لباس والے مزید دو افراد کمرے میں آگئے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس نے قیدیوں والا کاسٹیوم پہنا ہوا تھا اور وکٹر کے ہمراہ لفٹ میں سوار ہوا تھا۔ اسی کے بارے میں وکٹر کو گمان ہوا تھا کہ اس نے اسے بینک میں داخل ہوتے اور عقبی حصے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

انہیں بیڈ کے نیچے موجود بینک سے لوٹی ہوئی رقم کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

"کوئی بھی کلاؤن ڈے پر ایسی کوئی شے لے کر تہوار منانے نہیں آتا جب تک کہ اس کے ارادے کچھ اور نہ ہوں۔" رھونڈا ریڈ نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے وکٹر کی میگنم ریوالور کا چیمبر علیحدہ کر دیا اور کارتوس بیڈ پر اچھال دیے۔ پھر خالی ریوالور کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولی۔ "میں نے ڈیسک کلرک سے معلومات حاصل کی تھیں تو پتا چلا کہ تم نے پہلی بار اس قصبے میں آنے کے بارے میں مجھ سے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اس نے ہی مجھے یہ بھی بتایا کہ تم نے اپنی ہوٹل کی ریزرویشن بہ ذات خود کرائی تھی اور اس کی نقد ادائی کی تھی۔ اس کے بعد معاملہ تمہاری نگرانی کا رہ گیا تھا کہ تم خود کو کس مشکل میں گرفتار کرانے کے ارادے سے یہاں آئے ہو اور تم نے ریوالور کیوں پاس رکھا ہوا ہے؟"

پھر رھونڈا ریڈ نے اپنے لباس کے اوپری حصے کے اندر سینے میں ہاتھ ڈال کر ایک بٹوہ باہر نکالا اور بولی۔ "بائی دا وے میرے رخسار پر یہ گولڈن اسٹار اس اصلی گولڈن اسٹار کا صرف ایک متبادل ہے۔" ساتھ ہی اس نے اپنے بٹوے کا فلیپ کھول دیا اور اسے وکٹر کی نظروں کے سامنے لہرا دیا۔

"یہ کیا ہے اور تم کون ہو؟" وکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میرا گولڈ بیج ہے۔ میں یہاں گیبل لیکس کی شیرف ہوں اور تمہیں بینک لوٹنے کے جرم میں حراست میں لے رہی ہوں۔"

مسز ڈوئل نے گھنٹی کی آواز پر ٹیلی فون اٹھایا اور دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ فوراً ہی بدل گیا اور وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ میرے خدا، یہ تو بہت برا ہوا۔"

نوجوان کلرک جیمس نے فائلوں سے سر اٹھا کر دیکھا اور مسز ڈوئل کی کیفیت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج کا دن اچھا نہیں گزرے گا۔

"یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟" مسز ڈوئل نے پوچھا اور

گواہی

تنویر ریاض

مجرمانہ سرگرمیوں کی پہلی حماقت ہی کسی جرم کے بارے میں سوچنا اور منصوبہ بندی کرنا ہے مگر... افسوس کہ اس طرح کون سوچے... اگر سوچ لیا جائے تو جرم کی ابتدا اور ظلم کی انتہا کیونکر ہو... بہرحال جرم و سزا کا سیدھا سیدھا کلیہ ایک ہی ہے "جیسی کرنی ویسی بھرنی" بالآخر ایک روز اس کی چالاکی بھی دھری کی دھری رہ گئی۔

آزاد معاشرے کی سرکشی اور بندشوں کا احوال

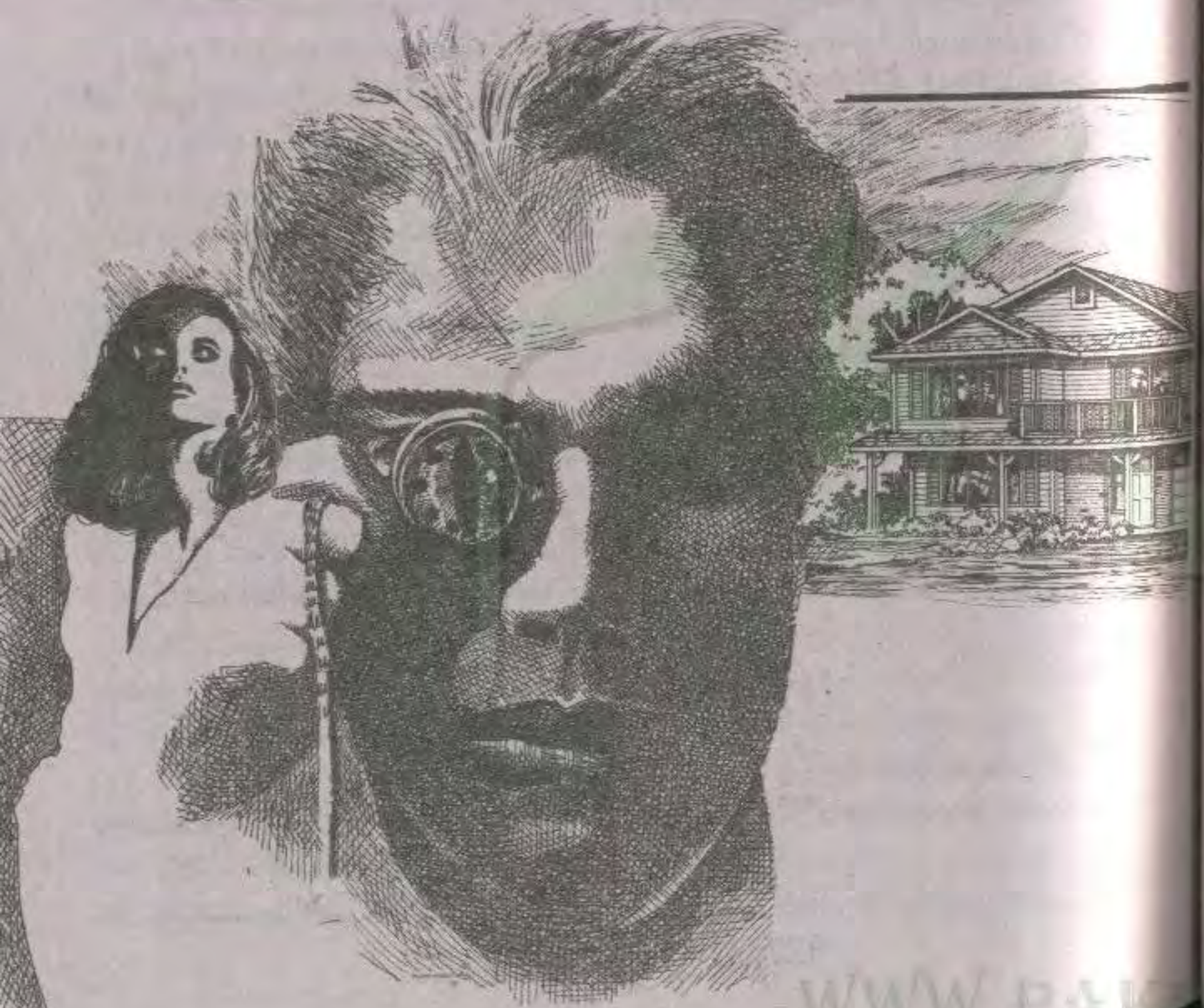

WWW.PAKSOCIETY.COM

جواب سنتے ہی اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوگئیں اور وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”اوہ میرے خدا، کتنی بار منع کیا تھا کہ اس راستے پر تنہا نہ جایا کرے۔“

جیمس منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”یہ حادثہ تو کسی جگہ بھی پیش آسکتا تھا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا تاکہ مسز ڈوئل تک اس کی آواز نہ پہنچ سکے۔

”ٹھیک ہے، میں ڈاکٹر کو بتادوں گی۔ وہ یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوگا۔“ یہ کہہ اس نے ریسیور رکھا اور جیمس کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”مسز جینگ کو کسی لٹیرے نے قتل کردیا۔“ اس کی آواز میں غم کا تاثر نمایاں تھا۔

جیمس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ مسز جینگ کو جانتا تھا۔ وہ یہاں آنے والے ان مریضوں میں سے تھی جنہوں نے اسے توجہ کے قابل سمجھا اور اسے اہمیت دی، ورنہ زیادہ تر مریض تو اسے کمرے میں رکھی ہوئی دیگر اشیا کی طرح کوئی شوپیس سمجھتے تھے۔ اس نے ایک دو مرتبہ یہ بھی جاننے کی کوشش کی تھی کہ جیمس آگے چل کر کون سا کیریئر منتخب کرنا چاہتا ہے۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ شاید ڈاکٹر یا کوئی مریض آیا ہو۔ مسز ڈوئل دیکھنے کے لیے اٹھی تو جیمس کو ایک نرس کی آواز سنائی دی جو کہہ رہی تھی۔ ”انسپکٹر ریفٹی نے فون پر یہ بری خبر سنائی ہے کہ مسز جینگ کو قتل کردیا گیا ہے۔ چارلس یہ تو نہ سن سکا کہ ڈاکٹر نے اس خبر پر کیا ردعمل ظاہر کیا لیکن جب وہ راہ داری میں نظر آیا تو اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی اور ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے چارلس کو دیکھ کر سر ہلایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مارتھا جینگ، فلاڈیلفیا کی رہنے والی تھی اور اس کا تعلق ایک دولت مند مذہبی گھرانے سے تھا۔ وہ اپنی دولت کا بڑا حصہ فلاحی کاموں پر خرچ کردیتی تھی۔ وہ ان روایتی مذہبی لوگوں میں سے تھی جو نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اپنی امارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی اسے سڑک سے گزرتا دیکھ لے تو یہی سمجھے گا کہ وہ کوئی بے گھر عورت ہے۔ اس کے بارے میں ایک قصہ بھی مشہور تھا کہ ایک مرتبہ وہ بینک گئی تو اس کے کوٹ میں بٹنوں کی جگہ سیفٹی پن لگی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان نئے ملازم نے اسے کوئی بھکارن سمجھ کر بینک سے باہر نکالنا چاہا لیکن عین موقع پر بینک کے منیجر نے مداخلت کی اور مسز جینگ کو بڑے احترام سے اپنے کمرے میں لے گیا۔

مسز جینگ کا خاندان غریب پروری اور خدمت خلق کے لیے مشہور تھا چنانچہ اس نے بھی خاندانی روایت کو جاری رکھا۔ وہ اپنے علاقے کے نوجوانوں اور طالب علموں کی خاص طور پر مدد کیا کرتی تھی۔ اس نے نوجوانوں کے لیے سمر کیمپ قائم کیا اور اپنی کچھ زمین بھی انہیں دے دی تاکہ اس پر وہ سبزی کاشت کرسکیں۔

اس کا پتھروں سے بنا ہوا مکان انقلاب سے پہلے 1766ء میں تعمیر ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ زرد بخار کی وبائی بیماری کے دنوں میں یہ امریکی صدر جارج واشنگٹن کی عارضی رہائش گاہ تھی۔ اس کے آبا واجداد نے قریب و جوار کی کئی ایکڑ زمین قدیم مقامی باشندوں سے خرید لی تھی جسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرکے تجارتی مقاصد کے لیے فروخت کردیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جدید طرز کی عمارتیں وجود میں آگئیں اور درختوں کے درمیان گھرا ہوا پتھروں کا یہ شاندار مکان ایک جزیرے کے مانند نظر آنے لگا۔ اس کے رشتے دار اور دوست کافی عرصے سے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ اس الگ تھلگ مکان کو چھوڑ کر کسی مضافاتی آبادی یا اولڈ ہوم میں منتقل ہوجائے لیکن اس نے ہر بار یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ اسی مکان میں پلی بڑھی ہے اور یہیں سے اس کا جنازہ اٹھے گا اور سب سے بڑھ کر یہاں رہ کر وہ علاقے کے لوگوں کے لیے بہتر طور پر کام کرسکتی ہے۔

دولت مند ہونے کے باوجود وہ بڑی سادگی سے زندگی گزار رہی تھی۔ وہ معمولی لباس پہنتی اور اس کے گھر میں بھی کوئی قیمتی ساز و سامان یا آرائشی اشیا نہیں تھیں۔ وہ بہت کم خریداری کیا کرتی تھی تاوقتیکہ کسی چیز کی ضرورت نہ پیش آجائے۔ اس نے ایک جز وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ ہیریٹا نامی یہ سیاہ فام عورت ہفتے میں تین بار آتی اور کھانا پکانے، گھر کی صفائی کرنے کے علاوہ کبھی کبھی بازار سے سودا سلف بھی لے آتی۔ وہ ایک قابل بھروسا اور وفادار ملازمہ تھی۔ اس کے علاوہ مسز جینگ نے ایک شوفر کی خدمات بھی حاصل کررکھی تھیں جو انہیں ایسی جگہوں پر لے کر جاتا جہاں پیدل جانا ممکن نہ ہو۔ مائیک ایک خوش طبع آئرش تھا اور ہمیشہ لطیفے سنا کر مسز جینگ کو ہنساتا رہتا تاہم مسز جینگ زیادہ تر اپنے لیے کھانا خود ہی بناتی اور مقامی دکانوں سے خریداری بھی کرلیتی تھی حالانکہ وہ اس علاقے میں واحد سفید فام عورت تھی۔

علاقے کے لوگ اس سے اچھی طرح واقف تھے اور

جانتے تھے کہ وہ یہاں کے لوگوں کی بہتری کے لیے کتنا کام کررہی ہے۔ اس نے سمر کیمپ کے علاوہ بھی کئی فلاحی کام کیے تھے۔ مقامی اسکول کے جمنازیم کی تعمیر کے لیے فنڈ جمع کرنے میں مدد کی۔ اپنی زمین کے ایک بڑے حصے پر پارک بنایا اور غریب بچوں کے لیے کپڑوں اور کتابوں کا بندوبست کیا۔ انہی خوبیوں کی بدولت لوگ اس کی عزت کرتے تھے اور وہ بلاخوف و خطر گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اسی لیے جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ اسے کسی لٹیرے نے قتل کردیا ہے تو سب کو گہرا صدمہ ہوا۔ وہ گلیوں اور بازاروں میں جمع ہوکر اظہارِ تاسف کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ تو دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز دنیا سے رخصت ہوگیا ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر آرنلڈ نے انسپکٹر ریفٹی کا نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ ”یہ واقعہ کہاں پیش آیا؟“

”ہیپرس کے مقام پر۔ مرکزی سڑک سے ذرا سا ہٹ کر۔“

”قتل کس وقت ہوا؟“

”کل شام کو تقریباً چھ بجے۔“ انسپکٹر نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”وہ ایسی جگہ ہے جہاں سے کوئی دن میں بھی گزرنا پسند نہیں کرتا۔“

”وہ کوئی عام عورت نہیں تھی۔ اسے علاقے کے سب لوگ اچھی طرح جانتے تھے۔“

انسپکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا تو ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا اسے لوٹا گیا ہے؟“

”ہاں، اس کا ہینڈ بیگ غائب ہے۔“

”کیا تم بتاسکتے ہو کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا؟“ ڈاکٹر اب سراغ رسانوں کے انداز میں پوچھ گچھ کررہا تھا۔

”حملہ آور عقب سے آیا اور اس پر اینٹ دے ماری۔“ انسپکٹر گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”حملہ آور نے انتہائی درندگی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا مقصد محض مسز جینگ کو خوف زدہ کرنا نہیں تھا بلکہ زخموں کی نوعیت سے ظاہر ہورہا ہے کہ وہ اس کے قتل کے ارادے سے ہی آیا تھا۔“

”زخم..... کیسے زخم؟“ ڈاکٹر چونکتے ہوئے بولا۔

”اس نے پے در پے کئی ضربات لگائیں جس سے اس کی کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔“

ٹیلی فون کے ریسیور پر ڈاکٹر کی گرفت سخت ہوگئی۔ اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔ ”واقعے کا کوئی گواہ ہے؟“

”میں پہلے ہی تمہیں بتاچکا ہوں کہ اس راستے سے لوگ دن میں بھی گزرنا پسند نہیں کرتے لہٰذا کسی گواہ کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔“

”ٹھیک ہے، مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر نے فون بند کردیا۔

مسز جینگ کی موت کی خبر اخبارات کے صفحۂ اول پر شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ فلاڈیلفیا انکوائرر نے اس کے بارے میں ایک تفصیلی فیچر بھی چھاپا جس میں اس کی جوانی کی تصویر لگائی گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی لیکن چہرے پر چھائی نرمی نے اسے پرکشش بنادیا تھا۔

اس کی تدفین اگلے ہفتے جرمن ٹاؤن میتنگ ہاؤس میں ہونا تھی۔ ڈاکٹر آرنلڈ کو اس سے ایک خاص لگاؤ تھا اس لیے وہ تو لازمی اس کی آخری رسومات میں شرکت کرتا لیکن مسز ڈوئل کا کہنا تھا کہ وہ بھی اس موقع پر وہاں موجود رہے گی۔ وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے پاس بیٹھی یہی پروگرام طے کررہی تھی کہ جیمس نے دروازے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں اندر آسکتا ہوں؟“

دونوں نے اسے چونک کر دیکھا تو وہ بولا۔ ”وہ ایک اچھی عورت تھی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد افسوس ہے۔“

”ہمیں اس کے سوگ میں دفتر بند کردینا چاہیے۔“ مسز ڈوئل نے تجویز پیش کی۔

”ٹھیک ہے، میں اس روز سہ پہر میں کسی مریض کو نہیں دیکھوں گا۔ جیمس تم مرکزی دروازے پر یہ نوٹس آویزاں کردو۔“

یہ طے ہوگیا کہ ڈاکٹر آرنلڈ اور اس کا تمام اسٹاف مسز جینگ کی آخری رسومات میں شرکت کرے گا۔

ڈاکٹر آرنلڈ کو خیال آیا کہ وہ اپنے ملازمین کو مسز جینگ کے خاندان میں ہونے والی آخری رسومات کے بارے میں بتادے کیونکہ وہ دونوں کیتھولک عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں کے لیے یہ سب کافی مختلف ہوگا۔ میتنگ ہاؤس بڑی سادہ سی جگہ ہے۔ وہاں قدآدم آئینے ہیں اور نہ ہی دیگر آرائشی اشیا، اس موقع پر کسی قسم کی موسیقی بھی نہیں بجائی جاتی ہے اور نہ ہی پادری کوئی وعظ کرتا ہے۔ اس دوران مکمل خاموشی ہوتی ہے اور جب روح آسمان کی جانب پرواز کرنے لگتی ہے تو خاندان کا ایک فرد اپنی جگہ سے اٹھ کر مرنے والے کے لیے چند کلمات ادا کرتا ہے۔“

”بہت خوب۔“ جیمس نے تعریفی انداز میں کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں، میں نے بھی اس بارے میں پڑھا ہے۔" مسز ڈوئل بولی۔

"کیا میں اس موقع پر تقریر کرسکتا ہوں؟" جیمس نے پوچھا۔

"ویسے تو ہر کوئی بول سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ "لیکن پہلا حق خاندان کے کسی فرد کا ہے جو مرنے والے کا قریبی عزیز ہو۔"

"میں تو اس لٹیرے کے بارے میں ضرور بولوں گی جس نے....."

"اس کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اس رسم کا بنیادی مقصد مرنے والی کی روح کو خاموش خراج تحسین پیش کرنا ہوتا ہے۔ تم لوگ اگلے بدھ کو ٹھیک ڈیڑھ بجے اپنا بہترین لباس زیب تن کر کے یہاں موجود رہو گے۔"

"کیا؟" جیمس چونکتے ہوئے بولا۔ وہ کافی حواس باختہ نظر آرہا تھا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ ایسے موقع پر کس قسم کا لباس پہنا جاتا ہے۔" مسز ڈوئل اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر نے مداخلت کی اور جیمس سے کہا۔ "اپنی ماں سے پوچھ لینا وہ تمہیں بتادے گی کہ اس موقع پر کیسا لباس پہننا چاہیے۔"

انہیں باتیں کرتے ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر نے گھڑی پر نظر ڈالی اور کہا کہ اب انہیں اپنے کام پر واپس جانا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ چھٹی والے روز مسز جینگ کے گھر جائے گا اور اس کے رشتے داروں، ملازمین اور پڑوسیوں سے ملاقات کرے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس کی مریضہ کی موت کے بارے میں کوئی اہم بات بتا سکیں۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس روایتی انداز میں تفتیش کر کے چند روز بعد اس کیس کو داخل دفتر کردے گی اور قاتل کبھی نہیں پکڑا جائے گا۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا لیکن اسے سراغ رسانی سے بھی دلچسپی تھی۔ ہر واقعے کا کھوج نکالنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ اس کی چھٹی حس بتارہی تھی کہ اس قتل کے پیچھے کوئی اور کہانی ہے۔ کسی چلتے پھرتے لٹیرے کو مسز جینگ سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی کہ وہ مسز جینگ کو اتنی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔ چنانچہ اس نے اپنے طور پر معاملے کی تہ تک پہنچنے کا فیصلہ کرلیا۔

جب اس نے اپنی گاڑی مرکزی شاہراہ سے ٹھنڈے اور سایہ دار راستے پر موڑی تو یوں لگا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آگیا ہو۔ دو گاڑیاں پہلے سے مرکزی دروازے کے باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک مسز جینگ کی فورڈ ایسکارٹ اور دوسری نیلے رنگ کی واکس ویگن تھی۔ آرنلڈ نے اپنی کار واکس ویگن کے پیچھے لگادی۔

بیرونی دروازہ اور تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں کیونکہ مسز جینگ ائرکنڈیشنر کی عیاشی کی قائل نہیں تھی۔ اس نے سنگی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر بعد کسی کے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک عمر رسیدہ سیاہ فام عورت ایپرن پہنے ہوئے نمودار ہوئی اور بڑے مہذب انداز میں بولی۔ "جی جناب!"

آرنلڈ سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اپنی آمد کا کیا جواز پیش کرے تاہم اس نے قدرے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "میں مسز جینگ کا معالج ڈاکٹر آرنلڈ ہوں اور....."

"براہ کرم اندر آجاؤ ڈاکٹر۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "میں مسز مارٹن کو تمہاری آمد کی اطلاع دیتی ہوں۔"

"مسز مارٹن!" آرنلڈ چونکتے ہوئے بولا۔ "میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔"

"وہ مسز جینگ کی بھانجی ہے، میں اسے بھیجتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ عورت سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ آرنلڈ نے ایک نظر ہال کا جائزہ لیا۔ اس کا ڈیزائن بھی قدیم طرز کے مکانات جیسا تھا جس میں مرکزی ہال اور سیڑھیوں کے ساتھ دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس نے بائیں جانب ایک کمرے میں جھانکا۔ یہ یقینی طور پر مرکزی نشست گاہ تھی جس میں رکھے فرنیچر پر سفید چادریں پڑی ہوئی تھیں جبکہ ایک طرف قدیم طرز کا پیانو بھی رکھا ہوا تھا۔

"خوش آمدید ڈاکٹر۔" ایک سریلی آواز نے آرنلڈ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ آرنلڈ نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک چھوٹے قد کی دبلی پتلی عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے جینز اور شرٹ پہن رکھی تھی اور پیروں میں کینوس شوز تھے جن کی وجہ سے قدموں کی چاپ نہیں سنائی دی۔

"دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر نے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ "میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا کہ کچھ دیر رک کر تم سے تعزیت کرلوں۔"

"تمہاری بہت مہربانی۔" وہ اپنے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ اس نے پارلر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا اور صوفے پر سے چادر ہٹاتے ہوئے

بولی۔ "بیٹھ جاؤ، ہمیں آنٹی مارتھا کے مکان کو خالی کرتے ہوئے بہت دکھ ہورہا ہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی یہاں گزار دی کو کہ وہ بچت کرنے کی قائل نہ تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے کئی قیمتی اور نادر اشیا جمع کر رکھی ہیں۔"

آرنلڈ نے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری آنٹی میری مریضہ تھیں اور اس سے پہلے میرے والد ان کا علاج کیا کرتے تھے۔ مجھے ان کی دردناک موت کا بہت صدمہ ہے۔"

"ہم سب کا یہی حال ہے۔" وہ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن ہر کوئی انہیں تنہا باہر جانے سے منع کیا کرتا تھا۔"

"مجھے اسی بات پر تو حیرت ہے کیونکہ یہاں سب لوگ انہیں جانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔"

"تمہاری بات درست ہے لیکن اندھیرے میں اسے پہچاننا مشکل تھا اور وہ ایک عام بوڑھی عورت لگ رہی تھی جسے کوئی بھی ڈاکو فوری طور پر نقد رقم حاصل کرنے کے لیے بہ آسانی شکار کرسکتا ہے۔"

مسز مارٹن کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اسے اس علاقے کے بارے میں اپنی آنٹی کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ اس نے یکا یک ہی موضوع بدل دیا اور بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم ایک معروف ڈاکٹر ہو لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ تم یہاں محض تعزیت کے لیے نہیں آئے ہو بلکہ تمہاری آمد کا مقصد کچھ اور ہے جس کا تعلق تمہارے دوسرے پیشے سے ہوسکتا ہے۔ کیا تم اور کوئی کام بھی کرتے ہو؟"

ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنی کمر صوفے کی پشت سے لگالی اور بولا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مسز جینگ کے قاتل کو انصاف کے کٹہرے تک لایا جائے۔"

مسز مارٹن کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری اور وہ بولی۔ "میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟"

آرنلڈ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا اور داخل اندازی کرتے ہوئے بولا۔ "معافی چاہتا ہوں مسز مارٹن۔ تم نے جو سامان منگوایا تھا وہ لے آیا ہوں۔ کیا اسے کچن میں رکھ دوں؟"

"ہاں، مائیک! ان سے ملو یہ ڈاکٹر آرنلڈ ہیں۔ آنٹی مارتھا کے ڈاکٹر۔"

مائیک بولا۔ "انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کی انتظار گاہ میں بہت وقت گزارا ہے۔"

"میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم مسز جینگ کے

بچے کی گواہی

مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک کافر عورت بچہ اٹھائے بغرض آزمائش اور امتحان حاضر ہوئی۔ اللہ کی شان دیکھیں، اس دو ماہ کے دودھ پیتے بچے نے کہا۔ "یارسول اللہ ﷺ ہم آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہیں۔" ماں کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا اور غصے سے کہنے لگی۔ "خبردار خاموش! یہ گواہی تیرے کان میں کس نے سکھادی؟"

بچے نے کہا۔ "اے ماں! تو اپنے سر کے اوپر تو دیکھ، تیرے سر کے اوپر حضرت جبرائیل علیہ السلام کھڑے ہوئے ہیں۔ مثل کامل بدر کے وہ مجھے نظر آرہے ہیں۔ وہ فرشتہ مجھے وصف رسول اللہ ﷺ سکھا رہا ہے اور کفر و شرک کے ناپاک علوم سے خلاصی و رہائی دلا رہا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اے دودھ پیتے بچے، یہ بتا کہ تیرا نام کیا ہے؟"

بچے نے کہا۔ "میرا نام حق تعالیٰ کے نزدیک عبدالعزیز ہے مگر ان مشرکوں نے میرا نام عبدعزیٰ رکھا ہے۔ اس پاک ذات کے صدقے جس نے آپ ﷺ کو پیغمبری بخشی، میں اس عزیٰ بت سے پاک اور بیزار اور بری ہوں۔"

حضور پاک ﷺ کی نگاہ کے صدقے جنت سے اسی وقت ایسی خوشبو آئی جس نے بچے اور اس کی ماں کے دماغ کو معطر کردیا۔

جس شخص کا خدا خود نگہبان ہو۔ اس کا تحفظ مرغ و ماہی بھی کرتے ہیں۔ بچے کے ساتھ ماں بھی ایمان و اسلام کی دولت سے مشرف ہوگئی۔ اس نے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھا اور مسلمان ہوگئی۔

اس حکایت میں زندگی کے لیے یہ سب ہے کہ نیک لوگوں کی قربت سے ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔

(حکایات رومیؒ)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈرائیور ہو۔" آرنلڈ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔ "مجھے بہت افسوس ہے۔"

"ہاں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "واقعی وہ ایک ہولناک واقعہ تھا۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد آرنلڈ نے مسز مارٹن سے پوچھا۔ "کیا تمہاری آنٹی کا کوئی دشمن تھا؟"

"اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اپنے دشمن بناتی۔"

آرنلڈ اگلا سوال کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا پھر اس نے خطرہ مول لے ہی لیا۔ "یہ ایک ذاتی سوال ہے اور اگر تم نہ چاہو تو بے شک اس کا جواب مت دینا۔"

مسز مارٹن کی بھویں تن گئیں لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔

آرنلڈ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ مارتھا کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کسے ہو سکتا ہے؟"

اس نے پلکیں جھپکائیں اور بولی۔ "جب جائداد کا بٹوارہ ہوگا تو یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی۔"

"میں سمجھتا ہوں لیکن طبعی موت اور قتل میں بہت فرق ہے اور اس سے ورثا کی پوزیشن متاثر ہو سکتی ہے۔"

"گویا تم نہیں سمجھتے کہ آنٹی کا قتل محض ایک ڈاکا زنی کی واردات کے نتیجے میں ہوا؟"

"یہ بہت اہم ہے کہ تمام ممکنات پر نظر رکھی جائے۔" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

مسز مارٹن نے غیر متوقع طور پر قہقہہ لگایا اور بولی۔ "میں تمہیں نہیں بتا سکتی کہ انہوں نے یہ مکان اور اس کے قرب و جوار کی زمین میرے لیے چھوڑی ہے اور ان کے دونوں ملازمین کو بھی اتنا مل جائے گا کہ انہیں اپنی زندگی میں دوبارہ کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی لہٰذا تم ہم تینوں پر ہی شبہ کر سکتے ہو۔ ان کی جائداد کا بڑا حصہ فلاحی تنظیموں کو چلا جائے گا۔"

ڈاکٹر آرنلڈ کو اس کے لہجے میں کوئی تلخی محسوس نہیں ہوئی، اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارا یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ "نہیں، خوش قسمتی سے اس مکان کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ سٹی کونسل نے مجھے اس کا بھاری معاوضہ دینے کی پیشکش کی ہے۔ وہ اسے ایک قومی یادگار کا درجہ دینا چاہتے ہیں۔"

اسی وقت مائیک راہ داری میں نمودار ہوا اور مسز مارٹن سے بولا۔ "کیا کسی اور کام کے لیے آج میری ضرورت ہے؟"

"نہیں، لیکن کل صبح ضرور آجانا۔ مجھے ان کتابوں کو پیک کرنے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی اور اگلے ہفتے تم ہمیں آنٹی کی آخری رسومات میں شرکت کے لیے بھی لے کر جاؤ گے۔"

"اوکے میڈم۔" وہ جانے ہی والا تھا کہ آرنلڈ نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ "مائیک! کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ مسز جینٹنگ کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟"

ڈرائیور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ اسے لوٹنا چاہ رہا تھا۔"

"گویا تمہیں یقین ہے کہ یہ ایک اتفاقی قتل ہے۔"

"بالکل، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ ہم نے کئی بار اسے سمجھایا کہ وہ اس علاقے میں اکیلے پیدل نہ جایا کرے لیکن اس نے ہماری ایک نہ سنی۔" پھر وہ مسز مارٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا میڈم! تمہاری آنٹی بہت ضدی عورت تھی۔"

"ہاں مائیک، میں جانتی ہوں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"ہم سب اس سے محبت کرتے تھے۔" مائیک نے اپنی بات جاری رکھی۔ "لیکن وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔" اس نے دوبارہ تصدیق کے لیے مسز مارٹن کی طرف دیکھا۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور تائید کرتے ہوئے بولی۔ "مائیک ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ کوئی ایسا مشورہ قبول نہیں کرتی تھی جو اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔" مائیک نے کہا۔

"ڈاکٹر، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا۔ "یہ شخص کب سے تمہاری آنٹی کے پاس کام کر رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بیس سال کی عمر میں یہاں آگیا تھا۔"

"اور ہیریٹا؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ہمیشہ اسے آنٹی کے پاس ہی دیکھا۔"

"گویا دونوں قابل اعتبار ملازم ہیں۔"

"بالکل۔"

"کیا انہیں تمہاری آنٹی کی وصیت کے بارے میں علم ہے؟ کیا وہ جانتے ہیں کہ انہیں ترکے میں سے کیا ملے گا؟"

"یقیناً انہیں توقع ہوگی کہ آنٹی انہیں بھی وصیت کے

مطابق کچھ حصہ دیں گی لیکن مجھے شبہ ہے کہ انہیں اصل رقم کے بارے میں علم ہو۔ یہاں تک کہ میں خود بھی نہیں جانتی اور مجھے آنٹی کی سخاوت پر بہت حیرت ہوئی۔"

"کیا میں جانے سے پہلے ہیریٹا سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں؟" ڈاکٹر آرنلڈ نے پوچھا۔

"یقیناً۔" یہ کہہ کر وہ باہر گئی اور اس نے آواز دے کر ہیریٹا کو بلا لیا۔ وہ عورت اپنے ہاتھ خشک کرتی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں نظر آرہی تھیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" مسز مارٹن اسے دیکھ کر پریشان نظر آنے لگی۔

"ہاں میڈم۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولی۔ "برتن دھوتے ہوئے میری نظر اس ٹی پاٹ پر چلی گئی جو مسز جینٹنگ کو بہت پسند تھا اور....."

مسز مارٹن نے اپنا بازو اس عورت کے کندھے پر رکھا۔ "میں جانتی ہوں کہ ہم سب کے لیے یہ ایک مشکل وقت ہے۔ بہرحال ڈاکٹر آرنلڈ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں اگر تم اس کے لیے تیار ہو۔" ہیریٹا نے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرانے لگی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس اتنا بتا دو کہ کیا مسز جینٹنگ کا کوئی دشمن تھا؟"

اس سیاہ فام عورت کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں وہ ایسی عورت نہیں تھی جس کا کوئی دشمن ہوتا لیکن وہ اس علاقے میں کافی سرگرم تھی۔ اسکول کی مدد کرنا، پارک بنانا اور سمر کیمپ کا قیام وغیرہ۔ عام طور پر لوگ اس طرح کے کاموں پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔"

"اگر اس کا کوئی دشمن ہوگا تو میں اس بارے میں نہیں جانتی۔" ہیریٹا نے قطعی لہجے میں کہا۔ "وہ ہمیشہ سے ہی لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہی تھی۔ تم کسی سے بھی اس کے بارے میں پوچھ لو وہ یہی بتائیں گے۔" اس کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ ہم دونوں کو خاندان کا فرد سمجھتی تھی اور ہمیں پیار سے تو کہہ کر بلایا کرتی تھی اور یہ لفظ صرف اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں مس مارٹن؟"

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "تم نے میری بہت مدد کی ہے۔ میں تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔"

عظیم طالب علم

استاد۔ "برائی کیا ہے؟"

طالب علم۔ "جناب! میں بتاتا ہوں، پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ کیا سردی کا کوئی وجود ہے؟"

استاد۔ "ہاں۔"

طالب علم۔ "غلط جناب! سردی کوئی چیز نہیں حرارت کی غیر موجودگی ہی سردی ہے۔ کیا اندھیرے کا وجود ہے؟"

استاد۔ "ہاں۔"

طالب علم۔ "پھر غلط جناب! روشنی کی غیر موجودگی کو ہی اندھیرا کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح برائی کوئی چیز نہیں۔ ایمان، اخلاق اور خوفِ خدا نہ ہونا ہی برائی ہے۔

تو دوستو! اس عظیم طالب علم کا نام "البیرونی" تھا۔

مرسلہ: سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ

****

باتوں سے خوشبو آئے

☆ ہمیشہ اس انسان کے قریب رہو جو تمہیں خوش رکھے لیکن اس انسان کے اور بھی قریب رہو جو تمہارے بغیر خوش نہ رہ پائے۔

☆ کسی دوسرے سے کیا ہوا وعدہ ٹوٹ جاتا ہے مگر اپنے سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔

☆ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر نہ آزماؤ جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔

☆ حق پر چلنے والوں کا پاؤں شیطان کے سینے پر ہوتا ہے۔

☆ کسی سے مشورہ لینا برا نہیں مگر کسی کے مشورہ پر سوچے سمجھے بغیر عمل کرنا برا ہے۔

☆ انسان کو چہروں سے نہیں دلوں سے پہچانا جاتا ہے۔

مرسلہ: محمد جاوید عباسی، نیو سینٹرل جیل ملتان

WWW.PAKSOCIETY.COM

"شکریہ جناب۔" اس نے بہ مشکل کہا اور کچن میں چلی گئی۔

"کیا تم اب بھی یہ سمجھتے ہو کہ میری آنٹی کے قتل میں کسی اندر کے آدمی کا ہاتھ ہے۔" مسز مارٹن نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور بولا۔ "فی الحال میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ اب تم یہ جاننا چاہو گے کہ قتل کے وقت ہم لوگ کہاں تھے؟"

"دراصل....."

"کوئی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "میں اس وقت جین کمنگو کے ساتھ کرکٹ کلب میں ٹینس کھیل رہی تھی۔"

"اس کا فون نمبر دے سکتی ہو؟"

مسز مارٹن نے بے یقینی کے انداز میں سر ہلایا پھر ایک کاغذ پر نمبر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

"مائیک کے بارے میں بتا سکتی ہو۔ اس سے مجھے کافی مدد ملے گی ورنہ مجھے خود معلوم کرنا پڑے گا۔"

"وہ ہمیشہ گھر جانے سے پہلے جونی کے بار پر رکتا ہے اور یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ وہاں کا بارٹینڈر اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ ان معلومات سے مجھے بہت مدد ملے گی۔"

مسز مارٹن کو لگا جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ اسے بار میں جانے والی بات نہیں بتانی چاہیے تھی۔ اب ڈاکٹر اسی پر اپنی توجہ مرکوز کر دے گا۔

"کیا تم جانتی ہو کہ اس وقت ہیریٹا کہاں تھی؟"

مسز مارٹن کو شک ہونے لگا کہ آرنلڈ کوئی سراغ رساں ہے جس نے ڈاکٹر کا روپ اختیار کر رکھا ہے۔ ایسی تفتیش کوئی سراغ رساں ہی کر سکتا ہے۔ اس نے جل کر کہا۔ "تم خود ہی پوچھ لو۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گئی اور خادمہ کو اپنے ہمراہ لے کر آ گئی۔

آرنلڈ نے پوچھا۔ "جب مس جینگ کا قتل ہوا تو تم اس وقت کہاں تھیں؟"

"میں اس وقت یہیں اسی گھر میں تھی۔ وہ دودھ لینے باہر جا رہی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ گھر پر رہیں میں دودھ لے آتی ہوں لیکن وہ بولیں تو سارا کام کر کے تھک جاتی ہے اور ویسے بھی مجھے تھوڑی سی چہل قدمی کی ضرورت ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ انہیں آخری بار دیکھ رہی ہوں۔"

"کیا تم نے اس کی واپسی کا انتظار کیا تھا؟"

"جی جناب۔"

"تم گھر پر اکیلی تھیں؟"

"جی ہاں جب پولیس آئی تب بھی میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔"

"بس اتنا کافی ہے۔" مسز مارٹن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر آرنلڈ یہ تمام معلومات پولیس سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔" پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "پولیس کو اطمینان ہے کہ آنٹی کو رہزنی کے دوران قتل کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ یہاں کا چکر لگانے کے بعد وہ دوبارہ یہاں نہیں آئے۔"

"یہ سچ ہے لہٰذا تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسز مارٹن۔ میں نے تمہارا بہت وقت لیا اس کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر آرنلڈ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ کار میں بیٹھ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور جین کمنگ کا نمبر ملانے لگا لیکن نمبر ایگیج تھا۔ اسے کچھ شک گزرا لیکن اس نے یہ سوچ کر سر کو جھٹک دیا کہ یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔

وہ جونی کے بار پہنچا تو وہاں صرف ایک شخص بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ بارٹینڈر گلاس چمکانے کے ساتھ ساتھ اپنے واحد گاہک سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ آرنلڈ کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ وہ اسے بھی گاہک سمجھ رہا تھا۔ آرنلڈ نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اس سے پوچھا کہ کیا اس نے مائیک نامی شخص کو بار میں دیکھا تھا جس رات مسز جینگ کا قتل ہوا۔

"ہاں، مائیک یہیں تھا۔ وہ کبھی ایک رات بھی غیر حاضر نہیں ہوا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی گھڑی میں وقت ملاتا ہوں۔ وہ ہر روز پونے چھ بجے یہاں آتا ہے۔ جس دن وہ نہیں آیا تو میں سمجھوں گا کہ قیامت آ گئی۔"

"وہ یہاں سے واپس کب جاتا ہے؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں سب گاہکوں پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ مجھے صرف اپنے بل سے غرض ہوتی ہے لیکن میں ہر منٹ کے بعد انہیں نہیں دیکھ سکتا۔"

"اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے یہ ایک اچھا طریقہ ہو سکتا ہے۔" اکلوتے گاہک نے اس پر طنز کیا۔

آرنلڈ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مائیک کو جانتے ہو؟"

"بالکل، یہاں سب لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ گزشتہ بدھ کی شام یہاں آیا تھا؟"

"وہ ضرور آیا ہوگا اگر نہ آتا تو مجھے یہ بات یاد رہ جاتی۔ جیسا کہ جونی نے کہا کہ اس کے نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا ختم ہو گئی۔"

"اوہ، کیا میں تمہارا ٹوائلٹ استعمال کر سکتا ہوں؟" آرنلڈ نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" بارٹینڈر نے ایک جانب اشارہ کیا۔

مردانہ ٹوائلٹ حیرت انگیز طور پر بہت صاف تھا۔

آرنلڈ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ مل جائے لیکن وہاں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے وہ اندر آیا البتہ ایک کھڑکی ضرور تھی۔ اس نے پٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ ایک آدمی اس کے ذریعے بہ آسانی گلی میں کود جائے جو سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی کو بند کر دیا۔

وہ ایک روشن اور گرم دن تھا۔ مسز ڈوئل کی آخری رسومات میں جانے کے لیے خوب بن ٹھن کر دفتر آئی۔ اس نے سیاہ ماتمی لباس کے ساتھ اسی رنگ کا خوب صورت ہیٹ پہن رکھا تھا جبکہ جیمس کو بھی اس کی ماں نے ڈھنگ کے کپڑے پہنائے تھے۔ سیاہ پتلون، سفید قمیص اور سیاہ ٹائی میں اس کی شخصیت کافی نکھر آئی تھی۔

"اوہ میرے خدا۔" مسز ڈوئل اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ دن بھی دیکھنا ہوگا۔"

جیمس اس کی مکاری اور اداکاری پر جل کر رہ گیا۔ اس نے اسے گھور کر دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ ڈاکٹر سب سے آخر میں آیا۔ اس نے بہترین نیوی بلیو سوٹ، سفید قمیص اور اس کے ساتھ دھاری دار ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس نے اپنے ملازمین کے لباس پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے صرف اتنا پوچھا کہ کیا وہ لوگ چلنے کے لیے تیار ہیں۔ جواب اثبات میں پا کر یہ قافلہ منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

میننگ ہاؤس میں ائرکنڈیشنر نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہاں حیرت انگیز طور پر ٹھنڈک تھی۔ پورے ہال میں کوئی سجاوٹ کی چیز نہیں تھی البتہ حاضرین کے بیٹھنے کے لیے لکڑی کی بینچوں کا انتظام کیا گیا تھا جن میں سے بیشتر بھر چکی تھیں۔ ایک خالی بینچ پر ڈاکٹر کے ایک جانب مسز ڈوئل اور دوسری جانب جیمس بیٹھ گئے۔ جیمس حیرت سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں نہ بڑے بڑے شیشے تھے، نہ موم بتیاں اور نہ صلیب البتہ سامنے کی جانب تین بیچیں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے سرگوشی میں کہا۔ "وہاں بزرگ اور معززین بیٹھیں گے۔"

"مثلاً۔" جیمس نے پوچھا۔

"وہ لوگ جو طویل عرصے سے چرچ آتے رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

عین اسی وقت مسز مارٹن، ہیریٹا اور مائیک بھی داخل ہوئے اور سب سے آگے والی قطار میں بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک نوجوان شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے ہال

خواہش مند

دو صاحبان ایک ہی لڑکی کے خواہش مند تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا اور دوسرا نوجوان تھا۔ ایک روز اتفاق سے ہی دونوں آگے پیچھے لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔ چائے کا دور چل رہا تھا کہ لڑکے نے اپنی دانست میں بڑی عمر کے صاحب کو شرمندہ کرنے کے لیے پوچھا۔

"بائی داوے، آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ....." وہ صاحب ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر بولے۔

"کہ گدھا بیس سال کی عمر میں بھی ساٹھ سال کے انسان سے زیادہ بوڑھا شمار ہوتا ہے۔"

مرسلہ: اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

شگوفے

ایک شوہر روز اپنی مرحومہ بیوی کے میکے فون کرتا اور پوچھتا کہ میری بیوی کہاں ہے؟ پورا ہفتہ جب شوہر کا یہی معمول رہا تو مرحومہ کی ماں نے اس سے کہا۔ "کتنی بار کہا ہے کہ وہ مر گئی ہے بار بار کیوں فون کرتے ہو؟"

شوہر۔ "کوئی خاص وجہ نہیں بس سن کر اچھا لگتا ہے۔"

مرسلہ: محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے تمام دروازے بند کردیے۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی سرگوشیاں بھی بند ہوگئیں اور پورے ہال میں خاموشی چھا گئی۔

مسز ڈوئل کو شروع میں اس خاموشی سے کوفت ہوئی لیکن پھر اس نے تسبیح نکال کر کچھ پڑھنا شروع کردیا۔ ڈاکٹر نے آنکھیں بند کرلیں اور تصور میں مس جینگ اور اس کی خوبیوں کے بارے میں سوچنے لگا لیکن پھر اس کی سوچ کا رخ مسز مارٹن، ہیریٹا اور مائیک کی طرف ہوگیا۔ وہ حیران تھا کہ ان میں سے کوئی جسمانی طور پر اس قابل ہے کہ کسی کے سر کے ٹکڑے کرسکے۔ ہیریٹا لمبے قد کی بھاری بھرکم عورت تھی اور گھر کا کام کرکے اس کے مسلز مضبوط ہوچکے تھے جبکہ مسز مارٹن چھوٹے قد کی ہونے کے باوجود فٹ نظر آتی تھی۔ وہ ٹینس کھیلنے کے ساتھ ساتھ ہفتے میں کئی بار ورزش بھی کرتی تھی۔

چند منٹ بعد ہال میں ایک شخص کی آواز گونجی جو مسز جینگ کی شخصیت، اس کی خوبیوں اور اچھے کاموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی کہ ہم سب کو اس بات پر شکر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایسی غیر معمولی شخصیت کو جاننے کا موقع ملا۔ اس کی تقریر کے بعد ایک بار پھر خاموشی چھا گئی پھر وقفے وقفے سے لوگ آتے رہے اور مسز جینگ کے حوالے سے اپنے تجربات بیان کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ کا انداز سنجیدہ تھا اور کچھ دلچسپ پیرائے میں گفتگو کررہے تھے۔ ایک لمبے قد کی سیاہ فام عورت اٹھی اور اونچی آواز میں کہنے لگی۔

"پولیس کا خیال ہے کہ مس جینگ کو اپنے علاقے میں ہی قتل کیا گیا ہے۔ میں اس پر یقین نہیں کرتی کیونکہ ہم سب اس سے بہت محبت کرتے تھے اور یہاں کا کوئی شخص اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس قتل کا کوئی اور ہی مقصد ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ لوگوں نے گردنیں موڑ کر اسے دیکھنا شروع کردیا۔ سب کو یہی تجسس تھا کہ اس نے یہ بات کس بنیاد پر کہی۔ ڈاکٹر بھی اس غیر معمولی بیان پر حیران تھا پھر اس نے اپنے بائیں جانب سرسراہٹ محسوس کی۔ جیمس اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے گلا صاف کرکے بولنا شروع کردیا۔ "میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مسز جینگ بہت ہی اچھی عورت تھی اور وہ حقیقت میں لوگوں کا خیال رکھتی تھی۔ اس نے میرا بھی بہت خیال کیا اور مجھے افسوس ہے کہ وہ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوگئی۔"

چند لوگوں نے اس کی جانب دیکھا اور کچھ عورتوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک بوڑھا شخص کھڑے ہوکر کہنے لگا۔ "میرے خیال میں اس نوجوان نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مارتھا نے ہمیشہ دوسرے لوگوں کا خیال رکھا اور اس کا واضح ثبوت وہ اچھے کام ہیں جو اس نے علاقے کے لوگوں کے لیے کیے۔ وہ ہمیں بہت یاد آئے گی۔"

اس کی تقریر ختم ہونے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی پھر سامنے کے بینچوں سے لوگوں نے اٹھنا شروع کردیا۔ یہ گویا اس جانب اشارہ تھا کہ میٹنگ ختم ہوگئی پھر کسی نے اعلان کیا کہ چند منٹ بعد برابر والے قبرستان میں تدفین ہوگی۔ جو لوگ اس میں شرکت کرنا چاہیں وہ قبرستان پہنچ جائیں۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کریں اور خود اس سیاہ فام عورت کو تلاش کرنے لگا جس نے مسز جینگ کے قتل کے بارے میں پولیس کے موقف پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ قبرستان کے باہر کھڑی سنگ مرمر کے سفید کتبوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب گیا اور بولا۔ "میں مسز جینگ کا پرانا دوست ہوں اور ابھی تم نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا، اس پر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس عورت نے غور سے اس کی جانب دیکھا لیکن خاموش رہی۔ ڈاکٹر آرنلڈ نے پھر کہا۔ "تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ مس جینگ کا قتل راہزنی کے نتیجے میں نہیں ہوا؟"

اس نے اسے گھورا اور اپنے لب کاٹنے لگی۔ ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں اس کی جانب ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ "میرا نام آرنلڈ ہے اور میں مس جینگ کا معالج ہوں۔"

اس عورت کے چہرے پر نرمی نظر آنے لگی۔ اس نے ڈاکٹر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔ "روزوا کر! کیا ہم کسی ایسی جگہ جاسکتے ہیں جہاں تنہائی ہو؟"

وہ اسے درخت کے سائے تلے ایک لوہے کی بینچ کی جانب لے گیا جو مجمع سے کافی دور تھی۔ جب دونوں بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے بولی۔ "میں موقع کی گواہ ہوں۔"

"پھر تم پولیس کے سامنے کیوں پیش نہیں ہوئیں؟"

"اس لیے کہ میں کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ میرا بھی خاندان ہے۔ شوہر ہے، بچے ہیں۔"

ڈاکٹر نے تائید میں سر ہلایا اور بولا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟"

"میں نے کچھ دیکھا نہیں بلکہ صرف سنا تھا۔"

"وہی بتادو۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور جب یقین ہوگیا کہ کوئی ان کی باتیں نہیں سن رہا ہے تو بولی۔ "ڈاکو کا چہرہ ایک اسکارف میں چھپا ہوا تھا۔ میں یہ نہیں بتاسکتی کہ وہ مرد تھا یا عورت لیکن جب مسز جینگ کو پہلی ضرب لگی تو اس نے گھوم کر دیکھا اور حملہ آور کو پہچانتے ہوئے بولی۔ تم بھی ایسا کرسکتے ہو۔"

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "تمہیں یقین ہے کہ اس نے یہی کہا تھا؟"

"ہاں کیونکہ مجھے یہ جملہ کچھ عجیب سا لگا تھا۔"

"کیا اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ کہا تھا؟"

"میں نہیں جانتی کیونکہ اس کے بعد میں فوراً ہی لوگوں کو مدد کے لیے بلانے چل دی تھی لیکن جب واپس آئی تو بہت دیر ہوچکی تھی۔"

"کیا تم ڈاکو کے حلیے کی مزید تفصیل بتاسکتی ہو مثلاً اس کی جسامت کیسی تھی یا اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے؟"

"مجھے اندھیرے کی وجہ سے یہ سب نظر نہیں آیا۔"

"تم نے اس کی آواز تو سنی ہوگی۔ زنانہ تھی یا مردانہ؟"

"اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا لیکن ایک منٹ....." وہ ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے اس کی گھڑی دیکھی تھی۔ جب اس نے حملہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تو اس کی آستین پیچھے کی جانب کھسک گئی اور اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں مجھے وہ گھڑی نظر آگئی۔"

"اس میں کوئی خاص بات تھی؟"

"ہاں، وہ مردانہ گھڑی تھی۔"

ڈاکٹر نے دکھ اور تکلیف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا دھیان فوراً ہی مائیک کی طرف گیا۔ ہیریٹا نے بتایا تھا کہ مسز جینگ دونوں ملازموں کو اپنے خاندان کے فرد کی طرح تو کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ مائیک شروع سے ہی اسے کچھ مشکوک لگ رہا تھا۔ جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو روزوا کر وہاں سے جاچکی تھی۔

اس نے قبرستان کو جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ قبر تیار ہوچکی تھی اور لوگ اس کے گرد کھڑے ہوئے تھے۔ انہی میں مسز مارٹن، ہیریٹا اور مائیک بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر نے تدفین ختم ہونے کا انتظار کیا اور تھوڑی دیر بعد لوگوں کی واپسی شروع ہوگئی۔ وہ کتبوں کے درمیان سے جگہ بناتے ہوئے بڑی احتیاط سے گزر رہے تھے۔ مائیک سب سے آگے تھا۔ جب وہ لوگ قریب آئے تو ڈاکٹر نے ان سے تعزیت کی اور وہ تینوں ایک زبان ہوکر بولے کہ انہیں ڈاکٹر کا اس موقع پر آنا اچھا لگا۔

"وہ لڑکا کون تھا جس نے اتنی خوب صورت تقریر کی؟" مسز مارٹن نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ اس کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد اس نے کہا۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔ اسپتال کا بھی ایک چکر لگانا ہے۔ بائی داوے کیا وقت ہوگا؟"

ان تینوں نے اپنی اپنی گھڑیوں کی طرف دیکھا۔ مائیک نے اپنی جیب سے ایک بڑی جیبی گھڑی نکالی جس میں چاندی کی زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ "یہ ہماری خاندانی گھڑی ہے۔ مجھ سے پہلے ڈیڈی اور ان سے پہلے دادا کے استعمال میں تھی لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی بالکل صحیح وقت دے رہی ہے۔ مجال ہے جو کبھی ایک سیکنڈ بھی ادھر ادھر ہوجائے۔"

ڈاکٹر کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ یہ وہ گھڑی نہیں تھی جس کی جانب روز نے اشارہ کیا تھا۔ مائیک نے مسز جینگ کو قتل نہیں کیا تھا پھر مقتولہ نے تو کا لفظ کس کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے پرامید نظروں سے ہیریٹا کی طرف دیکھا جس کی کلائی پر ایک نازک سی زنانہ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہیریٹا کو بھی مشتبہ افراد کی فہرست سے نکال دیا۔ اس نے مسز مارٹن کی طرف دیکھا جو اپنی جیکٹ کی آستین اوپر اٹھائے گھڑی پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ وہ ایک بڑے سائز کی مردانہ گھڑی تھی جس میں چین کے بجائے الاسٹک کا پٹا لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری۔ مسز مارٹن نے قہقہہ لگایا اور بولی۔ "یقیناً میرے ہاتھ میں یہ گھڑی دیکھ کر تمہیں حیرانی ہوئی ہوگی۔ دراصل ایک سال پہلے میری گھڑی گم ہوگئی تھی تو میرے شوہر نے وقتی طور پر استعمال کے لیے اپنی ایک فالتو گھڑی دے دی جو مجھے اتنی پسند آئی کہ اپنے پاس ہی رکھ لی۔"

ڈاکٹر نے گھوم کر اپنی کار کی جانب دیکھا۔ مسز ڈوئل اور جیمس اسے چلنے کا اشارہ کررہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کی طرف آیا اور بولا۔ "تم لوگ جاؤ، میں بعد میں آجاؤں گا۔" اب وہ سوچ رہا تھا کہ پولیس کو فون کرکے یہیں بلالے یا مسز مارٹن کے گھر پہنچنے کا انتظار کرے۔ دونوں صورتوں میں اس کی سہ پہر تو غارت ہوہی چکی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عقدہ

ملک صفدر حیات

راز زمین کا ہو یا آسمان کا اگر جستجو ہو تو سات پردوں سے بھی لوگ اشارہ پا جاتے ہیں... وہ تو پھر انسپکٹر ملک صفدر حیات تھے جن کے سر جانے کتنی الجھی گتھیاں سلجھانے کا سہرا تھا... وہ بھی ایک ایسا ہی پریمی جوڑا تھا جو گاؤں کے سادہ ماحول میں اپنے پیار کی دنیا میں گم تھا، اسے زمانے کے منتقم مزاج کا ذرا ادراک نہ تھا، ان بھید بھری آنکھوں کی کچھ خبر نہ تھی جو ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتی تھیں... کوئی چاہے کتنا ہی اپنی ذات میں گم رہے یہ دنیا کب اسے گم رہنے دیتی ہے... طرح طرح سے دریافت کرنے کے نشے میں چُور اپنی فتح کا جشن مناتی ہے لیکن... یہ فتح، یہ جشن جب ایک روز خود ان کے گلے کا پھندا بن جائے تو بہت سے لوگوں کے لیے یہ عبرت کا مقام بن جاتا ہے... مگر یہ عقدہ بھی زندگی بہت آخر میں کھولتی ہے۔

ملک صاحب کی ڈائری سے زیست کے اسرار و رموز سمجھاتا ایک اور قصہ

ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک سنسنی خیز خبر میری منتظر تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ کانسٹیبل نذیر حسین نے آ کر اطلاع دی۔

''ملک صاحب! اُدھر سے دو لاشیں ملی ہیں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''اُدھر کدھر سے نذیر حسین؟''

''دریا میں سے جی۔'' اس نے جواب دیا۔

ان دنوں میں ضلع اوکاڑہ کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ میرے تھانے سے تھوڑے فاصلے پر دریائے راوی بہتا تھا۔ دریا کی دوسری جانب ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) واقع تھا۔ کانسٹیبل نذیر حسین کا جواب سننے کے بعد میں نے پوچھا۔

''وہ لاشیں کن لوگوں کی ہیں، کچھ پتا چلا؟''

''نہیں جی۔'' کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ایک بندے نے تھانے آ کر لاشوں کے بارے میں بتایا ہے۔ لاشیں ایک لڑکے اور لڑکی کی ہیں۔ یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا کہ وہ کون ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تو پھر جائے وقوعہ پر جانے کی تیاری کرو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''ہم ابھی نکل رہے ہیں۔''

''او کے ملک صاحب۔'' نذیر حسین نے مجھے سیلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس تھانے میں میری تعیناتی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھے ایک روز بھی فارغ بیٹھنے کو نہیں ملا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وسطی پنجاب میں شیخوپورہ اور اوکاڑہ میں جرائم کا تناسب دوسرے اضلاع کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ میں نے جو سنا تھا اس کے ثبوت قدم قدم پر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ اگرچہ میں راوی کے کنارے پر واقع اوکاڑہ کے ایک دور دراز قصبے موضع سعید نگر کے تھانے کا انچارج تھا لیکن وہ بات کہ چاول کا ایک دانہ پوری دیگ کی کیفیت سے آگاہ کر دیتا ہے۔ میں بھی بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

کم عرصے میں اس حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا کہ اوکاڑہ، اوکاڑہ ہی ہے جناب۔

تھوڑی دیر کے بعد میں کانسٹیبل نذیر حسین کے ہمراہ جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ وقوعہ دریائے راوی کا کنارہ تھا اور سعید نگر سے اس کا فاصلہ بہ مشکل دو سو گز رہا ہوگا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا۔ جنوری کا مہینا تھا۔ تاریخ مجھے یاد نہیں لہٰذا واقعات کو ترتیب میں رکھنے کے لیے ہم آٹھ جنوری فرض کر لیتے ہیں۔

دسمبر اور جنوری دو ہی ایسے مہینے ہیں جن میں دریا سُکڑ اور سمٹ جاتے ہیں۔ راوی کا بھی یہی حال تھا۔ دریا کے کنارے خشک پڑے تھے اور عین قلب میں کسی چھوٹی نہر کے مانند دریائے راوی اپنی موجودی کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھا۔ دریا کے کنارے پر نصف درجن افراد بھی جمع دکھائی دیے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ مذکورہ لاشیں اسی مقام پر پڑی ہوں گی۔

میں موقع پر پہنچ گیا۔ دو باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر لوگ ادھر اُدھر ہو گئے۔ میں آگے بڑھا اور بہ غور لاشوں کا جائزہ لینے لگا۔

واقعی، وہ ایک جوان مرد اور جوان لڑکی کی لاشیں تھیں جو بڑے بے ڈھنگے انداز میں ایک دوسرے کے اوپر پھینک دی گئی تھیں۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کے قریب رہی ہوگی اور جوان لڑکا چوبیس پچیس کے آس پاس تھا۔ ان کی لاشیں خون میں لت پت تھیں اور یہ خون انہی کے جسموں سے خارج ہوا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق انہیں کسی تیز دھار آلے کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں، بازوؤں اور سروں پر متعدد کاری وار بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ قاتل نے کسی کلہاڑی وغیرہ کی مدد سے انہیں زندگی ایسی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔ موسم کی خنکی کے باعث ان کے جسموں سے خارج ہونے والا خون پپڑیوں کی صورت جم گیا تھا۔ ان کے چہرے اس انداز میں خون خون ہو رہے تھے کہ پہچاننا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ایک دل دوز اور روح فرسا منظر تھا۔

میں نے دونوں لاشوں کو الٹ پلٹ کر بہ غور ان کا جائزہ لیا اور وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ میں سے کوئی ان کو جانتا ہے؟“

ایک آدمی نے لڑکی کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ تو نرگس ہے جی..... صدیق مستری کی لڑکی۔“

”کیا صدیق مستری اسی گاؤں کا رہنے والا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ اسی شخص نے جواب دیا۔

”اور یہ لڑکا تو نور بی بی کا بیٹا لگتا ہے۔“ ایک دوسرا شخص سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس کا نام اکرم ہے۔“

”کیا مقتول اکرم کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے؟“ میں نے اس شخص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد باری باری سب کے چہروں کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا ”ان دونوں مقتولین کے وارثوں میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟“

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے بعد نفی میں گردنیں ہلانے لگے۔

”عجیب بات ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”مشکل سے ڈیڑھ، دو سو گھروں پر مشتمل یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اور اسی گاؤں میں بسنے والے دو افراد کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے اور ان کے لواحقین میں سے اب تک کوئی جائے وقوعہ تک نہیں آیا؟“

”ہو سکتا ہے.....“ ایک ضعیف شخص نے خیال آرائی کی۔ ”انہیں ابھی اس واقعے کی خبر ہی نہ ہوئی ہو۔“

”تو پھر انتظار کس بات کا ہو رہا ہے۔“ میں نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”جلدی سے جا کر ان کے گھروں کو اس سانحے کی اطلاع دیں۔“

دو نوجوان میری بات سنتے ہی گاؤں کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں اس آدمی سے پوچھ گچھ کرنے لگا جس نے سب سے پہلے ان لاشوں کو دیکھا تھا۔ اس شخص کا نام نبی بخش تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ مچھیرا تھا۔

نبی بخش کے بیان کے مطابق، وہ علی الصباح مچھلیاں پکڑنے دریا کی طرف چلا جاتا تھا۔ ان دنوں چونکہ دریا کے پانی کا زور ٹوٹ چکا تھا لہٰذا اس کا کام بھی بہت آسان ہو گیا تھا۔ معمول کے مطابق آج جب وہ دریا پر پہنچا تو سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ اس نے جیسے ہی کنارے سے اتر کر دریا میں قدم رکھا۔ وہ دو انسانی لاشوں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر اس نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نصف درجن لوگ وہاں جمع ہو گئے۔

نبی بخش نے اپنا بیان ختم کیا تو میں نے اس سے

پوچھا۔ ”جب تم دریا میں اترے تو کیا اتنی روشنی تھی کہ ان دونوں کی لاشیں آسانی سے تمہیں نظر آ جاتیں؟“

”جی سرکار۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس وقت اچھا خاصا اجالا ہو رہا تھا۔ میں انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ اس دنیا کو چھوڑ کر اُس دنیا میں جا چکے ہیں لیکن دونوں لاشیں ایک دوسرے کے اوپر اس طرح پڑی تھیں کہ انہیں پہچان نہیں سکا تھا۔ اب آپ نے انہیں سیدھا کیا ہے تو ان کی شناخت بھی ہو رہی ہے۔ یہ نرگس اور اکرم ہیں۔“

”جب تم نے یہ لاشیں دیکھیں.....“ میں نے نبی بخش مچھیرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تمہیں آس پاس یہاں کوئی شخص نظر آیا تھا؟“

”نہ جی۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”کوئی بھی نہیں۔“

یہ سوال میں نے اس بنا پر کیا تھا کہ ممکن ہے، مقتولین کی لاشوں کو علی الصباح دریا کے اس حصے میں لا کر پھینکا گیا ہو کیونکہ جائے وقوعہ کا ماہرانہ جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اکرم اور نرگس کو اس جگہ پر موت کے گھاٹ نہیں اتارا گیا تھا۔ قتل گاہ کوئی اور مقام تھا۔ ایسی صورت میں وہاں لاشیں پھینکنے والوں کا ماہی گیر نبی بخش کی نظر میں آ جانا لازمی امر تھا لیکن اس کے جواب سے کوئی بھی اہم نکتہ ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ میں نے مزید چند سوالات کے بعد نبی بخش مچھیرے کو فارغ کر دیا پھر دوسرے افراد کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

جائے وقوعہ پر موجود لوگوں کے بیانات میں سے کوئی ایسی بات سامنے نہ آ سکی جو قتل کے اس معمے کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی تاہم جب میں نے باریک بینی سے موقع کا جائزہ لیا تو یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ انہیں کس سمت سے گھسیٹ کر دریا کے مذکورہ حصے تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی۔

میں نے دریائی زمین کو بڑی توجہ سے کھوجا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد دریا کے کنارے زمینوں میں بنے ایک کچے کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے کمرے کھیتوں کے اندر عموماً زرعی آلات وغیرہ رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ میں نے جلد ہی مذکورہ کچے کمرے تک رسائی حاصل کر لی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ زمین چودھری فرزند علی کی ملکیت تھی جو موضع سعید نگر کا ایک بااثر زمین دار تھا۔

کمرے کے اندر پہنچ کر صورتِ حال واضح ہو گئی۔ ان بدنصیب مقتولین کو اسی کمرے میں کسی تیز دھار آلے کے وار سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ کمرے میں جا بہ جا خون کے آثار موجود تھے اور وہاں رکھے مختصر سے زرعی آلات کی افراتفری سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا کہ دُہرے قتل کی وہ اندوہ ناک واردات اسی کمرے میں کی گئی تھی اور بعد ازاں نرگس اور اکرم کی لاشوں کو کھیتوں میں گھسیٹ کر دریا کے کنارے اندرونی جانب پھینک دیا گیا تھا۔ یہ حقائق میرے ذہن میں دو اہم سوالات پیدا کر رہے تھے۔ نمبر ایک، نرگس اور اکرم ٹھنڈی ٹھار رات میں اس تن تنہا کمرے کے اندر کیا کر رہے تھے۔ نمبر دو، ان کی وہاں موجودی سے قاتل کو کیا تکلیف پہنچی تھی جو اس نے انہیں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا؟

پہلے سوال کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب میں نے مختلف لوگوں سے کڑے انداز میں پوچھ گچھ کی تو مجھے اس سوال کا جواب مل گیا اور جواب بہت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ نرگس اور اکرم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پتا چلا کہ نرگس کی گاؤں ہی کے ایک نوجوان امین سے منگنی ہو چکی تھی اور دو ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔

میں نے معلوم حقائق کی روشنی میں جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے کے بندوبست میں لگا ہوا تھا کہ پتا چلا مقتول اکرم کی والدہ نور بی بی وہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ تقریباً بین کرتے ہوئے وہاں تک پہنچی تھی۔ اس آہ و زاری کے بیچ میں وہ کسی عورت کا نام لے کر بڑے خطرناک انداز میں اسے بددعائیں بھی دیے جا رہی تھی۔

”خدا غارت کرے فضیلت کو..... اور اس کے بیٹے کو..... انہی لوگوں کی نظر میرے جوان جہان اکرم کو کھا گئی ہے۔“

”یہ فضیلت بی بی کون ہیں؟“ میں نے مقتول اکرم کی دکھی ماں سے اہم سوال کیا۔

”ہے ایک نامراد اور منہ کالی۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”میرے بیٹے سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا..... اس کو بھی اور امین کو بھی۔“

”امین .....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ نام مقتول نرگس کے منگیتر کے حوالے سے میرے علم میں آیا ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار

WWW.PAKSOCIETY.COM

صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ امین، فضیلت کا ہی بیٹا ہے۔ نرگس کی امین سے شادی ہونے والی تھی۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے نور بی بی کی طرف دیکھا۔ "لیکن امین یا اس کی ماں فضیلت کی تمہارے بیٹے سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"نرگس اور اکرم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ فضیلت یا امین میں سے کوئی نرگس اور اکرم کی موت کا ذمے دار ہے؟" میں نے ایک کڑا سوال کیا۔

"میرا شک تو انہی لوگوں پر ہے جی۔" وہ بڑے یقین سے بولی۔

"ٹھیک ہے نور بی بی۔ میں تمہارے شک کی بنیاد پر پوری تفتیش کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر ان لوگوں میں سے کوئی دُہرے قتل کی اس واردات میں ملوث پایا گیا تو وہ قانون سے بچ کر نہیں جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ انصاف کروں گا۔"

وہ قدرے مطمئن ہو کر ایک طرف ہٹ گئی۔ اسی لمحے وہ نوجوان بھی واپس آ گیا جو نرگس کے گھر والوں کو اس سانحے کی اطلاع دینے گیا تھا۔ وہ بندہ خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"نرگس کے گھر والوں میں سے کوئی نہیں آیا؟"

"گھر میں کوئی ہے ہی نہیں جناب۔" وہ سادگی سے بولا۔ "نرگس کے ماں باپ فتح پور گئے ہوئے ہیں۔"

میرے ذہن میں فوری طور پر یہ خیال آیا کہ نرگس اپنے والدین کی غیر موجودی کا فائدہ اٹھا کر گھر سے نکلی ہوگی اور اپنے محبوب اکرم سے ملنے اس کمرے کی طرف آئی ہوگی۔ اس خیال کے ساتھ ہی یہ بات بھی راسخ ہو جاتی تھی کہ قاتل جو کوئی بھی تھا اسے ان دونوں کی خفیہ ملاقاتوں کی پوری خبر تھی جبھی اس نے گزشتہ رات انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ قاتل کو ان کی میل ملاقات بالکل پسند نہیں تھی۔

میں نے نرگس کے گھر کی طرف سے ناکام لوٹنے والے بندے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "اگر اس کے ماں باپ فتح پور گئے ہوئے ہیں تو گھر میں اور کوئی تو موجود ہوگا۔ وہ لوگ نرگس کو اکیلے چھوڑ کر تو فتح پور نہیں جا سکتے ناں؟"

"نرگس کی بہن رابعہ ہوگی گھر میں تھانے دار صاحب۔" نور بی بی نے میری جانب دیکھتے ہوئے بتایا۔ "رابعہ کا دماغی توازن درست نہیں ہے۔"

"اوہ.....!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "اس کا مطلب ہے، نرگس کے لیے گھر سے نکلنا اور اکرم سے ملنے کے لیے اس کمرے تک پہنچنا نہایت ہی آسان ثابت ہوا ہوگا۔"

نور بی بی نے ہاں میں جواب دیا اور نہ ہی نہ میں۔ وہ اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہائے جا رہی تھی۔

موقع کی کارروائی تقریباً مکمل ہو چکی تھی لہٰذا میں نے دونوں مقتولین کی لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اوکاڑہ کے سرکاری اسپتال پہنچانے کا بندوبست کر دیا۔ اس زمانے میں فنگر پرنٹس وغیرہ اٹھانے کا کوئی رواج نہیں تھا اور نہ ہی کسی کیس کی ساعت کے دوران میں، عدالت فنگر پرنٹس رپورٹ کو کوئی اہمیت دیتی تھی۔

ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے آلۂ قتل کی تلاش میں دریائے راوی کے کنارے کے علاوہ کمرے کے اردگرد کھیتوں کا بھی ایک بڑا حصہ چھان مارا تھا لیکن تیز دھار والا وہ آلۂ قتل کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔

جائے وقوعہ سے نور بی بی کا گھر بہت کم ہی فاصلے پر تھا لہٰذا میں نے اسے تھانے بلانے کے بجائے ادھر اس کے گھر پر ہی ٹٹولنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی گھر پر چلا گیا۔ نور بی بی نے شک کے حوالے سے اتنی بڑی بات کی تھی کہ اس کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری ہو گیا تھا۔

نور بی بی کا گھر دیہاتی طرز کا ایک عام سا مکان تھا جو دو کمروں اور ایک کشادہ صحن پر مشتمل تھا۔ نور بی بی نے مجھے صحن میں، حرارت بخش دھوپ میں بٹھایا تو میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"نور بی بی، تم گھر میں اکیلی ہی نظر آ رہی ہو؟" میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اکرم کے سوا اس گھر میں تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟"

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد بتایا۔ "اکرم کا باپ تو بہت پہلے فوت ہو گیا تھا۔ بس میرے دو ہی بیٹے تھے۔ اکرم اور ولایت..... اکرم کی لاش ابھی میں دیکھ کر آ رہی ہوں اور ولایت....."

"اور ولایت.....؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ پچھلے تین سالوں سے جیل میں ہے۔" اس نے

افسردہ لہجے میں بتایا۔

"جیل میں۔" میرے استفسار میں حیرت در آئی۔

"وہ کس جرم کی سزا پا کر جیل میں سڑ رہا ہے؟"

"ولایت کے ہاتھوں گاؤں کا ایک بندہ قتل ہو گیا تھا۔" نور بی بی نے بتایا۔ "اس میں ولایت کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ولایت بہت کھرا اور غصے والا ہے۔ غلط بات اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ فرید سے کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ ولایت نے طیش میں آ کر فرید کو قتل کر ڈالا اور پھر خود ہی گرفتاری بھی پیش کر دی۔" وہ لمحے بھر کے لیے رکی پھر ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

"آج اگر ولایت جیل میں نہ ہوتا تو اکرم کی طرف میلی نظر سے کسی کو دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ہائے، میں کیا کروں..... ایک بیٹا جیل میں بند ہے اور دوسرا بے موت مارا گیا۔ میری تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے تھانے دار صاحب۔"

میں اس حرماں نصیب بڑھیا کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ان نازک لمحات میں نور بی بی کا دل یقیناً خون کے آنسو رو رہا ہوگا۔ اس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے پوچھا۔

"نور بی بی، تم نے بڑے وثوق سے مجھے بتایا تھا کہ اکرم اور نرگس کے قتل کے حوالے سے تمہیں فضیلت پر اور اس کے بیٹے پر شک ہے....."

"جی، میں اب بھی کہتی ہوں۔" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ "انہی دونوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا میرا اکرم۔"

"ان کی اکرم سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"پورا پنڈ اس بات سے واقف ہے جی کہ میرا اکرم اور نرگس ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔" وہ اپنی عقل و فہم کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میں اکرم کی خواہش پر اس کی شادی نرگس سے کروانا چاہتی تھی لیکن نرگس کے لالچی باپ نے نرگس کا رشتہ فضیلت کے بیٹے امین کو دے دیا۔"

"نور بی بی، تم اپنے دل میں نرگس اور اکرم کی شادی کی محض خواہش ہی رکھتی تھیں یا تم نے اس سلسلے میں کوئی عملی کوشش بھی کی تھی؟" میں نے تفتیشی کرید کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"جی عملی کوشش بھی کی تھی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"مثلاً.....؟" میں نے پوچھا۔ "کیا کوشش کی تھی تم نے؟"

"میں باقاعدہ اکرم کا رشتہ لے کر ان کے گھر گئی تھی۔" اس نے بتایا۔

"پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"نرگس کی ماں بھلی مانس عورت ہے جی۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "وہ اس رشتے کے لیے بڑی حد تک رضا مند تھی کیونکہ وہ اکرم کے لیے نرگس کی پسندیدگی سے واقف تھی لیکن صدیق مستری نے ایک عجیب سا اڑنگا لگا دیا تھا۔"

"صدیق مستری۔" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دُہرایا۔ "یہ کون ہے؟"

"صدیق مستری نرگس کا باپ ہے جی۔" اس نے بتایا۔ "ادھر گاؤں ہی میں اس کی سائیکل مرمت کی دکان ہے۔ وہ کرایے پر بھی سائیکلیں دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اب یہ بتاؤ کہ نرگس کے رشتے کے حوالے سے اس نے کون سا عجیب اڑنگا لگا دیا تھا؟"

اس وقت میرا ذہن مختلف زاویوں پر سوچ بچار میں مصروف تھا۔ دُہرے قتل کی یہ واردات جہاں عشق و محبت کی داستان رقم کرتی نظر آئی تھی وہیں پر نفرت اور خونیں انتقام کا قصہ سناتی بھی دکھائی دیتی تھی لہٰذا مجھے ہر نکتے اور ہر نقطے کو خاص الخاص اہمیت دینا تھی تاکہ میں اس دُہرے قتل کا معما حل کر کے نرگس اور اکرم کے قاتل تک رسائی حاصل کر سکوں۔

نور بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"صدیق نے مجھ سے کہا کہ اس کی دو بیٹیاں ہیں۔ رابعہ نرگس سے آٹھ سال بڑی ہے۔ اگر اس نے پہلے نرگس کا رشتہ دے دیا تو پھر رابعہ کی شادی میں بہت مشکلات پیش آئیں گی لہٰذا وہ اکرم کے لیے رابعہ کا رشتہ دینے کو تیار ہے....." اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"پورا پنڈ اس حقیقت سے واقف ہے جی کہ رابعہ کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ کوئی پاگل بھی اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ بے وقوف سے بے وقوف بندہ بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ صدیق مستری نے نرگس کے رشتے سے انکار کرنے کے لیے رابعہ کی شرط لگائی تھی پھر اس نے ایک اور گھٹیا بات بھی کی۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کون سی گھٹیا بات؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''صدیق نے مجھ سے کہا کہ رابعہ کا رشتہ دے کر بھی وہ مجھ پر بڑا احسان کررہا ہے۔'' نور بی بی نے بتایا۔ ''ورنہ جس لڑکے کا بڑا بھائی قاتل ہو اور جیل میں اپنے جرم کی سزا بھگت رہا ہو اسے کون رشتہ دے گا۔''
''ہوں.....!'' میں نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''مختصراً یہ کہ صدیق مستری نے نرگس کا رشتہ نہ دینے کے لیے بہانے بازی سے کام لیا تھا؟''
''جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔'' وہ زور دے کر بولی۔
''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''صدیق مستری نے بیٹیوں کے رشتوں کے سلسلے میں جو اصول بیان کیا تھا پھر خود ہی اس اصول کی نفی کیوں کردی؟''
''کون سا اصول جی؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔
''یہی کہ پہلے بڑی بیٹی رابعہ کی شادی ہوگی اور اس کے بعد نرگس کی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''نرگس کی امین کے ساتھ منگنی تو اس کے اصول کے خلاف ہے نا؟''
''لوگ اپنے مفاد کے لیے سارے اصول اور قاعدے بدل لیتے ہیں جی۔'' وہ کسی فلسفی کے مانند آنکھیں سکیڑ کر بولی۔ ''میں نے آپ کو بتایا ہے نا، صدیق مستری ایک لالچی اور حریص انسان ہے۔''
''اچھا۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''نرگس کی شادی امین کے ساتھ کرنے میں اس کی کون سی حرص اور لالچ چھپی ہوئی تھی؟''
''امین کا باپ ایک خوش حال زمیندار ہے جی اور ہم ٹھہرے غریب مسکین لوگ۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پتا چلا ہے، اس رشتے کی مد میں صدیق مستری نے لڑکے کے باپ مراد علی سے پورے دو ہزار روپے وصول کیے ہیں۔''
''اوہ.....!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
دو ہزار روپے آج کل بے شک ایک معمولی سی رقم ہے لیکن اس زمانے میں جب کا یہ واقعہ رقم کیا جارہا ہے، دو ہزار روپے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ان دنوں اوسط گھرانے کا مہینے بھر کا راشن لگ بھگ تیس روپے کا آجاتا تھا۔ تنخواہ دار طبقے کی ماہانہ آمدنی چالیس سے ساٹھ روپے تک ہوتی تھی۔ چاندی دس روپے اور سونا اسّی نوّے روپے فی تولہ (دس گرام) ہوا کرتا تھا۔
''نور بی بی، اگر تمہاری تمام باتوں کو میں درست تسلیم بھی کرلوں پھر بھی ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''کون سی بات ہے جی؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔
''یہی کہ اکرم اور نرگس کے قتل میں فضیلت یا امین کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم نے انہی دو افراد پر اپنے شک کا اظہار کیا ہے نا؟''
''جی بالکل۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔
''نور بی بی، میری بات غور سے سنو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نرگس کی امین کے ساتھ منگنی ہوچکی تھی اور میری حاصل شدہ معلومات کے مطابق، دو ماہ بعد ان کی شادی ہونے والی تھی۔ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ فضیلت اور امین تمہارے بیٹے سے شدید نفرت کرتے تھے لیکن اس صورت میں تو انہیں صرف اکرم کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ نرگس کی موت میں ان کا ہاتھ کس طرح ہوسکتا ہے۔ نرگس تو امین کی ہونے والی بیوی اور فضیلت کی ہونے والی بہو تھی؟''
''میں آپ کی سوچ کو غلط نہیں کہوں گی تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن شاید آپ کو ایک تلخ حقیقت کا پتا نہیں.....''
''تلخ حقیقت؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کس حقیقت کا ذکر کررہی ہو نور بی بی؟''
''یہ حقیقت کہ نرگس اور امین کی شادی کا فیصلہ مراد علی کا تھا۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''فضیلت اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔
''فضیلت، امین کی شادی اپنی چھوٹی بہن کی بیٹی زرینہ سے کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر مراد علی کی ضد اور زبردستی کی وجہ سے امین کی منگنی نرگس سے ہوگئی.....''
فضیلت اور امین کی نرگس اور اکرم سے دشمنی کے حوالے سے جو فلسفہ نور بی بی نے بیان کیا، وہ آسانی سے مجھے ہضم نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ اس کی دل آزاری نہ ہو، میں نے تسلی بھرے انداز میں کہہ دیا۔
''ٹھیک ہے نور بی بی، تم فکر نہ کرو میں پوری دیانت

داری سے اس معاملے کی تفتیش کروں گا اور تم دیکھو گی کہ اکرم اور نرگس کا قاتل بہت جلد میری گرفت میں ہوگا۔"

"سوہنا رب کرے، ایسا ہی ہو جی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میں تھوڑی دیر اور اس کے پاس بیٹھا پھر وہاں سے چلا آیا۔

میں تھانے پہنچا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ اس وقت تک دُہرے قتل کی اس واردات کی خبر پورے گاؤں کو ہو چکی تھی۔ میں جیسے ہی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا، ایک لحیم شحیم شخص مجھ سے ملنے آ گیا۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ایک سنجیدہ طبع آدمی تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب، میرا نام مراد علی ہے۔ نرگس کی شادی میرے بیٹے امین سے ہونے والی تھی....."

"اوہ.....تو آپ ہیں مراد علی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کا ذکر تو صبح سے سن رہا ہوں، اب مل بھی لیا۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تھانے دار صاحب، میرا ذکر اچھے الفاظ میں ہو رہا تھا یا بُرے میں؟"

جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی۔

اس نے کہا۔ "جناب، نرگس تو دو ماہ کے بعد بہو بن کر میرے گھر آنے والی تھی۔ یہ اچانک کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے ہم پر.....؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہ واقعہ کسی قیامت سے کم نہیں تینوں گھروں کے لیے۔"

"تینوں گھروں؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "دو گھر تو سمجھ میں آ رہے ہیں، تیسرا کون سا ہے؟"

"جو دو گھر آپ کی سمجھ میں آ رہے ہیں وہ کون سے ہیں؟" میں نے مراد علی کی بات کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"ایک گھر تو ہے صدیق مستری کا جہاں سے نرگس کی رخصتی ہونا تھی۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ "دوسرا گھر ہے میرا جہاں نرگس کو بہو بن کر آنا تھا۔"

"اور تیسرا گھر ہے....." میں نے اسی کے انداز میں کہا۔ "نور بی بی کا جس کا جوان جہان بیٹا نرگس کے ساتھ ہی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔"

"اوہ.....!" مراد علی نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ نور بی بی کے گھر میں بھی صف ماتم بچھ گئی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، اس واقعے کے پیچھے ہاتھ بھی اسی کا ہے۔"

نور بی بی نے بڑے واشگاف الفاظ میں دُہرے قتل کی اس لرزہ خیز واردات کے لیے امین اور اس کی ماں فضیلت کو قصور وار ٹھہرایا تھا اور مراد علی نور بی بی کا قصور گنوا رہا تھا۔ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"مراد علی، اس واقعے کے پیچھے نور بی بی کا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"دیکھیں جی....." وہ قدرے آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ "پورے گاؤں کو اس حقیقت کی خبر تھی کہ نرگس اور نور بی بی کے بیٹے اکرم میں پسندیدگی کا تعلق تھا۔ یہ بات میں بھی جانتا تھا۔ اس کے باوجود بھی میں نے اپنے بیٹے کی نرگس کے ساتھ منگنی کر دی اور دو ماہ بعد ان کی شادی ہونے والی تھی۔ نور بی بی اس واقعے کی ذمے دار اس طرح ہے کہ....." وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جب نرگس کی امین کے ساتھ باقاعدہ منگنی ہو گئی اور عنقریب ان کی شادی بھی ہونے والی تھی تو پھر نور بی بی کو چاہیے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو سمجھائے، اسے نرگس سے میل جول کے لیے روکے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو سختی سے اکرم کو منع کر دیتی۔ میں سمجھتا ہوں، نور بی بی کی مجرمانہ غفلت اور ڈھیل نے اکرم کو حوصلہ دیا اور اس نے نرگس سے ملنا جلنا جاری رکھا اور پھر پچھلی رات وہ دونوں بڑے دردناک انداز میں قتل کر دیے گئے۔ میں ان کی لاشیں تو نہیں دیکھ سکا مگر دیکھنے والوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی ہے۔"

"عجیب بات ہے مراد علی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سانحے کے لیے نور بی بی کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں اور نور بی بی نے آپ لوگوں کے خلاف بیان دیا ہے۔"

"ہمارے خلاف.....!" وہ تقریباً اچھل پڑا۔ "کیا کہتی ہے وہ.....؟"

"اس نے دُہرے قتل کی اس واردات کے لیے امین اور فضیلت پر شک ظاہر کیا ہے۔" میں نے نور بی بی کا موقف بیان کر دیا۔

"اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ برہمی سے بولا۔ "امین اپنی ہونے والی بیوی کو کیوں قتل کرے گا اور

فضیلت.....وہ قتل کی کسی واردات میں کیسے ملوث ہو سکتی ہے.....کتنی فضول بات کی ہے اس نے۔"

"بات فضول ہے یا کارآمد مگر نور بی بی اپنے بیان پر بڑی مضبوطی سے ڈٹی ہوئی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اس کے مطابق، فضیلت نرگس کو بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ امین کی شادی اپنی چھوٹی بہن خالدہ کی بیٹی کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ امین بھی خالدہ کی بیٹی زرینہ کو پسند کرتا تھا۔ فضیلت اور امین نرگس کے رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ آپ کی زبردستی کی وجہ سے ہوا تھا اور....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ صدیق مستری ایک حریص اور لالچی انسان ہے۔ بیٹی کے رشتے کے عوض اس نے آپ سے دو ہزار روپے بھی وصول کیے تھے؟"

"یہ بات بھی آپ کو نور بی بی نے بتائی ہوگی؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں نے صدیق مستری کو دو ہزار روپے دیے تھے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن نور بی بی کے اس بیان میں کوئی حقیقت نہیں کہ صدیق مستری کوئی لالچی یا حریص انسان ہے۔ وہ رقم میں نے خود اپنی مرضی سے زبردستی اسے دی تھی۔ میں جانتا ہوں، صدیق کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں چاہتا تھا، صدیق اپنی بیٹی کو ٹھیک ٹھاک انداز میں رخصت کرے۔ اگر اللہ نے مجھے صدیق کا کچھ بوجھ اٹھانے کی توفیق دے رکھی ہے تو میرے اس فعل میں برائی کا کون سا پہلو نکل آتا ہے۔"

"آپ نے جو کچھ کیا اس میں کوئی برائی نہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور جہاں تک فضیلت اور امین کی بات ہے....." وہ اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "یہ درست ہے کہ فضیلت زرینہ کو بہو بنا کر اپنے گھر لانا چاہتی تھی اور امین بھی زرینہ میں دلچسپی لیتا تھا لیکن میں اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔"

"اس گریز کی کوئی خاص وجہ؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا تھانے دار صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں اپنی سالی خالدہ اور اس کے گھر کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہوں لہٰذا میں کسی بھی قیمت پر اپنے بیٹے کا رشتہ اس گھر میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میں اس سلسلے میں آپ کو کریدنے کی کوشش بھی نہیں کروں گا۔" میں نے متعدل انداز میں کہا۔ "لیکن آپ یہ تو بتا سکتے ہیں، نرگس اور اکرم کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"نہیں جناب۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں کسی پر الزام تراشی کر کے خود کو گناہ گار نہیں کر سکتا۔"

"آپ نے تھوڑی دیر پہلے اس لرزہ خیز واقعے کے لیے نور بی بی کو قصور وار ٹھہرانے کی کوشش تو کی ہے نا۔" میں نے یاد دہانی کروانے والے انداز میں کہا۔

"وہ اس حد تک کہ اگر نور بی بی نے اپنے بیٹے اکرم کو سمجھایا ہوتا تو وہ نرگس سے میل ملاقات ختم کر دیتا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "نرگس اور اکرم اپنے بیچ کا تعلق توڑ دیتے تو پچھلی رات اتنی بے دردی سے قتل نہ کر دیے جاتے۔"

"میں سمجھتا ہوں، اس معاملے میں اکرم سے زیادہ نرگس کا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کی آپ کے بیٹے کے ساتھ منگنی ہو چکی تھی لہٰذا اسے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس کی معمولی سی لغزش، اس نوزائدہ رشتے کا خاتمہ کر سکتی تھی۔"

"میں آپ کے خیالات کی تردید نہیں کروں گا۔ تھانے دار صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "غلطی دونوں طرف سے ہوئی ہے۔"

"غلطی ہو چکی اور اس غلطی کے نتیجے میں دو انسانی جانیں ضائع ہو گئیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہلاک ہونے والوں کو تو کسی بھی صورت واپس نہیں لایا جا سکتا تاہم میری اولین کوشش ہوگی کہ جلد از جلد نرگس اور اکرم کے قاتل کو گرفتار کر کے قانون کے مطابق سزا دلوا سکوں۔ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"آپ جو بھی حکم کریں، میں تیار ہوں۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

"یہ تو آپ نے واضح کر دیا کہ کسی پر الزام لگا کر خود کو گناہ گار نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کہا۔ ''لیکن دُہرے قتل کی اس واردات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار تو کرسکتے ہیں۔ یہ کسی دوست کا کارنامہ تو نہیں ہوسکتا نا۔''

''آپ نے ٹھیک کہا، یہ کسی دوست کی نہیں بلکہ دشمن کی کارروائی ہوسکتی ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ ''میرا ذہن کسی پرانی دشمنی کی جانب اشارہ کررہا ہے۔''

''پرانی دشمنی؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اکرم کا بڑا بھائی ولایت اس وقت جیل میں اپنے کیے کی سزا کاٹ رہا ہے۔'' مراد علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اس کے ہاتھوں تین سال پہلے فرید نامی ایک بندے کا قتل ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے، مقتول پارٹی والوں کی طرف سے کسی نے کام دکھادیا ہو۔''

''ولایت کی کہانی تو نور بی بی کی زبانی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا مقتول فرید کے گھر والے ابھی تک سعید نگر میں رہتے ہیں؟''

''نہیں جی۔'' مراد نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اس واقعے کے بعد وہ سعید نگر کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔''

''کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

مراد نے نرگس اور اکرم کے قتل کے حوالے سے جس جانب اشارہ کیا تھا وہ میرے لیے سنسنی خیز اور دلچسپ تھا لہٰذا میری کرید میں تیزی آگئی۔ اکرم کے بڑے بھائی ولایت کے ہاتھوں فرید کا قتل ہوا تھا اور ولایت اسی جرم میں جیل میں بند تھا۔ اب ولایت کا چھوٹا بھائی قتل ہوگیا تھا چنانچہ مقتول فرید کے خاندان کی جانب میرا دھیان جانا لازمی بات تھی۔

مراد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''فرید کے قتل کے کچھ عرصہ بعد تک تو وہ عرصے لوگ ادھر سعید نگر ہی میں رہے پھر مقبول آباد چلے گئے۔ مقبول آباد میں فرید مقتول کے چاچے اور پھوپیاں پہلے سے آباد ہیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ فرید کی ددھیال ہے۔ ان کا دادا تو اب زندہ نہیں مگر زیادہ تر ددھیالی رشتے دار ادھر مقبول آباد میں ہی رہتے ہیں۔''

مقبول آباد نامی وہ گاؤں قصبہ سعید نگر سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے مراد علی سے پوچھا۔

''فرید مقتول کے گھرانے میں کل کتنے افراد تھے؟''

''یہ کل چار افراد کا کنبہ تھا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دو بھائی، فرید اور انور۔ ان کا باپ یعقوب اور ماں غفور بی بی۔ فرید بڑا بھائی تھا اس کے قتل کے بعد یہ گھرانا تین افراد تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔''

میں نے مقبول آباد میں بسنے والے مقتول فرید کے دیگر رشتے داروں کے بارے گھما پھرا کر مختلف سوالات کیے۔ مراد علی جس حد تک ان لوگوں کے بارے میں جانتا تھا، اس نے مجھے بتادیا پھر پوچھ گچھ کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے میں نے اس سے استفسار کیا۔

''مقتول فرید یا اس کے گھر کے کسی فرد کی نرگس یا اس کے گھر والوں سے بھی کسی قسم کی دشمنی تھی؟''

نرگس اور اکرم کا قتل اس امر کی جانب بڑے واضح انداز میں اشارہ کرتا تھا کہ ان کا میل ملاپ کسی شخص کو پسند نہیں تھا۔ اگر اس واردات کی ذمے داری مقتول فرید کے گھر والوں پر ڈالنے کے بارے میں سوچا جاتا تو پھر ان لوگوں کی نرگس کے گھر والوں سے بھی کسی قسم کی دشمنی ہونا لازمی بات تھی۔ مراد علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جناب تو مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کی نرگس یا صدیق مستری سے کوئی پرخاش رہی ہو باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''آپ نے بالکل درست کہا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''اللہ سے زیادہ بہتر اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ یہ بتائیں، امین کہاں ہے، وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟''

''جناب..... وہ گھر میں ہوتا تو میرے ساتھ آتا نا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس بے چارے کو تو کوئی خبر ہی نہیں کہ یہاں سعید نگر میں اس کی ہونے والی بیوی کے ساتھ کیا حالات پیش آچکے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا.....'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ یہاں نہیں تو پھر کہاں ہے؟''

''وہ تو کل صبح سے موضع شاہ کوٹ گیا ہوا ہے جناب۔'' مراد علی نے جواب دیا۔

''شاہ کوٹ۔'' میں نے اس کے الفاظ دُہرائے۔ ''یعنی آپ کی سالی خالدہ کے گاؤں؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو اس کا مطلب ہے، امین کا اپنی خالہ کی بیٹی زرینہ میں پسندیدگی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے؟'' میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے جناب۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ کوٹ میں کوئی صرف

میری سالی خالدہ ہی کا گھر نہیں ہے۔ وہاں میرے بھی کئی رشتے دار آباد ہیں۔ یوں سمجھیں کہ امین کی ددھیال وہاں بستی ہے اور امین مہینے میں ایک آدھ چکر وہاں کا لگا تا رہتا ہے۔''

''اوہ..... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب۔'' وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''دُہرے قتل کی اس واردات کے سلسلے میں ابھی تک آپ نے کیا تفتیش کی ہے؟''

''ابھی تو تفتیش کا آغاز ہوا ہے مراد علی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے امید ہے، میں بہت جلد نرگس اور اکرم کے قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو جناب۔'' اس نے خلوص دل سے کہا۔

میں مزید تھوڑی دیر تک مراد علی سے بات چیت کرتا رہا پھر اسے رخصت کردیا۔ اس نے جاتے جاتے مجھے یقین دلایا کہ اس واردات کے سلسلے میں جیسے ہی کوئی اہم خبر اس کو ملی وہ سیدھا میرے پاس آئے گا۔

مراد علی سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں امین کی ذات شک کے دائرے سے باہر چلی گئی تھی۔ وہ بندہ اگر کل صبح موضع شاہ کوٹ گیا تھا اور ابھی تک وہ سعید نگر واپس نہیں لوٹا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ قتل کی اس واردات میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میں پہلے بھی اسے اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھ رہا تھا۔ نرگس اور اکرم کی محبت کی کہانی پورے گاؤں کو معلوم تھی۔ اگر امین کے دل میں اکرم کے لیے کوئی دشمنی چھپی ہوتی تو وہ اس سے شادی سے صاف انکار کرسکتا تھا جب کہ اس کا دل بھی اپنی خالہ زاد زرینہ میں اٹکا ہوا تھا۔ اسی طرح امین کی والدہ فضیلت بھی اس کارروائی سے جُڑی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ گویا، اکرم کی والدہ نور بی بی نے جو دعویٰ کیا تھا اس میں کوئی دم خم نہیں تھا۔

باقی باتیں تو رہیں ایک طرف البتہ مراد علی نے فرید مقتول کے حوالے سے اس کے خاندان کی طرف جو اشارہ کیا تھا اس میں اچھی خاصی جان تھی۔ اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اکرم اور نرگس کے قتل میں ان لوگوں میں سے کسی کا ہاتھ ہو۔

میں نے حوالدار سرفراز احمد کو اپنے پاس بلایا اور موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

''سرفراز! تمہیں اسی وقت مقبول آباد روانہ ہونا ہے۔ اپنے ساتھ ایک کانسٹیبل کو بھی لے جاؤ۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی، بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے وہاں جاکر انور اور اس کے گھر والوں کے بارے میں معلومات جمع کرنا ہے۔ انور کی پچھلی رات کی سرگرمیوں کی رپورٹ آپ کو پیش کرنا ہے۔''

''بالکل..... میں یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''لیکن یہ کام اتنی احتیاط سے ہونا چاہیے کہ ان لوگوں کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔''

''آپ فکر ہی نہیں کریں ملک صاحب۔'' وہ اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو انشاء اللہ مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''سرفراز، ادھر مقبول آباد میں تو تمہارے رشتے بھی رہتے ہیں نا؟''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میری امی کے کچھ رشتے دار اُدھر رہتے ہیں۔ میں سادہ لباس میں ان سے ملنے ہی جاؤں گا لیکن در پردہ میں اس مشن پر کام کروں گا جو آپ نے سونپا ہے۔''

''ہاں..... یہی مناسب رہے گا۔'' میں نے اس کے منصوبے کو سراہتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے ساتھ جس بھی کانسٹیبل کو لے جانا چاہو، لے جاسکتے ہو۔ تمہاری پہلی کوشش تو نہایت ہی احتیاط کے ساتھ انور کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا ہے اور اگر تم محسوس کرو کہ وہ کسی بھی حوالے سے اکرم اور نرگس کے قتل میں ملوث ہے تو تم فوراً اسے گرفتار بھی کرسکتے ہو۔ میری طرف سے تمہیں اس کام کی مکمل اجازت ہے۔ گرفتاری کے لوازمات کے ساتھ ہی مقبول آباد کا رخ کرنا۔''

''جو آپ کا حکم ملک صاحب۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے ضروری ہدایات کے ساتھ اسے رخصت کردیا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے کانسٹیبل عباس کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''عباس! آج کی رات تمہیں بڑی کڑی ڈیوٹی دینا ہے۔''

''آپ حکم کریں ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے کڑی کیا اور نرم کیا جناب۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"عباس، تمہاری یہی باتیں مجھے متاثر کرتی ہیں۔" میں نے تعریفی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہارے اندر احساس ذمے داری کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کاش پولیس ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہر شخص تمہارے ہی انداز میں سوچنے لگے۔"

"جناب، یہ تو آپ کی محبت اور مہربانی ہے ورنہ میں تو ایک عام سا پولیس اہلکار ہوں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"عباس۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آج کل شدید سردی کا موسم ہے اور رات میں تو ٹھنڈ قیامت خیز ہو جاتی ہے۔ اسی ٹھنڈی ٹھار رات میں تمہیں کھلے میں ڈیوٹی دینا ہے۔"

"دوں گا ملک صاحب۔" وہ بڑے عزم سے بولا۔ "آپ حکم کریں، کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے؟"

"جانا تو ہے چودھری فرزند علی کے کھیتوں میں....." میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اس کمرے کے آس پاس جہاں پچھلی رات نرگس اور اکرم محبت کی کہانی رقم کرتے ہوئے قتل کر دیے گئے تھے۔ وہ کمرا جہاں چودھری فرزند علی کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ مختلف زرعی آلات رکھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اس کمرے کے اردگرد موجود رہ کر وہاں کی نگرانی کروں گا لیکن یہ تو بتائیں، یہ نگرانی کس نوعیت کی ہوگی؟"

"بہت اچھا سوال ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دیکھو عباس! میں نے اس کمرے میں جس محنت اور مہارت سے تفتیش کی ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ آج کی رات ادھر کا ایک آدھ چکر ضرور لگائے گا۔ آلۂ قتل ابھی تک برآمد نہیں ہو سکا اور مجھے یقین ہے، قاتل نے آلۂ قتل کو جائے وقوعہ کے قریب ہی کہیں پھینکا ہوگا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کمرے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے۔ وہ آس پاس کے علاقے میں بھی نظر آ سکتا ہے۔"

"جی، میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔" عباس علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

میں نے اسے چند ضروری ہدایات دینے کے بعد استفسار کیا۔ "عباس! مجھے تمہاری صلاحیت پر تو کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے لیکن میں پھر بھی یہ جاننا چاہوں گا کہ تم اس کام کے لیے مورچا کہاں بناؤ گے..... میرا مطلب ہے، تم کہاں پر بیٹھ کر نگرانی کا کام کرو گے؟"

"مجھے پتا تھا، آپ یہ سوال ضرور کریں گے۔" وہ چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "ملک صاحب! جب آپ نے اس کمرے اور نگرانی کا ذکر کیا تھا تو میرے ذہن نے فوراً فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ کام مجھے کس مقام پر بیٹھ کر کرنا ہوگا۔ آپ سنیں گے تو مجھے داد دیں گے۔"

"میں ضرور سننا چاہوں گا۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ "بتاؤ، کہاں بیٹھ کر تم جائے وقوعہ کی نگرانی کرو گے؟"

"آپ کو اچھی طرح معلوم ہے جناب کہ مذکورہ کمرا کھیتوں کے آخری کنارے پر واقع ہے۔" عباس وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور اس کمرے سے دریائے راوی چند قدموں کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ نے جب دریا کے اندر پڑی اکرم اور نرگس کی لاشوں کا معائنہ کیا تو یہ بات آپ کے مشاہدے میں ضرور آئی ہوگی کہ دریائے راوی کے کنارے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹہلی شیشم اور کیکر کے بلند و بالا درخت لگے ہوئے ہیں اور....."

"بس عباس۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "میں سمجھ گیا، تم انہی میں سے کسی درخت پر بیٹھ کر جائے وقوعہ کی نگرانی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"درست فرمایا آپ نے۔" وہ بڑی شدت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "کیکر کے درخت پر تو کانٹوں کا خطرہ قدم قدم پر موجود رہتا ہے۔ میں اس کام کے لیے ٹہلی کے درخت کا انتخاب کروں گا۔ اچھی طرح گرم کپڑے پہن لوں گا اور ساتھ میں اوڑھنے کے لیے گرم کمبل بھی لے جاؤں گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔"

"بہت خوب۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "عباس تمہارا منصوبہ مجھے پسند آیا ہے۔"

"شکریہ ملک صاحب۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے، تم ابھی سے رات والے مشن کی تیاری شروع کر دو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتا دینا۔"

"او کے ملک صاحب۔" اس نے مجھے سیلیوٹ کیا اور کمرے سے نکل گیا۔

عباس کے جانے کے بعد میں نرگس اور اکرم کے قتل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ قاتل جو کوئی بھی تھا اسے نرگس کا اکرم کے ساتھ ملنا جلنا سخت ناپسند تھا۔ اس سلسلے میں جو نام ابھی تک میرے سامنے آئے تھے ان میں امین سرفہرست تھا۔ نرگس اس کی منگیتر تھی۔ ظاہر ہے، اکرم کے ساتھ اس کا میل جول امین کو اچھا نہیں لگتا ہوگا لیکن امین تو گزشتہ رات سعید نگر میں موجود ہی نہیں تھا۔ جائے وقوعہ سے اس کی غیر موجودی اس کی بے گناہی کو ثابت کرتی تھی۔

دوسرا زاویہ اکرم کا تھا۔ دُہرے قتل کی یہ واردات اکرم کے کسی دشمن کی کارروائی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ اکرم کی جان لینے جائے وقوعہ پر پہنچا ہو اور پہچان لیے جانے کے خوف سے اس نے نرگس کا کام بھی تمام کر دیا ہو۔ اس حوالے سے سردست مقتول فرید کا خاندان سامنے آیا تھا اور میں نے حوالدار سرفراز کو اس خاندان کی خبر گیری کے لیے مقبول آباد روانہ کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ کوئی نہ کوئی خبر لے کر آئے گا۔

سعید نگر میں موجود لوگوں، خاص طور پر متعلقہ افراد کو میں اچھی طرح ٹٹول چکا تھا لیکن ابھی تک قاتل کے حوالے سے کوئی سراغ میرے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا۔ صرف ایک پارٹی کو چیک کرنا باقی تھا اور وہ تھے نرگس کے والدین۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور صدیق مستری کے گھر پہنچ گیا۔ دروازے کے باہر ہی سے مجھے رونے پیٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی صدیق مستری اور اس کی بیوی فتح پور سے واپس آئے ہیں۔ جوان جہان بیٹی کی موت کا سن کر ان پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ گھر کے اندر سے اٹھنے والی آہ وبکا اسی سلسلے میں تھی۔

میری آمد کی اطلاع اندر پہنچی تو مراد علی مجھے اپنے ساتھ گھر میں لے گیا۔ وہ اپنے ہونے والے بلکہ اب کبھی نہ ہو سکنے والے سمدھی کے گھر میں اس کی دلجوئی کے لیے آیا ہوا تھا۔ میں مراد علی کے ساتھ صدیق مستری کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ گھر کے پچھلے حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ سامنے والے حصے میں ایک بیٹھک نما کمرا تھا جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ بیچ میں اوسط درجے کا صحن تھا۔ گھر کے اندر سے اٹھنے والی آوازوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہ ہوا کہ وہاں درجن بھر افراد موجود تھے جن میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ مراد علی جلد ہی صدیق مستری اور اس کی بیوی آسیہ کو میرے پاس بیٹھک میں لے آیا۔

صدیق مستری ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی صحت کو تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں آسیہ خاصی تنومند عورت تھی۔ آسیہ فربہ اندام اور گوری چٹی تھی جبکہ صدیق مستری کا رنگ گندمی اور وہ بھی جھلسا ہوا گندمی تھا تاہم ان لمحات میں وہ دونوں بے حد پریشان اور دکھی نظر آ رہے تھے۔

مراد علی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تھانے دار صاحب! اگر آپ تنہائی میں نرگس کے ماں باپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں تو میں باہر چلا جاتا ہوں؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اس کی ضرورت نہیں، آپ کے یہاں موجود رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"شکریہ..... تھانے دار صاحب۔" وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

صدیق مستری اور آسیہ کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ میں نے مناسب الفاظ میں انہیں تسلی دلاسا دیا اور کہا۔ "مجھے نرگس کی اندوہ ناک موت کا بہت دکھ ہے۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے واپس تو نہیں لا سکتا لیکن آپ لوگوں سے میرا وعدہ ہے کہ میں اس کے قاتل کو جلد از جلد گرفتار کر کے کڑی سے کڑی سزا دلوانے کی کوشش کروں گا۔"

"پتا نہیں، کس ظالم نے ہمارا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔" آسیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ہماری خوشیوں کو کس شیطان کی نظر کھا گئی ہے۔"

"ہماری تو کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں تھی۔" صدیق مستری نے دکھی لہجے میں کہا۔ "ہم دونوں بہنوں کو ٹھیک ٹھاک ہنستے کھیلتے گھر میں چھوڑ کر گئے تھے اور واپس آئے ہیں تو نرگس کی موت کی خبر سننے کو ملی ہے۔"

ظاہر ہے، بیٹی کی موت کا انہیں دکھ تھا اسی لیے وہ دکھی بھی ہو رہے تھے لیکن میں بھی اپنے فرض سے مجبور تھا لہٰذا بڑے ٹھوس انداز میں، میں نے ان سے کہا۔

"میں آپ لوگوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن تفتیش بھی ضروری ہے اور تفتیش یہ کہتی ہے کہ نرگس اور اکرم کا قتل کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ انہیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ قاتل جو کوئی بھی ہے اسے ان دونوں کا ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

امید ہے، آپ لوگ قاتل کی تلاش کے سلسلے میں ضرور میری مدد کریں گے۔"

"ہم کیا مدد کر سکتے ہیں جناب۔" صدیق نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

"یہ مدد کہ..... نرگس سے اکرم کا ملنا جلنا کس شخص کو ناپسند تھا۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میں اس شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں۔"

"اگر اس کے بارے میں ہمیں پتا ہوتا تو میں ابھی اس شیطان کی اولاد کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتی۔" آسیہ غصیلے لہجے میں بولی۔ "آپ کو چاہیے کہ جلد از جلد نرگس کے قاتل کو گرفتار کریں۔ آپ تو الٹا ہم پر ہی دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے آسیہ بہن۔" مراد علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تھانے دار صاحب تو معمول کی پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

"میں آپ لوگوں پر دباؤ نہیں ڈال رہا بلکہ آپ کی کوتاہیوں کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہماری کوتاہیاں.....؟" صدیق مستری نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

آسیہ نے برہمی سے کہا۔ "ہم نے کیا کیا ہے تھانے دار صاحب؟"

"آپ لوگوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "اور لگتا ہے کہ آپ لوگوں کو اس سنگین غلطی کا ذرا سا بھی احساس نہیں۔"

"غفلت..... کیسی غفلت تھانے دار صاحب؟" صدیق مستری الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"نمبر ایک....." میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جب پورا گاؤں جانتا ہے تو آپ دونوں کو بھی یہ بات پتا ہوگی کہ نرگس اور اکرم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور وہ چوری چھپے آپس میں ملتے بھی تھے۔ ان کا میل ملاپ، درست تھا یا غلط، یہ موقع اس بحث میں پڑنے کا نہیں ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ جب آپ لوگوں نے اپنی بیٹی کی منگنی مراد علی کے بیٹے امین سے کر دی اور دو ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی تو آپ نے اس کی سرگرمیوں پر نظر کیوں نہیں رکھی۔ آپ کا فرض بنتا تھا کہ اسے سمجھائیں کہ اکرم سے تعلق اس کی آنے والی زندگی کے لیے زہر ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میں نے یہ بات نرگس کو اچھی طرح سمجھا دی تھی۔" آسیہ نے بتایا۔ "اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ وہ اکرم سے کبھی نہیں ملے گی۔"

"لیکن گزشتہ رات والی خوف ناک واردات اس بات کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہے کہ نرگس اور اکرم چودھری فرزند علی کی زمینوں میں بنے ہوئے کمرے میں ملے تھے....." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے معائنہ کیا ہے۔ نرگس اور اکرم کو اسی کمرے کے اندر کسی تیز دھار آلے کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ بعد ازاں ان کی لاشوں کو کھیتوں میں گھسیٹ کر دریا میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"..... کہ نرگس رات کی تاریکی میں اکرم سے ملنے کھیتوں والے اس کمرے میں پہنچی تھی جب کہ اسے ایسا ہرگز ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ نرگس آپ لوگوں کی بیٹی ہے اور آپ کی ذمے داری ہے لیکن اس کا یہ فعل آپ کی غفلت اور کوتاہی میں شمار ہوگا۔"

"کل ہم لوگ فتح پور گئے ہوئے تھے۔" صدیق مستری نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "رات کو واپس نہیں آ سکے تو نرگس کو گھر سے نکلنے کا موقع مل گیا۔"

"یہ کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر آپ لوگوں کا فتح پور جانا بہت ضروری تھا تو رات کو ہر صورت واپس آ جانا چاہیے تھا۔ آپ کی بڑی بیٹی ذہنی طور پر معذور ہے۔ وہ خود کو نہیں سنبھال سکتی، نرگس کا کیا خیال رکھتی اور اگر آپ لوگوں کو اس بات کا اندازہ تھا کہ رات کو واپسی نہیں ہو سکے گی تو آپ کو گھر میں خاندان کی کسی سیانی عورت کو چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" آسیہ نے کہا۔ "واقعی ہم سے غلطی ہوئی ہے۔"

"غلطی ہوئی اور اس کا بھیانک نتیجہ بھی سامنے آ گیا۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب آپ لوگوں کی غلطی کی تلافی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ قاتل تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔"

"ہم کس طرح مدد کر سکتے ہیں جناب؟" صدیق مستری نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"بہت ہی آسانی سے۔" میں نے گہری سنجیدگی

سے کہا۔ "آپ صرف مجھے اس شخص یا ان لوگوں کے نام بتائیں جو نرگس اور اکرم کے میل جول کو پسند نہیں کرتے تھے؟"

"ہم دونوں میاں بیوی کو ان کا ملنا اچھا نہیں لگتا تھا۔" صدیق مستری نے جواب دیا۔ "میں نے آسیہ کو زور دے کر کہا تھا کہ وہ نرگس کو سمجھائے اور اس اللہ کی بندی نے سمجھایا بھی تھا۔ آسیہ نے جب مجھے بتایا کہ نرگس نے اس سے وعدہ کیا ہے، وہ اب بھی اکرم سے نہیں ملے گی تو میں مطمئن ہو گیا تھا لیکن....."

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں نے اکرم کی ماں سے بھی اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی؟"

"جی کئی بار کی تھی۔" آسیہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ "وہ بڑے الٹے دماغ کی بڈھی ہے۔"

"الٹے دماغ کی بڈھی..... کیا مطلب؟" میں نے چونک کر آسیہ کی طرف دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں جناب۔" صدیق مستری نے کہا۔ "نور بی بی کچھ عرصہ پہلے نرگس کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھی اور میں نے صاف انکار کر دیا تھا پھر نرگس کی امین سے منگنی ہو گئی۔ نور بی بی اس بات سے چڑی ہوئی ہے کہ میں نے اکرم کو نرگس کے رشتے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اکرم کو سمجھانے کے بجائے الٹا اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔ اکرم اگر باز آ جاتا تو نرگس کی ہمت بھی ٹوٹ جاتی اور آج ہم سب کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"جناب میں نے آپ کو بتایا ہے نا سب سے زیادہ قصور اسی نور بی بی کا ہے۔" مراد علی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "صدیق بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگر نور بی بی عقل مندی سے کام لیتی تو معاملات کو سنبھالا جا سکتا تھا۔"

"لیکن اب تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "نرگس اور اکرم سمجھائے جانے کی منزل سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ انہیں واپس لانا کسی بھی طور ممکن نہیں۔ اب تو صرف اور صرف ان کے قاتل تک رسائی حاصل کرنا ہے۔ آپ لوگ بتائیں، یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟"

وہ تینوں باری باری ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

میں نے گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے کرید جاری رکھی۔ بالآخر آسیہ کی زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میرے ساتھ ہی مراد علی بھی چونک اٹھا تھا کیونکہ وہ بھی اس واقعے سے آگاہ نہیں تھا۔

یہ چند روز پہلے کا واقعہ تھا۔ ان دنوں نرگس کی ابھی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ نرگس اکرم کو پسند کرتی تھی مگر گاؤں میں ایک اور شخص بھی ایسا تھا جو نرگس کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا تھا اور اس نوجوان کا نام تھا صفدر۔ صفدر کا تعلق بھی سعید نگر ہی سے تھا۔ وہ جلال دین کمہار کا بیٹا تھا۔ صفدر کہنے کو نوجوان تھا مگر اس کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ صحت کا اس سے خدا واسطے کا بیر رہا ہوگا۔ دھان پان اور لاغر سا۔ اکرم کو جب پتا چلا صفدر بھی نرگس کا امیدوار ہے تو وہ غصے میں آ گیا۔ کیونکہ نرگس نے اکرم سے صفدر کی شکایت بھی کر دی تھی۔ نرگس کے مطابق، صفدر اسے دیکھ کر گھٹیا قسم کی حرکتیں بھی کرتا تھا۔ اکرم اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے صفدر کی بڑی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی لگا دی تھی۔ صفدر کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔ وہ چونکہ اکرم کے مقابلے میں بہت کمزور تھا لہٰذا وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اکرم بے دریغ اسے پیٹتا رہا اور وہ مار کھاتا چلا گیا۔ مراد علی کو اتنی خبر تو تھی کہ گاؤں کے دو لڑکوں کی آپس میں لڑائی ہوئی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس دنگا فساد کے پیچھے وہی لڑکی چھپی ہوئی تھی، چند روز بعد وہ اپنے بیٹے کے لیے جس کا رشتہ مانگنے والا تھا۔ آسیہ کی بات ختم ہوئی تو میں نے صدیق مستری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کیا کہتے ہو صدیق، کیا صفدر ان دونوں کا قاتل ہو سکتا ہے؟"

"لگتا تو نہیں جناب۔" اس نے جواب دیا۔ "اس میں اتنی ہمت نظر نہیں آتی۔ اکرم نے اسے جتنے بُرے انداز میں پیٹا تھا اگر اس میں جرأت ہوتی تو وہ اس کا ہاتھ روکنے کی ضرور کوشش کرتا۔"

"اکرم نے جس وحشیانہ انداز میں صفدر کی پٹائی کی تھی اسی کے پیش نظر میں اس زاویے پر سوچ رہا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "صفدر کی پٹائی چونکہ نرگس کی وجہ سے ہوئی تھی لہٰذا ہو سکتا ہے، وہ اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے کسی موقع کے انتظار میں ہو۔ پچھلی رات اسے یہ موقع میسر آ گیا اور اس نے نرگس اور اکرم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"ایسا سوچنا عین منطقی اور فطری عمل ہے تھانے دار صاحب۔" مراد علی نے کہا۔ "لیکن میں نہیں سمجھتا، صفدر ایسی جرأت کا مظاہرہ کر سکتا ہو۔ میں نے صفدر کو دیکھ رکھا ہے جناب..... وہ چڑیا کے دل والا ایک کمزور سا لڑکا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''بہرحال، میں اس چڑی مار صفدر کو ضرور چیک کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مجھے اس کے گھر کا ایڈریس بتائیں۔''

صدیق مستری نے فوراً ہی میری مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔ میں اٹھنے لگا تو آسیہ نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''تھانے دار صاحب یہ تو بتادیں کہ نرگس کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی۔ اس کی ڈولی تو نہیں اٹھ سکی۔ اب اس گھر سے اس کا جنازہ ہی اٹھے گا.....'' بیٹھک کی فضا میں سناٹا چھا گیا۔ آسیہ کی بات نے سب کو غمزدہ کردیا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے امید ہے، کل شام سے پہلے دونوں لاشیں اسپتال سے تھانے پہنچ جائیں گی۔ اس کے بعد نرگس کی لاش کو آپ کے گھر تک پہنچانا میری ذمے داری ہوگی۔''

''بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔'' صدیق مستری نے تشکر آمیز انداز میں کہا اور میرے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں انہیں تسلی تشفی دینے کے بعد گھر سے نکل آیا۔

جب میں تھانے پہنچا تو اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ وہ موسم سرما کے دن تھے۔ دن چھوٹا اور رات طویل اور ٹھنڈی ٹھار۔ میں نے تھانے میں پھیلے ہوئے اپنے معاملات کو سمیٹا اور کوارٹر میں آگیا۔ میرا کوارٹر تھانے کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ جب میں تھانے سے اٹھا تو کانسٹیبل عباس علی میرے سونپے گئے مشن پر روانہ ہوچکا تھا۔

میں نے رات کا کھانا کھایا، عشا کی نماز ادا کی اور گرم لحاف میں دبک گیا۔ دن پورا بھاگ دوڑ میں گزرا تھا اور بدن تھکن سے چور تھا لیکن اس کے باوجود بھی اس رات میں دیر تک جاگتا رہا اور دُہرے قتل کی اس پراسرار واردات کے بارے میں سوچتا رہا۔

نرگس اور اکرم کا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ خاصا الجھا ہوا معاملہ تھا۔ نور بی بی، نرگس اور اس کے گھر والوں سے خفا تھی۔ اگر اس نے اپنی خفگی نکالنے کے لیے نرگس کو کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچا ہوگا تو پھر اکرم کا قتل کوئی معنی اور جواز نہیں رکھتا تھا۔

یونہی اگر دیکھا جاتا تو صدیق مستری اور آسیہ کو اکرم کی حرکتیں سخت ناپسند تھیں۔ اس نے ان کی بیٹی نرگس کو اپنے ہاتھوں کا کھلونا بنا رکھا تھا۔ اگر وہ دونوں میاں بیوی یا ان میں سے کوئی ایک اکرم کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچتا تو پھر وہ نرگس کی جان لینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

تیسرا گھر مراد علی کا تھا جہاں نرگس کو بیاہ کر جانا تھا۔ ان لوگوں کو بھی اکرم سے تو شدید ترین نفرت ہوسکتی تھی مگر وہ نرگس کو جانی نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ بھی شک کے دائرے سے باہر نکل جاتے تھے۔

اب تک کی تفتیش سے جو نتائج سامنے آئے تھے ان کی روشنی میں مجھے حوالدار سرفراز کی واپسی کا انتظار کرنا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ انور کے حوالے سے کسی سنسنی خیز خبر کے ساتھ لوٹے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آئندہ روز دو اہم کام بھی انجام دینا تھے۔

نمبر ایک، آلۂ قتل کی تلاش کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت تھی۔ کسی بھی قتل کی واردات میں آلۂ قتل کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے جس کی بازیابی کے بعد قاتل تک رسائی نسبتاً آسان ہوجاتی ہے۔

نمبر دو، کل صبح پہلی فرصت میں مجھے جلال دین کمہار کے بیٹے صفدر کو تھانے بلا کر اس سے کڑی پوچھ گچھ کرنا تھی۔ اس واردات سے کچھ عرصہ پہلے صفدر اور اکرم میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا جس میں اکرم نے صفدر کو اچھا خاصا جسمانی نقصان پہنچایا تھا۔ اس بات کے امکانات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ صفدر نے کسی گہری منصوبہ بندی کے بعد اکرم اور نرگس کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ اگرچہ وہ نرگس کا طلبگار تھا تاہم اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اکرم کے ہوتے ہوئے نرگس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ زور زبردستی کا ایک تجربہ اس نے کرکے دیکھ لیا تھا جس میں اسے بری طرح ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ چودھری فرزند علی کی حویلی میں گزشتہ رات چوری کی بہ الفاظ دیگر ڈکیتی کی ایک خوف ناک واردات ہوگئی تھی۔ دن کا ابتدائی حصہ اسی سلسلے کی بھاگ دوڑ میں گزر گیا تھا لیکن ڈکیتی کی اس واردات کا زیر نظر دُہرے قتل کی واردات کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

تھانے میں بیٹھنے کا موقع دوپہر کے بعد ہی نصیب ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آیا ہی تھا کہ اکرم کی بوڑھی ماں نور بی بی مجھ سے ملنے آگئی۔ میں نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ وہ خاصی اجڑی بچڑی دکھائی دیتی تھی۔ سب سے پہلے اس نے مجھ سے اپنے مقتول بیٹے کے بارے میں ہی

سوال کیا۔

''تھانے دار صاحب! اکرم کی لاش کب تک اسپتال سے واپس آجائے گی؟''

کسی بھی مقتول کی لاش کے حوالے سے اس کے ورثا کا یہ سوال بڑا تکلیف دہ اور دلگرفتہ ہوتا ہے لیکن بہرحال کسی نہ کسی طرح اس کا جواب بھی دینا ہی پڑتا ہے۔ میں نے نور بی بی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے امید ہے، آج شام تک دونوں لاشیں سرکاری اسپتال سے تھانے پہنچ جائیں گی اور اگر دیر بھی ہوئی تو کل صبح لازماً آجائیں گی۔ تم اس سلسلے میں پریشان نہیں ہونا۔ جیسے ہی لاشیں یہاں آتی ہیں، میں تمہیں اس کی اطلاع دے دوں گا۔''

اس نے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر مستفسر ہوئی۔ ''تھانے دار جی! اکرم کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا..... آپ نے ابھی تک امین اور فضیلت کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟''

''اچھا سوال کیا ہے تم نے نور بی بی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فضیلت اور امین کو میں نے اس لیے گرفتار نہیں کیا کہ میری تفتیش کے مطابق، فضیلت قتل کی اس واردات میں ملوث نہیں ہے اور جہاں تک امین کا تعلق ہے تو جس رات نرگس اور اکرم کو قتل کیا گیا امین سعید نگر سے کوسوں دور، موضع شاہ کوٹ میں تھا۔ اب میں آتا ہوں تمہارے سوال کے پہلے حصے کی جانب.....''

میں نے لمحاتی توقف کرکے سوالیہ نظر سے نور بی بی کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوگئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے پوچھا ہے کہ اکرم کے قاتل کے بارے میں پتا چلا یا نہیں تو جب مقتول کے وارث اہم باتوں کو چھپائیں گے تو پولیس کس طرح قاتل کا سراغ لگا سکے گی۔''

''مقتول کے وارث.....!'' وہ بھونچکا نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نور بی بی۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''لیکن اکرم کی وارث تو میں ہوں۔'' اس کی حیرانی دوچند ہوگئی۔ ''میں نے تو آپ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کا اشارہ شاید صدیق مستری اور اس کی بیوی آسیہ کی جانب ہے۔''

''نہیں نور بی بی میرا اشارہ صرف اور صرف تمہاری طرف ہے۔''

''مگر..... میں نے..... آپ سے کون سی اہم بات چھپائی ہے؟'' اس کی الجھن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔

''کیا تم اسی گاؤں میں بسنے والے کسی نوجوان صفدر کو جانتی ہو؟''

''صفدر.....!'' وہ چونکی۔ ''آپ جلال دین کمہار کے لڑکے کی بات کررہے ہیں؟''

''بالکل..... میں اسی کا ذکر کررہا ہوں۔''

''صفدر کو کیا ہوا ہے جی؟''

''کیا یہ سچ ہے نور بی بی کہ.....'' میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔ ''کچھ عرصہ پہلے صفدر اور اکرم کے بیچ زبردست جھگڑا ہوا تھا جس میں اکرم نے مار مار کر صفدر کو لہولہان کردیا تھا؟''

''ہاں، یہ سچ ہے جناب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟''

''میں سمجھی، یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔''

''ان دونوں کے بیچ نرگس کی وجہ سے جھگڑا ہوا تھا نا؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا پھر چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ کو یہ قصہ آسیہ نے سنایا ہوگا؟''

''کسی نے بھی سنایا ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''اکرم اور صفدر کے درمیان نرگس کے معاملے پر جھگڑا ہوا تھا اور اکرم نے مار مار کر صفدر کا بھرکس نکال دیا تھا۔ وہ اس وقت تو کچھ نہ کرسکا لیکن عین ممکن ہے، اس نے موقع ملتے ہی اکرم اور نرگس کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔''

''تو آپ کا مطلب ہے، صفدر نے نرگس اور اکرم کو قتل کیا ہے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''ابھی اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک امکان ہے۔ میں ابھی صفدر کو تھانے بلا کر اس سے پوچھ گچھ کرتا ہوں۔ جو بھی حقیقت ہوگی، سامنے آجائے گی.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اس کی تسلی کے لیے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کل اپنے تھانے کے عملے کے دو افراد کو مقبول آباد بھی روانہ کردیا تھا۔ مجھے امید ہے، وہاں سے کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

حوصلہ بخش رپورٹ آئے گی۔"

مقبول آباد کا ذکر سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے، جلدی سے بولی۔ "وہاں آپ نے دو بندوں کو کیوں بھیجا ہے جی؟"

"تمہارے بڑے بیٹے ولایت کے ہاتھوں فرید کا قتل ہوا تھا نا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "فرید کا چھوٹا بھائی انور اور اس کے ماں باپ سعید نگر سے جانے کے بعد مقبول آباد میں بس گئے تھے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں اس دُہرے قتل میں انور کا ہاتھ نہ ہو۔ اس نے اپنے بڑے بھائی فرید کا بدلہ لینے کے لیے اکرم اور اس کی محبوبہ کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیا ہو۔"

"ہاں جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ میرا تو ادھر دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"میں نے مقبول آباد والی بات صرف تمہیں بتائی ہے نور بی بی۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "کسی سے اس کا ذکر نہیں کرنا ورنہ خوامخواہ تفتیش میں روک پڑے گی۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں تھانے دار صاحب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں یہ راز کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گی۔ آپ تو میرے اکرم کی موت کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ آپ جلد از جلد اکرم کے قاتل کو گرفتار کر کے اسے عدالت سے پھانسی کی سزا دلوا دیں تاکہ میرا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے نور بی بی۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم زیادہ فکرمند نہیں ہو۔ میں بہت جلد نرگس اور اکرم کے قتل کا معما حل کر لوں گا۔" پھر میں نے نور بی بی کو تشفی دے کر تھانے سے رخصت کر دیا۔

نور بی بی کی اپنی ایک مخصوص سوچ تھی۔ وہ جب بھی اس واردات کے مجرم کی گرفتاری یا اسے سزا دلوانے کی بات کرتی تھی تو اس کے منہ سے اکرم کا قاتل کے الفاظ ہی خارج ہوتے تھے۔ کبھی اس نے نرگس کا قاتل یا نرگس اور اکرم کا قاتل کے الفاظ استعمال نہیں کیے تھے۔ اس کے اس رویے سے خودغرضی اور نرگس سے اس کی قلبی عداوت جھلکتی تھی۔ وہ ایک اور معاملے میں بھی اسی سوچ کی حامل دکھائی دیتی تھی۔

اس نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ میں جلد از جلد اکرم کے قاتل کو گرفتار کر کے اسے عدالت سے پھانسی کی سزا دلواؤں تاکہ اس کا کلیجا ٹھنڈا ہو جائے۔ ان جذبات کا اظہار کرتے ہوئے وہ یہ بات بھول گئی تھی کہ غفور بی بی بھی ایک ماں ہے اور اس کے سینے میں بھی ایک کلیجا موجود ہے۔ اگر ولایت کو فرید کے قتل کی سزا کے طور پر پھانسی دے دی جاتی تو یقیناً اس سے غفور بی بی کے سینے میں ٹھنڈ پڑنا تھی بہرحال انسانی جذبات اور احساسات ایک وسیع موضوع ہے۔

جس دوران میں، میں نور بی بی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل عباس کو اپنے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے خاصا بے چین نظر آیا تھا۔ عباس علی کو میں نے گزشتہ رات جائے وقوعہ کی نگرانی کی ڈیوٹی سونپی تھی۔ نور بی بی کے جانے کے فوراً بعد میں نے عباس علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے میرے کمرے میں آ کر سیلیوٹ کیا تو میں نے کہا۔ "بیٹھ جاؤ عباس۔"

وہ میری میز کی دوسری جانب بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا خوف اور ابھرا ابھرا جوش دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"عباس، اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم کوئی سنسنی خیز خبر لے کر آئے ہو؟"

"آپ غلطی کر ہی نہیں سکتے ملک صاحب۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "خبر ایسی ہے کہ آپ سنیں گے تو پھڑک اٹھیں گے۔"

اس نے پھڑک اٹھیں گے کے الفاظ کچھ اس طرح ادا کیے تھے کہ واقعتاً پھڑک اٹھنے کو جی چاہا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر دیر کس بات کی ہے عباس۔ جو بھی سنسنی خیز خبر لائے ہو بیان کرو؟"

"ملک صاحب!" وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ "میں نے آلۂ قتل کا سراغ لگا لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں اچھل پڑا۔

"وہ ایک کلہاڑی ہے جناب۔" وہ انکشاف کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے، نرگس اور اکرم کو اسی کلہاڑی کی مدد سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔"

"تم نے وہ کلہاڑی کہاں اور کس کے پاس دیکھی ہے؟" میں نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"نوید کے پاس جناب۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ نوید کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نوید، شوکت علی کا جوان بیٹا ہے جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "شوکت علی، چودھری فرزند علی کا خاص آدمی ہے۔ وہ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس کے ساتھ مدد کے لیے، رحمت اور قادر بھی ہوتے ہیں۔ آپ نے کھیتوں کے بیچ بنے جس اکلوتے کمرے کی نگرانی کا مجھے حکم دیا تھا نا جناب، اس کمرے کی بڑی اہمیت ہے ملک صاحب....."

جوشِ جذبات نے عباس علی کے بیان کو الجھا دیا تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کے جواب میں کہا۔ "ہاں اس کمرے کی اہمیت تو ہے۔ ظاہر ہے، اسی کمرے کے اندر نرگس اور اکرم کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

"جی ہاں..... یہ بات تو ہے۔" وہ قدرے سنبھلتے ہوئے بولا۔ "لیکن میں آلۂ قتل کی بات کر رہا ہوں۔ نوید نے وہ کلہاڑی اس کمرے کے اندر سے نکال کر دریا کے کنارے زمین میں دبا دی ہے۔"

"کیا مطلب ہے عباس.....؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "ذرا آرام سے ٹھہر ٹھہر کر تسلی سے مجھے بتاؤ کہ رات تم نے کیا کیا منظر دیکھ لیا ہے؟"

اس نے دو تین گہری سانسیں لیں پھر بڑے ربط کے ساتھ بتانے لگا۔

"ملک صاحب! میں نے جائے وقوعہ کی نگرانی کے لیے ایک ٹہلی کے درخت کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خاصا گھنا درخت تھا۔ میں اندھیرا ہوتے ہی بہ آہستگی اس درخت پر نشست جما کر بیٹھ گیا تھا۔ میں درخت کے جس تنے پر جم کر بیٹھا تھا وہاں سے وہ کمرا اور دریا کا کنارا بڑی وضاحت کے ساتھ نظر آتا تھا۔ آدھی رات کے لگ بھگ میں نے ایک سایے کو کھیتوں میں سے نکل کر مذکورہ کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو چونک پڑا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اسے پہچان نہیں سکتا تھا تاہم میں نے پوری توجہ اس پر مرکوز کر دی۔" اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ بندہ سیدھا کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی محتاط انداز میں دائیں بائیں بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جسے دوسروں کی نظروں سے چھپانا ضروری ہو۔ وہ کمرے کے سامنے آ کر رکا تو اس کے گھونگریالے بالوں نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سعید نگر کا

ملازمت

ایک شخص پولیس میں ملازمت کا امیدوار تھا۔ ممتحن نے پوچھا۔ "ابراہام لنکن کو کس نے قتل کیا؟"

وہ کچھ دیر سوچ کر بولا۔ "مجھے اس کا جواب دینے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔"

"ضرور، آپ جائیں اور کل صحیح صحیح جواب لے کر آئیں۔" وہ گھر آیا تو بیوی نے پوچھا۔

"کیا رہا، ملازمت مل گئی؟"

وہ بولا۔ "معلوم تو یہی ہوتا ہے، فوراً ہی انہوں نے ایک قتل کا کیس دے دیا اور قاتل کی تلاش پر مامور کر دیا ہے۔"

دانش مندی

دو سکھ دوستوں نے دو گھوڑے خریدے۔ چونکہ دونوں کا ماڈل ایک سا تھا اس لیے مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ یہ کس طرح پتا چلے گا کہ کون سا گھوڑا کس کا ہے۔ ایک دوست بولا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے، میں اپنے گھوڑے کی دم کاٹ دیتا ہوں۔ یہ نشانی رہے گی، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صبح جب اٹھے تو دونوں گھوڑوں کی دم کٹی ہوئی تھی، پھر ایک نے اپنے گھوڑے کا کان کاٹ دیا۔ رات کو پھر کسی نے دوسرے گھوڑے کا کان بھی کاٹ دیا۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سخت پریشان ہوئے۔ آخر کار ایک دوست بولا۔ "یار، ایسا کرتے ہیں کہ سفید والا گھوڑا آپ رکھ لو اور کالے والا میں۔"

مرسلہ: افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر

* * * *

احتیاط

بعض آلو میں سبز حصہ پایا جاتا ہے، یہ حصہ کبھی نہ پکایا جائے کیونکہ اس میں Glycoalkaloids نامی زہر پایا جاتا ہے جسے کھانے سے صحت کو نقصان پہنچنے کا کافی اندیشہ ہے۔

مرسلہ: محمد جاوید، تحصیل علی پور

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہی رہنے والا ہوتا ہم اتنے فاصلے سے میں اس کی شکل پہچان نہیں سکتا تھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ میں ٹہلی سے نیچے اتر کر اس کا تعاقب کروں لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ میں نے ٹھیک ہی کیا تھا ورنہ شاید میں وہ حقیقت جاننے میں کامیاب نہ ہو پاتا جو ابھی آپ کو بتانے والا ہوں.....''

کانسٹیبل عباس علی قسطوں میں انکشاف کر رہا تھا لیکن میں نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''ملک صاحب! میرے دیکھتے ہی دیکھتے گھونگھریالے بالوں والا وہ بندہ کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ باہر نکلا تو میں اس کے ہاتھ میں کوئی چمکدار چیز دیکھ کر چونک اٹھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی کلہاڑی تھی۔ اس نے مذکورہ کلہاڑی کو بڑی احتیاط کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ کمرے سے نکلنے کے بعد بھی اس نے چوکنا نظر سے گردوپیش کا جائزہ لیا پھر دریا کے کنارے کی جانب بڑھنے لگا.....''

''ایک منٹ عباس۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے کانسٹیبل کو مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ''میں نے اس کمرے کا بڑی اچھی طرح معائنہ کیا تھا لیکن مجھے وہاں کوئی کلہاڑی، برچھی یا ڈنڈا سوٹا نظر نہیں آیا تھا۔''

''ہوسکتا ہے جناب.....'' عباس نے خیال آرائی کی۔ ''اس کلہاڑی کو چھت کی کڑیوں کے بیچ کہیں پھنسا کر چھپا دیا گیا ہو۔''

''ہاں، ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''تم بتاؤ، گھونگریالے بالوں والے کلہاڑی بردار شخص نے پھر کیا کیا؟''

''وہ دریا کی طرف بڑھتے ہوئے جب اس ٹہلی کے قریب سے گزرا جس کے اوپر میں نشست جمائے بیٹھا تھا تو مجھے اس کے چہرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔'' عباس علی نے سنسنی خیز انداز میں بتایا۔ ''وہ شوکت علی کا بیٹا نوید تھا۔''

''اوہ.....!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''پھر کیا ہوا، کیا تم نے درخت سے اتر کر نوید کا تعاقب کیا یا ٹہلی پر بیٹھے بیٹھے ہی اس کی نگرانی کرتے رہے تھے؟''

''ارادہ تو میرا یہی تھا کہ درخت سے نیچے اتر آؤں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور دبے پاؤں کے ساتھ نوید کا پیچھا کروں لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔''

''کیوں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی ملک صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''نوید دریا کے کنارے پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کلہاڑی کو ٹھکانے لگانے کے ارادے سے وہاں پہنچا تھا۔ دریا کا کنارا درخت پر بیٹھے بڑا واضح نظر آرہا تھا لہٰذا میں توجہ سے اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔''

''ہوں۔'' میں نے سوچتی ہوئی نظر سے عباس کو دیکھا اور پوچھا۔ ''نوید نے دریا کے کنارے کیا کارروائی کی ہے؟''

''نوید نے دریا کے کنارے پر ایک جگہ زمین کو کھودا اور کلہاڑی کو کھدی ہوئی جگہ پر رکھ کر مٹی برابر کر دی۔'' عباس علی نے جواب دیا۔ ''اوپر سے اس نے زمین ایسی کر دی تھی کہ پتا نہ چلے، یہاں کی مٹی کھود کر کچھ دبایا گیا ہے۔''

''کیا تمہیں اچھی طرح یاد ہے، نوید نے وہ کلہاڑی کس مقام پر دبائی تھی؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''تم مذکورہ مقام کی نشان دہی کر سکتے ہو؟''

''ایک سو ایک فی صد کر سکتا ہوں ملک صاحب۔'' وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''آپ ابھی چلیں میرے ساتھ، میں آپ کو اس جگہ پہنچا دیتا ہوں۔''

''میں ضرور چلوں گا تمہارے ساتھ۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم اپنی کہانی مکمل کر لو۔ ہوسکتا ہے، اس میں کوئی اور کام کی بات نکل آئے۔ نوید نے کلہاڑی کو زمین میں دبانے کے بعد کیا کیا تھا؟''

''وہ جدھر سے آیا تھا، ادھر ہی لوٹ گیا۔'' عباس نے بتایا۔ ''واپسی میں اس نے تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا اور تیز تیز قدموں سے گاؤں کی جانب بڑھنا شروع کر دیا تھا۔''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم پھر بھی درخت کے اوپر ہی بیٹھے رہے تھے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''اب ٹہلی کے اوپر بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی لہٰذا میں فوراً نیچے اتر آیا اور محفوظ فاصلہ رکھ کر نوید کا تعاقب کرنے لگا۔''

''کیا نوید سیدھا اپنے گھر گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''نہیں ملک

صاحب! گاؤں میں داخل ہونے کے بعد اس نے اپنے گھر کا رخ نہیں کیا بلکہ اپنے گھر کی مخالف سمت میں نکلتے ہوئے وہ بیری والے کھوہ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا اور بیری والے کھوہ سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کھوہ پر گاؤں ہی کا ایک نوجوان نوید کا منتظر تھا۔ دونوں میں مختصر سی بات ہوئی۔ ان کی آواز میری سماعت تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ وہ دونوں واپسی کے لیے مڑے تو میں اچک کر ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ وہ اسی سمت پلٹے تھے اگر میں فوری طور پر خود کو تنے کی آڑ میں نہ چھپاتا تو میرے دیکھ لیے جانے کے قوی امکانات تھے۔''

وہ لمحے بھر کو تھما تو میں نے فوراً سوال کر دیا۔ ''واپسی میں تو وہ دونوں تمہارے بہت قریب سے گزرے ہوں گے؟''

''جی ہاں ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے سوال کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا۔ ''میں نے سانس روک لی تھی جناب..... اور جب نوید میرے نزدیک سے گزرا تو مجھے اس کے دبلے پتلے ساتھی کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔''

''کون تھا وہ؟'' میں نے متجسس انداز میں استفسار کیا۔

''وہ صفدر تھا جناب۔'' عباس نے سادگی سے جواب دیا۔

اس کے اس سادہ سے جواب نے میرے اندر سنسنی بھر دی تھی۔ میرے رگ و پے میں ایک کرنٹ سا دوڑنے لگا تھا۔ میں نے یک بارگی پوچھا۔

''تم جلال دین کمہارے کے دبلے پتلے اور کمزور سے بیٹے صفدر کی بات تو نہیں کر رہے.....؟''

''جی..... جی ہاں..... بالکل وہی صفدر۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''کوئی خاص بات ہے ملک صاحب؟''

''صفدر کے حوالے سے میرے پاس تسلی بخش رپورٹ نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کچھ عرصہ پہلے مقتول اکرم کے ساتھ اس کا شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا جس میں اکرم نے اس کی درگت بنا ڈالی تھی۔ مجھے شک تھا کہ صفدر، اکرم کے قتل میں ملوث ہوسکتا تھا لہٰذا میں آج صفدر کو تھانے بلا کر پوچھ گچھ کرنے والا تھا کہ تم نے یہ نئی انکشاف انگیز رپورٹ دے دی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے، صفدر اور نوید آپس میں ملے ہوئے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر نرگس اور اکرم کے قتل میں انہی دونوں کا ہاتھ ہے تو پھر صرف صفدر ہی کو نہیں بلکہ نوید کو بھی تھانے بلا کر تفتیش کی چکی میں ڈالنا چاہیے۔''

''نہیں۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔ ''انہیں تھانے ضرور لایا جائے گا مگر آلۂ قتل کی برآمدگی کے بعد۔ کیا ان دونوں میں کوئی دوستی یاری بھی ہے؟''

''ضرور ہوگی ملک صاحب۔'' عباس علی بڑے اعتماد سے بولا۔ ''ورنہ آدھی رات کو وہ بیری والے کھوہ پر گلی ڈنڈا تو نہیں کھیل رہے تھے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو عباس۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں، نرگس اور اکرم کے قتل کا کیس حل ہونے کے قریب ہے۔ ہمیں ابھی اور اسی وقت ان دونوں کو گرفت میں لے کر دریا کی طرف جانا چاہیے۔''

کانسٹیبل عباس نے فوراً میرے خیال کی تائید کر دی۔

لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد میں اور کانسٹیبل عباس علی پوری تیاری کے ساتھ نکلے اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ ہم نے یکے بعد دیگرے صفدر اور نوید کو پکڑ لیا۔ پہلے میں نے انہیں باقاعدہ گرفتار کر کے ہتھکڑی نہیں لگائی تھی لیکن انہوں نے مجھے اس کام کے لیے مجبور کر دیا۔ صفدر کی صحت کو گئی گزری کہنا ہی مناسب تھا تاہم نوید خاصا پھرتیلا ثابت ہوا۔ جب میں انہیں گاؤں سے پکڑ کر دریا کی طرف لے جا رہا تھا تو نوید نے ایک پہلوانی داؤ مار کر کانسٹیبل کی گرفت سے خود کو آزاد کروا لیا تھا۔ نہ صرف آزاد کروا لیا تھا بلکہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی تھی تاہم میں نے بروقت کارروائی کر کے اسے قابو کر لیا تھا۔

اب دونوں کو ہتھکڑی پہنانا لازمی ٹھہرا تھا۔ میں نے دونوں کے ایک ایک ہاتھ کو آہنی زیور سے آراستہ کرنے کے بعد زنجیر کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا پھر انہیں دھکیلتے کھینچتے ہوئے ہم دریا کے اس کنارے پر پہنچ گئے جہاں کی نشان دہی عباس علی نے کی تھی۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ نوید کبڈی کا بہت اچھا کھلاڑی تھا۔ وہ دونوں راستے بھر بڑے پریشان رہے تھے۔ ان کی کیفیت کو دیکھ کر مجھے یہ تو یقین ہوگیا تھا کہ نرگس اور اکرم کے قتل سے ان کا گہرا تعلق ہے ورنہ وہ یوں حواس باختہ ہو کر بھاگنے کی کوشش نہ کرتے۔ جب ہم مطلوبہ مقام پر پہنچے تو میں نے دریا کی زمین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خاصے جارحانہ انداز میں نوید سے پوچھا۔

''اس جگہ کو پہچانتے ہو؟''

''نہیں.....'' وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہاں کیا ہے، آپ ہمیں ادھر کیوں لے کر آئے ہیں؟"

"ایک خطرناک مگرمچھ دریا میں سے نکل کر اس زمین کے اندر گھس گیا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم اسے کھود کر باہر نکالو گے۔"

ہمارے ساتھ ہی گاؤں کے کئی افراد بھی مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے تھے اور ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں میں یقیناً جلال دین کمہار اور شوکت علی شامل نہیں تھے ورنہ وہ مجھ سے ضرور سوال کرتے کہ میں ان کے بیٹوں کے ساتھ کون سا کھیل، کھیل رہا ہوں۔

نوید نے میری بات کے جواب میں اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں کیوں کھودوں گا مگرمچھ کو..... میرا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"جب دفن کر رہے تھے اس وقت تعلق یاد نہیں آیا تھا۔" میں نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ "چلو کھودو اس زمین کو اور سب کو نکال کر دکھاؤ پچھلی رات تم نے یہاں کیا دبایا تھا؟"

اس کے چہرے پر خوف کے سایے لہرانے لگے۔ اب تک وہ محض اس لیے اکڑ رہا تھا کہ شاید کسی حیلے بہانے سے اس کی جان چھوٹ جائے لیکن اب تو اس کی جان پر بن آئی تھی۔ جب کوئی جائے فرار باقی نہ رہی تو اسے بہ حالت مجبوری میرے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ جلد ہی اس نے دریا کی نرم اور گیلی زمین میں سے آلۂ قتل یعنی تیز پھل والی ایک خطرناک کلہاڑی برآمد کر لی۔ جب میں نے اس کے جرم کا ذکر کیا تو وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگا لیکن میں اس کے چکر میں آنے والا نہیں تھا۔ کانسٹیبل عباس علی نے مجھے جو رپورٹ دی تھی وہ نوید اور صفدر کو فٹ کرنے کے لیے کافی تھی۔ آلۂ قتل کی دستیابی کے بعد میرا کام نہایت ہی آسان ہو گیا۔ مجھے اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے جائے وقوعہ پر ہی نوید کی اچھی خاصی دھنائی کر دی۔ جلد ہی اس کا باپ بھی وہاں پہنچ گیا۔ شوکت علی نے اپنے بیٹے کے بچاؤ کے لیے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور نوید و صفدر کو کھینچتے ہوئے تھانے لے آیا۔

اس رات میں نے ان دونوں کو حوالات میں رکھا اور تفتیش کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ صفدر جیسا کہ اس کی صحت ہی سے ظاہر ہوتا تھا، تفتیش کا مزہ چکھنے میں ناکام رہا اور ابتدائی مرحلے پر ہی اس نے زبان کھول دی۔ اس کے اقبال کے بعد نوید کے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ تھوڑی چھترول کے بعد وہ بھی پٹڑی پر آ گیا اور اس نے نرگس و اکرم کے بہیمانہ قتل کا اقرار کر لیا۔ میں نے دونوں کا اقبالی بیان نوٹ کر لیا۔

واقعات کے مطابق، نوید اور صفدر میں گہری دوستی تھی اور دونوں مختلف اوقات میں نرگس اور اکرم کی وجہ سے ذلت اٹھا چکے تھے۔ ایک موقع پر جب نوید نے نرگس سے زیادہ ہی فری ہونے کی کوشش کی تو نرگس نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کو دل میں رکھے کسی سنہری موقع کی تاک میں تھا۔ دوسرا واقعہ صفدر کے ساتھ پیش آ گیا جب نرگس کی وجہ سے اکرم نے مار مار کر اسے لہولہان کر دیا تھا۔ دونوں دوستوں نے اپنی ہزیمت کا انتقام لینے کے لیے نرگس اور اکرم کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ چند روز تک انہوں نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ نرگس اور اکرم کے میل ملاپ کا جائزہ لیا اور یہ جاننے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ رات کی تاریکی میں کھیتوں میں بنے ہوئے کمرے میں ملاقات کرتے ہیں۔

چنانچہ وقوعہ کی رات انہوں نے کارروائی کا فیصلہ کیا اور جب نرگس و اکرم راز و نیاز میں مصروف تھے تو نوید نے کلہاڑی کے پے در پے وار کر کے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔ صفدر اتنا ہمت والا نہیں تھا کہ اس خونیں مشن میں وہ نوید کا ساتھ دیتا۔ وہ کمرے سے تھوڑے فاصلے پر کھیتوں میں موجود تھا۔ دُہرے قتل کی اس واردات کا ذمے دار صرف اور صرف نوید ہی تھا۔

جب نوید کو محسوس ہوا کہ میں نے مذکورہ کمرے کو تفتیش کا خصوصی نشانہ بنا رکھا ہے تو اسے فکر ہوئی کہ کہیں کلہاڑی میرے ہاتھ نہ لگ جائے۔ قتل کی واردات کے بعد کلہاڑی کو اس نے کمرے کی چھت کی کڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ وہ کلہاڑی کو کمرے سے نکالتے ہوئے ہماری نظر میں آ گیا اور اس طرح ایک خوف ناک کھیل اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

عدالت نے نوید کو عمر قید اور صفدر کو پانچ سال کی سزا سنائی تھی۔ تین روز کی کاری محنت کے بعد میں یہ عقدہ کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ حسد اور حرص کی آگ انسان کو جلا کر ختم کر دیتی ہے اور عقدہ جیسی عبرت ناک کہانیوں کو جنم دینے کا موجب بھی۔

(تحریر: حُسام بت)

میں دیانت داری سے بتا دوں کہ اخلاقی طور پر میں صحیح آدمی نہیں ہوں۔ میرے جواری ساتھی مجھے نقصان کی پروا کیے بغیر خطرہ مول لینے والا تصور کرتے ہیں جو ہمیشہ بے دھڑک داؤ کھیلتا ہے اور پہلے نمبر کے حصول میں رہتا ہے۔ میں ان کی اس بات کو اپنے لیے ستائش سمجھتا ہوں لیکن میں دھوکے باز نہیں ہوں البتہ معاملات کو سیدھا کرنے کے لیے میں زندگی میں چند شارٹ کٹ لینے کے خلاف نہیں ہوں اور نہ ہی قاتل ہوں۔ لہٰذا جولائی کے اتوار کی اس صبح جب پھوار پڑ رہی تھی اور میں نے اپنے باس کی لاش دفتر میں اس کی میز پر پڑی دریافت کی تو میں نے فوری طور پر نتیجے کی پروا کیے بغیر خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے باس جسٹن کرین کے چہرے کا ایک رخ پوست اترے ہوئے پارچے کے مانند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے گھنے بال خون میں لت پت تھے اور فرش پر بچھے ہوئے براؤن قالین پر سرخ چپچپا دھبا پھیلا ہوا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی میز پر ٹکا ہوا تھا اور اس کی گول مٹول موٹی انگلیوں میں اعشاریہ تین آٹھ اسپیشل اسٹین لیس اسٹیل اسمتھ اینڈ ویسن ریوالور دبا ہوا تھا جو وہ اپنے دفتر کی تجوری میں رکھتا تھا۔

میں نے ایک نگاہ میں اندازہ لگا لیا کہ اس کی نبض دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جھک کر قالین پر

ثمر عباس

جواری

اگرچہ زندگی کی بساط بہت چھوٹی سی ہے مگر... اس پر جیتنے اور ہارنے کے لیے بہت سامان ہے، لہٰذا یہاں ہر کھلاڑی اپنے مفاد اور مقاصد کے تحت داؤ چلتا ہے... یہ اور بات کہ اس کے مفاد اور مقاصد میں اس کی نیت کیا کردار ادا کرتی ہے جبکہ نتائج کی ذمہ داری بھی اسی پر ہو۔ کچھ لوگوں کو نفع و نقصان دیکھ کر یہ بازی کھیلنے کی عادت ہوتی ہے جبکہ کچھ آنکھ بند کر کے کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں... وہ بھی ایسا ہی ایک جواری تھا جیسے ہر بازی جیتنے کی خواہش تھی مگر یہ ضروری تو نہیں کہ ہر خواہش پوری بھی ہو۔

منزلوں سے بے خبر ایک بلند پرواز پنچھی کی ستوں کا ماجرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھیلے ہوئے سرخ دھبے کو چھو کر دیکھا۔ وہ خشک تھا، اس کا مطلب تھا کہ جسٹن کی موت کو کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔

جسٹن کے مقابل میز پر رکھا ہوا کمپیوٹر آن تھا اور مانیٹر کی اسکرین روشن تھی۔ اسکرین پر ایک پیغام فلیش کر رہا تھا جو غالباً اس کی جانب سے ایک آخری پیغام تھا۔ ”میں نے اپنی فیملی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ناقابل معافی ہے۔ آئی ایم سوری گلینڈا، رونی کا خیال رکھنا میں تم دونوں سے پیار کرتا ہوں۔“ بس چار جملوں پر مشتمل یہی پیغام تھا جو ایک شخص کی پوری زندگی کا خلاصہ تھا۔

بات یہ تھی کہ میری اضطراری کیفیت مجھ سے کہہ رہی تھی کہ یہ خودکشی نہیں ہے۔ یقیناً کسی نے یہ ظاہر کرنے کا کھیل کھیلا تھا جیسے جسٹن نے اپنی زندگی کا خاتمہ خود کیا ہے لیکن میں اپنی زندگی میں کئی بار پولیس سے بھڑ چکا تھا اور جانتا تھا کہ وہ کس طرح سوچتے ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا تھا کہ بوسٹن ہوی سائڈ کے سراغ رساں جلد ہی یہاں ہر طرف پھیلے ہوئے ہوں گے اور مجرم کا سراغ لگانے میں تاخیر نہیں کریں گے اور میں ان کی آمد پر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

اتوار کی صبح دفتر میں جسٹن کرین کی موجودگی ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ ہفتے میں چھ دن کام کرنے والوں میں سے تھا۔

اور میری یہاں اتوار کے روز دفتر میں موجودگی کی وجہ سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ کمپنی کے اکاؤنٹ سے مزید رقم نکالنے کے لیے مجھے تنہائی درکار تھی۔ چوری کرنے کی میری توجیہہ یہ تھی کہ جسٹن اس کا مستحق تھا۔ کسی بھی مجھ جیسے دھوکے باز کو سڑک پر سے اٹھا کر ایک ایماندار آدمی میں تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس کے سماجی تجربات میں سے ایک تھا جو کامیاب نہیں ہو سکا تھا لیکن میں نے اس کی اس کوشش کو سراہا تھا۔

میری نظریں کھڑکی سے باہر اطراف کے ویئر ہاؤسز پر جمی ہوئی تھیں۔ باہر پارکنگ لاٹ میں موجود واحد کار میری تھی۔ مجھے علم تھا کہ جب پولیس جسٹن کی موت کے اسباب جاننے کے لیے تفتیش کا آغاز کرے گی تو وہ قاتل کا مقصد معلوم کرنے کے لیے ہر جگہ کی تلاشی لیں گے۔ خاص طور پر کاروباری معاملات کی۔

بھلا الزام تھوپنے کے لیے انہیں اس سے بہتر کون ملے گا جس کی عمر پچیس سال ہو، جو غبن کر رہا ہو، جو سڑکوں پر پروان چڑھا ہو اور جس کے ریکارڈ میں چھوٹی چھوٹی چوریاں ہوں۔

میری اپنی بچت کا واحد راستہ یہی تھا کہ میں جسٹن کے قاتل کو تلاش کروں اور اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دوں پھر یہ کیس ختم ہو جائے گا اور پولیس مزید کوئی تفتیش نہیں کرے گی۔

میری اس سوچ میں یہ غرور بھی شامل تھا کہ میں پالا مار سکتا ہوں لیکن مجھے وقت درکار تھا اور میرے پاس قاتل کو اپنے جال میں پھنسانے کا بہتر چانس یہ بھی تھا، اگر وہ یہ سمجھ رہا ہوگا کہ جسٹن کی لاش کو ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا ہے۔

میں نے دفتر کے داخلی دروازے کو مقفل کر دیا اور باہر پارکنگ لاٹ میں نکل آیا پھر پلٹ کر ”کرین رینٹل فرنیچر“ کے سائن بورڈ پر نظریں جما دیں۔

میں نے پلکیں جھپکائیں تو یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میرے رخسار پر ایک آنسو بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک حتمی نگاہ عمارت پر ڈالی اور پہلی بار اسے زندہ جسٹن کے بغیر پایا۔ کوئی بھی چیز مختلف دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن پھر بھی مختلف محسوس ہو رہی تھی۔

میں اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے دریائے چارلس پہنچ گیا۔ وہاں چند سگریٹ پینے کے دوران میں دریا کے دھندلے پانی کو کہر اور ہوا میں گھومتے چکراتے بہتے دیکھتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ جسٹن کی سیکریٹری لارا ٹھیک صبح آٹھ بجے دفتر پہنچ جائے گی۔ میں اسے پولیس کو طلب کرنے کی اجازت دے دوں گا۔ اس وقت تک مجھے قاتل کو پکڑنا ہوگا۔

میں نے سگریٹ کار کی ایش ٹرے میں مسل دی اور اس بارے میں سوچنے لگا کہ جسٹن کی موت کا خواہاں کون ہو سکتا ہے۔ وہ میرے لیے ایک باپ کے مانند تھا۔ میرے اپنے باپ کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب میری عمر بارہ برس تھی اور میری ماں نے میرے باپ کے مرنے کے کچھ عرصے بعد ہی مے نوشی شروع کر دی تھی۔ وہ میری پرورش کرنے میں بہت کم دلچسپی لے رہی تھی۔

میں نے اسکول سے بھاگنا شروع کر دیا اور بوسٹن کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے ساتھ ساتھ جس طرح ہو سکا، پیسا حاصل کرنے لگا۔ جیسے دھوکے بازی سے، تاش کھیل کر یا کسی بھی طرح۔ کوئی بھی چیز میری صلاحیتوں کے خلافِ شان نہیں تھی۔

جسٹن کرین میرے ڈیڈی کا پرانا دوست تھا اور چار سال قبل مجھے اپنے کاروبار میں شامل کرنا ان نیکی کے کاموں میں سے ایک تھا جس کے لیے وہ مشہور تھا۔ ابتدا میں، میں نے بہ طور سیلز مین کام کیا اور جب اسے احساس ہو گیا کہ لین دین کے معاملات میں، میں کتنا تیز ہوں تو اس نے مجھے تمام کھاتوں کا انچارج بنا دیا۔ وہ مجھ پر پورا اعتماد کرتا تھا اور میں

اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن جب میں نے گھڑ دوڑ میں دلچسپی لینا شروع کی اور ناسازگار حالات سے دوچار ہونا پڑا تو میں نے اس کے بزنس اکاؤنٹس میں سے رقم اڑانا شروع کر دی۔ ابتدا میں تو بس تھوڑی سی رقم نکالی تھی لیکن بڑھتے بڑھتے یہ رقم سات ہزار ڈالرز تک جا پہنچی۔

میرا ارادہ تھا کہ جوں ہی میری قسمت نے پلٹا کھایا میں اس کی یہ رقم لوٹا دوں گا۔ اس لیے کہ میں ایک جواری ہوں، دھوکے باز نہیں۔

ایک بات کے بارے میں مجھے حد درجہ یقین تھا اور وہ یہ تھی کہ جسٹن کبھی خودکشی نہیں کر سکتا۔ زندگی کی جس طرح وہ قدر کرتا تھا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کئی ایک خیراتی اداروں کو عطیات دیا کرتا تھا، بے گھر لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی لانے کے لیے مستقل رضاکارانہ طور پر کام کرتا تھا اور ان کی ہر ممکن مدد کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

اسے اپنے سترہ سالہ بیٹے، لائیو تھیٹرز، موویز اور عمدہ ریسٹورنٹس سے عشق تھا۔ وہ ایک کامل شخص تھا اور اپنے ملازموں اور دوستوں سے بھی کاملیت کی توقع رکھتا تھا اور وہ ایک کھرا آدمی تھا۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے اس اصول کو بارہا کہتے سنا تھا۔

”دنیا بہت ہی صبر آزما اور دشوار ہے۔“ وہ کہا کرتا تھا۔ ”غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اسے ایک موقع ضرور دینا چاہیے لیکن اگر کوئی دوسری بار گڑبڑ کرتا ہے تو پھر اسے لٹکا نا دینا چاہیے۔“

اس نے مجھے سڑک سے اٹھا کر ایک موقع ضرور فراہم کیا تھا۔ اب اگر وہ مجھے اپنے کاروبار میں سے رقم چوری کرتے ہوئے پکڑ لیتا تو مجھے معلوم تھا کہ وہ پولیس کو طلب کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔

اسی لیے میں کھاتوں کے معاملے میں بے حد احتیاط سے کام لیتا تھا لیکن اگر باریک بینی سے کھاتوں کا جائزہ لیا جاتا تو ان میں فرق ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ میں بے دھڑک داؤ کھیلنے کا عادی تھا لیکن اس معاملے میں، میں کسی قسم کا چانس نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگا لی۔

جب میں نے اس کے کمپیوٹر اسکرین پر اس کا وہ پیغام پڑھا جو چار جملوں پر مشتمل تھا تو اسی لمحے میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے خود کو ہلاک نہیں کیا ہے۔ جسٹن جو بھی کام کرتا تھا اس کی جزوئیات پر مکمل دھیان دیتا تھا اور نہایت محتاط اور باریک بین شخص تھا۔ اپنے بارے میں عام لوگوں کے تاثر اور اپنی بیوی اور بچے کے لیے وصیت کے بارے میں خاص دھیان رکھتا تھا لیکن اس نے کمپیوٹر پر جو پیغام چھوڑا تھا وہ اس کی طرز زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ کم از کم میری اضطراری کیفیت مجھ سے یہی کہہ رہی تھی اور میں اپنے احساسات کا قیدی تھا۔

میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اسے گیئر میں ڈال دیا۔ کار کے ڈیش بورڈ پر نصب گھڑی کی مطابق ایک بج کر چند ہی منٹ ہوئے تھے۔ میرے پاس قاتل کو تلاش کرنے کے لیے اُنیس گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا تھا۔

جسٹن کرین کی رہائش گاہ بوسٹن کے نواح میں ایک پوش علاقے میں تھی اور اس کی طرز زندگی کی آئینہ دار تھی۔ پندرہ کمروں پر مشتمل اس کوٹھی کی تزئین و آرائش میں بے تحاشا فضول خرچی اور نمود و نمائش سے کام لیا گیا تھا۔

جسٹن کی عمر 54 برس تھی لیکن جب وہ اپنے گھر اور بیٹے کے بارے میں بات کرتا تھا تو اس کا انداز اس طرح کا ہوتا تھا جیسے اس نے بیلمونٹ میں ڈربی کی گھڑ دوڑ میں سب سے بڑا انعام جیتا ہے۔

اس کی شادی کو تیئس برس گزر چکے تھے جن میں سے بیشتر پریشانی ہی میں بیتے تھے۔ وہ کام پر جو باتیں کیا کرتا تھا ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اور گلینڈا صرف ان کے بیٹے رونی کی خاطر اس رشتے میں جڑے ہوئے ہیں۔

ان کے خاندان کی دولت گلینڈا کو اپنے آنجہانی باپ سے ترکے میں ملی تھی جس کی بدولت جسٹن جو ساؤتھ بوسٹن کے ایک غریب گھرانے کا بچہ تھا، یہ لگژری اسٹائل کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

حال ہی میں ان دونوں کے درمیان کھنچاؤ ظاہر ہونے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کے درمیان مسائل اس قتل کا محرک تو نہیں؟ جسٹن گزشتہ چند ماہ سے اپنی وکیل کیتھرائن کے ساتھ کچھ زیادہ ہی وقت گزارنے لگا تھا۔ کیتھرائن وہ عورت تھی جس سے اس کے تعلقات ایک طویل عرصے سے قائم تھے۔ میں نے اس کا نام بھی اپنے ممکنہ قاتلوں کی مختصر فہرست میں شامل کر لیا تھا۔

جسٹن کی رہائش گاہ پہنچ کر میں پورچ کے دلکش ستونوں کے درمیان سے چلتا ہوا دروازے تک آ گیا اور اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ دروازہ گلینڈا نے کھولا۔

”ارے فلپ تم!“ اس نے کہا۔ ”کیا سرپرائز ہے اگر تم جسٹن سے ملنے کے لیے آئے ہو تو وہ دفتر میں ہے۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

گلینڈا کی عمر پچاس برس سے کچھ اوپر ہی تھی لیکن خود کو کم عمر ظاہر کرنے کی کوشش میں اس نے اپنے بالوں کو رنگا ہوا تھا اور سیاہ رنگ کی جینز کے ساتھ ایک پھولدار بلاؤز پہنا ہوا تھا جو اس کے جسم پر قدرے زیادہ کسا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک جام تھا جس میں ایک شفاف مائع بھرا ہوا تھا۔ وہ پانی بھی ہوسکتا تھا لیکن اس کی خمار آلود نگاہوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ووڈکا ہے۔

''درحقیقت میں تم سے بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس چند منٹ ہیں؟'' اس نے مجھے لیونگ روم میں چلنے کا اشارہ کیا۔

گو میں چند مرتبہ پہلے بھی اس کے گھر میں آچکا تھا لیکن اس کے باوجود میں اب بھی اس کے تاباں و دلکش اور ہینڈل قالین، ہارڈ ووڈ کے پالش شدہ دمکتے ہوئے فرش اور قیمتی فرنیچر کو دیکھ کر مغلوب الجذبات ہوجاتا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں میں رہنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ جسٹن کرین اپنی زندگی کا خاتمہ کرکے ان آسائشوں سے دستبردار ہوجائے گا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کس طرح کہوں۔'' میں نے اپنے چہرے کو بہترین حد تک سپاٹ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''جسٹن کچھ عرصے سے قدرے مایوس اور بددل سا دکھائی دے رہا ہے۔ کیا تمہیں کچھ آئیڈیا ہے کہ اسے کیا پریشانی لاحق ہے؟''

گلینڈا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں، یقیناً جب سے وہ اپنے کام میں اور اپنی اس چھوٹی دلبر کو پہلو میں لیے زیادہ وقت گزارنے لگا ہے تو میں اس سے زیادہ ملاقات ہی نہیں کرتی بلکہ میرے مقابلے میں غالباً تمہارا اس سے کہیں زیادہ میل جول ہوتا ہوگا۔''

اتنے میں داخلی دروازہ کھلا اور رونی اندر آگیا۔ اس کے براؤن بال ہوا سے بکھرے ہوئے تھے اور اس کا دبلا پتلا لمبا بدن باسکٹ بال کھیلنے کی وجہ سے کسرتی دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ نوجوان اداکار جیمز ڈین یاد آجاتا تھا۔

''ہائے فلپ!'' اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ لہرا دیا۔

میں نے بھی جواباً جلدی سے ہاتھ ہلا دیا۔ مجھے اپنے سامنے موجود ان دونوں ماں بیٹے کو جسٹن کی موت سے بے خبر رکھنے اور دھوکا دینے کی بنا پر احساسِ ندامت ہورہا تھا لیکن میں کیا کرسکتا تھا۔

''تم کہاں تھے، ہنی؟'' گلینڈا نے پوچھا۔ ''تم آج صبح بہت سویرے نکل گئے تھے؟''

''میں ساحل پر دوڑنے گیا تھا۔ صبح سویرے وہاں زیادہ لوگ نہیں ہوتے تو دوڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ یوں بھی صبح سویرے کی ورزش کو عمدہ کہا جاتا ہے۔''

رونی یہ کہہ کر کچن میں چلا گیا۔ میں نے ریفریجریٹر کا دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ میں اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ ایک بچہ تھا۔ اس کا مزاج بھی اپنی ماں کے مانند تھا۔

''سو یہ سب کیا چکر ہے، فلپ؟'' گلینڈا نے جاننا چاہا۔

''اس بارے میں کوئی آئیڈیا ہے کہ جسٹن آج دفتر کیوں گیا ہے، جبکہ آج چھٹی کا دن ہے؟'' اگر گلینڈا کو میرا یہ سوال عجیب سا محسوس ہوا تب بھی اس نے اپنے تاثرات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

''اس کے کلائنٹس میں سے کسی ایک نے اسے نقد ادائی کی تھی اور بینک کھلنے تک اس رقم کو دفتر میں چھوڑنا اسے بے چین کررہا تھا۔ وہ رقم گھر لانے کے لیے دفتر گیا ہے یا پھر یہ اس کی صرف ایک کہانی تھی جو اس نے گھر سے نکلنے کے لیے تراشی تھی۔'' گلینڈا نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

''نہیں، یہ حقیقت ہے۔'' میں نے بتایا۔

جسٹن کی لاش دریافت کرنے کے شاک میں، میں یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ دفتر کی تجوری میں چند ہزار ڈالرز بھی موجود تھے۔ میں حیران تھا کہ کہیں اس قاتل نے اس رقم پر بھی ہاتھ نہ صاف کردیا ہو۔

''فلپ معاملہ کیا ہے؟'' گلینڈا نے اصرار کیا۔

میں مسکرا دیا۔ ''اوہ، تم تو جانتی ہو گلینڈا میں ان جلد گھبرا جانے والے نوجوانوں میں سے ایک ہوں جو بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے جسٹن کے موڈ کو پڑھنے میں غلطی کی ہو۔'' اس بات پر گلینڈا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور غصہ اس کی آنکھوں میں عود آیا۔

''اتوار وہ ایک دن ہوتا ہے جس کو اس نے فیملی کے ساتھ گزارنے پر اتفاق کیا تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ رہی ہوں کہ اگر مجھے پتا چلا کہ وہ اس حرافہ کے ساتھ گل چھرّے اڑا رہا ہے تو میں ان دونوں کو قتل کردوں گی۔''

کیتھرائن، بوسٹن کی ایک بڑی فرم میں وکیل تھی اور ساؤتھ اینڈ میں اس کا شاندار اپارٹمنٹ اس کی کامیاب زندگی کا سمبل تھا۔ جسٹن کے مطابق وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی اور کسی قسم کے سنجیدہ تعلقات قائم کرنے کے لیے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

جسٹن کا بھی گلینڈا کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ان کے مابین جیسے بھی تعلقات تھے وہ اسے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

پھر میں کیتھرائن سے ملاقات کرنے چل پڑا۔

اس کے اپارٹمنٹ پر چھٹی بار گھنٹی بجانے پر دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ شخص باہر آیا۔ ''میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' اس نے کہا۔

''میں کیتھرائن سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام فلپ سیمپسن ہے اور میں جسٹن کرین کا دوست ہوں۔ میں ان سے کسی معاملے پر بات کرنا چاہتا ہوں اور یہ بے حد ضروری ہے۔'' میں نے بتایا۔

''میرا خیال ہے کہ تم کم نصیب ہو۔'' اس بوڑھے نے کہا۔ ''کیتھرائن اپنے بزنس کے سلسلے میں گزشتہ جمعرات کو شکاگو چلی گئی تھی اور آج رات سے قبل اس کی واپسی متوقع نہیں ہے۔ جب میں نے گھنٹی سنی تو میں یہی سمجھا کہ وہ جلدی واپس آگئی ہے۔''

جب میں اپنی کار کی جانب واپس جارہا تھا تو میرا ذہن کیتھرائن کا نام اپنی ممکنہ قاتلوں کی فہرست سے حذف کرنے کے لیے اب بھی تیار نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی واپسی صبح سویرے کی فلائٹ سے ہوئی ہو اور جسٹن اسے لینے کے لیے ایرپورٹ گیا ہو۔ مجھے اب ایک اور بات کو چیک کرنے کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

اگلے دو دن بہت تھکان میں گزرے۔ جسٹن کو دفنانے سے پہلے اس کی میت کے پاس رات بھر کی جگائی، پھر تدفین اور اس بات کا احساس کہ قصّے کہانیوں کا مبادلہ کرنے کے لیے اب جسٹن نہیں ہوگا۔ میرا پورا وقت اسی میں گزر گیا۔

اس کی تدفین کے موقع پر خاصی بھیڑ تھی اور اس کے اتنے زیادہ دوستوں کی شرکت نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ اس موقع پر زیادہ تر لوگ دو ہی بات کررہے تھے۔ ایک تو یہ کہ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ جسٹن خود کو اس طرح ہلاک کرسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اپنی زندگی کے دوران اس نے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کی مدد کی تھی۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے جس انداز سے وہ کام کیا کرتا تھا، ایسے لوگ گنے چنے ہی ہوتے ہیں۔

میں بھی اس شخص سے پیار کرتا تھا لیکن جس روز اسے دفنایا گیا اس روز مجھے اس سے اور بھی زیادہ پیار ہوگیا۔ اس روز میرے اندر بھی کوئی تبدیلی آگئی لیکن میں اس کی نشاندہی کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے خواہش کی کہ کاش میں بھی جسٹن جیسا بن جاؤں۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجھے کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ سماجی میل جول کس طرح قائم کیا جاتا ہے۔

تدفین کے بعد میں جسٹن کے گھر پر ہی تھا جب مجھے علم ہوا کہ مجھے ایسے پانسے پھینکنا ہوں گے جس سے دونوں پانسوں پر ایک ایک نقطے کے نشان اوپر آجائیں۔

گلینڈا نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے جسٹن کے ایک وفادار ملازم اور ایک اچھے دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اگر میری بچپن ہی سے سخت گیری میں پرورش نہ ہوئی ہوتی تو اس وقت میں یقیناً رو پڑتا۔

''مجھے وقت چاہیے۔'' گلینڈا نے کہا۔ ''یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کاروبار کا کیا کرنا ہے۔ کیا تم اسٹاف سے میری جانب سے کہہ سکتے ہو کہ وہ معاملات کو معمول کے مطابق جاری رکھیں جب تک میں اس بارے میں کچھ طے نہ کرلوں؟''

''ضرور۔'' میں نے کہا۔

''پولیس نے جسٹن کے دفتری معاملات کے بارے میں بھرپور تحقیقات کی درخواست کی ہے۔ یقیناً میں نے انہیں اپنے طور پر تفتیش کرنے کی اجازت دے دی ہے۔'' گلینڈا نے مزید بتایا۔ ''میرا خیال ہے وہ سب ہی سے پوچھ گچھ کریں گے۔'' جب گلینڈا نے یہ جملہ ادا کیا تو میں اس کی آنکھوں کے تاثرات پڑھنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اگلے روز پولیس کے دو سراغ رساں دفتر میں آگئے۔ ان کی جوڑی مٹ اینڈ جیف نامی کرداروں کے اصل روپ کے مانند تھی۔ ایک دبلا پتلا اور لمبا، دوسرا پستہ قد اور بھرائی ہوئی آواز والا۔ انہوں نے پہلے سیلز کے عملے سے بات کی پھر جسٹن کی سیکریٹری لارا سے کچھ سوالات کیے۔ اس دوران میری نگاہیں مسلسل ان پر جمی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر باتیں لمبے قد والا دبلا پتلا سراغ رساں کررہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بار بھی مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے چیلنج کررہا ہو۔

''ہمت ہے تو ذرا مجھ سے جھوٹ بول کر تو دیکھو۔''

جب وہ آخر میں میرے پاس آئے تو دراز قامت نے کہا۔ ''تم نے مسز جسٹن سے اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ ان کے شوہر بددل اور مایوس سے دکھائی دیتے تھے۔ کیا تم اس کی تفصیل بیان کرسکتے ہو؟''

میں نے شانے اچکا دیے۔ پسینا میرے سینے سے نیچے بہنے لگا۔ ''بس یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز انہیں پریشان کررہی تھی۔'' میں نے بتایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا تم مسز جسٹن سے عام طور پر ان چیزوں کے بارے میں بات کیا کرتے تھے؟"

"نہیں، لیکن میں فکرمند تھا۔ یہ سب باتیں کیوں ہورہی ہیں؟" مجھے اپنی آواز میں کپکپاہٹ کا احساس ہورہا تھا۔ "جسٹن نے تو خودکشی کی ہے، ہے ناں؟"

سراغ رساں نے میرے سوال کو نظرانداز کردیا۔ "اتوار کی صبح کو تم کہاں تھے مسٹر فلپ سیمپسن؟" اس نے سوال داغ دیا۔

"میں دیر تک سوتا رہا تھا پھر سنڈے گلوب اخبار پڑھا اور اس کے بعد مسز جسٹن سے ملنے چلا گیا لیکن اس بارے میں تو آپ لوگوں کو پہلے ہی پتا ہے۔"

"بس یہی؟" میں نے اس امید کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا کہ کسی نے مجھے دفتر کے آس پاس نہ دیکھا ہو۔

"جو شخص کیتھرائن کی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ تم کیتھرائن کی تلاش میں وہاں گئے تھے۔ وہاں کس لیے جانا ہوا تھا؟" دراز قامت نے اپنے مخصوص سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"وجہ وہی تھی جس کے بارے میں، میں نے مسز جسٹن سے بات کی تھی۔ میں جسٹن کے بارے میں فکرمند تھا۔"

"کیا تمہارے اور مسز جسٹن کے درمیان افیئر چل رہا ہے؟"

"قطعی نہیں۔"

"تم دفتر کی تجوری کی کمبی نیشن سے واقف تھے اور یہ کہ مسٹر جسٹن اپنی گن اس سیف میں رکھتے تھے، کیا ایسا نہیں ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "تم مجھے موردالزام تو نہیں ٹھہرا رہے ہو؟"

"اس وقت تو ہم معلومات اکٹھی کررہے ہیں۔ مسز جسٹن نے ہمیں چند کاروباری لین دین کی چھان بین کی اجازت دے دی ہے۔ میرے آدمیوں میں سے ایک آج سہ پہر یہاں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے بات کرنا چاہے گا۔" اس دراز قامت نے رخصت ہونے سے قبل بتایا۔

جب وہ سراغ رساں چلے گئے تو میں دفتر سے باہر نکل آیا۔ میں نے سگریٹ سلگائی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور میرے دل کی دھڑکن بھی بہت تیز ہوگئی تھی۔ پولیس کو کھاتے چیک کرنے سے روکنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے، میں سوچ رہا تھا لیکن میرے پاس وقت بہت کم تھا جو تیزی سے گزر رہا تھا پھر ایک خیال اچانک ہی میرے ذہن میں عود کر آیا۔ یہ خیال میرے دماغ میں یوں پیوست تھا جیسے ہمیشہ سے وہاں موجود رہا ہو اور ابھرنے کے لیے عین اسی لمحے کا انتظار کررہا تھا۔

لارا دو سال سے جسٹن کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کررہی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس برس تھی۔ وہ دو نوعمر لڑکیوں کی اکلوتی ماں تھی۔ جسٹن نے اسے بھی سڑک سے اسی طرح اٹھایا تھا جیسے اس نے مجھ پر عنایت کی تھی۔ لارا بھی جسٹن کے فلاحی کاموں میں سے ایک تھی۔

جب میں واپس دفتر میں داخل ہوا تو وہ اپنے کمپیوٹر پر کام کررہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تمہارے خیال میں مسز جسٹن اس کاروبار کے بارے میں فیصلہ کب تک کریں گی، میں اس جاب کو کھونے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔"

"ابھی تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ ہمارے چند کلائنٹ اس بات پر اپ سیٹ ہیں کہ ہم نے جسٹن کی موت کے بارے میں انہیں ذاتی طور پر اطلاع کیوں نہیں دی۔ کیا تم میرے لیے ایک لیٹر کمپوز کرسکتی ہو؟" میں نے کہا پھر اس کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔

"اس لیٹر کو ولکنز کمپنی کے نام بھیجنا ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ وہ ٹائپ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ میں نے لیٹر لکھوانا شروع کیا۔

"ڈیر ڈیوڈ، جسٹن کی موت کے بارے میں آپ کو مطلع نہ کرنا ناقابل معافی ہے، پلیز ہماری معذرت قبول فرمائیں۔"

"بس یہ کافی رہے گا۔" میں نے کہا۔

میں اس کے کمرے سے نکل کر مردانہ واش روم میں چلا گیا۔ میں کچھ دیر تک وہاں رہا پھر وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے لارا سے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے جسٹن کو قتل کیوں کیا تھا؟"

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے اپنی انگلی اس کی جانب اٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم تجوری کے تالے کے کمبی نیشن سے واقف تھیں۔ تم اتوار کی صبح تجوری سے رقم چوری کرنے اور اسے ڈکیتی کی واردات ظاہر کرنے کے ارادے سے یہاں آئی تھیں، اسی میں جسٹن اچانک یہاں آگیا اور تم نے اسے گولی ماردی اور کوشش یہ کی کہ اسے خودکشی کا رنگ دے دو۔"

"لگتا ہے کہ آج کل تم ٹیلی وژن شو کچھ زیادہ ہی دیکھ

رہے ہو۔"

"دیکھو لارا، میں جانتا ہوں کہ یہاں تمہیں جتنی تنخواہ ملتی ہے اس میں دو نوعمر لڑکیوں کی پرورش اور ان کی ضرورتیں پوری کرنا بے حد مشکل ہوتا ہوگا۔ اب ان کی عمریں کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

میرے اس اچانک سوال پر وہ گم صم سی ہوگئی۔ "جینی چھ سال کی ہے اور سانتھا اگلے ہفتے گیارہ برس کی ہوجائے گی۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میرا اور تمہارا دونوں کا تعلق سڑک پر سے ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم کس کیفیت سے گزرے ہیں۔ جسٹن میرے لیے ایک باپ کے مانند تھا۔ میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ ہم جو بھی بات کریں گے وہ مزید آگے نہیں جائے گی۔ میں جسٹن کی قبر کی قسم کھا کر یہ وعدہ کررہا ہوں۔"

یہ سن کر لارا کا جسم تن گیا۔ "کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کی جاسکتی ہے۔"

"ہاں، بات ہے لارا۔ میں نے جسٹن کی آمد سے قبل تمہیں یہاں دفتر میں داخل ہوتے دیکھا تھا پھر مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں نے یہ بات پولیس کے سراغ رسانوں کو اس لیے نہیں بتائی کہ ہم ایک فیملی کے مانند ہیں۔ یقین کرو یہ میری حتمی کوشش ہوگی کہ تمہیں کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہونے دوں لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھ پر بھروسا کرتی ہو؟"

اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "اوہ خدایا!"

"اگر تم سب کچھ اگل دو گی تو خود کو بہتر محسوس کرو گی۔ لارا، میں سمجھ جاؤں گا۔ آخر کار ہم دونوں کا ماضی ایک ہی رہا ہے۔ تمہیں بھی سڑک پر سے اٹھایا گیا تھا اور مجھے بھی۔" میں یہ کہہ کر اس طرح ہنس دیا جیسے میرے ہاتھ میں رائل فلش کے پتے آگئے ہوں۔ "میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے لڑکیوں کو یا تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ تم میرے لیے ایک بہن کے مانند ہو۔"

تب اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر دائیں بائیں دیکھنے کے بعد دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ "میں صرف رقم لینا چاہتی تھی تاکہ اپنی بچیوں کے لیے کچھ کپڑے خرید سکوں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ مجھ جیسی ماں کی وجہ سے وہ کتنی تکلیف اٹھاتی رہی ہیں۔ میں ان کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہی ہوں۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔

"جب میں تجوری سے رقم نکال رہی تھی تو اتنے میں جسٹن اندر آگیا اور اس نے رنگے ہاتھوں مجھے پکڑ لیا۔ وہ مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے میرا ایک موقع دے چکا تھا اور میں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اب وہ مجھے پولیس کے حوالے کردے گا۔ اپنی ماں کے بغیر میری بچیاں کیا کرتیں؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے۔

"میں نے اسے ڈرانے کے لیے تجوری میں رکھا ہوا اس کا پستول نکال لیا پھر میں بوکھلا گئی اور گھبراہٹ میں مجھ سے پستول چل گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا، یقین کرو میں نے جان بوجھ کر گولی نہیں چلائی تھی۔ کاش اگر یہ سب کچھ واپس ہوسکتا تو میں واپس لیے لیتی۔ آئی ایم سوسوری۔ وہ واقعی بہت اچھا انسان تھا۔"

میں وہاں سے پلٹا تو دل ہی دل میں بے حد خوش تھا۔ بات بن چکی تھی۔

میں بیرونی دفتر میں آگیا اور وہ ٹیپ ریکارڈر آف کردیا جو مردانہ واش روم میں کچھ دیر قبل اپنے سینے پر باندھا تھا پھر ریکارڈر میں سے لارا کے اعتراف جرم کا ٹیپ نکال لیا۔

میں نے جو خط لارا سے ٹائپ کروایا تھا اس میں لفظ unforgivable کے ہجے اس نے بالکل اسی طرح غلط ٹائپ کیے تھے جیسے جسٹن کے خودکشی کے پیغام میں غلط ٹائپ تھے۔

جسٹن جیسا صحت کلام پر اصرار کرنے والا شخص دنیا کو اپنے آخری پیغام میں ہجے کی ایسی فاش غلطی کرنے کا مرتکب ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔

میں دفتر کی عمارت سے نکل کر عقبی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ پولیس اسٹیشن پانچ منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔

لارا کو مجرم ثابت کرنے کے لیے وہ ٹیپ ہی کافی تھا جس میں اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا پھر یہ کیس ختم ہوجاتا اور مزید کوئی تحقیقات نہیں ہوتیں۔ یوں میری جاں بخشی ہوجاتی اور میرے رقم چرانے کا راز، راز ہی رہتا۔

میرا گیم سیٹ رہا تھا اور بازی میرے حق میں ہوگئی تھی۔ تب اچانک لارا کا چہرہ میرے ذہن کے پردے پر فلیش کرنے لگا۔

"اپنی ماں کے بغیر ان دونوں بچیوں کا کیا ہوگا؟"

میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور تیزی سے کش لینے لگا پھر میں نے وہ ٹیپ کوڑے دان میں پھینک دیا۔ اپنی منہ بولی بہن کی خاطر میں نے خود کو ایک اور بے دھڑک داؤ کھیلنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

محفلِ شعر و سخن

❄ جواد سہیل......لاہور

جو اشکوں نے کہی آنکھوں سے وہ ہر بات ادھوری ہے
بجھے کیوں پیاس صحرا کی کہ یہ برسات ادھوری ہے

❄ حسنین عباس، کمیل عباس......کھاریاں

یہ سال بھی بیتے گا صدیوں کی طلب بن کر
اس سال بھی آئے گی نہ تیری خبر جاناں
آنکھیں تجھے ڈھونڈیں گی پھولوں کے نظاروں میں
پر دل کے تڑپنے کی ہو گی نہ خبر جاناں

❄ جواہر سعید......خانیوال

ہر ایک چہرہ پڑھتے جائیں، ہر اک دامن چاک کریں
ہر اک جوہر ڈھونڈ کے لائیں، خود کو نہ پہچانے لوگ

❄ ثمینہ حبیب......مری آباد کوئٹہ

سکھا دی بے وفائی بھی تمہیں ظالم زمانے نے
کہ تم جو سیکھ لیتے ہو ہم ہی پہ آزماتے ہو

❄ زاہد چودھری......چھور کینٹ

ہزار اس نے چاہا کہ میں بکھر جاؤں
سو میں نے صبر کیا، صبر بھی قیامت کا

❄ افتخار حسین اعوان......مظفر آباد، آزاد کشمیر

خرچ لمحوں میں تیرے دستِ کشادہ سے ہوئے
کتنی صدیوں کی مشقت سے کمائے ہوئے ہم

❄ محمد جاوید شبیر بربرہ......علی پور

توبہ کو توڑنے کی نیت نہ تھی مگر
موسم کا احترام نہ کرتے تو ظلم تھا

❄ محمد اقبال......کورنگی، کراچی

آج اِک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

❄ اظہر حسین بچار......ہزاری، جتوئی

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے انساں کو ہنسایا جائے

❄ قیصر اعوان......ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

گئے دنوں کی کوئی "داستان" ہونا ہے
یہ طے ہوا کہ ہمیں "بے نشان" ہونا ہے
محیط کر دیں گے صدیوں پہ اس "محبت" کو ہم
بس ایک لمحہ تمہیں "مہربان" ہونا ہے

❄ محمد رشید سیال......روہڑی

بے حسی کی دنیا میں دو سوال میرے بھی
کہ کس طرح جیا جائے، کس لیے جیا جائے

❄ عمر دراز قمر انصاری......پھلروان شہر

تم سے ایسے ہو گیا ہے رابطہ دیکھے بغیر
جس طرح ہم سانس لیتے ہیں ہوا دیکھے بغیر

❄ محمد جاوید......تحصیل علی پور

زندگی بتانے کا ہنر جانتا ہوں
تیری یاد مشل شغل جانتا ہوں

❄ طاہرہ یاسمین......سرگودھا

تپش سے بچ کے گھٹاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
گئے ہوؤں کی صداؤں میں بیٹھ جاتے ہیں
ہم اردگرد کے موسم سے جب بھی گھبرائیں
تیرے خیال کی چھاؤں میں بیٹھ جاتے ہیں

❄ ڈاکٹر این شیخ......سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا

رات پھر دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے مریض کو بے وجہ قرار آجائے

❄ امتیاز علی اللہ......سرگودھا

نہ میں پاس اس کو بلا سکا
نہ میں دل کی بات بتا سکا
وہ جدا ہوا بھی تو یوں ہوا
کہ میں ہاتھ تک نہ ہلا سکا

❄ محمد جاوید عباسی......نیو سینٹرل جیل ملتان

میں بھر سکتا ہوں تیری یاد میں حسرت بھری آہیں
مگر آہوں کی گرمی سے کیا پتھر پگھلتے ہیں

❄ محمد صفدر معاویہ......خانیوال

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکان اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھا
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

❄ افتخار حسین اعوان......مظفر آباد، آزاد کشمیر

خرچ لمحوں میں تیرے دستِ کشادہ سے ہوئے
کتنی صدیوں کی مشقت سے کمائے ہوئے ہم

❄ غلام عباس......علی پور

توبہ کو توڑنے کی نیت نہ تھی مگر
موسم کا احترام نہ کرتے تو ظلم تھا

❄ متین سلطان......کراچی

قائم ہیں اس زمانے میں رشتوں کے سلسلے
تم بھی کچھ لے دے کر مجھ سے محبت کر لو

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

❄ احمد خان توحیدی......اسٹیل ٹاؤن کراچی

اے قائدِ اعظم چشمِ نم ترے غم خوار تجھ کو یاد کرتے ہیں
باضمیر جانِ نثار سپوت وطن تجھ کو یاد کرتے ہیں
پاک دھرتی بھی روتی ہے چھم چھم اپنی تباہی پر
زریں اقوال تیرے سانپ نے ہی کیا اغیار بھی تجھ کو یاد کرتے ہیں

❄ فیصل حسن پرنس......ستیانہ جھنگ صدر

یہ جو ڈوبی ہیں میری آنکھیں اشکوں کے دریا میں
یہ تیرے معصوم چہرے پہ بھروسے کی سزا ہے

❄ قاضی عرفان احمد عاجز، ماسٹر جمیل احمد......آڑہ

خواہش سے نہیں گرتے پھل جھولی میں
وقت کی شاخ کو میرے دوست ہلانا ہو گا
کچھ نہیں ہو گا اندھیروں کو برا کہنے سے
اپنے حصے کا دیا خود جلانا ہو گا

❄ راجا ثاقب محمود جنجوعہ......پنڈ دادن خان

ٹوٹ جائیں نہ کہیں، پیار کے نازک رشتے
وقت ظالم ہے ہر ایک موڑ پہ ٹکرائے گا

❄ احمد حسن عرضی......قبولہ شریف

موت کا نام ہی دنیا میں برا ہے
زندگی میں بھی بہت ایسے مقام آتے ہیں

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال

نہ باندھ عمر کے پیمان، زیست کے بندھن
نہ وقت میرا ہے پیارے، نہ وقت تیرا ہے
یہ ایسا عہد ہے جس کی ہیں مختلف اقدار
ڈسا ہوا یہاں سانپوں کا خود سپیرا ہے

❄ عائشہ اقبال......کراچی

ہونے والے خود ہی ہو جاتے ہیں اپنے
کہہ کر کسی کو اپنا بنایا نہیں جاتا

❄ ہارون رشید......کاٹلنگ مردان

مجھ سے بچھڑ کے وہ بھی کہاں اب یاروں پہلے جیسی ہے
پھیکے پڑ گئے کپڑے شہزادے، زیور شیوور سب کے سب
دکھ کے چمن کے باسی ہیں یہ درد شہر کے بانی ہیں
محسن و حسن، غالب شالب، ساغر واغر سب کے سب

❄ مہرین ناز ڈوگر......حیدر آباد

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اڑے گا اپنی ہی موج میں اسے آب دے یا سراب دے

❊ مسز بابر عباس، ماہین بابر......کھاریاں
وہ شخص پیار کے قابل ہے کیا کیا جائے
مگر وہی میرا قاتل ہے کیا کیا جائے
وہ اِک لمحہ بھی مجھ سے جدا نہیں ہوتا
نفس نفس میں وہ شامل ہے کیا کیا جائے

❊ ہما انصار......کراچی
تشنگی تھی میری زندگی کے صحرا کی
جسے نظر نے میری سطحِ آب جانا تھا

❊ سوہا جی......ملتان
اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں
یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

❊ اعجاز احمد......راحیل
بچھڑ کر مجھ سے کبھی تو نے یہ بھی سوچا ہے
ادھورا چاند بھی کتنا اداس لگتا ہے
یہ ختم وصل کا لمحہ ہے، رائگاں نہ سمجھ
کہ اس کے بعد وہی دوریوں کا صحرا ہے

❊ محمد اکرم......جہلم
کچھ اس طرح سے نظر انداز ہوگئے
جیسے اضافی حرف تھے تیری کتاب زندگی میں

❊ محمد جاوید......بہاولپور
جب بھی تیرے بارے میں سوچتا ہوں
ہر لفظ دعا ہو جاتا ہے میرے لب کا

❊ احسان سحر......میانوالی
اٹھا کر چوم لی ہیں چند مرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے نہ جشنِ بہاراں کیا میں نے

❊ اشتیاق احمد......حیدرآباد
رسم وفا ہم نے ہی نبھائی اور ہم ہی بدنام ہوئے
حسن و عشق کی اس دنیا میں ہم ایسے دیوانے تھے

❊ وقار حسین......میرپور خاص
جب دیکھا اس کا کتراتا تو دل نے آخر سوچ لیا
ہم کیوں نہ بدل دیں رستوں کا رخ بدلے ساری باتوں کا

❊ اسرار احمد......بدین
زندہ رہنا بھی دشوار تر ہو گیا
اِک قیامت ہے شام و سحر زندگی

❊ ماہین حنیف......ٹنڈوآدم
یہ درد کے ٹکڑے چن چن کر کیوں دل میں اتارے جاتے ہو
میں زندہ رہنا چاہتی ہوں تم دل کو مارے جاتے ہو

❊ ثاقب عزیز......گلشن اقبال، کراچی
جس کی رفاقت شام کے ڈھلتے سائے تک ہی ملتی ہو
مانا وہ خورشید ہے لیکن اس کی پوجا کیا کرتے

❊ سید محی الدین اشفاق......ضلع لیہ
بے خیالی میں یوں ہی ایک ارادہ کر لیا
اپنے دل کے شوق کو حد سے زیادہ کر لیا

❊ ظفر علی خان......کوئٹہ
جانتے تھے ہم یہ دونوں کہ نباہ سکتے نہیں
اس نے بھی وعدہ کرلیا میں نے بھی وعدہ کرلیا

❊ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن خانیوال
اس کا عشق بھی چاند جیسا تھا
پورا ہوا تو گھٹنے لگا

❊ رضا علی......سکھر
ہو جائے معلوم اگر اس ہار میں جیت ملے گی
پیار کی بازی کی خاطر میں اپنی جاں پہ کھیلوں

❊ انصار احمد......ڈگری
کھیل تماشا سمجھے تھے وہ میرے سارے جذبوں کو
دیکھی عشق کی جب گہرائی، آخر میں گھبرائے بہت

❊ ذوالفقار خان......کوئٹہ
پھول گگن اور تارے مٹی سب کا وہ دھن وان
شکر کرے ہے ذرّہ ذرّہ نا شکرا انسان

کوپن برائے شمارہ مارچ 2014

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : --

پتا : --

"رات کو وہ گھس آئے تھے چھ لوگ، لمبے تڑنگے، شلوار قمیص پہنے، چہروں پر مخصوص چادر باندھے ہوئے، بڑی بڑی آنکھیں اور ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھیار، پستول، کلاشنکوف اور چاقو۔ ایک نے احمد کے باپ کی گردن پر چھری رکھ دی اور مجھے میری چارپائی پر ہی رسیوں سے باندھ دیا۔ میرے بعد ان سے بھی بستر پر لیٹنے کو کہا اور دوسرے نے پستول کے دستے کو ان کے سر پر دے مارا تھا۔ خون جیسے ابل رہا ہو، میں تقریباً بے ہوش سی ہوگئی۔ ہم

اندھیرا

ڈاکٹر شیر شاہ سید

کہتے ہیں اپنا مارے چھاؤں میں ڈالے مگر... آنے والے وقتوں میں شاید ایسی تمام کہاوتیں غلط ثابت ہوجائیں کیونکہ... اب تجربہ کہتا ہے کہ "اپنا اتنا مارے کہ ظلم کی انتہا کرے اور دھوپ میں ڈالے" جب اپنے ہی گھر میں سانپ اور سپیروں کا کھیل کھیلا جائے... تو زہر خاموشی سے جڑوں میں اتر جاتا ہے۔ وہ بھی جنہیں دوست سمجھتے تھے آستین کے سانپ نکلے۔

ہجرتوں میں زندگی تمام کرنے والوں کی روداد الم

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں کو باندھنے اور ہمارے منہ پر پٹیوں کو کسنے کے بعد برابر والے کمرے میں ایک ایک کر کے وہ میری بیٹی اور بہو کو پامال کرتے رہے۔ کسی چیخ کے بغیر، بے آواز، دہشت کی خاموشی میں آہستہ آہستہ وہ وحشی سب کچھ کرتے رہے۔ نہ جانے کب وہ دونوں مرگئی تھیں۔"

احمد کی ماں نے مجھے بڑے دکھ سے بتایا تھا۔ ہر ایک لمحے کا کرب، بچیوں کی ایک ایک ان سنی چیخ، پامالی کا ایک ایک لمحہ، اس رات کا ہر ایک عذاب، ان کے چہرے پر رنگ بدل بدل کر عیاں تھا پھر وہ اسی بجھے بجھے لہجے میں بولی تھیں۔ "اب احمد کو ہم کیا بتائیں گے کہ کیا ہوا اس کی بیوی کے ساتھ..... کہاں چلی گئی بہن اس کی؟"

یہ کہہ کر وہ اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکی تھیں۔ بھیگا بھیگا آنسوؤں سے تر چہرہ مجھے ایسا لگا جیسے ان کے چہرے کی جھریاں لہر بن کر دکھ کے سمندر میں فنا ہو رہی ہیں۔

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ احمد کے والد گھر میں داخل ہوئے۔ ابھی سال بھر پہلے تک ان کے چہرے پر بشاشت تھی، بغاوت ان کے ماتھے پر نمایاں مگر اب ان کا چہرہ ان کے ٹوٹنے کی چغلی کھا رہا تھا..... یہ ایک مختلف چہرہ تھا، بجھا ہوا، ٹوٹا ہوا، بھیگا ہوا، نامانوس مایوس سا چہرہ۔ ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی مجھے لگا جیسے میں خود بھی اندر سے ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ نہ جانے کس طرح سے بے سمت ہو کر کہاں سے کہاں چلا جا رہا ہوں۔

پہلے..... بہت پہلے، وہ احمد کے ساتھ ہی ہمارے آفس آئے تھے، جوش سے بھرا ہوا، تانبے کی طرح تپتا ہوا چہرہ میں نہیں بھول سکتا ہوں۔ وہ چہرہ بھی میں دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ کچھ بولے نہیں، نہ احمد کی خیریت پوچھی، نہ اپنا حال بتایا، خاموشی سے احمد کی ماں کے برابر میں بیٹھ گئے۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح، ایک تھکے ہوئے انسان کے مانند، ایک ایسے سپاہی کی طرح جس کے ہتھیار چھن گئے ہوں، جس کا سپہ سالار بھاگ گیا، جو موت سے بچ گیا ہو مگر زندہ بھی نہ رہنا چاہتا ہو۔

مجھے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بات کا سلسلہ شروع کروں اور شروع کروں تو کہاں سے؟ مجھے لگا کہ میرے پاس سنانے کو بہت کم ہے اور سننے کو بہت زیادہ۔ ان دونوں کو دیکھ کر، احمد اور ان کے بارے میں سوچ کر ہی ٹھنڈا ٹھنڈا پسینا میرے وجود کو تر کرتا چلا گیا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑنے والی بجلی نہ جانے کتنے میگاواٹ کا اخراج کر رہی تھی کہ میں شل سا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ مجھے غور سے دیکھتے رہے، میں انہیں تکتا رہا، کچھ بولنے ہی والا تھا کہ وہ بول اٹھے۔ "اسی لیے بنایا تھا یہ ملک ہم لوگوں نے؟"

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا۔

"سنتا ہار کا نام سنا ہے تم نے..... مشرقی پاکستان کا ایک شہر ہے۔" وہ بنگلا دیش کو اب بھی مشرقی پاکستان ہی کہتے تھے۔ "میں جب وہاں پہنچا، بہار سے مہاجر بن کر تو بہاری کہلایا، پاکستانی نہیں کہا مجھے کسی نے..... اسی مٹی میں ملا لیا تھا اپنے آپ کو میں نے کہ اب پاکستان میں رہوں گا۔ اردو بولوں گا، اسلامی حکومت میں..... ہندوؤں سے دور، زندگی آرام سے گزرے گی۔ چین ہوگا، امن ہوگا، اپنے مسلمانوں کے درمیان زندگی نہ پریشان ہوگی، نہ پشیمان۔ سب آزاد ہیں ہم لوگ قائداعظم کے پاکستان میں ہیں۔ وہ پاکستان جس کا خواب نہ جانے کتنوں نے دیکھا اور نہ جانے کتنوں نے جس کے لیے اپنی جانیں دے دیں۔ اسی پاکستان میں آیا تھا میں، اسی پاکستان میں۔"

"بہار میں ہندوؤں نے میرے باپ کو مار دیا تھا، وہ پاکستان کے حامی تھے۔ میں فسادات میں چھوٹی عمر میں گھر کو، خاندان کو لے کر مشرقی پاکستان کے شہر سنتا ہار پہنچ گیا تھا۔ جو کچھ سنتا ہار میں گزری وہ تو پہلے سن چکے ہو ناں تم..... بتا چکا ہوں ناں تمہیں..... یاد ہے ناں تمہیں۔ وہ سب کچھ کہانی نہیں تھا، افسانہ نہیں تھا، اختراع نہیں تھی..... سچ تھا، بالکل سچ۔"

وہ بہت پہلے بتا چکے تھے جب مشرقی پاکستان میں فسادات شروع ہوئے تو وہ، ان کی بیوی، بیٹا اور بیٹی چٹاگانگ میں تھے۔ انہیں خبر ملی کہ مکتی باہنی نے سنتا ہار میں ایک بھی بہاری کو زندہ نہیں چھوڑا ہے، چھ ہزار کے چھ ہزار، سب کے سب مار دیے گئے۔ ایک خاندان کو شاید کسی بنگالی گھرانے نے بچا لیا تھا۔ انہوں نے پھر بھی کوشش کی تھی، اپنے بنگالی دوست شمس الرحمٰن کے ساتھ سنتا ہار جانے کی۔ پر جا نہیں سکے مگر شمس الرحمٰن خبر لایا کہ سب مر گئے، نہ ماں نہ چچا، نہ ماموں نہ بہن اور نہ ان کے بچے۔ مجھے یاد تھا انہوں نے ہمارے آفس میں بیٹھے بیٹھے تفصیل سے پوری داستان سنائی تھی کہ کس طرح بچتے بچاتے بنگلا دیش بننے کے بعد چٹاگانگ سے ایک چھوٹی سی بوٹ میں سارا خاندان دوسرے بہاریوں کے ساتھ بھاگا تھا۔ بوٹ دو دن میں برما کے ساحلی شہر اکیاب پہنچی۔ صرف بیوی اور بیٹی کے سونے کے زیورات تھے جنہیں بیچ بیچ کر وہ لوگ زندہ رہے،

پاکیزہ قارئین کے پیغام ہائے محبت لیے فروری 2014ء کے شمارے کی دل رُبا جھلکیاں

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

مسلسل ناول

رفعت سراج اور عنیزہ سید کے ناولوں کی چونکا دینے والی اقساط

مِنی ناول

اِک نئے موڑ پر... رضوانہ پرنس کے دلکش بیان کا مظہر

رتیزا اشی کی پُرمحبت تحریر..... پیامِ محبت مکمل ناول کی صورت

نایاب جیلانی کے کہنہ مشق قلم کا شاہکار ناولٹ ترکِ وفا

اس کے ساتھ ساتھ پڑھیے

سکینہ فرخ، سیما یاسمین مجتبیٰ، غزالہ فرخ، مدیحہ عدنان،

تحسین اختر اور شاہدہ ملک کی خوشبو بکھیرتی دل نشیں تحریریں

حسبِ سابق مستقل سلسلوں کا پُراثر اور سحر انگیز امتزاج صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

اکیاب میں پاکستانی سفارت خانے نے ایک شاخ کھول لی تھی جہاں سے مغربی پاکستان اور خاص طور پر پنجاب کے ڈومیسائل والوں کو فوراً ہی داخلے کا پرمٹ ملتا مگر مشرقی پاکستان کے ڈومیسائل والوں کی لمبی لائن لگتی تھی۔ ہفتوں کے انتظار کے بعد ان کی باری آتی، انہیں ٹہلایا جاتا، انہیں بہلایا جاتا، جانچ پڑتال، پوچھ گچھ کے بعد انہیں کراچی کا ٹکٹ دیا جاتا تھا۔ اسی طرح کے جھمیلوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ بھی پی آئی اے سے کراچی پہنچے تھے۔ سنتاہار کی کہانی ایک بڑا دکھ تھا اور مشرقی پاکستان کے بنگلا دیش بننے میں جتنے بنگالی مرے، ان کی تو یادیں ہیں، میوزیم ہے، ان کے نام پر چھٹی ہے مگر اَن گنت بہاریوں کا کون ہے جو تاریک راہوں میں مار ڈالے گئے، جن کی لاشوں کو گِدھوں نے نوچ لیا، جن کی قبریں بھی نہ بن سکیں، جو مسلمان ہوتے ہوئے مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ جن کی عورتیں اغوا ہو گئیں، جو سنتاہار سے بچیں تو طوائفیں بن گئیں، جنہیں لوٹا گیا، کلکتہ کے بازارِ حسن سے تھائی لینڈ چکلوں تک ان کے جسموں کو روندے جانے کے لیے چھوڑ دیا گیا، ایک پوری ناجائز نسل تیار کرنے کے لیے۔

چٹا گانگ میں چھپ چھپ کر بچ بچ کر بوٹ میں سوار ہونا، بوٹ میں ڈر ڈر کر رو رو کر اکیاب پہنچنا، برما سے لڑ لڑ کر بگڑ بگڑ کر نکلنا، زندگی کیا تھی صرف جدوجہد...... صرف قربانی...... مگر سب کچھ گوارا...... سب کچھ سہا اس لیے کہ پاکستان سے محبت تھی۔ اسلام کے لیے ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ ہندوؤں کے ہاتھوں قتل ہوئے، پاکستان کے لیے بنگال چھوڑا، بنگالیوں کے ہاتھوں پامال ہوئے۔ ان لوگوں پر بھی کوئی فلم بنے گی، ان کا بھی کہیں ذکر ہوگا...... میں سوچ رہا تھا۔

انہیں اورنگی میں کھپایا گیا، غربت کے باوجود ایک پاکستان کی محبت تھی جنہوں نے انہیں تازہ دم رکھا ہوا تھا۔ اورنگی جیسی جگہ پر بھی وہ صبر شکر کے ساتھ بس گئے تھے۔ اس حوصلے کے ساتھ کہ اب تو پاکستان میں ہیں۔ اب تو اچھا ہی ہوگا، اب تو انصاف ہوگا۔ زندگی شاد ہوگی، فخر سے جئیں گے ہم لوگ، عزت کے ساتھ۔ امیدیں، صرف اچھی امیدیں ہی لگائی تھیں ان لوگوں نے اور قربانی دیے چلے جا رہے تھے۔

کراچی ہی میں انہوں نے ایک آفس میں ملازمت کر لی، وہ بنگلا دیش میں بھی ایک مذہبی جماعت میں تھے اور کراچی میں بھی اسی جماعت میں ہی رہے۔ جب کراچی میں ایک خاص لسانی جماعت کی سیاست کا ایک طوفان اٹھا اور بڑے بڑے کٹر لوگ دائیں بازو اور بائیں بازو کی اپنی سیاست، نظریہ، جدوجہد، مقصد چھوڑ کر صرف اسی جماعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سب کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ہم پر مقامی لسانی اکثریت نے بہت ظلم ڈھا لیے، اب کراچی کا مزید استحصال نہیں ہوگا۔ اب کوٹہ سسٹم ختم کرنا ہوگا۔ اب کراچی کی دولت کراچی میں رہے گی۔ ہمیں اپنے حقوق چھیننے ہوں گے۔ سب کو ایک ہونا ہوگا، کراچی کی ایک آواز ہوگی۔ ہر شعبے میں ہم بھی ہوں گے۔ کراچی، کراچی والوں کی جنت ہوگی یہاں امن ہوگا، امان ہوگی، بغیر کسی خوف کے۔

”میں ہندوستان میں باغی تھا، میں مشرقی پاکستان میں باغی تھا، میں کراچی میں بھی باغی ہی رہوں گا۔ اسلام کے لیے کچھ بھی کر گزروں گا۔“ یہ جواب دیا تھا انہوں نے ان لوگوں کو جو علاقہ انچارج کے ساتھ ان کے گھر سے دینی جماعت کا جھنڈا اتارنے آئے تھے۔ ان کا غصہ، ان کا یقین اور ان کا انداز ایسا ہی تھا کہ کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکا اور نہ کچھ کر سکا تھا۔ دینی جماعت کا جھنڈا لہراتا رہا۔

کراچی کے سارے خواب بکھر گئے، کوئی فرق نہیں تھا کراچی کے لیڈروں میں اور پیروں، میروں، وڈیروں اور لٹیروں میں۔ وہی دہشت، وہی رعونت، وہی انداز، وہی ہتھیار اور وہی ہیر پھیر۔ وہ جن کی تہذیب مقامی تہذیب سے اعلیٰ تھی، جن کی زبان اس خطے کی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ تھی، جو تمدن لے کر آئے تھے، جو کہتے تھے وہ زیادہ تعلیم یافتہ بھی ہیں، تہذیب یافتہ بھی، وہ کم تر تہذیب کم تر زبان کم تر تمدن سے مات کھا گئے تھے۔ روشنی کہاں ہے، دور تک اندھیرا تھا۔

نہ جانے کس کے خواب تھے نہ جانے کن لوگوں نے دیکھا اور نہ جانے کن لوگوں نے خوابوں کی تعبیر پائی۔ شہر اور شہر کے لوگ تو ٹوٹ پھوٹ کر کرچی کرچی بکھر گئے تھے۔

انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی کراچی میں ہی کی، اور بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کر رہے تھے۔ جب وہ دفتر میں آ کر بیٹھتے تو میں ان کے چہرے کو دیکھ کر سوچتا کہ کتنا بہادر ہے یہ آدمی۔ کتنی قربانیاں دی ہیں اس نے۔ ان جیسے سیکڑوں بہاری تھے جو اپنے خاندان، اپنے پیاروں کی جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود دوبارہ مرنے پر تیار تھے۔ کچھ تھا لفظ پاکستان میں جادو۔ کوئی بات تھی زبان اردو میں کہ یہ لوگ جانیں ہتھیلی پر لیے گھومتے تھے۔ اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ۔

جب افغانستان کا جھگڑا شروع ہوا اور ہم لوگوں نے مجاہدین بھرتی کرنے شروع کیے تو غازی اور شہید بننے کے لیے لوگوں کی لائن لگ گئی۔ افغانستان کی جنگ بھی خوب تجربہ تھا۔ یہ وہ محاذ تھا جہاں ہم لوگوں کو اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع ملا تھا۔ امریکا، برطانیہ، سعودی عرب اور نہ جانے کن کن طاقتوں نے مل کر جنگ شروع کی تھی۔ ملک میں موجود ہر قسم کے مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہ جنگ، یہ جہاد ضروری ہے اور جنگ لڑی جائے گی، جیتی جائے گی۔

وہ خود تو نہیں گئے افغانستان، مگر زبردست جوش وجذبے کے ساتھ مجاہدین جمع کیے انہوں نے۔ نئے مجاہدوں کو سمجھانا پڑھانا، جہاد کا جذبہ جگانا، روسی دہریوں اور کمیونسٹ افغانی فوج سے لڑنے کے لیے جماعت کے لٹریچر کو پھیلانا، یہ ذمے داری انہیں دی گئی اور اس ذمے داری کو انہوں نے خوب نبھایا۔ دن رات ایک کر دیا انہوں نے۔ گھنٹوں آفس میں بیٹھے تقریر کرتے تھے۔ روسیوں کا تختہ ہونے والا تھا۔ افغانستان آزاد ہونے والا تھا اور اسلام کا سورج پھر ابھر کر دنیا بھر میں حکومت کرنے کے لیے تیار تھا۔ روزانہ آفس میں میٹنگ ہوتی۔ جہاد سے آنے والے آ کر اپنے قصے سناتے، نئے مجاہدوں کا حوصلہ بڑھایا جاتا۔ جہاد میں شہید ہونے والوں کے لیے قرآن خوانی ہوتی۔ ہر کوئی اس کام میں اس طرح سے جڑا تھا جیسے یہ جنگ اس کی جنگ ہے، جیسے یہ جہاد ایسا جہاد ہے جس میں جیت ہی مقدر ہے، جو جنت کا واحد راستہ ہے۔

میں نے پھر نظر بھر کر ان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ چہرہ ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چہرہ جس کو دیکھ کر مجھے لگتا تھا کہ ایک دن وہی سب کچھ ہوگا جس کا خواب ہم سب دیکھتے رہے ہیں۔ وہ ہاتھ جو جھنڈا اٹھایا کرتے تھے، تھرتھرا رہے ہیں اور وہ ہونٹ جو فلک شگاف نعرے لگاتے تھے، کپکپا رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے، افغانستان سے روسیوں کے بھاگنے پر وہ کس قدر خوش ہوئے تھے۔ ایسا لگا جیسے دنیا فتح ہو گئی ہے، بہ قول ان کے یہ پہلی جست تھی کئی سال کے بعد۔ پاکستان بنا تو خوشی ہوئی تھی پھر پینسٹھ کی جنگ بھٹو اور مجیب کی جیت، پھر 71ء کا حادثہ ایسا لگتا تھا جیسے ساری نظریاتی جنگیں ویت نام کی طرح ہاری جائیں گی۔

انہوں نے جوش سے کہا تھا، اب انگلینڈ اور امریکا کا بھی یہی حشر ہوگا۔ سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اس وقت۔ پاکستان کے ہر کونے سے یہی آواز آ رہی تھی کہ پاکستان کے طالب علموں نے پھر سے ملت اسلامیہ کی قسمت جگا دی ہے۔ بڑے جلسے کیے گئے، بڑا ہنگامہ اٹھایا گیا۔ کئی سال کے بعد پھر ایک بار مسلمانوں نے جنگ جیتی تھی۔ جنگ کمیونسٹوں اور دہریوں کے خلاف۔ ہم کو ایسا لگا تھا جیسے اسلامی انقلاب بہت قریب آ گیا ہے۔

ان کے چہرے پر دھواں دھواں مایوسی اور اداسی کے بادل گھیرے سے گھیرے ہوتے جا رہے تھے، بڑی بے چارگی سے، تقریباً روتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”کیا جرم کیا تھا میری بیٹی نے؟ کیا قصور تھا میری بہو کا کہ ان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا؟ یا خدا میں چارپائی پر بندھا بندھا مر کیوں نہیں گیا۔ کیوں موت نہیں آئی مجھ کو۔ بنگالیوں نے تو ہم لوگوں کو مارا تھا کیونکہ ہم ان کے غدار تھے، غدار کی سزا تو موت ہی ہوتی ہے، ہم نے بھی تو ڈھاکا ڈوبنے سے پہلے بہت سارے بنگالیوں کی جانیں لی تھیں، غدار تھے وہ، مکتی باہنی کے لوگ، پر یہاں کیا تھے ہم لوگ؟ کیا کیا تھا ہم نے؟ کیا بتاؤں گا میں احمد کو جب وہ واپس آئے گا؟ کس نے مارا اس کی بیوی کو، بہن کو، چادر میں لپٹے ہوئے اپنے ہی چہروں نے پامال کیا ہے میرے خاندان کو۔ ہندو نہیں تھے وہ لوگ، مسلمان تھے، مسلمان! کسی کا نام ظہیر تھا، کوئی شریف تھا اور کوئی رفیق...... وہ کیوں گیا تھا جہاد کرنے اپنے گھر کو چھوڑ کر، اپنی بیوی کو ہماری حفاظت میں دے کر۔ خدا کی راہ میں کافروں سے لڑنے کے لیے۔ ان مسلمان لڑکیوں کی جان بچانے، جن کی عزتیں بھارتی فوجی درندے بن کر پامال کر رہے ہیں۔ ان لٹیروں سے آزادی کی جنگ لڑنے گیا ہے، جنہوں نے مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کی مدد سے ہزاروں بہاریوں کو مار ڈالا تھا۔ جن کی لاشوں پر رقص کیا تھا ان لوگوں نے۔ وہ کشمیر میں عزتیں بچا رہا ہے اور یہاں پر اس کے گھر میں عزتیں لٹ رہی ہیں۔ وہ سب کچھ ہوا ہے جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا......“

ان کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی، ان کی بیوی نہ جانے دیوار پر کیا تک رہی تھیں؟ وہ آواز کے ساتھ ہچکیاں لے رہے تھے، مجھ میں بالکل بھی ہمت نہیں تھی کہ میں ان سے کوئی بات کرتا، کچھ کہتا۔ کیسے انہیں بتاتا کہ احمد اب کبھی نہیں آئے گا، وہ سری نگر میں مجاہدوں کے ساتھ لڑتے لڑتے شہید ہو گیا ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے کسی درخت کے ساتھ باندھ کر ہندوستانی فوجیوں نے اس کے جسم کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا ہے۔ میں انہیں یہی بتانے آیا تھا۔ یہی ذمے داری مجھے سونپی گئی تھی کہ میں خاندان کو خبر کروں کہ احمد نے شہادت کا بلند درجہ پا لیا ہے۔

میں ان کے آنسو بھرے چہرے کے سامنے بیٹھا رہا، زمین میرے پیروں کے نیچے ناچتی رہی، آسمان میرے سر کے اوپر گھومتا رہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماروی

محی الدین نواب

تیسری قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

محبوب علی ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے معروف تجلی پریشانی سے ٹہل رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”میں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔ میرے بعد اور کوئی سمجھانے والا نہیں ہے اور تم سمجھنے والے بھی نہیں ہو۔“

وہ ٹہلتے ٹہلتے ذرا رُک گیا پھر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ ماروی میں ایسی کیا بات ہے جو تمہیں دیوانہ بنا رہی ہے اور تم عقل سے خالی ہوتے جا رہے ہو۔“

وہ پھر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ محبوب کا کوئی جواب سنے بغیر بول رہا تھا۔ ”میں تو تم سے کہتا ہوں کہ اس سے محبت کی انتہا کر دو۔ اس پر اپنی تمام دولت لٹا دو۔ اس کے عشق میں جو چاہو کرو مگر اپنی ذات کو تو نقصان نہ پہنچنے دو۔“

اس نے رُک کر اسے بے بسی سے دیکھا پھر اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا۔ ”کچھ تو عقل سے سوچو سمجھو۔ کیا تمہاری عقل اتنی سی بات نہیں سمجھاتی ہے کہ تمہیں اپنی عزت کو، نیک نامی کو اور اپنی شخصیت کو ہر حال میں برقرار رکھنا چاہیے؟“

محبوب نے کہا۔ ”آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ چاچا نے میری کار وہاں دیکھی ہے۔ آپ نے انہیں منع کر دیا ہے تو اب وہ کسی کے سامنے زبان نہیں کھولیں گے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں واردات کے وقت اُدھر گیا تھا۔“

”برخوردار...! بچنے کے کئی راستے نکل آتے ہیں اور پھنسنے کی بھی کئی وجوہات پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں، جب رحمت جلالی پر حملہ کرانا ہی تھا تو تمہارا وہاں جانا کیا ضروری تھا؟ تمہارا ہرکام میں کرتا ہوں۔ یہ بھی میں کرا سکتا تھا۔“

وہ پھر ٹہلتے ہوئے بولنے لگا۔ ”لیکن نہیں تمہارا وہاں جانا ضروری تھا کیونکہ وہ معشوق کی گلی تھی۔ وہاں سے ہوا کا جھونکا آتا ہے۔ اس کی خوشبو ملتی ہے۔ کیا پاگل پن ہے۔ اس گلی میں مچھر مار دوا اسپرے کی جائے گی تب بھی تمہیں خوشبو ملتی رہے گی۔

خدا جانے یہ کیسی محبت ہے؟ کسی بھی بات کی، کسی بھی کام کی ایک حد ہوتی ہے۔ تمہاری تو کوئی حد ہی نہیں ہے۔ عشق کے جنون میں کاروبار کو بھولتے جا رہے ہو۔“

وہ پھر اس کے سامنے رک کر بولا۔ ”مانا کہ میں نگرانی کر رہا ہوں۔ میرا بڑی تندہی سے ذمے داریاں پوری کر رہی ہے۔ ملازم بھی بہت وفادار ہیں۔ پھر بھی... پھر بھی دانش مندی یہ ہے کہ کاروبار کی لگام پوری طرح اپنے ہاتھوں میں رکھی جائے۔“

”آپ میری بہتری چاہتے ہیں۔ ہمیشہ بہترین مشورے دیتے ہیں۔ میں کل صبح آپ کے ساتھ دفتر جاؤں گا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ میں آپ کا کتنا احترام کرتا ہوں۔ آپ روز صبح آ کر مجھے جبراً یہاں سے لے جائیں گے تو میں انکار نہیں کر سکوں گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ لیکن جب تک عشق کا جنون کم نہیں ہوگا اور تم کاروبار کی طرف پوری طرح توجہ نہیں دے سکو گے تو آفس میں جا کر بیٹھنا فضول ہوگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ماروی کے پاس پہنچتے رہو گے تو پھر تمہارا گھر میں بیٹھنا ہی بہتر رہے گا۔“

وہ اس کے قریب صوفے پر آ کر بیٹھ گیا، پھر بولا۔ ”میرے ایک مشورے پر عمل کرو گے تو پہلے کی طرح کاروبار پر پوری توجہ دے سکو گے اور تم عشق کے معاملات میں بھی نارمل رہا کرو گے۔“

محبوب اسے سوچتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے کہا۔ ”میری بات کو سمجھو اور مانو۔ تم نے اسے کوٹھی لے کر دی ہے۔ اس کے رہنے سہنے کھانے پینے کی تمام ذمے داریاں پوری کر رہے ہو۔ ایک طرح سے وہ تمہارے گھر میں رہتی ہے۔

یہ تمہاری شرافت ہے کہ تم اس کے قریب نہیں جاتے ہو۔ تم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ تم پر خدا کی رحمت ہو۔ میرے مشورے کے مطابق خدا کو مانو اور اس سے شادی کر لو۔“

وہ ایکدم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ مراد کی منگیتر ہے۔ جب تک وہ واپس نہیں آئے گا۔ وہ میرے پاس اس کی امانت ہے۔“

”اور جب تک وہ واپس نہیں آئے گا تب تک وہ تمہاری کوٹھی میں رہ کر تمہارا اناج کھا کر، تمہارے کپڑے پہن کر رسوا ہوتی رہے گی۔ تم اس سے نکاح نہیں پڑھاؤ گے تو لوگ اسے تمہاری داشتہ کہیں گے۔ بلکہ کہہ رہے ہیں۔“

وہ صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”لوگوں کو کہنے دیں۔ لیکن آپ نہ کہیں پلیز...!“

وہ صوفہ سے اٹھ کر بولا۔ ”میرا منہ بند کر رہے ہو۔ کیا میرے نہ کہنے سے بدنامی پر پردہ پڑ جائے گا؟“

”خدا دیکھ رہا ہے کہ میں اسے عزت دے رہا ہوں۔“

”خدا بے شک دیکھ رہا ہے۔ اس معبود کو بھی یہ منظور

نہیں ہے کہ کسی نامحرم کو نکاح کے بغیر اپنے گھر میں رکھو۔ اس کی تمام ذمے داریاں اُٹھاؤ اور کھل کر بدنام ہوتے رہو۔

دنیا کہے گی کہ تم اسے ذلت دے رہے ہو۔ یہ بات دھیرے دھیرے کاروباری حلقے میں پھیل رہی ہے کہ تم کسی ماروی کے دیوانے ہو۔ تم نے اس کے لیے یہ کوٹھی لی ہے اور اس کے ماہانہ اخراجات پورے کر رہے ہو۔ وڈیرا حشمت جلالی بھی یہی بات پھیلائے گا۔ تم کس کس کا منہ بند کرو گے۔ دماغ سے سوچو تم جسے دل و جان سے دیوانہ وار چاہ رہے ہو۔ اسے کھل کر بدنام بھی کر رہے ہو۔“

”میں کیا کروں نیکی کر رہا ہوں، بدی ہو رہی ہے۔ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ ہم اچھی طرح جانتے ہیں، قدم قدم پر عزت کے لٹیرے ملیں گے۔ پھر وہ وڈیرا تو اسے کچا ہی چبا جائے گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ نہ تم اسے چھوڑ سکتے ہو نہ اس کی عزت بنا کے رکھ سکتے ہو۔ بس دین کا، ایمان کا اور سچی محبت کا ایک ہی راستہ ہے کہ اسے اپنی منکوحہ بنا لو۔“

یہ ایسی بات تھی کہ وہ اندر سے لہرا گیا۔ وہ فرشتہ تو نہیں تھا۔ اپنے سینے میں چاہنے اور چاہے جانے والا دل رکھتا تھا۔ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دل مچلتا تھا کہ اسے دھڑکنوں سے لگا لے۔ لیکن شرافت اور دیانت داری آڑے آتی تھی۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ”وہ کبھی راضی نہیں ہوگی۔“

”یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اسے کسی طرح منا لوں گا۔ اسے سمجھاؤں گا وہ نادان نہیں ہے۔ وہ اپنا بھلا برا سمجھتی ہے۔ شاید تم سے راضی ہو جائے گی۔“

”یہ بات مراد کو معلوم ہوگی تو وہ کیا سوچے گا؟ میرے لیے ماروی کو منکوحہ بنانا آسان ہے۔ لیکن ہمیں اس کے نتائج پر بھی ایمان داری سے غور کرنا چاہیے۔

پہلی ایمان کی بات یہ ہے کہ وہ مراد کی امانت ہے اور مجھے امین بن کر رہنا ہے۔ پھر وہ بیچارہ کسی جرم کے بغیر سزا بھگت رہا ہے۔ اسے معلوم ہوگا کہ میں اس کی امانت کو اپنی زوجہ بنانا چاہتا ہوں تو وہ غریب جیل کی چار دیواری میں گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔“

معروف نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں۔ مراد تک یہ بات نہیں پہنچے گی۔ اگر ماروی راضی ہو جائے گی اور تمہاری شریک حیات بن جائے گی تو اس بات کو تب تک چھپایا جائے گا جب تک اسے عدالت سے رہائی نہ مل جائے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ معروف تجلی نے کہا۔ ”اگر تم اسے عزت اور نیک نامی نہیں دو گے تو تمہاری محبت کھوکھلی ہوگی۔ ظالمانہ ہوگی۔ اس پر ظلم ہوتا رہے گا۔“

”آپ بہت ہی سچی اور سیدھی بات کہہ رہے ہیں اور ماروی کی بہتری کے لیے کہہ رہے ہیں۔ پلیز مجھے سوچنے کا وقت دیں۔ ابھی ماروی سے کوئی بات نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے سوچو۔ ساری زندگی سوچتے رہو۔ تب بھی یہی بات سمجھ میں آئے گی کہ جسے جی جان سے چاہتے ہو۔ اسے صرف منکوحہ بنا کر ہی عزت دے سکتے ہو۔“

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ محبوب نے اسے اٹھا کر نمبر پڑھے پھر کہا۔ ”پارٹی کے چیئرمین کی کال ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”حشمت نے یہ خبر وہاں تک پہنچا دی ہے کہ اس کے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔“

محبوب نے بٹن کو دبا کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہیلو۔ میں محبوب علی چانڈیو بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے پی اے نے کہا۔ ”جناب ہولڈ آن کریں۔ جناب عالی بات کریں گے۔“

اس نے انتظار کیا پھر چیئرمین بابر بشیر کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو چانڈیو صاحب! آپ جانتے ہیں ہمارے ملک کے سیاسی معاملات کتنے الجھے ہوئے ہیں۔ ہمیں آرام سے کھانے اور سکون سے سونے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اس پر آپ اور حشمت جلالی ایسے مسائل پیدا کر رہے ہیں جن کا تعلق نہ ہماری سیاست سے ہے نہ ہمارے ذاتی مفادات سے۔

مفادات تو دور کی بات ہے ہمیں آپ دونوں کے جھگڑوں سے بہت زیادہ نقصان پہنچنے والا ہے۔ دو اہم اور معروف سیاست دان آپس میں لڑیں گے۔ مقدمہ عدالت میں جائے گا تو عقل سے سوچیں، پارٹی بدنام ہوگی۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”آپ سُن رہے ہیں نا؟“

”جی سُن رہا ہوں۔ آپ کی بات ختم ہوگی تو بولوں گا۔“

وہ بولا۔ ”ابھی حشمت جلالی نے آپ پر الزام لگایا ہے کہ آپ نے اس کے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کرایا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟“

محبوب نے کہا۔ ”اس کا منہ ہے۔ اس کی زبان ہے۔ وہ کچھ بھی بول سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی ایک چیونٹی نہیں ماری ہے۔ میں ایک ہی بات جانتا ہوں، جو اپنی ذہانت سے اور حکمت عملی سے مارنا جانتے ہیں۔ وہ کبھی ہتھیار استعمال نہیں کرتے۔“

”میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا۔ آپ دونوں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جھگڑے کی وجہ صرف ایک عورت ہے۔اس کا نام ماروی بتایا گیا ہے۔آپ حضرات سیاست کے کھلاڑی ہیں۔یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ ایک عورت آپ دونوں سے کھیل رہی ہے اور یہ بات آپ دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"جہاں تک سمجھنے کی بات ہے' میں اپنے معاملات کو اپنے طور پر سمجھتا ہوں۔آپ وڈیرے کو سمجھائیں کہ ماروی اس کے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔اس پر خوامخواہ اپنا حق نہ جتائے۔"

"حق جتانے کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔وہ اپنی طرف سے ضرور کوئی جواز پیش کر رہا ہوگا؟"

"کوئی معقول جواز نہیں ہے۔کہتا ہے وہ اس کے گوٹھ میں پیدا ہوئی تھی۔وہاں پلی بڑھی ہے تو اس پر صرف وڈیرے کا حق ہے۔ایسے حقوق نہ قانون مانتا ہے۔نہ ہم مانیں گے۔"

"انسانی تاریخ میں یہی ہوتا آیا ہے کہ ایک بادشاہ کی سلطنت میں جو رعایا ہوتی ہے وہ اپنے بادشاہ کے حکم کے مطابق اس کی غلام بن کر رہتی ہے۔اور بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق جسے چاہتا ہے اسے اپنے تصرف میں لاتا ہے۔"

محبوب نے کہا۔"ہماری پارٹی اقتدار میں ہے اور ہم جمہوریت کے علم بردار ہیں۔آپ بادشاہت کی باتیں نہ کریں۔ماروی جیسی تمام ہستیاں خدا کی مرضی سے آزاد پیدا ہوتی ہیں۔انہیں اپنی شرم وحیا کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے لیکن وہ وڈیرا اسے اپنی داشتہ بنانا چاہتا ہے۔"

"آپ بھی تو یہی کر رہے ہیں۔کیا اسے وہاں ایک کوٹھی لے کر نہیں دی ہے۔اس کے اخراجات پورے نہیں کر رہے ہیں۔آپ نے اسے کس رشتے سے اپنے پاس رکھا ہے؟"

"خدا گواہ ہے۔میں نے اسے عزت آبرو کے ساتھ رکھا ہے۔وہ مراد علی منگی کی امانت ہے۔یہ میرا خدا جانتا ہے۔میں نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔"

"آپ کی اس بات کا کون یقین کرے گا؟"

"آپ ایک طرح سے درست کہہ رہے ہیں۔میں ماروی سے جس شرافت اور انسانیت کے ساتھ پیش آرہا ہوں۔ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آتا اس لیے کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"پھر اپنی شرافت کا دعویٰ لاحاصل ہوگا۔"

"دنیا یقین نہ کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شرافت' ایمانداری اور انسانیت سے باز آجائیں۔"

"سیاست میں اتنی زیادہ انسانیت اور شرافت کی باتیں نہیں کی جاتیں جتنی آپ کر رہے ہیں۔آپ چاہیں تو اس بات کو یہیں ختم کر سکتے ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

اس نے کہا۔"سیاسی مفادات حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی ہستیوں کو گولیاں مار دی جاتی ہیں۔آپ سوچیں کہ ایک غریب لڑکی کی کیا ہستی ہے؟

حالات کا تقاضا ہے کہ ایک کٹر سیاست دان کی طرح اسے اپنے دل و دماغ سے نکالیں۔اسے گولی ماریں۔حشمت جلالی کے حوالے کر دیں۔

پلیز..... پارٹی کی نیک نامی کو پیش نظر رکھیں۔جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ہمیں صرف سیاسی معاملات میں الجھنا اور سلجھنا چاہیے۔"

محبوب نے کہا۔"میں کٹر سیاست دان نہیں ہوں۔آپ جانتے ہیں کہ مجھے سیاست سے دلچسپی نہیں ہے۔کبھی اسلام آباد جاتا ہوں تو اسمبلی میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

میرے والد مرحوم کو ہماری پارٹی سے دلی لگاؤ تھا۔انہوں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ میں ہمیشہ اس پارٹی کا وفادار بن کر رہوں۔لیکن سوری ٹو سے..... میں وفاداری ختم کر رہا ہوں۔جو سیاست میری ماروی کو داشتہ بنانے' گولی مارنے اور اپنی محبت کو دوسرے کے حوالے کرنے کو کہتی ہے' میں اس سیاست پر ہمیشہ کے لیے لعنت بھیج رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔معروف حجلی سے کہا۔"یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے؟ میں نے کئی بار تمہیں سمجھایا ہے کہ غصے کی حالت میں کبھی کوئی فیصلہ کن بات نہ کیا کرو۔"

"کیا میں ماروی کی ذلت برداشت کر لوں؟"

"کبھی برداشت نہ کرو۔اگر وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں تو تمہارے مخالفانہ رویے کو دیکھ کر پچھتائیں گے۔تم سے سوری کہیں گے۔تمہیں سیاست میں واپس لانے کے لیے منائیں گے۔

بے شک تم انہیں اپنے پیچھے دوڑاؤ لیکن اس پارٹی کو نہ چھوڑو۔یہ اقتدار میں ہے۔یہ نہ بھولو کہ تم بزنس کے معاملات میں کئی طرح کی سہولتیں حاصل کرتے رہتے ہو۔"

محبوب اسے دیکھنے لگا۔اور سوچنے لگا۔وہ بول رہا تھا۔"ایسے ہی وقت اپنے آپ کو سمجھو اور پرکھو کہ عشق کے جنون میں کیسی حماقتیں کرنے لگے ہو۔"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔"آپ درست فرماتے ہیں۔مجھے جوش میں آکر اس سیاسی پارٹی کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔آپ کا بہت بہت شکریہ۔میں بہت خوش نصیب

ہوں کہ مجھے آپ کے جیسا بزرگ مشیر نصیب ہوا ہے۔"

"میری تعریفیں کرنے سے بگڑی ہوئی باتیں نہیں بنیں گی۔بگڑی بنانے والی عقل سے سوچو۔ماروی کو نہ جانے کتنے لوگ تمہاری داشتہ کہہ رہے ہوں گے۔ایک چیئرمین کے ایسا کہہ دینے سے تمہیں طیش میں نہیں آنا چاہیے۔تمہیں ہر حال میں برسر اقتدار پارٹی سے چمٹ کے رہنا چاہیے۔"

محبوب نے سر جھکا لیا۔وہ تسلیم کر رہا تھا کہ اس سے غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں۔ماروی ذہن پر سوار رہتی ہے۔اس لیے وہ دوسرے معاملات کے ہر پہلو پر غور نہیں کرتا ہے۔اسے برسر اقتدار پارٹی کو چھوڑنے کی حماقت نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

پارٹی کے چیئرمین بابر بشیر نے اپنے فون کو گھور کر دیکھا۔ادھر محبوب علی چانڈیو نے کچھ کہے سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔اس کے ایسے رویے سے چیئرمین کی انسلٹ ہوئی تھی اور وہ لبوں کو سختی سے بھینچ کر اپنی توہین برداشت کر رہا تھا۔

اس وقت پارٹی کے تین اہم عہدیدار اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔وہ تینوں ہم نوالہ وہم پیالہ تھے۔اسی لیے ان کے درمیان گول میز پر پیالے بھرے ہوئے تھے۔

سیاست کا نشہ چڑھ جائے تو اُترتا نہیں ہے۔اس پر شراب کا نشہ کچھ اور رنگ جما رہا تھا۔

ایک نے پیالہ اُٹھا کر پوچھا۔"کیا ہوا بابر صاحب؟"

وہ ناگواری سے بولا۔"ایک تو چانڈیو صاحب کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔کبھی کبھی پارٹی کی کوئی اہم میٹنگ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ارب پتی سرمایہ دار ہیں۔اپنی کاروباری سہولتیں حاصل کرنے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں لیکن پارٹی کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔"

اس نے فون کو ایک طرف رکھ کر پیالہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔"اب خود ہمارے لیے مسئلہ بن گئے ہیں۔میں حیران ہوں' ابھی انہوں نے فون پر صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ پارٹی کو چھوڑ دیں گے لیکن اس دو کوڑی کی لڑکی کو نہیں چھوڑیں گے۔"

ایک عہدیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔"عورت بڑی ظالم شے ہے۔اگر چانڈیو صاحب کی کھوپڑی الٹ رہی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ہماری تاریخ میں عورتوں نے شاہوں اور شہنشاہوں کے تختے الٹ دیے ہیں۔"

بابر بشیر نے کہا۔"میں غصے میں اسے دو کوڑی کی کہہ رہا ہوں۔لیکن ذرا غور کریں' اس کی طاقت دیکھیں کہ وہ حکمران پارٹی کو نقصان پہنچا رہی ہے۔"

ایک نے کہا۔"ہاں، نقصان تو پہنچے گا۔یہ خبر باہر نکلے گی کہ ہمارے دو اہم سیاستدان ایک بوٹی کے لیے کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔مقدمہ بازی کی نوبت آگئی ہے۔یہ پریس والے تو ڈنکے کی چوٹ پر کہیں گے کہ جب ہماری پارٹی کے اندر اتحاد نہیں ہے تو ہم اپنی قوم کو کیسے متحد رکھ سکیں گے۔"

ایک عہدیدار نے کہا۔"تمام اخبارات اس لڑکی کے ساتھ دونوں سیاستدانوں کی تصویریں فرنٹ پیج میں شائع کریں گے۔نیوز چینلز والے لائیو عدالتی کارروائیاں نشر کرتے رہیں گے اور تو اور جب بھی عدالت میں پیشی ہوگی تو اپوزیشن والے ڈھول بجانے آجائیں گے۔"

بابر بشیر نے کہا۔"سارے معاملات اس ایک لڑکی کی وجہ سے اَپ سیٹ ہو رہے ہیں۔"

"بابر صاحب! آخر یہ ہے کون؟ کیا قلوپطرہ کی طرح تاریخی حسینہ ہے کہ سیاست کا رُخ بدلنے والی ہے؟"

بابر بشیر نے کہا۔"اگرچہ یہ بچکانا سی بات ہے۔لیکن کچھ حقیقت نظر آرہی ہے۔وہ ہمارے دو سیاست دانوں کے رُخ پھیر چکی ہے اور یہاں اسلام آباد میں' اس ایوان میں ہماری گفتگو کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ہماری آئندہ میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل ہونے والی ہے۔"

یہ ایسی حقیقت تھی' جو پیش آرہی تھی اور آئندہ بھی ان عہدیداروں کو تشویش میں مبتلا کرنے والی تھی۔اسی لیے بیچارے پیالہ بکف ہو کر غم غلط کر رہے تھے۔بابر بشیر نے کہا۔"جتنی جلدی ہو سکے' ہمیں پارٹی کو بدنامی سے بچانا ہوگا۔چانڈیو اور جلالی کے درمیان کسی بھی طرح صلح کروانی ہوگی۔"

ایک نے کہا۔"جلالی تو کبھی صلح نہیں کرے گا۔وہ سر پھرا ہے۔پارٹی چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔"

"ابھی چانڈیو بھی پارٹی چھوڑنے کی دھمکی دے چکا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔"ان دونوں کا کچھ نہیں جائے گا۔وہ ہم سے چھوٹ کر اپوزیشن کی گود میں جا بیٹھیں گے۔یہ تو بابر صاحب! ہمارے حق میں اور بُرا ہوگا۔"

بابر بشیر نے کہا۔"فی الحال تو میں مڈل مین بیلو شاہ سے بات کرتا ہوں۔وہ دونوں کو سمجھائے گا کہ پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ نہ کریں۔ہم ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں کہیں گے۔"

ایک نے گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔"اور ان کا مزاج عاشقانہ ہے۔دیکھیں کہ ایک معمولی لڑکی سیاست کے منہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

زور دریا کا رُخ پھیر رہی ہے۔ان عاشقوں کو ہماری پارٹی کی وفاداری سے اُکھاڑ کر انہیں اپنا وفادار بنا رہی ہے۔"

ایک نے کہا۔"اس لڑکی کے لیے کچھ سوچنا ہوگا۔"

دوسرے نے کہا۔"کچھ سوچنا نہیں' کچھ کرنا ہوگا۔"

بابر بشیر نے باری باری تینوں عہدیداروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔"میں حشمت جلالی کو سنبھال لوں گا۔آپ حضرات کراچی جائیں۔بہت دنوں سے سمندر نہیں دیکھا ہے۔تفریح ہو جائے گی۔وہاں محبوب علی چانڈیو سے ملاقات کریں۔

کیا کیا جائے اس کے گھر جا کر سمجھانا پڑے گا۔اسے سمجھائیں کہ وہ ایک معمولی لڑکی کی خاطر اپنے سیاسی کیریر کو نقصان نہ پہنچائے۔وہ سیاست میں اور بزنس میں ایک بھاری بھرکم شخصیت کا حامل ہے۔اسے اپنا وزن نہیں گرانا چاہیے۔"

"جناب عالی! جو عاشق دیوانہ بن جائے' وہ سمجھانے سے کبھی نہیں سمجھتا۔معشوقہ سر پر ناچتی رہتی ہے۔ہماری نصیحتیں ہوا میں اُڑ جائیں گی۔"

چیئرمین بابر بشیر نے سر ہلا کر کہا۔"وہ لڑکی اس کے حواس پر چھا گئی ہے۔نو پرابلم۔میں نے سیاست میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔اب اس لڑکی کو کارڈ بنا کر اپنے پتے کھیلوں گا۔"

وہ ذرا سوچ کر بولا۔"اسے وہاں جا کر سمجھاؤ۔ماروی اس کی معشوقہ ہے۔اسی کی رہے گی۔ہم حشمت جلالی کو اس کی طلب سے باز رکھیں گے۔"

ایک نے پوچھا۔"کیسے رکھیں گے؟ وہ ضدی وڈیرا ہے۔اپنی ناک نیچی نہیں ہونے دے گا۔"

وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔"ہم حشمت جلالی کو دلاسا دیتے رہیں گے کہ ماروی اس کی ہے۔اسے تسلی دی جائے گی کہ ہم جلد ہی ماروی کو چانڈیو کے رنگ محل سے نکال کر اس کی حویلی میں پہنچا دیں گے۔"

وہ تینوں پیتے پیتے رُک گئے۔چیئرمین کو دیکھنے لگے۔ایک نے کہا۔"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اِدھر محبوب کو یقین دلایا جائے کہ ماروی اس کی ہے۔اُدھر وڈیرے کو بھی یہی کہا جائے۔"

ایک نے پیالہ خالی کرتے ہوئے کہا۔"یہ ممکن نہیں ہے۔"

بابر بشیر نے کہا۔"اغوا کرانے کے بعد اسے کسی کی گود میں بٹھایا نہیں جائے گا۔جب چانڈیو دیکھے گا کہ اس کی معشوق حشمت جلالی کے پاس بھی نہیں ہے تو وہ ہمارے خلاف طیش میں نہیں آئے گا۔ہم سے ناراض نہیں ہوگا اس کے اغوا اور گمشدگی کے سلسلے میں ہمیں کسی طرح کا الزام نہیں دے گا۔"

ایک عہدیدار نے سر ہلا کر کہا۔"ہاں۔وہ جلالی کا اور زیادہ دشمن ہو جائے گا لیکن ہماری پارٹی چھوڑ کر نہیں جائے گا۔"

وہ سب ذرا چپ رہے۔سوچتے رہے۔پھر بابر بشیر نے کہا۔"وہ دونوں ماروی کو ڈھونڈتے رہیں گے۔پھر اس کی لاش کہیں ملے گی تو کسی ثبوت کے بغیر کسی کو اس کا قاتل نہیں کہہ سکیں گے۔ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کو چیلنج کرتے رہیں گے۔

ماروی نہیں رہے گی تو کسے حاصل کرنے کے لیے مقدمہ لڑیں گے؟ ہماری جیت یہ ہوگی کہ نہ وہ عدالت میں جائیں گے نہ ہماری پارٹی بدنام ہوگی۔"

ایک نے بابر بشیر کا پیالہ بھرتے ہوئے کہا۔"ہاں۔پھر وہ دونوں پارٹی چھوڑ کر اپوزیشن والوں سے نہیں ملیں گے۔"

بابر بشیر پھر ان تینوں کو چند لمحوں تک دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔"اغوا اور مرڈر کا انتہائی قدم ابھی نہیں اُٹھایا جائے گا۔پہلے ان دونوں کو سمجھانے کے لیے پارٹی کے تمام اہم کارکنان کی میٹنگ کال کرنی ہوگی۔سب ہی مل کر انہیں سمجھائیں گے تو شاید ان کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

پھر وہ صوفہ پر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔"فی الحال تو ماروی کو ان دونوں سے دور کر دینا ہے۔جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ ماروی ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہے تو ان کا غصہ کسی حد تک ٹھنڈا ہوگا۔وہ ایک دوسرے کے مقابلے میں نہ فاتح ہوں گے نہ شکست خوردہ۔۔۔جھگڑے کی بنیادی وجہ ہی ختم ہو جائے گی۔"

ایک نے پوچھا۔"ختم کر دینے کا مطلب کیا ہے؟"

دوسرے نے کہا۔"بھئی بابر صاحب کہہ چکے ہیں۔اسے بعد میں ختم کیا جائے گا؟"

بابر بشیر نے کہا۔"ہاں بعد میں۔۔۔حقیقتاً۔اغوا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ دو بیماروں کے درمیان ایک انار نہ رہے۔انار کبھی ان کے سامنے آئے گا تو وہ پھر بیمار پڑ جائیں گے۔خوامخواہ ہمیں بھی بیمار بناتے رہیں گے۔بیمار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ماروی کے بیمار ہو جائیں گے۔"

یہ ایسی بات تھی کہ سب ہی ہنسنے لگے۔سیاسی عداوتوں

میں یہی ہوتا ہے۔ہنستے ہنستے کسی کی بھی موت کا فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔

☆☆☆

اے دلوں میں دھڑکنے والی۔۔۔!

ارے او ہوش و حواس اڑانے والی۔۔۔!

کیا تجھے خبر ہے کہ تیرے قتل کی تدبیر ہو رہی ہے؟

محبت کیا جانے موت کیا ہوتی ہے۔وہ تو زندہ رہنے کے لیے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔

وہ خوابوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔کیونکہ اسے دیکھنے کے لیے آہنی سلاخوں کے باہر نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ ایک ملاقات کے بعد دوسری بار آئی تھی۔

دوری ہو تو تصور میں آتے ہی قربت حاصل ہو جاتی ہے یا کبھی خواب میں ملاقات ہو جاتی ہے۔وہ بہت دنوں کے بعد اسے خواب نگر میں دیکھ رہا تھا۔وہ بہت خوش تھی اور لہرا رہی تھی جیسے رقص کے انداز میں چل رہی ہو۔

خواب کا منظر بدل رہا تھا۔ایک عالیشان کوٹھی کا دروازہ اس کے لیے کھل رہا تھا۔خدام اور کنیزیں اس کی خدمت کے لیے اِدھر سے اُدھر آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔بڑے گھرانے کی خواتین اور مرد اُسے پھول اور تحائف پیش کر رہے تھے۔

وہ کسی پہلو سے بھی جھگی میں رہنے والی اور ایک گدھا گاڑی والے سے پیار کرنے والی ماروی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔دولت اور بلند مرتبے نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے اور اس کی شخصیت کو شاہانہ بنا دیا تھا۔

مراد نے خود کو دیکھا' وہ اس عالی شان تقریب میں ماروی کے آگے پیچھے تھا لیکن اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔یا وہ اسے پہچان نہیں رہی تھی۔اس نے تنہائی میں اسے مخاطب کیا تھا۔لیکن آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔کیا دولت کی سرمستی تھی۔وہ محفل میں مست ہوا کے جھونکے کی طرح بہتی چلی جا رہی تھی۔

پھر اس نے محبوب علی چانڈیو کو دیکھا۔اس کے ملازم ایک بڑا سا تحفہ اٹھا کر لائے تھے۔تحفے پر ایک چاندی جیسی چادر پڑی ہوئی تھی۔یہ دیکھ کر مراد کا دل بیٹھ رہا تھا کہ ماروی کو وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔محبوب سائیں اسے دکھائی دے رہا تھا۔

ماروی نے تحفہ کے قریب جا کر اس پر سے چادر ہٹائی تو ایک جگمگاتا ہوا تاج محل نگاہوں کے سامنے آ گیا۔حاضرین تالیاں بجا رہے تھے۔گلاب کی پتیاں ماروی پر اور تاج محل پر ہر سمت سے برس رہی تھیں۔محبوب اس کی ایک انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی پہنا رہا تھا۔

پھر آنکھ کھل گئی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔پلکیں جھپکائے بغیر جیل کی سخت، ظالم دیواروں کو دیکھنے لگا۔ان دیواروں نے اس کی ماروی کو اس سے الگ کر دیا تھا۔

خواب تو خواب ہوتے ہیں۔کوئی کوئی سچ ہوتا ہے اور وہ قیدِ تنہائی میں سمجھ رہا تھا کہ خواب سچا ہے۔اس کی بے بسی، اس کے حالات کہہ رہے تھے کہ ماروی کوٹھی والی بن گئی ہے۔

نصیب بدل جائے۔دولت مل جائے تو خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا تھا کہ ماروی کو توقع سے زیادہ تحفظ اور مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں۔لیکن اس کی یہ خوش نصیبی چپ چاپ اندر ہی اندر کھٹکتی رہتی تھی۔

وہ محبوب سے کوئی شکایت نہیں کر سکتا تھا۔وہ تو نیکی کر رہا تھا۔اس کی عدم موجودگی میں ماروی بے سہارا ہو جاتی۔چاچا چاچی پر بھروسا نہیں تھا۔حشمت جلالی انہیں بڑی رقم کا لالچ دیتا تو وہ ماروی کو اس کے حوالے کر دیتے۔

اگر وہ لالچ میں نہ آتے۔وڈیرے کے مطالبے سے انکار کرتے تو وہ ماروی کو اٹھوا لیتا۔ہر صورت میں وہ غیر محفوظ ہوتی۔محبوب نے اسے اپنی مضبوط پناہ میں رکھا تھا۔ایسا نہ کرتا تو وہ اب تک ہاتھ سے بے ہاتھ ہو چکی ہوتی۔

یہ محبوب کا بڑا احسان تھا۔لیکن دل یہ سوچ کر ڈوبنے لگا تھا کہ وہ صرف محسن اور محافظ نہیں تھا، ایک عاشق بھی تھا۔

وہ صاف لفظوں میں دو باتیں کہہ چکا تھا۔ایک تو یہ کہ وہ دل سے مجبور ہے۔ماروی کو کبھی اپنے دل سے نہیں نکال سکے گا۔

دوسری بات یہ کہ وہ مراد کو دل و جان سے چاہتی ہے۔لہٰذا وہ اس کی خوشی میں خوش رہے گا۔اسے مراد کی امانت سمجھے گا اور امانت میں کبھی خیانت نہیں کرے گا۔

اس کا دل کہتا تھا کہ محبوب انتہائی شریف انسان ہے۔اپنی زبان سے نہیں پھرے گا۔لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنی زبان پر قائم بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔وہ اسے مراد سے نہیں چھین رہا ہے لیکن ماروی کو اپنے احسانات کے زیر اثر لا رہا ہے۔اس نے ماڈلنگ کا بہانہ کیا تھا۔اس کی کوئی اشتہاری فلم کسی چینل سے ریلیز نہیں کی تھی اور اسے یونہی پانچ لاکھ دے دیے تھے۔

وہ اس کی رہائش کے لیے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان کا بندوبست کر سکتا تھا۔لیکن ایک مہنگی کوٹھی خرید کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ تاثر دے رہا تھا کہ اس کے لیے تاج محل بھی بنا سکتا ہے۔

مراد نہیں جانتا تھا کہ باہر اور کیا ہو رہا ہے؟

اس نے ماہانہ اخراجات کے لیے چالیس ہزار روپے دیے تھے۔ اس کے لیے سیکیورٹی گارڈز رکھے تھے اور اس کی خاطر دشمن کے بیٹے پر گولی چلوائی تھی۔ یہ عشق، یہ جنون کہہ رہا تھا کہ وہ ماروی کی خاطر دشمنوں کا لہو اچھالتا رہے گا۔ اپنی شخصیت، اپنی دولت، اپنا سب کچھ لٹاتا رہے گا۔

مراد اپنی ماروی کے بدلتے ہوئے حالات سے پوری طرح واقف نہیں تھا۔ پھر بھی جس حد تک جانتا تھا' وہ حقائق اندیشے پیدا کر رہے تھے کہ محبوب اپنی معشوق کو منہ سے کچھ نہیں بولے گا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف نہیں کھینچے گا۔ وہ بیچاری اس کی نیکیوں اور ہمدردیوں کے بوجھ تلے اس کی طرف جھکتی چلی جائے گی۔

اور شاید جھک گئی ہوگی....

یہ خیال کانٹوں کی طرح دل میں چبھتا تھا۔ وہ بے اختیار آہنی سلاخوں کو یوں تھام لیتا تھا جیسے ماروی کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ رہا ہو کہ کہیں چھوٹ نہ جائے۔

وہ ان قیدیوں میں سے تھا جنہیں سونے کے لیے آرام دہ بستر ملتا ہے۔ عام قیدیوں سے الگ ذائقہ دار کھانا نصیب ہوتا ہے۔ محبوب کی مہربانیاں ایسی تھیں کہ وہاں اس سے کوئی کام نہیں کرایا جاتا تھا۔

وہ فرشتہ باہر ماروی کے ساتھ اور جیل کے اندر اس کے ساتھ جیسی نیکیاں کر رہا تھا' ایسی نیکیاں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو جتنا کر رہا تھا اس سے بھی زیادہ کرنے والا تھا۔

صبح کی اذان ہونے والی تھی۔ سپاہی نے آ کر جیل کا دروازہ کھولا۔ نمازیوں کو جیل کی مسجد تک جانے کے لیے ان کی کوٹھریوں سے نکالا جاتا تھا۔ وہ غسل کرنے کے بعد مسجد میں آ گیا۔ صبح کی نماز کے بعد قیدی قرآن پڑھتے تھے۔ جو پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ انہیں واپس ان کی کوٹھریوں کی طرف ہانک دیا جاتا تھا۔

مراد نے کلام پاک کی تلاوت کے دوران پیش امام کو قریب پا کر کہا۔ ''امام صاحب! کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ اس کے روبرو آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بولا۔ ''میں نماز پڑھتا ہوں۔ تلاوت کرتا ہوں۔ مگر دھیان سے نہیں کرتا۔ میرا خیال بھٹکتا ہے۔ وہ میری نمازوں میں آ جاتی ہے۔''

پیش امام نے اسے توجہ سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ''میں آیتیں پڑھتا رہتا ہوں مگر اس کے لیے سوچتا رہتا ہوں کہ باہر اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

انہوں نے پوچھا۔ ''کیا اس کا کوئی والی وارث نہیں ہے؟''

''ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ باہر اسے جو سہارا مل رہا ہے۔ وہ مجھے منظور نہیں ہے اور میں نامنظور بھی نہیں کر سکتا۔ کروں گا تو وہ محفوظ نہیں رہے گی۔''

''خدا کی رضا کو اور قدرتی حالات کو سمجھو۔ رب کریم نے اس کی حفاظت کا جو وسیلہ پیدا کیا ہے۔ اس سے انکار نہ کرو۔ کرو گے تو الجھتے رہو گے۔ وہ تمہارے ذہن پر سوار رہے گی اور تمہاری نمازوں میں آتی رہے گی۔''

''میں اسے دل سے اور دماغ سے نکال نہیں سکوں گا۔''

''تم نکالو یا نہ نکالو۔ حالات اسے نکال دیں گے۔ باہر جو عورت ہے' وہ بدلنا چاہے تو تم یہاں رہ کر اسے راستہ بدلنے سے نہیں روک سکو گے۔''

وہ سر جھکائے سُن رہا تھا۔ امام صاحب نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کس الزام میں آئے ہو؟''

''قتل کے جھوٹے الزام میں۔''

''جھوٹا اور سچا الزام عدالت میں ثابت ہوتا ہے اور اکثر قتل کے مقدمات برسوں چلتے رہتے ہیں۔ یہ بھول جاؤ کہ تم دو چار دنوں میں یا دو چار مہینوں میں چھوٹ جاؤ گے۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں میں نے یہاں ایسے قیدیوں کو دیکھا ہے۔ جو برسوں سے پیشیاں بھگت رہے ہیں۔''

''پھر سوچو کہ وہ کب تک تمہارا انتظار کرے گی؟''

''یہی خیال کوڑے مارتا رہتا ہے کہ یہاں دن گزرتے رہیں گے۔ وہ وہاں اپنے محسن کی طرف مائل ہوتی رہے گی۔''

''دانشمندی یہ ہے کہ اسے مائل ہونے دو۔ ایک سہاگن بن کر زندگی گزارنے دو۔''

''لیکن وہ بے وفا نہیں ہے۔ محترم! وہ میرے سوا کسی دوسرے کو قبول نہیں کرے گی۔''

امام صاحب نے پوچھا۔ ''کیا وہ وفا کی پتلی برسوں تمہارے انتظار میں اپنے محسن کے رحم و کرم پر رہے گی؟''

''میں دعا مانگتا رہتا ہوں کہ زیادہ دیر نہ ہو۔ مجھے جلد سے جلد رہائی مل جائے۔''

''ہمارے دین میں حکم ہے کہ جوان عورت کو تنہا نہ رہنے دو۔ جلد سے جلد اس کی شادی کر دو۔ ورنہ وہ گمراہ ہو جاتی ہے اور گمراہ ہونے کے لیے محسن سب سے قریب ہوتا ہے۔''

انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تم کہتے ہو' وہ بے وفا نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے' جانتے ہو؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ بولے۔ ''نہ مرد بے وفا ہوتے ہیں نہ عورت ایسی ہوتی ہے۔ حالات انہیں بے وفا بنا دیتے ہیں۔ حالات ہماری توقع کے خلاف زبان بدلنے اور ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

وہ چپ رہا۔ ان کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ انہوں نے پوچھا۔ ''اگر حالات نے اسے اپنے محسن کا شرعی سہارا لینے پر مجبور کیا تو کیا تم اس کی بے وفائی کا رونا روؤ گے؟''

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ ایسے ٹھوس حقائق سننے کے باوجود ماروی اس کے اندر چیخ رہی تھی ''میں بے وفا نہیں ہوں۔ میری دنیا تم ہو۔ تمہیں چھوڑنا پڑا تو اس سے پہلے دنیا چھوڑ دوں گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بہت اچھی نصیحتیں کی ہیں۔ میں ان پر عمل کروں گا۔''

''کیسے عمل کرو گے؟''

''میں اسے خدا کے بھروسے چھوڑ دوں گا۔ وہ اپنے حالات سے خود ہی نمٹتی رہے گی۔''

''اگر اس سے رابطہ ہو سکتا ہے تو اس کی بہتری کے لیے اسے پیغام بھیجو کہ وہ اس گناہ اور جرائم سے بھرپور دنیا میں تنہا نہ رہے۔ اپنے محسن سے نکاح پڑھا لے۔''

اس نے پریشان ہو کر پیش امام کو دیکھا۔ وہ بولے۔ ''جسے دل و جان سے چاہنے کا دعویٰ کرتے ہو' اسے ایسی پناہ میں پہنچاؤ جہاں اسے عزت اور سلامتی نصیب ہوتی رہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہاری محبت کا دعویٰ سراسر کھوکھلا ہوگا۔''

امام صاحب اس کے سامنے سے اٹھ کر چلے گئے۔ اب اس کے سمجھنے کے لیے یہ حقائق تھے کہ ماروی محبوب کے احسانات قبول کیے بغیر عزت اور سلامتی سے نہیں رہ سکے گی۔ محبوب صرف محسن نہیں ہے۔ اس کا عاشق بھی ہے۔ قتل کا مقدمہ نامعلوم مدت تک چلتا رہے گا۔

اور مدت جتنی بھی ہو' کیا وہ ایک نامحرم کی پناہ میں رہ کر عزت دار کہلائے گی؟

اس سے پہلے کہ وہ بدنام ہوتی رہے کیا اسے محبوب کی منکوحہ بن کر نیک نامی سے نہیں رہنا چاہیے؟

ان حالات میں اسے دل پر پتھر رکھ کر ماروی سے کہنا چاہیے کہ بچپن کے پیار سے چمٹی نہ رہے۔ اسے بھول جائے۔

یہ تمام اہم حقائق تھے۔ ان کے پیش نظر اپنی ماروی کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جنوری 2014ء

گلابوں اور جاڑوں کا موسم
سالِ نو کے پہلے شمارے کی نکہتیں

پہلی سوغات ● خواب دیکھنا..... خوابوں کو سوچنا اور خوابوں سے کنارہ کشی موت ہے
ایک پراسرار کہانی کی انہونیاں کاشف زبیر کی جادو دانیاں

گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ

جواری ● احمد اقبال کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز

مغرب کے نرالے انداز ● مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● زروزمین کے پرانے شاخسانے کی نذر ہو جانے والی زن گزیدہ داستان

دوسری کہانی ● صبح دم کے اجالوں میں کھو جانے والے قانون شکن اور خواب شکن جانبازوں کا احوال

آپ کے تبصرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں ... کتھائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمجھانا تھا کہ وہ اسے بھول جائے۔ کیا سمجھانے سے وہ بھول جائے گی؟ اور کیا وہ اس کے بغیر جی سکے گا؟

اس کے سامنے دنیا کی آخری کتاب ہدایت کھلی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اس کے اوراق میں منہ چھپا لیا۔

☆☆☆

عشقیہ معاملات کے باعث سیاسی معاملات اس قدر الجھ گئے تھے کہ انہیں سلجھانے میں خاصا وقت درکار تھا۔ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں نے رازداری سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ماروی کو اغوا کر کے دونوں سیاستدانوں کو اس سے محروم کر دیا جائے۔

اس فیصلے پر بھی عمل کرنا آسان نہ تھا۔ پہلے انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کراچی میں اپنی سیاسی پارٹی کے جتنے خطرناک غنڈے ہیں۔ ان میں کتنے محبوب علی چانڈیو کے وفادار ہیں۔

حقیقتاً چانڈیو کسی بدمعاش کو منہ نہیں لگاتا تھا۔ لیکن حال ہی میں لنگڑا جانی اس کے منہ لگ گیا تھا۔ بڑی صفائی سے رحمت جلالی کو گولی مار کر چلا گیا تھا اور محبوب نے سوچا تھا۔ یہ غنڈے آئندہ بھی کام آسکتے ہیں۔ انہیں کبھی کبھی بخشش دیتے رہنا چاہیے۔

اور وہ لین دین کا سلسلہ شروع کر چکا تھا۔ اس نے لنگڑے جانی سے کہا۔ ”میری بہادر آباد والی کوٹھی میں سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ لیکن میرے لیے ناکافی ہیں۔ میں تمہارے جیسے لوگوں سے بھی کوٹھی کی نگرانی کا کام لینا چاہتا ہوں۔“

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہم حاضر ہیں۔ حکم کریں، ہمیں کرنا کیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”تمہارے چار آدمی کوٹھی کے چاروں طرف دن رات پہریداری کریں گے۔ کوئی بھی وارداتیا ادھر آئے تو اسے گولی مار کر اپاہج بنا دیں گے۔ تم سب کو معقول معاوضہ ملتا رہے گا۔“

یوں اس نے سیکیورٹی گارڈز کے علاوہ مجرموں کی فورس بھی کوٹھی کے پاس پہنچا دی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ماروی کے اغوا کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ وہ دیوانہ تو محض اپنے دلی اطمینان کے لیے ایسے اقدامات کر رہا تھا۔

عدالت میں کیس کی فائل کھل چکی تھی۔ کسی دن بھی عدالت میں پیشی کے لیے سمن جاری ہونے والا تھا۔ پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں نے ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ اس اجلاس میں درجنوں اہم کارکنان نے محبوب سے اور جلالی سے اپیل کی کہ وہ اپنا جھگڑا یہیں ختم کر دیں۔ ورنہ مقدمہ کے سماعت شروع ہوگی تو اپوزیشن اور پریس والے یہ بات خوب اچھالیں گے کہ پارٹی کے اندر پھوٹ پڑ گئی ہے۔

چیئرمین بابر بشیر نے کہا۔ ”یہ بات اُچھالی جائے گی کہ ہم اپنا فیصلہ خود کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ہماری عداوت عدالتی فیصلے کی محتاج ہوگئی ہے۔ ہم اسمبلی میں ایک بینچ پر بیٹھنے والے عدالت کے مختلف کٹہروں میں کھڑے ہو رہے ہیں۔“

ماروی ایک جنون تھی جو محبوب کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ سیاست چھوڑ سکتا تھا۔ اپنے کاروبار سے منہ موڑ سکتا تھا لیکن ماروی کی طلب سے باز نہیں آسکتا تھا۔

حشمت جلالی نے اجلاس میں کہا۔ ”میری اکلوتی بیٹی کی بے حرمتی کی گئی، اسے قتل کیا گیا۔ یہ آپ حضرات کے لیے معمولی بات ہوگی۔ میرے لیے غیرت کا مسئلہ ہے۔ جب تک قاتل کو پھانسی کے پھندے تک نہیں پہنچاؤں گا۔ تب تک یہ سوچا ہے کہ بازو پر سیاہ پٹی باندھ کر رہوں گا۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے پوچھا۔ ”اگر ماروی کو آپ کے حوالے کر دیا جائے تو؟“

اس نے ذرا سنجیدگی سے اس عہدیدار کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“

دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”یہ سارا جھگڑا تو ماروی کے لیے ہے۔ آپ اس کے بارے میں دوٹوک بات کریں۔“

جلالی نے کہا۔ ”بے شک جھگڑا ماروی کے لیے ہے۔ میں عدالت سے باہر اور پارٹی سے باہر دشمن سے نمٹ لوں گا۔“

چیئرمین بابر بشیر نے کہا۔ ”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپس میں پھوٹ ڈالنے والے اور اپنا سیاسی کیریئر کمزور کرنے والے سیاستدان ہماری پارٹی میں نہیں رہ سکیں گے۔“

اس نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ دونوں کی سیٹیں اہم ہیں اور ہم یہ سیٹیں جانے بھی نہیں دیں گے۔ اس سلسلے میں طریقۂ کار یہ ہوگا کہ آپ دونوں استعفیٰ دیں گے اور مستعفی ہونے کے بعد بھی ہمارے اپنے رہیں گے۔“

وہ حشمت کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جلالی صاحب ہمارے اپنے ہیں۔ ان کی خالی سیٹ کے لیے جو ضمنی انتخاب ہوگا اس میں جلالی صاحب کا بیٹا برکت جلالی کامیاب ہو کر باپ کی جگہ آئے گا۔ اس حلقہ میں ان باپ بیٹے کے ہی ووٹرز ہوتے ہیں۔ یہی ہمیشہ کامیاب ہوتے آئے ہیں۔“

پھر چیئرمین نے محبوب کو دیکھ کر کہا۔ ”ہم نہیں جانتے کہ آپ کے استعفیٰ دینے کے بعد اس حلقہ سے کس پارٹی کا

امیدوار کامیاب ہوگا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمیں آپ کی طرف سے نقصان اٹھانا ہوگا۔

مجبوری ہے۔ کیا کیا جائے؟ آپ کے جانے کے بعد ہم بیان جاری کریں گے کہ اپنی پارٹی کو عداوت سے پاک رکھنے کے لیے دونوں سیاستدانوں سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ لہٰذا آپ دونوں کھل کر مقدمہ لڑتے رہیں۔ ہماری بلا سے...“

محبوب نہ جانے ماروی کے لیے اور کیا کچھ ہارنے والا تھا۔ وہ صرف سیاست کے میدان سے نہیں نکلا تھا بلکہ انجانے میں اس سیاسی پارٹی کو اپنا دشمن بنا چکا تھا۔

معروف نے درست کہا تھا، وہ ماروی کے سحر سے نہ نکلتا ہے۔ نہ ہی عشق سے ہٹ کر دوسرے معاملات کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے جس کے نتیجے میں بزنس سے لے کر سیاست تک ہر جگہ نقصان اُٹھاتا آرہا ہے۔

چیئرمین بابر بشیر نے اجلاس کے بعد حشمت جلالی سے کہا۔ ”آپ نہیں ہوں گے آپ کا بیٹا اس سیٹ پر رہے گا۔ اس طرح آپ نے چانڈیو کی طرح پارٹی سے وفاداری ختم نہیں کی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے آپ کی خاطر چانڈیو صاحب کو پارٹی سے نکال دیا ہے۔“

وہ بولا۔ ”ہم بھی آپ کو نہیں چھوڑتے ہیں۔ یہ پارٹی تو وڈیروں کی جنت ہے۔ یہاں میوے بھی کھاتے ہیں اور وڈیرا شاہی کو زندہ بھی رکھتے ہیں۔ آج میں نے اس صنعت کار کو ایوانِ حکومت میں مات دی ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے۔ عدالت میں بھی اس کے چھکے چھڑا دوں گا۔“

بابر بشیر نے کہا۔ ”چانڈیو کو پارٹی سے بے وفائی بہت مہنگی پڑے گی۔ آپ آرام سے حویلی میں رہیں۔ یہ تسلی رکھیں کہ ماروی اس کے پاس نہیں رہے گی۔ اس کا مقدمہ بھی کمزور کریں گے۔ قاتل کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے ہم ایسے ہتھکنڈے آزمائیں گے کہ چانڈیو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“

بے شک و شبہ ماروی سے عشق اسے مہنگا پڑ رہا تھا۔ اس نے ایک سیاسی پارٹی کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ وہ اسلام آباد سے ایسے واپس آیا جیسے ہار کر نہیں میدان مار کر آرہا ہو۔ اس دیوانے کی خوشی یہ تھی کہ اس نے ماروی کی حیثیت گرنے نہیں دی۔ بھرے اجلاس میں اس جانِ تمنا کو تمام سیاسی مفادات سے بلند و برتر رکھا تھا۔

معروف تجلی نے کراچی ایرپورٹ میں اسے ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔ ”سب خیریت ہے نا؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیا میں بخیریت نظر نہیں آرہا ہوں؟“

وہ کار میں آکر بیٹھ گئے۔ معروف نے کہا۔ ”چیئرمین تم دونوں کو عدالت میں جانے سے روکنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اعلیٰ عہدیداروں کی میٹنگ بلائی تھی۔ نتیجہ کیا ہوا؟“

”نہ جلالی مقدمہ بازی سے باز آنے والا تھا نہ میں ماروی کو وڈیرے کے حوالے کر سکتا ہوں۔ اگرچہ اس نے اجلاس میں ماروی کی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بہت بڑا نوٹنکی ہے۔ اپنی بیٹی کا دکھڑا رو رہا تھا۔“

”پھر ہوا کیا؟“

”یہ فیصلہ سنایا گیا کہ ہم دونوں سیاستدانوں کو عدالت میں جانے سے پہلے استعفیٰ دینا ہوگا۔ ورنہ ہماری مقدمہ بازی سے پارٹی بدنام ہوگی۔“

”وہ سیاست کے کھلاڑی ہیں۔ ان کا فیصلہ اپنے طور پر درست ہے۔ تم نے استعفیٰ تو نہیں دیا ہے نا؟“

”سوری معروف صاحب...! دیدیا ہے۔“

وہ غصے سے اچھل پڑا۔ ”کیا بول رہے ہو؟“

”میں نے اکیلے نہیں دیا ہے۔ جلالی نے بھی دیا ہے۔ آئندہ اس کی سیٹ پر اس کا بیٹا آئے گا۔“

”انہیں جہنم میں جانے دو۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ جلالی پارٹی سے نکلنے کے باوجود بیٹے کی صورت میں رہے گا۔ تم تو بالکل ہی کٹی ہوئی پتنگ ہو گئے ہو۔“

وہ کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جو ہو گیا اس پر مٹی ڈالیں۔“

”میں کیا ڈالوں تم خود ڈال ہی چکے ہو۔ تمہیں سمجھایا تھا۔ اقتدار میں رہنے والی پارٹی کو ہرگز نہ چھوڑو۔ ہمیں کاروباری معاملات میں بڑی سہولتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں۔“

”تین برس پہلے جب یہ پارٹی اقتدار میں نہیں تھی تو سہولتیں حاصل نہیں تھیں۔ اس وقت بھی منافع کا گراف کبھی نیچے نہیں آیا۔“

”تم سے کاروباری بحث فضول ہے۔ تم سے تو صرف عشق و محبت کی ہی باتیں کی جاسکتی ہیں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تو پھر کریں نا۔“

”میں بوڑھا کیا کروں گا۔ ماروی کے پاس جاؤ۔“

وہ ڈرائیو کرتا ہوا ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ وہ دکھائی دینے لگی۔ اس کے لبوں پر بڑی ہی دھیمی سی سنجیدہ سی مسکراہٹ تھی۔

معروف نے کہا۔ ”میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ ماروی کا نام سنتے ہی اس کے پاس پہنچ گئے ہو۔“

”سنا ہے، مجنوں کے عشق کا جنون ایسا تھا کہ بچے بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے دیکھ کر کہہ دیتے کہ وہ لیلیٰ کو یاد کر رہا ہے۔"

"ابھی میں نے بھی تمہاری محویت دیکھ کر یہی کہا ہے اور یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ تم اسلام آباد میں میدان مارنے کے بعد اس کے لیے تحفہ ضرور لائے ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ کا یقین درست ہے۔ مگر سوچ رہا ہوں۔ اسے کیسے دوں؟ میرا پیار یک طرفہ ہے۔ اس کی طرف سے نہیں ہے۔ کیسے کہوں کہ یہ تحفہ قبول کرو۔"

"تم پیش کرو۔ وہ قبول کر لے گی۔"

"نہیں کرے گی۔ کسی سے کوئی چیز لینے کا کوئی رشتہ ہونا چاہیے۔ میں نے پہلی بار اسے موبائل فون پیش کیا تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ تحفہ قبول نہیں کرے گی۔ تب میں نے بات بنائی کہ وہ تحفہ نہیں، ضرورت کی چیز ہے۔ اسے ضرورتاً دی جا رہی ہے۔ تب اس نے وہ فون لیا تھا۔"

معروف نے کہا۔ "مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ ایک ہاتھ سے تالی بجا رہے ہو اور وہ نہیں بج رہی ہے۔"

"ہاں نہیں بج رہی ہے۔ اس اکیلے ہاتھ کو سینے پر ہائے ہائے کے انداز میں مارتا ہوں تو دھڑکنیں بجنے لگتی ہیں۔"

"ایسا کرو جو تحفہ لائے ہو وہ مجھے دو۔ میں اسے جا کر دوں گا۔ تحفہ تمہارا ہوگا۔ تم سامنے نہیں ہوگے تو وہ میرے ہاتھ سے لے گی یوں جھجک دور ہو جائے گی۔ ایک بار قبول کرے گی تو دوسری بار تمہارے ہاتھوں سے ضرور لے گی۔"

"واہ معروف صاحب! جھجک دور کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ آپ یہ تحفہ ابھی لے جائیں گے؟"

"ہاں مجھے اس کوٹھی کے قریب ڈراپ کرتے ہوئے جاؤ۔"

"کوٹھی کے قریب کیوں؟ میں کوٹھی کے اندر پہنچا کر جاؤں گا۔ کیا قریب جا کر اس کا دیدار نہ کروں؟"

"پھر تو وہ مجھ سے کہے گی کہ جب سائیں یہاں آ ہی گئے تھے تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے تحفہ کیوں نہیں دیا؟ نہیں۔ تم یہاں گاڑی روکو۔ میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا۔"

اس نے گاڑی روک دی۔ پچھلی سیٹ پر سامان رکھا تھا۔ اس میں ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ محبوب نے اسے دیتے ہوئے کہا۔ "خدا کرے وہ اسے قبول کرے اور بات آگے بڑھے۔"

معروف نے کہا۔ "میں بڑھاؤں گا۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجے۔"

اس نے ایک ٹیکسی روکی پھر جاتے ہوئے بولا۔ "میری کار تمہاری کوٹھی میں ہے۔ چابی کار میں ہی چھوڑ دی تھی۔ ڈرائیور سے کہو اسے ماروی کی کوٹھی میں لے آئے۔"

محبوب اپنی کار میں چلا گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ ماروی اس کا تحفہ قبول کر لے گی۔ معروف تحفے کے ذریعہ قبولیت کا در کھلے گا تو پھر ان کے درمیان بے تکلفی پیدا ہونے لگے گی۔

معروف ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اپنی گود میں رکھے ہوئے تحفے کو سہلا رہا تھا۔ تجربات کی بھٹی میں پکا ہوا دماغ کہہ رہا تھا۔ "مراد بچپن سے ماروی کے دل میں گھسا ہوا ہے۔ وہ اپنے محسن کو ناراض نہ کرنے کے لیے شاید تحفہ قبول کر لے گی لیکن دل کے فریم سے مراد کی تصویر ہٹا کر محبوب کی تصویر نہیں لگائے گی۔

اسے کئی طرح سے آزمایا جا چکا ہے۔ اگر وہ لالچی ہوتی تو ابھی تک محبوب کی احسانمندی اور دولتمندی سے جھک کر اس کے قدموں میں آ جاتی۔"

وہ سوچ رہا تھا۔ "میں نہیں جانتا کسی سے پاگلوں جیسا پیار کیسے ہو جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو لڑکی پسند کی اسے ہم نے شریک حیات بنا لیا۔ انسان کو اپنی زندگی میں بڑے بڑے مثبت کارنامے انجام دینے چاہئیں۔ جھیل کا کنول اور شاعر کی غزل والی باتیں سراسر احمقانہ ہیں۔

میرا فرض ہے کہ میں محبوب کو ایسی حماقت سے باز رکھوں۔ کسی طرح ماروی کو اس کی شریک حیات بنا دوں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے عشق کا بخار اتر جائے گا اور وہ پہلے کی طرح کاروبار پر پوری توجہ دینے لگے گا۔

اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ ماروی ذرا عقل سے کام لے۔ غریب مجنوں کو چھوڑے اور امیر مجنوں کی قدر کرے۔"

وہ کوٹھی میں پہنچا۔ میڈم روزی نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر پوچھا۔ "ماروی کہاں ہے؟"

"اپنے بیڈ روم میں سبق یاد کر رہی ہے۔ میں نے اسے موبائل فون کے تمام فنکشنز سمجھائے ہیں۔ اسے ادبی سوسائٹی میں گفتگو کے آداب سکھا رہی ہوں۔ چاچا چاچی اپنے کمروں میں ہیں۔ انہیں بھی سمجھاتی رہتی ہوں کہ کوٹھی میں کس طور طریقے سے رہنا چاہیے۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں ماروی کو بھیجتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ معروف ادھر ادھر گھوم کر ڈرائنگ روم کے سیٹ اپ کو دیکھنے لگا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ

میڈم روزی نے پوری کوٹھی کو بڑے سلیقے سے سجا بنا کر رکھا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس کا ڈھکا چھپا مقصد یہی تھا کہ ماروی محبوب علی چانڈیو کے شایان شان بن جائے۔

ماروی نے آ کر سلام کیا پھر کہا۔ "آپ کھڑے ہوئے ہیں؟ تشریف رکھیں۔"

"ہاں آؤ۔ تم بھی بیٹھو۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "محبوب تمہارے لیے فکرمند رہتا ہے۔ اس نے تمہاری خیریت معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ایسی بڑی بڑی کوٹھیوں میں کوئی مصیبت نہیں آتی۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ سائیں نے جو سکھ چین اور آرام دیا ہے۔ اس کے سامنے کوئی پریشانی پریشان کر ہی نہیں سکتی۔"

معروف نے سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے گفٹ پیکٹ کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "محبوب اسلام آباد گیا تھا۔ یہ وہاں سے لایا ہے... تمہارے لیے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "وہ میری تمام ضرورتیں پوری کر رہے ہیں۔ میں ان کی تمام مہربانیوں کو قبول کر رہی ہوں۔ لیکن کوئی چیزیوں الگ سے لیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔"

میڈم روزی دروازے پر تھی۔ اندر آتے ہوئے بولی۔ "میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ تحفے قیمتی ہوں یا بہت معمولی ہوں۔ انہیں لینے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ جو بات تہذیب کے دائرے میں ہو اسے تسلیم کرنا چاہیے۔"

ماروی نے ہچکچاتے ہوئے دونوں ہاتھ بڑھا کر وہ گفٹ پیکٹ لے لیا۔ میڈم نے کہا۔ "معروف صاحب ہمارے بزرگ ہیں۔ یہ یہاں آ کر تحفہ پیش کرنے کی زحمت اٹھا رہے ہیں۔ انہیں تھینک یو بولو۔ اپنا سبق بھولا نہ کرو۔"

ماروی نے معروف کو دیکھ کر "تھینک یو" کہا۔

میڈم روزی نے کہا۔ "یہ تحفہ دینے محبوب صاحب نہیں آئے۔ جانتی ہو کیوں؟"

ماروی نے روزی کو دیکھا، وہ بولی۔ "محبوب صاحب تمہارے بیگانہ پن سے مایوس ہیں۔ انہوں نے ابھی مجھے فون پر کہا ہے کہ وہ آتے اور تم تحفہ ان کے ہاتھوں سے نہ لیتیں تو ان کی توہین ہوتی اور واقعی تم نے ابھی قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔"

وہ قریب آ کر ایک صوفہ پر بیٹھ کر بولی۔ "کیا ایک نیکی کرنے والے کو تم نے آج تک کبھی تھینک یو کہا ہے؟ زبان سے نہ سہی کبھی خاموش نظروں سے شکریہ ادا کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "میں محبوب سائیں کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ لیکن میں ان کے سامنے کچھ بول نہیں پاتی ہوں۔"

"کیوں نہیں بول پاتی ہو؟"

"اس لیے کہ..."

وہ بولتے بولتے رک گئی پھر صوفے پر پہلو بدل کر بولی۔ "اس لیے کہ وہ مجھے مراد کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔"

روزی نے پوچھا۔ "وہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کیا زبان سے کچھ کہتے ہیں؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "انہوں نے کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔ لیکن مراد سے کہہ چکے ہیں کہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ مراد سے مجھے نہیں مانگیں گے۔ مجھے کسی بھی طرح مجبور نہیں کریں گے لیکن مجھ سے آس لگائے رہیں گے۔"

معروف نے کہا۔ "وہ زبان کا دھنی ہے کبھی تمہیں مجبور نہیں کرے گا۔ لیکن خاموشی سے تمہیں ایک صحت مند اور بیمار زندگی کا فرق سمجھاتا رہے گا۔

شاید تم یہ سمجھ رہی ہوگی وہ تمہیں احسانات کے بوجھ تلے دبا کر اپنی طرف مائل کر رہا ہے۔ جبکہ حقیقتاً وہ پوری سچائی سے تمہارے دکھ دور کر رہا ہے۔ تم کہیں جھگی میں محفوظ نہیں رہ سکتی تھیں۔ یہاں تمہیں تحفظ فراہم کر رہا ہے۔

وہ شریف آدمی تمہاری خاطر خون خرابے پر اتر آیا ہے۔ یہ تو جانتی ہو کہ وڈیرا تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ محبوب نے اس کے بیٹے پر گولی چلا کر اسے جتا دیا ہے کہ تم کمزور ہاتھوں میں نہیں ہو۔

ذرا عقل سے سوچو اور سمجھو، کیا مراد جیل سے باہر آ کر اس طرح تمہاری حفاظت کر سکے گا؟"

ماروی نے نظریں اٹھا کر معروف کو دیکھا پھر کہا۔ "غریب کو کوئی وڈیرا اور فرعون نہیں مارتا۔ اسے غربت اور محتاجی مارتی ہے۔ اگر مراد کے پاس دولت اور ہتھیار نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے محبت بھی چھین لوں۔

ایک محبت ہی ایسی ہوتی ہے جو مفت میں غریب کو ملتی ہے۔ آپ چاہتے ہیں، وہ مفت حاصل ہونے والی چیز بھی ایک دولت مند کو دیدوں۔"

معروف تجلی اور میڈم روزی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ ایسی باتیں کر رہی تھی جس کی انہیں توقع نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔معروف نے جلدی سے کہا۔"یہ تم سے کسی نے نہیں کہا ہے کہ ایک غریب کی محبت چھین کر امیر کو دو۔"

وہ بولی۔"آپ میں سے کسی نے نہیں کہا۔محبوب سائیں نے بھی مجھے چاہنے کے باوجود کبھی زبان سے نہیں کہا کہ میں مراد سے بے وفائی کروں اور ان سے وفا کروں۔سائیں بہت اچھے انسان ہیں وہ مجھ پر جبر نہیں کر رہے ہیں۔صبر کر رہے ہیں۔انتظار کر رہے ہیں۔"

میڈم نے کہا۔"سب ہی محبت کرنے والے جواباً محبت چاہتے ہیں چلو وہ منہ سے نہیں کہتے۔لیکن ان کا ایک ایک انداز کہتا ہے کہ وہ تمہارے لیے جنون میں مبتلا رہتے ہیں۔تم ایسے سچے دیوانے عاشق کو کیا صلہ دے سکتی ہو۔"

وہ صوفے پر تن کر بولی۔"خدا کی قسم سائیں مجھ سے ابھی جان مانگیں ابھی جان دیدوں گی۔

اگر کہیں گے مراد کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے خود کو بیچ دوں تو میں ان کے ہاتھوں بک جاؤں گی۔اپنا یہ وجود سائیں کو دیدوں گی لیکن..."

میڈم نے اسے دیکھا۔"لیکن...؟"

معروف تجلی کی نظروں میں سوال تھا۔"لیکن...؟"

اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔"دل نہیں دوں گی۔سائیں میرا ڈھانچا خرید سکیں گے۔روح تو مراد کی ہی رہے گی۔"

وہ جو چپ چپ سی گونگی بن کر رہتی تھی اچانک جیسے کفن پھاڑ کر بول رہی تھی اور جو بولتے رہتے تھے انہیں چپ لگ گئی تھی۔

معروف تجلی نے سوچا۔"ماروی کی زبان سے ہمارے کام آنے والی ایک بات نکل گئی ہے۔ابھی اس نے کہا ہے کہ مراد کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے وہ خود کو فروخت کر سکتی ہے۔میں تو یہی چاہتا ہوں خواہ فروخت ہو کر ہی آئے۔کسی بھی طرح محبوب کی شریک حیات بن جائے پھر وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند رہنے والا مستعد بزنس مین بن جائے گا۔"

اس نے چور نظروں سے ماروی کو دیکھا پھر سوچا۔"محبت سراسر حماقت ہوتی ہے۔یہ کہتی ہے محبوب کے لیے جان دیدے گی اپنا وجود دیدے گی لیکن دل نہیں دے گی۔

او نہہ! یہ دل کیا ہوتا ہے؟ گوشت کا ایک لوتھڑا۔پورے جسم میں خون پمپ کرتا ہے اس سے زیادہ یہ کچھ نہیں ہے۔کچھ ہے تو ماروی کی قربت ہے۔جو بکھرے ہوئے محبوب کو سمیٹ لے گی، سنوار دے گی۔"

وہ ماروی سے بولا۔"پہلے تم مراد کی بات کرو۔یہ جانتی ہو کہ وہ مجبوری کی حالت میں ہی سہی زلیخا کے ساتھ گناہ گار بن چکا ہے۔یہ ایسا گناہ ہے کہ اسے کوڑے لگائیں جائیں گے۔

اس پر دوسرا الزام یہ ہے کہ اس نے زیورات چرائے ہیں اور تیسرا سنگین الزام یہ ہے کہ اس نے زلیخا کو قتل کیا ہے۔"

وہ تڑپ کر بولی۔"یہ جھوٹ ہے۔اس پر جھوٹے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔زلیخا کا باپ اور بھائی گواہ ہیں۔گوٹھ کے درجنوں لوگوں کو بھی گواہ بنا لیا جائے گا۔پھر مراد کے صندوق سے برآمد ہونے والا زیور ٹھوس ثبوت ہے۔وڈیرا اسے پھانسی کے تختے پر پہنچانے کے تمام ہتھکنڈے آزمائے گا۔

صرف ایک محبوب ہی ہے جو پانی کی طرح لاکھوں روپے بہا کر اسے سزائے موت سے بچائے گا۔اب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولو۔مراد کو نئی زندگی کی طرف لانے کا صلہ کیا دو گی؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔"جو سائیں کہیں گے اور جو میری اوقات میں ہوگا وہ صلہ دوں گی۔"

"وہ تمہیں عزت دیں گے۔تمہیں عزت اور شرافت سے اپنی شریک حیات بنائیں گے۔"

ماروی کا دل ڈوبنے لگا۔وہ تو خوابوں میں خود کو مراد کی دلہن بنتے دیکھتی رہتی تھی۔کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میڈم اور معروف اسے دیکھ رہے تھے۔انتظار کر رہے تھے کہ وہ کیا جواب دے گی؟ ویسے جواب تو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ مراد کو جیل سے رہا کرانے کے لیے خود کو فروخت کر سکتی ہے۔

میڈم نے پوچھا۔"کیا تمہیں منظور ہے۔محبوب صاحب سے نکاح پڑھایا جائے؟"

معروف نے کہا۔"ابھی راضی ہو جاؤ گی تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔"

ماروی نے پوچھا۔"ابھی...کیا ابھی راضی ہو جاؤں؟ کیا ابھی مراد رہا ہو کر آئے گا؟"

"ابھی کیسے آئے گا۔یہ تو جانتی ہو۔عدالتی فیصلے کے بعد ہی اسے رہائی ملے گی۔"

"تو پھر اسے رہائی ملنے دیں۔"

"رہائی جلد ہی ممکن نہیں ہے۔قتل کے مقدمے

میں مہینوں اور برسوں گزر جاتے ہیں۔"

"میں آخری سانسوں تک اس کا انتظار کروں گی اپنی آنکھوں سے اسے ایک نئی زندگی حاصل کرتے دیکھوں گی تو وعدہ کے مطابق خود کو ہار جاؤں گی۔"

معروف نے کہا۔"تب تک کیا ہوگا جانتی ہو؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ بولا۔"تم خوامخواہ بدنام ہوتی رہو گی۔ایک کنواری لڑکی کسی رشتے کے بغیر کسی کی پناہ میں رہتی ہے تو طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں۔"

میڈم روزی نے معروف سے کہا۔"میں نے اسے بتایا ہے کہ محبوب صاحب کے پورے بزنس سیکٹر میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ صاحب سے ماروی کا افیئر چل رہا ہے اور صاحب اس پر خوب دولت لٹا رہے ہیں۔"

ماروی پریشان ہو کر سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔معروف نے کہا۔"تمہارے لیے محبوب اور حشمت جلالی کا جھگڑا اسلام آباد تک پہنچ گیا ہے۔محبوب نے تمہاری خاطر اقتدار میں رہنے والی پارٹی کو چھوڑ دیا ہے۔سیاسی کیریئر ختم کر دیا ہے۔اتنی بڑی قربانی کے باعث سب ہی کو یقین ہو گیا ہے کہ تم محبوب صاحب کی..."

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ماروی نے اسے دیکھا۔اس کی نظروں میں سوال چیخ رہا تھا۔"میں محبوب صاحب کی...؟"

اس نے تڑپ کر معروف سے پوچھا۔"آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔آگے بولیں لوگ کیا کہتے ہیں؟"

"سوری۔میں بول نہیں سکوں گا۔تم جتنی معصوم ہو تمہارے متعلق اتنا ہی گھٹیا لفظ کہا جا رہا ہے۔"

"جب مجھے کہا جا رہا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔اگر آپ نہیں بتائیں گے تو میں اُٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

معروف نے میڈم روزی کو دیکھا۔وہ بولی۔"ہاں تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ خوامخواہ بدنام ہو رہی ہو۔تمہیں محبوب صاحب کی داشتہ سمجھا جا رہا ہے۔"

ماروی کے دل میں پتھر آ کر لگا۔اس نے تکلیف کی شدت سے آنکھیں بند کر لیں۔تھوڑی دیر بعد کھولیں تو آنسو ابل پڑے۔میڈم اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔"خدا گواہ ہے۔ہم سنتے ہیں تو ہمیں بھی صدمہ پہنچتا ہے۔اسی لیے تمہیں مفت کی بدنامی سے بچانا چاہتے ہیں۔"

معروف نے کہا۔"تمہیں محبت سے سچے دل سے سمجھاتے ہیں۔محبوب صاحب کی منکوحہ بن جاؤ۔ساری بدنامیاں یکلخت نیک ناموں میں بدل جائیں گی۔تم ایک عزت دار شریک حیات بن کر فخر کرو گی۔"

وہ میڈم سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آنسو کو پونچھنے لگی۔دل نہیں مان رہا تھا کہ خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے اپنے مراد کو چھوڑ دے۔اسے چھوڑ کر نیک نامی کی زندگی گزارتی رہے گی تو جیتے جی مرتی رہے گی۔مراد سے بے وفائی اسے مار ہی ڈالے گی۔

ہاں اگر اس کی رہائی کی قیمت پر محبوب کو قبول کرے گی تو اس کا ضمیر مطمئن رہے گا۔وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچ رہی تھی۔"مراد کو نئی زندگی دے کر اطمینان ہوگا۔تب میں محبوب کے احسانات کا بوجھ اتاروں گی۔اسے قبول کروں گی۔"

پھر سوال پیدا ہوا۔"اور کیا تب تک پتھر کھاتی رہو گی؟ کسی کی داشتہ کہلاتی رہو گی؟"

معروف نے کہا۔"تم جتنا سوچو گی۔اتنا ہی الجھتی رہو گی۔عقل ایک ہی بات کہتی ہے کہ زندگی کا ایک ایک پل نیک نامی کے ساتھ جیو۔عزت سے ازدواجی زندگی گزارو۔"

وہ صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔"میں مراد کا انتظار کروں گی۔"

دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔معروف نے پوچھا۔"برسوں تک مقدمہ چلتا رہے گا۔کیا برسوں تک خوامخواہ کسی کی داشتہ کہلاتی رہو گی؟"

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔"نہ یہاں رہوں گی نہ کسی کی داشتہ کہلاؤں گی۔"

وہ کوٹھی چھوڑ کر، محبوب کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ سنا رہی تھی۔میڈم نے کہا۔"کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟ ایسی محفوظ پناہ گاہ کہیں نہیں ملے گی۔اس کوٹھی کے باہر کھلا آسمان ہے۔آسمان کے نیچے کوئی ایسی چار دیواری نہیں ہے جہاں تمہاری جیسی جوان کنواری لڑکی کو عزت سے پناہ اور سلامتی ملے۔"

معروف نے کہا۔"محبوب سنے گا کہ تم اس کی پناہ گاہ سے جانا چاہتی ہو تو پاگل ہو جائے گا۔ذرا عقل سے سوچو۔اس پناہ گاہ میں کسی فکر اور پریشانی کے بغیر تمہاری آبرو سلامت ہے۔جو عزت اور نیک نامی یہاں مل رہی ہے باہر اس کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔"

وہ سرد لہجے میں بولی۔"دھجیاں یہاں بھی اڑ رہی ہیں۔میں خوامخواہ داشتہ اور آبرو باختہ کہلا رہی ہوں۔"

"یہاں صرف جھوٹا الزام ہے یہاں کوئی تمہیں ہاتھ نہیں لگاتا ہے۔باہر نوچنے کھسوٹنے والے ہاتھ تمہیں سچ مچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک شرمناک گالی بنادیں گے۔"

"میں چادر اور چاردیواری میں رہوں گی۔ کسی ایسی جگہ چھپ کر رہوں گی جہاں عزت کے لٹیرے نہ پہنچیں۔"

میڈم نے کہا۔ "ہماری دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ عورت کہیں بھی محفوظ نہیں رہتی ہے۔ بولو تم کہاں چھپ سکو گی؟"

"نہ چھپ سکی اور اگر کسی نے ہاتھ بھی لگایا تو اپنی جان دیدوں گی۔ مرتے وقت اطمینان رہے گا کہ اپنے مراد کی امانت کو کسی کے ہاتھ لگنے نہیں دیا۔"

میڈم روزی اور معروف بجلی اسے بے بسی سے دیکھنے لگے۔ اس کی باتیں سن کر غصہ آرہا تھا اور وہ غصہ دکھا نہیں سکتے تھے۔ معروف نے کہا۔ "یہ ایک احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں آیا ہے۔ یہ نہیں سوچ رہی ہو کہ جب لٹیرے گھیر لیں گے تو تمہیں جان پر کھیلنے نہیں دیں گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر بولی۔ "میں تنہائی میں سوچوں گی اچھی طرح غور کروں گی کہ باہر کسی بھی تدبیر سے محفوظ رہنا ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ممکن نہیں ہوگا تو یہاں سے باہر نہیں جاؤں گی۔"

میڈم نے کہا۔ "تھینکس گاڈ یہاں رہو گی۔"

"یہاں بھی نہیں رہوں گی۔ مجبوراً رہنا پڑا تو اسی دن میری میت یہاں سے نکلے گی۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ وہاں چاچی اور چاچا کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے معروف اور میڈم کو دیکھ کر کہا۔ "یہاں مجھے گالی پڑ چکی ہے۔ گالی بے غیرت برداشت کرتے ہیں۔ میں نہیں کروں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چاچی منتی نے حیرت سے پوچھا۔ "میری بچی کو کس نے گالی دی ہے؟"

میڈم نے کہا۔ "آپ دونوں اس کے بزرگ ہیں۔ آئیں بیٹھیں، میں آپ کو سمجھاتی ہوں یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

معروف اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ "میں محبوب سے... فون پر بات کر رہا ہوں۔"

وہ فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے لاؤنج میں آگیا۔ محبوب اپنے بیڈروم میں بے چین تھا۔ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ماروی نے اس کا تحفہ قبول کیا ہے یا نہیں؟ اس نے کال بیل سنتے ہی بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر پوچھا۔ "جی معروف صاحب! خیریت ہے؟"

"کیا بتاؤں؟ خیریت نہیں ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یعنی اس نے تحفہ قبول نہیں کیا ہے؟ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔"

"میڈم روزی کے سمجھانے سے قبول کر لیا ہے لیکن بات بہت بگڑ رہی ہے۔ وہ کوٹھی چھوڑ کر تمہاری تمام عنایات سے منکر ہو کر کہیں جانا چاہتی ہے۔"

"کہاں جائے گی؟ کیوں جائے گی؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا وہ مجھ سے بدظن ہوگئی ہے؟"

"جیسا کہ تم جانتے ہو وہ تمہاری نیکیوں اور مہربانیوں کے سائے میں رہ کر پاکباز رہنے کے باوجود داشتہ کہلا رہی ہے۔ یہ گالی اس سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ کہتی ہے تمہارے سائے سے کہیں دور جا کر چھپ کر زندگی گزارے گی تو کوئی اسے ایسی شرمناک گالی نہیں دے گا۔"

"یہ کیا حماقت ہے۔ وہ باہر غیر محفوظ رہے گی۔ یہاں محض جھوٹی بدنامی ہے۔ باہر سچ مچ برباد ہو جائے گی۔"

"میں نے اور میڈم نے اسے ہر پہلو سے سمجھایا ہے۔ یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ تم سے نکاح پڑھا لے گی تو بدنامیاں نیک نامی میں بدل جائیں گی۔"

محبوب نے بے تابی سے پوچھا۔ "وہ کیا کہتی ہے؟"

"وہ احمق ہے۔ عاقبت نا اندیش ہے۔ اسی گدھا گاڑی والے کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے آخری سانسوں تک اسی کی واپسی کا انتظار کرتی رہے گی۔"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "میں جانتا ہوں، وہ وفا کی مثال ہے۔ اس کے آگے سونے کا پہاڑ لا کر رکھ دو۔ پھر بھی وہ اپنے مراد سے نہیں پھرے گی۔"

"کیا تم نامراد رہو گے؟ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیا تمہیں اپنی شرافت کا اور نیکیوں کا صلہ نہیں ملنا چاہیے۔"

"شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ دو غریب پیار کرنے والوں کو جدا نہ کیا جائے۔ آپ ماروی کو اور سمجھائیں کہ وہ کوٹھی چھوڑ کر نہ جائے۔ ہم مراد کو جلد ہی واپس لائیں گے۔"

"ہم نے سمجھانے کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا ہے۔ اب تم ہی اسے سمجھا کر دیکھ لو۔"

"میں ابھی اس کے نمبر پر بات کروں گا۔ آپ اس کی طرف سے محتاط ہو جائیں۔ وہ سر پھری ہے پتا نہیں کب کوٹھی سے نکل جائے گی۔ تمام سیکیورٹی گارڈز سے کہہ دیں کہ وہ جب بھی باہر جائے گی تو ایک گارڈ اس کے ساتھ ضرور رہے گا اور اسے واپس کوٹھی میں ضرور لائے گا۔ اس کے چاچا اور چاچی کو سمجھاؤ۔ وہ دونوں اس کے ساتھ سائے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

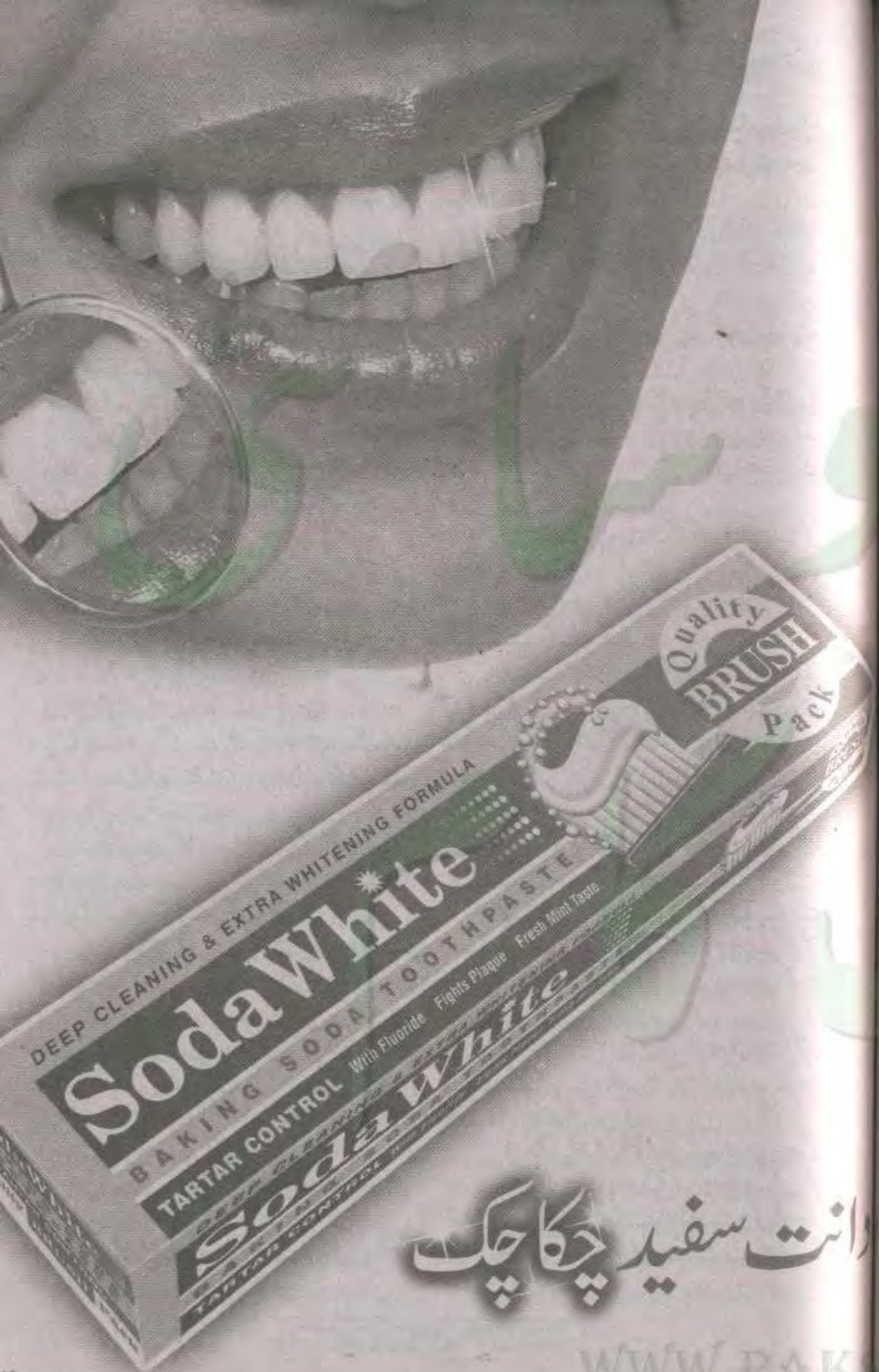

طرح رہیں گے۔ یا خدا میں کیا کروں؟ میں ابھی ماروی سے بات کرتا ہوں۔"

وہ فون بند کر کے سوچنے لگا۔ ماروی کو اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ اس نے کئی دن پہلے اسے ایک فون دیا تھا۔ یہ آس لگائی تھی کہ وہ کبھی کسی ضرورت سے ہی سہی' فون پر اپنی آواز سنائے گی۔ لیکن اس کی طرف سے خاموشی اور بے حسی رہی تھی۔

اور یہ تو ہوتا ہی ہے۔ حسن بے نیاز ہوتا ہے عشق نیاز مند رہتا ہے۔ محبوب یہ الزام نہیں اٹھانا چاہتا تھا کہ اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لیے فون پر باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس نے بھی اسے کال نہیں کی تھی لیکن اب اسے مخاطب کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے لاحاصل پیار کے نمبر پنچ کیے پھر فون کو کان سے لگایا۔ ماروی بیڈ روم میں آ کر نڈھال سی ہو کر بیڈ پر گر پڑی تھی۔ داشتہ محض ایک لفظ نہیں تھا۔ ایک انگارہ تھا۔ اس کے دماغ میں سُلگ رہا تھا۔

وہ ایسی نہیں تھی جیسی گالی پڑ رہی تھی۔ جھنجلا کر فیصلہ کر چکی تھی کہ اور گالیاں کھانے کے لیے وہاں نہیں رہے گی۔

سوچ رہی تھی۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کیا اس شہر کے کسی علاقے میں چھپ کر رہ سکے گی؟

اس شہر سے کہیں دور جائے گی تو پھر مراد سے بھی دور ہو جائے گی۔ اگرچہ کوٹھی سے نکلنے کے بعد اس سے مل نہیں سکے گی۔ اسے دیکھ نہیں سکے گی لیکن یہ سوچ کر بہلتی رہے گی کہ دونوں ایک ہی شہر میں ہیں۔

اس کوٹھی سے نکلنے سے پہلے اسے کئی پہلوؤں سے سوچنا تھا۔ اسی لیے بیڈ روم میں آ گئی تھی۔ وہاں اس کی تنہائی میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی نہیں آ سکتا تھا۔

مگر وہ آ گیا۔ فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ میڈم روزی نے اسے فون کو استعمال کرنا اچھی طرح سکھا دیا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ پھر محبوب کی آواز سنتے ہی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ جس سے دور جانا چاہتی تھی وہ اچانک تنہائی میں قریب آ گیا تھا۔

سامنے جیسے مراد آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ محبوب ہو گا لیکن دل تو اسے مراد مان رہا تھا۔

مراد جیسی دل کو دھڑکا دینے والی آواز اور لہجہ سنائی دیا۔ "ہیلو ماروی! میں خوامخواہ فون کرنا اور تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اسی لیے اب تک خاموش رہا۔ لیکن ابھی مجبور ہو کر تمہیں پریشان کرنے آیا ہوں۔"

"آپ بہت اچھے ہیں۔ پریشان نہیں کریں گے۔"

"تم کر رہی ہو۔ وہاں سے کہیں جانے کی بات کہہ کر میری نیکی اور شرافت کے منہ پر طمانچا مار رہی ہو۔"

"ایسی بات نہ کریں۔ میں مرتے دم تک آپ کی نیکی اور شرافت کی قسمیں کھاتی رہوں گی۔ خدا گواہ ہے' آپ کے احسانات کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔"

"اگر حالات موافق نہیں ہیں۔ میں نیکی کر رہا ہوں اور تمہارے حق میں برائی ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے ٹھکرا کر چلی جاؤ۔"

"میں ٹھکرانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آپ ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔"

"ماروی...!" اس نے بڑے جذبے سے اس کا نام لیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ اندر آ گیا ہو۔ وہ پریشان ہو کر ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ بولا۔ "میں نے آج تک تم سے ایک تنکا نہیں مانگا۔ آج پہلی بار...."

یہ ایسی بات تھی کہ دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ...! خیر ہو۔ جانے وہ کیا بولنے والا ہے؟

وہ ذرا چپ ہوا۔ پھر بولا۔ "پہلی بار تمہارا وجود اس کوٹھی کے لیے مانگ رہا ہوں۔"

ماروی نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہ بول رہا تھا۔ "میں تم سے دور رہتا ہوں اور دور ہو جاؤں گا۔ تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔ لیکن تم اس مضبوط پناہ گاہ سے باہر نہ جاؤ۔"

"بے شک آپ میری سلامتی چاہتے ہیں۔ کیا میری رسوائی اور ذلت بھی چاہتے ہیں؟ اگر نہیں تو آپ وہ گالی کیسے مٹائیں گے جو میرے وجود سے چپک گئی ہے؟"

محبوب نے کہا۔ "کسی کو بدنام کرنے کے لیے جب جھوٹی بات کو پر لگ جاتے ہیں تو ہر طرف گونجنے والے جھوٹ کو سچ مان لیا جاتا ہے۔ یہی تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"میں کیا کروں؟ کوئی میری نیکی اور شرافت کو نہیں مانے گا۔ مجھے آپ کے ساتھ بدنام کرتا رہے گا اور میں دنیا والوں کا منہ بند نہیں کر سکوں گی۔"

"فی الحال یہ سمجھ میں آتا ہے کہ میں رازداری سے کسی دوسرے علاقہ میں مکان لوں۔ تم وہاں رہو اور میں کبھی تمہاری طرف نہ آؤں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہو کہ تمہاری کوئی بھی ضرورت پوری کرنے کے لیے مجھے تمہاری طرف نہ آنا پڑے۔"

وہ بولی۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ دشمن مجھے ڈھونڈتے رہیں گے۔ میں ہمیشہ چھپ کر نہیں رہ سکوں گی۔"

"ہمیشہ نہیں۔ صرف مراد کی رہائی تک چھپ کر رہنا ہے۔ مراد کی خاطر میری یہ بات مان لو۔"

وہ چپ رہی۔ جواباً یہ نہیں کہا کہ اس کی بات مانے گی۔ اس کی یہ بات اچھی لگی کہ وہ مراد کی رہائی تک چھپ کر رہنے کو کہہ رہا تھا اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ کسی نئی خفیہ پناہ گاہ کی طرف نہیں آئے گا۔ اپنا سایہ بھی اس پر پڑنے نہیں دے گا۔

وہ عجیب عاشق تھا۔ صرف معشوق کی عزت' نیک نامی' سلامتی اور بہتری چاہتا تھا۔ اپنے لیے اس کی ایک نگاہ بھی نہیں مانگ رہا تھا۔ اپنی آرزو اپنی طلب بھول گیا تھا۔ صرف اس کے لبوں پر تبسم لانا اور اس کے دل میں مسرتیں بھر دینا چاہتا تھا۔

اس کے کان سے فون لگا ہوا تھا۔ محبوب نے پوچھا۔ "چپ کیوں ہو؟ مجھے تھوڑا وقت دو۔ میں تمہارے اطمینان کے لیے جلد ہی ایسی جگہ تلاش کروں گا جہاں کوئی دشمن تو کیا کوئی شناسا بھی تمہارے سائے تک پہنچ نہیں پائے گا۔

ایک بار مجھ پر بھروسا کرو۔ میں ایسا کروں گا کہ کسی طرح کی بدنامی تمہارا پیچھا کرتی ہوئی نہیں آئے گی پھر جب مراد آئے گا تو اس کے سائے میں تمام بدنامیاں آپ ہی آپ فنا ہو جائیں گی۔"

"آپ کی یہ باتیں دل کو لگ رہی ہیں۔ میں کیا کہوں کہ آپ کتنے اچھے ہیں۔ میں خدا کے بعد آپ پر بھروسا کروں گی کہ میرے لیے جو کریں گے اس میں میری بہتری ہو گی۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں، بولو۔"

"میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مراد بہت یاد آ رہا ہے۔ کیا اسے پھر ایک بار دیکھ سکوں گی؟"

"اپنے وکیل سے بات کروں گا۔ ملاقات کی اجازت حاصل کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔"

وہ اچانک ہی رو پڑی۔ محبوب اور اس کے آنسو دیکھے یا روتا ہوا سنے؟ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میں کیا بولوں؟ وہ یاد آتا ہے تو صدمہ سے جان نکلنے لگتی ہے۔"

وہ تڑپ گیا۔ کتنا خوش نصیب ہے مراد؟ یا خدا...! یہ اس کے لیے کیسے تڑپ رہی ہے؟

وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔ "یہ جان نکل ہی جاتی تو اس نامراد کے صدمہ سے نجات مل جاتی۔ کیسی بدنصیبی ہے کہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتی۔ اس کی آواز بھی نہیں سن سکتی۔"

وہ چپ ہوئی تو سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ اس کے آنسو کھولتے ہوئے پانی کی طرح محبوب کے دل میں ٹپک رہے تھے۔

وہ بے بسی سے بولا۔ "کیا کروں؟ میرے اختیار میں ہوتا تو مراد کو ابھی جیل سے نکال کر تمہارے پاس لے آتا۔ میں وکیل سے بات کروں گا۔ اپنے آنسو پونچھ لو۔"

وہ بول رہا تھا اور اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ جی کر رہا تھا پھٹ پڑے۔ اس نے کہا۔ "ماروی چپ ہو جاؤ۔ میں تمہیں مراد سے ملاؤں گا۔ اب نہ رونا نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا انتظار کرو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں فون کروں گا۔"

اس نے رابطہ ختم کیا پھر فون پر وکیل کو مخاطب کیا۔ "صمدانی صاحب! کیا آپ نے مراد سے ملاقات کے لیے اپلائی کیا تھا؟"

"جی ہاں۔ ایک ہفتہ بعد اس ماہ کی بیس تاریخ کو صبح دس ملاقات کا اجازت نامہ مل گیا ہے۔"

محبوب نے ایک ذرا سوچ کر کہا۔ "میں قانون کو سمجھتا ہوں پھر بھی احمقانہ سوال کر رہا ہوں۔ کیا کل کسی طرح ماروی سے اس کی ملاقات کرائی جا سکتی ہے؟"

صمدانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے خود ہی کہا ہے کہ یہ احمقانہ سوال ہے۔ میں جواب کیا دوں؟ ہاں جیلر کچھ کر سکتا ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ جیلر سے کچھ معاملات طے ہو گئے ہیں۔ مراد کو وہاں کچھ سہولتیں حاصل ہو رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ملاقات کی اجازت دینا جیلر کے اختیار میں نہیں ہے۔"

"جناب جیل کے اندر جتنی لاقانونیت ہوتی ہے' اتنی اور کسی شعبہ میں نہیں ہوتی۔ بڑے بڑے کرنسی نوٹ بڑا معجزہ دکھاتے ہیں۔ آپ وہاں جا کر تو دیکھیں۔"

محبوب نے جیلر سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "دلاور بھٹی صاحب! میں محبوب علی چانڈیو بول رہا ہوں۔"

دلاور بھٹی نے چہک کر کہا۔ "جی چانڈیو صاحب! آپ کی عمر بہت لمبی ہے۔ ابھی آپ ہی کو یاد کر رہا تھا۔"

محبوب نے کہا۔ "زہے نصیب۔ میں آپ کی یادوں میں رہتا ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''کچھ پرسنل باتیں ہیں۔فون پر نہیں کہہ سکتا۔''

''نو پرابلم۔میں ابھی آجاتا ہوں۔''

وہ حیرانی سے بولا۔''آپ ابھی آئیں گے؟اس سے اچھی بات کیا ہوگی چانڈیو صاحب!ابھی آجائیں۔''

''او۔کے۔بس ابھی آیا۔''

اس نے فون بند کیا پھر ماروی سے رابطہ کیا اور کہا۔''میں جیلر سے ملنے جارہا ہوں۔کوشش کررہا ہوں کہ مراد سے کل ہی تمہاری ملاقات ہوجائے۔''

وہ خوش ہوکر بولی۔''کیا سچ کہہ رہے ہیں؟یا اللہ! میں اسے کل دیکھ سکوں گی۔''

''میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔مجھے لاکھوں روپے بھی دینے پڑیں تو میں تمہارے آنسو ضرور پونچھوں گا۔تم دعا کرو اور میرے فون کا انتظار کرو۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ماروی فون کو کان سے لگائے سوچتی رہ گئی۔وہ دیوانہ عاشق صرف اس کے آنسو پونچھنے کے لیے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہانے والا تھا۔

اس کے دل سے آواز نکلی۔''یہ میرے لیے پاگل ہوجاتا ہے۔اب تک میرے لیے جو کرتا آرہا ہے۔وہ کوئی نہیں کرے گا۔

میری ہستی کیا ہے۔ایک عام سی غریب لڑکی ہوں لیکن اس کی چاہت نے میری قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔میں ایک کے نہیں،دو چاہنے والوں کے دلوں میں دھڑکتی رہتی ہوں۔''

اس نے مہنگے آرائشی سامان سے آراستہ بیڈ روم کو دیکھا۔پھر سوچا۔''میری یہ اوقات نہیں تھی۔سائیں نے مجھے جھگی سے نکال کر یہاں پہنچا دیا ہے۔سائیں کے پیار نے مجھے اتنا اہم بنا دیا ہے کہ میری وجہ سے اسلام آباد میں ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا تھا۔میڈم روزی نے آج صبح بتایا تھا کہ وہ میری وجہ سے اسلام آباد گئے تھے۔

معروف صاحب کہہ رہے تھے کہ انہوں نے میری خاطر پارٹی کو چھوڑ دیا ہے۔گویا مجھ سے دوستی رکھنے کے لیے حکمرانوں سے دشمنی مول لی ہے۔

میری ہستی کیا تھی۔ان کے پیار نے،ان کے جنون نے مجھے زمین سے آسمان بنا دیا ہے۔یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ میں ان کی بے مثال چاہتوں اور قربانیوں کا صلہ نہیں دے سکوں گی۔دینے کے لیے جو کچھ ہے،وہ سب مراد کے لیے ہے۔''

اور وہ دیوانہ کچھ مانگنے اور لینے والا نہیں تھا۔وہ عاشق تھا۔سوداگر نہیں تھا۔ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے لینے کی سودے بازی نہیں جانتا تھا۔

اس نے جیلر دلاور جان کے دفتری کمرے میں آکر اس سے ایسی گرم جوشی سے مصافحہ کیا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔دلاور جان نے کہا۔''آپ تو واقعی ہوا کے گھوڑے پر آئے ہیں۔''

اس نے کہا۔''آپ مجھ سے پرسنل باتیں کرنا چاہتے ہیں۔پرسنل باتوں سے ہی دوستی اور اپنایت بڑھتی ہے۔''

دلاور جان نے مسکرا کر کہا۔''تشریف رکھیں۔آپ نے مجھے فون کیا تھا۔مجھے کال کرنے کی بھی یقیناً کوئی خاص وجہ ہوگی۔''

وہ دونوں دفتری میز کے اطراف بیٹھ گئے۔محبوب نے کہا۔''جی ہاں۔ضرورتیں ایک دوسرے کو قریب لے آتی ہیں۔ہم نے قیدی مراد سے ملاقات کا اجازت نامہ حاصل کیا ہے لیکن ایک ہفتہ بعد کی تاریخ ملی ہے۔کیا اس سے پہلے ملاقات ممکن ہے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔''ناممکن ہے۔''

محبوب نے اپنے بیگ کو میز پر رکھ کر اسے تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔''کیا ہم دونوں اسے ممکن بنا سکتے ہیں؟''

اس نے بیگ کو دیکھا،سمجھا پھر بے بسی سے کہا۔''آپ مجھے مشکل میں ڈال رہے ہیں۔اپنی ملازمت کے لیے خطرہ مول لینے والی بات ہوگی۔ایک قیدی کے معاملے میں میرے خلاف انکوائری ہورہی ہے۔ابھی میں کوئی رسک نہیں لے سکوں گا۔''

محبوب سوچ میں پڑ گیا کیا کرے؟ماروی کے رونے اور سسکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔وہ اتنی رات کو ہر حال میں اس کے آنسو پونچھنے آیا تھا۔

دلاور جان نے کہا۔''مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔میں تمہارے قیدی کو اور زیادہ سہولتیں فراہم کرسکتا ہوں۔اسے اے کلاس میں رکھ سکتا ہوں۔اگر آپ پچاس ہزار دے سکیں گے تو میں اگلے دو ماہ تک کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔مراد آرام سے رہے گا۔''

محبوب نے کہا۔''اس کی منگیتر رو رہی ہے۔اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔کوئی صورت نکالیں۔میں ابھی اسی وقت پچاس ہزار سے زیادہ دوں گا۔''

دلاور جان بے چین ہوگیا۔اسے اپنی طلب سے زیادہ رقم مل رہی تھی۔وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔محبوب اس کی طلب کو اور بے چینی کو سمجھ رہا تھا۔وہ واپس اپنی کرسی پر آکر بیٹھتے

ہوئے بولا۔''چونکہ ابھی مجبوری ہے۔اس لیے روبرو ملاقات کو جانے دیں۔اگر ان کی آدھی ملاقات کرا دی جائے تو؟''

اس نے تعجب سے پوچھا۔''آدھی ملاقات کیسے ہوتی ہے؟''

وہ میز پر جھک کر بولا۔''اگر لڑکی یہاں نہ آئے۔اپنے گھر میں ہی رہے اور قیدی ادھر اپنے سیل میں رہے تو موبائل فون کے ذریعہ آدھی ملاقات کرائی جاسکتی ہے۔''

محبوب سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔پینے کے لیے سمندر نہ ملا۔کوزہ مل رہا تھا۔کچھ نہ ہونے سے کچھ تو ہو رہا تھا۔

وہ سنے گی کہ ابھی اس کا مراد اس سے بولنے والا ہے تو اس کے آنسو ہوا ہوجائیں گے۔وہ چڑیا کی طرح چہکنے لگے گی۔

اس نے کہا۔''ٹھیک ہے۔بات ابھی ہوگی۔کیا فون مراد کے پاس پہنچایا جائے گا؟''

''نہیں۔میں اسے یہاں بلا رہا ہوں۔وہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک باتیں کرے گا پھر سیل میں چلا جائے گا۔''

''آپ اسے بلائیں میں ماروی سے بات کرتا ہوں۔''

جیلر کمرے سے باہر چلا گیا۔محبوب نے ماروی سے فون پر رابطہ کیا۔وہ انتظار کررہی تھی۔فوراً ہی بولی۔''ہاں میں بول رہی ہوں۔اچھی خبر سنائیں،میں اسے مل سکتی ہوں نا؟''

''قانونی طور پر ایک ہفتہ بعد بیس تاریخ کو ملاقات ہوگی۔ہاں مگر میں نے ایسا انتظام کیا ہے کہ تم ابھی اس کی آواز سن سکو گی۔اس سے فون پر بات کرو گی۔''

وہ خوشی سے چیخ پڑی۔''کیا سچ کہہ رہے ہیں۔میں ابھی،یعنی کہ اسی وقت مراد سے بولوں گی اور وہ بھی مجھ سے بولے گا۔سچ بولیں،یہ کیسے ہوگا؟''

اس نے کہا۔''تمہارے ہاتھ میں فون ہے۔آخر یہ کس دن کے لیے تمہیں دیا ہے؟''

''ایں...؟'' اس نے چونک کر اپنے فون کو دیکھا۔خوشی کے مارے یہ بھول گئی تھی کہ اس فون پر اپنے یار دلدار سے باتیں کرسکتی ہے۔اس نے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔آپ واقعی فرشتہ ہیں۔''

''فرشتے عشق نہیں کرتے۔مجھے انسان ہی رہنے دو۔اور یاد رکھو صرف آدھے گھنٹے کی اجازت ہے پھر فون بند کردیا جائے گا۔اب اپنا فون بند کرو۔تھوڑی دیر میں کال آئے گی۔''

محبوب نے اپنا فون بند کردیا۔تھوڑی دیر بعد مراد جیلر کے ساتھ کمرے میں آیا۔محبوب نے کرسی سے اٹھ کر اسے گلے لگایا۔مصافحہ کیا پھر پوچھا۔''کیسے ہو؟''

وہ دلاور جان کی طرف دیکھ کر بولا۔''جیلر صاحب مجھ پر مہربان رہتے ہیں۔میں یہاں آرام سے ہوں۔''

دلاور جان نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''بیٹھ جاؤ۔''

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔''سائیں آپ رات کو ملنے آئے ہیں۔خیریت تو ہے؟ماروی کیسی ہے؟''

''وہ خیریت سے ہے۔لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔میں جو نیکیاں کررہا ہوں وہ اس کے لیے مصیبت بن رہی ہیں۔اس کا عیش و آرام دیکھ کر یہ بات پھیل رہی ہے کہ میں نے اسے خرید لیا ہے اور وہ بن بیاہی میرے ساتھ ایک کوٹھی میں رہتی ہے۔''

مراد نے کہا۔''یہ تو اس پر ظلم ہورہا ہے۔میرا پیار،میرا اعتماد کہتا ہے کہ وہ حیا والی ہے کسی بھی قیمت پر بکنے والی نہیں ہے۔''

محبوب نے کہا۔''بے شک وہ اتنی ہی پاکیزہ ہے۔اس حیا والی سے ایسی بدنامی اور ذلت برداشت نہیں ہورہی ہے۔وہ میری دی ہوئی تمام سہولتوں کو ٹھکرا کر کوٹھی چھوڑ کر کہیں جانا چاہتی ہے۔''

مراد نے پریشان ہوکر پوچھا۔''وہ کہاں جائے گی؟''

''یہی تو میں اسے سمجھا رہا ہوں۔وہ اس بات پر راضی ہوگئی ہے کہ کوٹھی چھوڑ کر میری بتائی ہوئی کسی دوسری پناہ گاہ میں اس وقت تک چھپ کر رہے گی جب تک تم یہاں سے رہا ہوکر اس کے پاس نہیں آؤ گے اور تب تک میں اس سے دور رہوں گا۔اس پر بدنامی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔''

مراد نے مطمئن ہوکر کہا۔''یہ بہت اچھا فیصلہ کیا گیا ہے۔''

''وہ اب بھی ذہنی طور پر الجھی ہوئی ہے۔رو رہی تھی۔تم سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ایک ہفتہ بعد ملاقات کی تاریخ ہے۔لیکن وہ روتی ہے تو پھر چپ نہیں ہوتی۔اسے چپ کرانے کے لیے تم ابھی اس سے فون پر بات کرو گے۔''

''سائیں! آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔میں بھی اس سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔''

جیلر نے کہا۔''آدھے گھنٹے سے زیادہ بات نہیں کرو گے۔میں فون چھین لوں گا۔''

محبوب نے ماروی کے نمبر پنچ کیے۔پھر رابطہ ہونے پر بولا۔''یہ لو۔خدا کا شکر ادا کرو اور اپنے مراد سے باتیں کرو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ خوشی سے کھل گئی۔ محبوب سائیں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ اس کے پیار کی آواز اسے سنا رہا تھا۔ اور وہ آواز جیسے دل میں آ کر بجی۔ ''ماروی...!''

وہ سحر زدہ سی ہو گئی۔ ایک گہری سانس کھینچ کر بولی۔ ''مراد! یا اللہ...! یہ تم بول رہے ہو نا؟''

''ہاں۔ میں ہوں تمہارا مراد...''

''مجھے یقین دلاؤ۔ تم دونوں کی آواز ایک جیسی ہے۔ بہت دیر تک بولو گے تو شاید تمہاری آواز کو پہچان لوں گی۔''

''تم ابھی پہچان لو گی۔ ذرا ایک منٹ۔''

اس نے محبوب اور جیلر کو دیکھ کر کہا۔ ''میں اکیلے میں اس سے کچھ بولنا چاہتا ہوں۔''

جیلر نے اسے گھور کر دیکھا۔ اعتراض کرنا چاہا۔ محبوب نے کہا۔ ''پلیز بھٹی صاحب! اسے واش روم میں جانے دیں۔ ہم لین دین کا معاملہ نمٹائیں گے۔''

وہ خوش ہو کر مراد سے بولا۔ ''جاؤ۔''

آدمی مشین ہے۔ سکہ رائج الوقت کا بٹن دباتے ہی چل پڑتا ہے۔ مراد نے واش روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر کے کہا۔ ''ہاں ماروی! تم یقین کرنا چاہتی ہو کہ میں ہی تمہارا مراد ہوں۔ یاد ہے ایسے وقت میں نے تمہیں اپنے مراد کو پہچاننے کے لیے ایک بات کہی تھی۔''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ وہ بات میرے دل پر لکھی ہوئی ہے۔ وہ بات بولو۔ میں سن رہی ہوں۔''

''یہ کوئی نہیں جانتا۔ صرف ہم تم جانتے ہیں۔ میں نے کہا تھا۔ 'میری ماروی کسی عمر کے شکنجے میں نہیں آئے گی۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''ہائے تم نے پہچان کے لیے یہی بات کہی تھی۔ تم ہی میرے مراد ہو۔ کہاں ہو تم؟ میں تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔ ایسا لگ رہا ہے صدیوں کے بعد تمہاری آواز سن رہی ہوں۔ آ جاؤ مراد نہیں تو میں مر جاؤں گی۔''

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ادھر مراد کا دل رونے لگا۔ وہ بڑے ضبط و تحمل سے بولا۔ ''چپ ہو جاؤ روتے روتے وقت نہ گزارو۔ تمہیں یہ بتایا گیا ہو گا کہ ہمیں باتیں کرنے کے لیے صرف آدھے گھنٹے کی اجازت ملی ہے۔''

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''تم دور ہو گئے ہو۔ یہ نہیں جانتے کہ مصیبتیں قریب آ رہی ہیں۔ میں بدنام ہو رہی ہوں۔ مجھے سائیں کی داشتہ کہا جا رہا ہے۔''

وہ پھر رونے لگی۔ ''وہ بہت اچھے انسان ہیں وہ بھی مشکل میں ہیں۔ اچھا کر رہے ہیں۔ بُرا ہو رہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے سائے میں کیسے رہوں گی۔ اگر کسی دوسری جگہ چھپ کر نہ رہ سکی تو پھر ان کے ساتھ بدنام ہونے لگوں گی۔''

''ان کے سائے میں بدنامی ہے لیکن عزت آبرو سلامت ہے۔ کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکے گا۔''

''جہاں عزت مل رہی ہے۔ وہاں ذلت بھی مل رہی ہے۔ داشتہ جیسی گالی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔''

''آئندہ یہ گالی نہیں پڑے گی۔ سائیں کسی دوسری جگہ چھپ کر رہنے کو کہہ رہے ہیں۔ وہ تم سے دور رہا کریں گے۔ میرے آنے تک وہاں کسی طرح دن گزارو۔''

''مراد! ایک بات کہوں؟ وہاں کوئی نہیں سنے گا نا؟''

''میں یہاں ٹوائلٹ میں اکیلا ہوں۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ بولو کیا بات ہے؟''

وہ دھیمی سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے سائیں سے ڈر لگتا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''وہ اپنی زبان سے تو نہیں کہتے ہیں مگر معروف صاحب نے آج کہا ہے کہ میں سائیں کی زوجہ بن جاؤں گی تو پھر کوئی مجھے داشتہ نہیں کہے گا۔ میں ایک عزت دار کی شریک حیات کہلاؤں گی۔''

مراد نے دل برداشتہ ہو کر پوچھا۔ ''کیا یہ بات معروف صاحب نے تم سے کہی ہے؟''

''سائیں چاہتے ہیں۔ تب ہی تو کہی ہے۔''

''اب تک یہی دیکھ رہا ہوں اور یہی جانتا رہا ہوں کہ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں اور یہ یقین رہا ہے کہ وہ تمہیں کبھی مجھ سے چھین لینا نہیں چاہیں گے لیکن آج...''

وہ صدمہ سے ٹوٹ کر بولا۔ ''یہ تو صاف سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ معروف صاحب نے تمہیں سائیں کی زوجہ بننے کو کہا ہے تو پھر سائیں کی مرضی سے ہی کہا ہے۔ وہ تمہیں میری امانت کہتے تھے۔ اب ان کی نیت بدل گئی ہے۔''

''مراد! یہ ہم سے نیکیاں کرتے آ رہے ہیں اور ہم انہیں سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ یہ جاہل وڈیرے کی طرح مجھے چھیننا نہیں چاہتے۔ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ بڑی عقل سے فرشتہ بن کر تمہیں تو سچ مچ وہاں سے باہر لانا چاہتے ہیں لیکن مجھے بڑی سیاست سے قید کر لینا چاہتے ہیں۔''

مراد کا سر گھوم رہا تھا۔ محبوب پر جو اعتماد تھا' اس اعتماد کو ٹھیس پہنچ رہی تھی۔ معروف تجلی نے ماروی کو محبوب کی دلہن بننے کا مشورہ دے کر ان غریب اور مجبور پیار کرنے والوں کو بدظن کر دیا تھا۔

جبکہ مراد کو بدظن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آج صبح ہی جیل

کی مسجد کے پیش امام نے سمجھایا تھا کہ دینی احکامات کے مطابق جوان لڑکی کی شادی جلد سے جلد ہو جانی چاہیے۔

یہ بھی سمجھایا تھا کہ قتل کا مقدمہ برسوں چلتا رہے گا۔ وہ جس کی پناہ میں رہ کر بدنام ہو رہی ہے' اس کی منکوحہ بن کر عزت اور نیک نامی حاصل کرے گی۔

وہ ان ہدایات پر عمل کر کے عزت آبرو سے زندگی گزار سکتی تھی۔ مراد ان ہدایات کو تسلیم کر رہا تھا۔ لیکن اپنی جانِ حیات کو محبوب کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پورے یقین سے خود کو سمجھاتا تھا کہ بہت جلد جیل کی چار دیواری سے نکل کر اپنی ماروی کا محافظ بن جائے گا۔ وہ فون پر بولا۔ ''اب یہ میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے کہ تمہیں گالی پڑ رہی ہے۔ تمہیں داشتہ کہا جا رہا ہے۔ اور تمہیں سائیں کی منکوحہ بنانے کی سازش ہو رہی ہے۔

قسم سے رہائی نہ ملی تو جیل توڑ کر نکل آؤں گا۔ بلا سے مجھ پر گولی چلائی جائے۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ یا تو تمہیں حاصل کروں گا یا پھر جان پر کھیل جاؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''نہیں مراد! جان پر کھیلنے والی باتیں نہ کرو۔ خدانخواستہ تم نہ رہے تو میرا کیا ہو گا؟''

وہاں ان کی باتیں کوئی نہیں سن رہا تھا پھر بھی مراد نے فون کو منہ سے لگا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''سائیں پر بھروسا مہنگا پڑے گا۔ جیل کی چار دیواری میں اچانک کسی دن خبر ملے گی کہ تم پرائی کر دی گئی ہو۔ پھر بولو ماروی...! میں کیا کروں گا؟ میں تو یہاں کی دیواروں سے سر پھوڑتا رہ جاؤں گا۔''

وہ بھی جیسے سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے بھی یہی بات ڈرا رہی ہے۔ یہاں میرے ساتھ کیا ہو گا؟ تمہیں سزائے موت سے بچانے کے لیے میں کیسی مجبور ہو جاؤں گی' وہاں تمہیں معلوم نہیں ہو گا۔''

''میری فکر نہ کرو۔ مجھے اللہ سائیں یہاں سے نکالے گا۔''

''میں اللہ پر بھروسا کروں گی پھر بھی ایسا ہوتا ہے نا۔ اللہ سائیں ظالموں کو ڈھیل دے دیتا ہے اور وہ ہم غریبوں کی گردنیں اڑا دیتے ہیں۔''

''نہیں ماروی...! ایسا ہونے سے پہلے میں کچھ کر گزروں گا۔ مجھے کوئی بہت بڑا خطرہ مول لینا ہو گا۔''

وہ بولی۔ ''میں تمہیں خطرہ مول لینے نہیں دوں گی۔ یہ بتاؤ' ابھی ہماری باتیں کوئی سنتا تو نہیں ہو گا نا؟''

''نہیں۔ میں نے کہا نا۔ ابھی ایک ٹوائلٹ میں ہوں اور دروازہ اندر سے بند ہے۔''

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''یہاں سے جا کر چھپ کر رہنے کی ایک جگہ ہے۔ تمہارے باہر آنے تک میں وہاں سلامتی سے رہوں گی۔''

''تم اکیلی کہاں جاؤ گی؟ سائیں تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''وہ ادھر نہیں جائیں گے۔ اِدھر سے سکھر تین سو میل دور ہے۔ وہاں سے بھی سو میل دور ریتی نام کی ایک چھوٹی سے بستی ہے۔ وہاں چاچی کی ایک دور کی بہن رہتی ہے۔ میں اُدھر چھ مہینے رہ چکی ہوں۔ وہ ایسی اُجاڑ جگہ ہے کہ کوئی ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔ آئے گا تو چھپنے کی بہت جگہ ہے۔''

''اگر وہاں جا کر عزت آبرو سے چھپ کر رہ سکو تو ضرور اس کوٹھی سے نکل جاؤ۔ تم اکیلی تو نہیں رہو گی نا؟ چاچا اور چاچی کے ساتھ جاؤ گی نا؟''

''ہاں تم دل مضبوط کرو۔ اِدھر سے مجھ کو داشتہ والی بدنامی سے نکلنے دو۔ میں دن رات کے اس اندیشے سے نکلنا چاہتی ہوں کہ سائیں کبھی زبردستی نکاح پڑھا لیں گے۔''

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ''تم ہو تو میں ہوں۔ خدا نہ کرے پرائی ہو جاؤ گی تو تمہارے بغیر ایک پل نہیں جیوں گا۔ جان پہ کھیل جاؤں گا۔ میں تمہیں کسی کی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔''

''اور کوئی مجھے اپنا نہیں بنا سکے گا۔ میں بھی دل مضبوط کر کے تم سے دور جا رہی ہوں۔ جب تک تمہیں رہائی نہیں ملے گی میں تمہاری صورت نہیں دیکھ سکوں گی۔ فون پر تمہاری آواز بھی نہیں سن سکوں گی۔ یہاں سے سیکڑوں میل دور ویران سی بستی میں دن رات تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔''

ٹوائلٹ سے باہر جیلر نے گھڑی دیکھی پھر سپاہی سے کہا۔ ''اسے باہر نکالو۔''

سپاہی ٹوائلٹ کی طرف جانے لگا۔ محبوب نے جیلر کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''جان صاحب! اور دس ہزار دوں گا آپ انہیں اور آدھا گھنٹا دیں۔''

دلاور جان نے سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ رک جائے اور باہر جائے۔ سپاہی کمرے سے چلا گیا۔ محبوب نے ہزار ہزار کے دس نوٹ نکال کر اسے دیے وہ انہیں جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور پوچھیں۔''

''میں نے کسی کو کسی پر اتنی رقم لٹاتے نہیں دیکھا۔ آپ قیدی پر لٹا رہے ہیں یا لڑکی پر؟''

''دونوں پر... اس سے آگے کوئی سوال نہ کریں۔ میری نیکیاں برباد ہو رہی ہیں۔ مجھے غلط سمجھا جا

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہا ہے۔ یہ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ وہ شرم والی ہے اور بے داغ ہے۔"

دلاور جان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی کیسی بھی ہو۔ مجھے کیا لینا ہے۔ میں ایک راؤنڈ مار کر آتا ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔"

وہ کمرے سے چلا گیا۔ محبوب نے سر گھما کر ٹوائلٹ کے بند دروازے کو دیکھا۔ دو بچھڑے ہوئے پریمی مل رہے تھے۔ وہ ایسی ملاقات تھی کہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے کو اپنی دھڑکنوں کے قریب سن رہے تھے، بول رہے تھے۔ طویل جدائی کے باعث پیار کا جتنا غبار بھر گیا تھا اسے نکال رہے تھے۔ وہ محروم رہنے والا دیوانہ عاشق ان کے ساتھ عجیب طرح کی نیکیاں کر رہا تھا۔

نامراد نے درد دل سے سوچا۔ "وہ پیار سے کیسے بولتی ہے؟ اس کے منہ کی مٹھاس سن کر کیسا لگتا ہوگا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اس کی مٹھاس میرے لیے نہیں ہے۔

معروف صاحب کو یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ وہ میری منکوحہ بن جائے۔ اس کے منکوحہ بننے سے محض ایک بدن ملے گا۔ وہ مٹھاس نہیں ملے گی جو مراد کے لیے ہے۔

میرے لیے یہ کافی ہے کہ میں اسے اپنی ذات سے بھی زیادہ چاہتا ہوں اور یہ اطمینان میرے لیے بہت ہے کہ وہ میری چاہت اور دیوانگی کو خوب سمجھتی ہے۔ وہ مجھے مراد کی محبت نہیں دے گی لیکن میرے پیار کی آگہی میں بھیگی بھیگی سی رہے گی۔

وہ مجھ سے کتراتی ہے مگر کبھی کبھی سوچتی ہوگی کہ میں اسے سوچ رہا ہوں۔ اور یہ سمجھتی ہوگی کہ وہ جن لمحات میں مراد کو تصور میں دیکھ رہی ہے۔ ان ہی لمحات میں، میں بھی اسے دیکھ رہا ہوں۔

کوئی بات نہیں، وہ رہے مراد کے سامنے رہے۔ میرے سامنے سے کبھی نہیں جائے گی۔ ہزار جتن کرے گی۔ کرتی رہے گی۔ تب بھی خود کو مجھ سے دور نہیں لے جا سکے گی۔

مراد تو کسی دن اسے پالے گا۔ برت لے گا۔ آج کی ماروی کو کھو دے گا۔ اس کے پاس بچوں کی ماں رہ جائے گی۔ میرے پاس آخری سانسوں تک اچھوتی اور کنواری ماروی رہے گی۔ اگر یہ عشق نہیں ہے پاگل پن ہے تو میں پاگل ہوں۔ میری ایک ہی کوشش ہوگی کہ وہ تنہا رہے یا مراد کے ساتھ رہے۔ میری پناہ میں رہے اور میں اسے دور سے سہی، دیکھتا رہوں۔

آج وہ مجھ سے دور کہیں جانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ تھینکس گاڈ! میں نے اسے منا لیا ہے۔ وہ مان گئی ہے۔ کوٹھی میں نہ سہی کسی دوسری جگہ رہے گی لیکن میری ہی پناہ میں رہے گی۔ میری نظروں میں ہی رہا کرے گی۔"

اُدھر فون ماروی کے کان سے لگا ہوا تھا۔ مراد کی آواز کان کے راستے دل میں اتر رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "پہلے ہم جھگی میں رہتے تھے۔ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اب کچھ دنوں سے اچانک ہی ہمارے نصیب ہمارے ہی دشمن ہو گئے ہیں۔

بدنصیبی نے مجھے جیل کی کوٹھری میں پھینک دیا ہے اور تمہیں کوٹھی میں پہنچا کر بھی غیر محفوظ کر دیا ہے۔ تم وہاں حفاظتی انتظامات کے باوجود انتظامات کرنے والے فرشتے سے محفوظ نہیں ہو۔ تمہیں وہ کوٹھی چھوڑنے سے پہلے اچھی طرح یقین کرنا ہوگا کہ یہاں سے چار سو میل کا فاصلہ طے کر کے اس چھوٹی سی بستی میں کیسے پہنچ سکو گی؟ کیا راستے میں دشمن رکاوٹیں نہیں آئیں گی؟"

"میں اچھی طرح سوچ سمجھ لوں گی۔ ابھی تو ایک ہفتہ یہاں رہنا ہے۔ بیس تاریخ کو ہماری ملاقات ہوگی۔ میں تم سے ملنے آؤں گی۔ پھر یہاں سے جانے کے بعد کسی کو نظر نہیں آؤں گی۔"

"میں بھی اس قید تنہائی میں تمہاری سلامتی کے لیے سوچتا سمجھتا رہوں گا کہ تمہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے کتنے مہربانوں اور دشمنوں سے محتاط رہنا ہوگا۔ ٹرین کے ذریعہ اور بس کے ذریعہ کس طرح راستے بدل کر اپنی منزل تک جانا ہوگا۔"

"میرے لیے زیادہ نہ سوچو۔ وہاں اکیلے بیٹھ کر جتنا سوچو گے پریشان ہوتے رہو گے۔"

"جب چلی جاؤ گی تو کوئی یہ بھی بتانے والا نہیں ہوگا کہ تم وہاں خیریت سے پہنچ گئی ہو۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں زیادہ نہ سوچو۔ مجھے خدا پر چھوڑ دو۔"

دروازے پر دستک ہوئی پھر سپاہی کی آواز سنائی دی۔ "ٹائم مک گیا ہے۔ باہر آؤ۔"

مراد نے بھاری دل سے کہا۔ "ماروی! جدا ہونا پڑے گا۔ جیلر صاحب بلا رہے ہیں۔ میں اور کچھ نہیں بول سکوں گا۔ ہم بیس تاریخ کو ملیں گے۔"

اس نے بولتے ہوئے دروازے کے پاس آ کر اسے کھولا اور فون کو بند کر دیا۔ سپاہی کے پیچھے چلتا ہوا آ کر جیلر

کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ محبوب نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر اس سے فون لے کر پوچھا۔ "ماروی خوش ہے نا؟"

وہ بولا۔ "آپ کی مہربانی ہے سائیں! آپ بچھڑنے والوں کو ملاتے ہیں۔ ہماری مرادیں پوری کرتے ہیں۔ خدا آپ کی مرادیں پوری کرے گا۔"

وہ ایسا کہتے ہی ذرا ٹھٹک گیا۔ اس سے غلطی ہو گئی تھی۔ سائیں کی مراد بھی تو ماروی ہی تھی اور وہ بے دھیانی میں سائیں کو اپنی ہی ماروی کے حق میں دعا دے رہا تھا۔

جیلر نے دو سپاہیوں کو بلا کر کہا۔ "اسے سیل میں پہنچا دو۔"

محبوب نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "خدا حافظ۔ بیس تاریخ کو ماروی تم سے ملے گی۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں جلد از جلد یہاں سے رہائی مل جائے۔"

وہ اس کا شکریہ ادا کر کے سر جھکا کر سپاہیوں کے ساتھ چلا گیا۔ محبوب نے جیل سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر فون کو جیب سے نکالا۔ پھر ماروی کے نمبر پنچ کیے۔

وہ مراد سے باتیں کرتے رہنے کے دوران جیسے اس کی قربت سے سرشار ہوتی رہی تھی۔ اب بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی اسے آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے آئندہ کی پلاننگ کے متعلق سوچ رہی تھی۔

فون کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنا فون اٹھا کر دیکھا۔ ننھی سے اسکرین پر محبوب کے نمبر نمایاں تھے۔ وہ ابھی مراد کی سوچ سے نکلنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس محسن کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی اہمیت بھی کم نہیں تھی۔ اسی نے اس کے آنسو پونچھے تھے اور مراد سے جی بھر کے بات کرائی تھی۔

ایسے وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ "کیا ابھی تک باتیں کر رہی ہو؟"

اس نے اٹھ کر دروازہ نہیں کھولا اونچی آواز میں کہا۔ "ذرا رک جائیں۔ میں ابھی آپ کے پاس آؤں گی۔"

پھر اس نے فون کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ محبوب نے پوچھا۔ "ہیلو۔ بات ہو گئی؟"

"جی ہاں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنی دیر تک باتیں کر سکوں گی۔ بات کرنے سے پہلے آپ نے کہا تھا کہ صرف آدھے گھنٹے کی اجازت ہے۔"

"ہاں۔ اجازت اتنی ہی تھی۔ میں نے وقت بڑھا دیا تھا۔"

"آپ ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"پلیز... تم بھی میرا صرف اتنا خیال رکھو کہ کبھی چھوڑ کر جانے کی بات نہ کرو۔"

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ چپ رہی۔ یہی کرنے والی تھی۔ جواب کیا دیتی؟

وہ بولا۔ ”میں جلد سے جلد تمہاری نیک نامی اور سلامتی کے لیے کوئی بہترین خفیہ پناہ گاہ تلاش کروں گا۔ مراد کے آنے تک وہاں کوئی تمہیں بدنام نہیں کرے گا۔“

اب تو اسے بدنامی کا ڈر بعد میں تھا۔ پہلا خوف یہی طاری تھا کہ وہ مسلسل احسانات کرتے ہوئے حواس پر چھا گیا تھا۔ وہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کر پاتی تھی۔ یہ سوال اسے چبھتا رہتا تھا کہ وہ پیار سے یا جبر سے نکاح قبول کروائے گا تو وہ کیا کر سکے گی؟

احسانات کی مار کھا کر رہ جائے گی۔

محبوب نے پوچھا۔ ”تم خاموش ہو۔ کچھ سوچ رہی ہو؟“

اس کی ایک سوچ یہ تھی کہ محبوب اس کے لیے دوسری پناہ گاہ میں لاکھوں روپے خرچ کرے گا۔ یہ مناسب نہیں ہے اس پر خوا مخواہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اس نے کہا۔ ”میں سوچ رہی ہوں کہ آپ میرے لیے ابھی کسی دوسری جگہ رقم خرچ نہ کریں۔“

”کیا اسی کوٹھی میں رہو گی؟“

”بیس تاریخ کو مراد سے ملوں گی۔ اس سے باتیں کروں گی پھر جگہ بدل کر رہنے کی بات سوچوں گی۔“

”کوئی بات نہیں جیسا مناسب سمجھتی ہو کرو۔ میں تو وہی چاہوں گا جو تم چاہو گی۔ وہی کروں گا جو تم کرنے کو کہو گی۔“

وہ چپ رہی۔ جواباً کچھ کہنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ محبوب نے کہا۔ ”میں نے معروف صاحب کے ہاتھوں ایک پیکٹ بھیجا تھا۔ کیا اسے کھول کر دیکھا ہے؟“

”آپ ناراض نہ ہوں تو کہنا چاہتی ہوں۔ آپ کوئی تحفہ نہ بھیجا کریں۔ میں آئندہ قبول نہیں کروں گی۔“

”میں نے کوئی تحفہ نہیں بھیجا ہے۔ پہلے ضرورت کے مطابق موبائل فون دیا تھا۔ تم نے اسے بھی تحفہ سمجھا تھا۔ تمہیں میری توہین کرتے اچھا لگتا ہے؟“

وہ جلدی سے تڑپ کر بولی۔ ”میں آپ کی توہین کرنے سے پہلے مر جاؤں گی۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”تم ایسا رویہ کیوں اختیار کرتی ہو؟ کیا تم نے پیکٹ کھول کر دیکھا ہے کہ اس میں کیا ہے؟“

اس نے سر گھما کر پیکٹ کی طرف دیکھا۔ وہ قریب ہی بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اہمیت نہ دیتے ہوئے بیڈ پر پھینک دیا تھا۔ اب وہ سوالیہ نشان بن گیا تھا کہ وہ تحفہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا پھر ریپر کو ہٹا کر گتے کے ڈبے کو کھولا تو اس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں دکھائی دیں۔

ماروی کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ پہلا خیال یہی آیا کہ اب وہ نقد لاکھوں روپے دے کر خریداری کی راہ پر آ رہا ہے۔

اس نے فون کو کان سے لگا کر ناگواری سے پوچھا۔ ”یہ کیا؟ آپ نے یہ روپے کیوں بھیجے ہیں؟ آپ مجھے کیا سمجھ رہے ہیں؟“

”بس رک جاؤ۔ دیکھو آگے کچھ نہ بولنا۔ مجھے غلط سمجھنے سے پہلے صحیح بات کو سمجھو۔“

”میرے سامنے آپ کی بھیجی ہوئی بہت ہی غلط چیز ہے۔ آپ غلطی کو صحیح کیسے کریں گے؟“

محبوب نے پہلی بار سخت لہجے میں کہا۔ ”یوشٹ اپ۔ بکواس کرنے سے پہلے یاد کرو۔ یہ تمہارے تین لاکھ روپے کی باقی پیمنٹ ہے۔ مراد نے اور تمہارے چاچا جی نے اشتہاری فلم کے لیے میری پانچ لاکھ کی آفر قبول کی تھی۔ دو لاکھ پہلے ہی لے چکے تھے۔“

ماروی کا منہ شرمندگی سے کھلا رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہارے تین لاکھ میرے پاس پڑے تھے۔ نہ تم میرے مشورے کے مطابق بینک اکاؤنٹ کھول رہی تھیں۔ نہ اپنی باقی پیمنٹ طلب کر رہی تھیں۔ پھر میں کیا کرتا؟ میں نے اصول کے مطابق یہ ادائیگی کر کے اپنا بوجھ اتارا ہے۔“

وہ چپ چاپ سن رہی تھی۔ وہ غصہ سے بول رہا تھا۔ ”میں کیا کروں۔ جتنا اچھا کرتا ہوں۔ اتنا ہی برا بنتا جاتا ہوں۔ خدا کے لیے تم تو اتنی گری ہوئی بات نہ سوچو کہ میں لاکھوں روپے سے تمہیں خریدنا چاہتا ہوں۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”سائیں میں بہت شرمندہ ہوں۔ اپنی بے عقلی کو کوس رہی ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔“

محبوب کو جو تکلیف پہنچی تھی۔ اسے برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے معافی نہ مانگو۔“

”آپ ناراض ہو گئے ہیں۔“

”میری ناراضگی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔“

”دیکھا جائے تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میرا ضمیر مجھے مار ڈالے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں آپ پر کبھی کسی طرح کا شبہ نہیں کروں گی۔ آپ معاف نہیں کریں گے تو پھر میں بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔ خود کو سزا دینے کے لیے بھوکی رہوں گی۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”میں معاف تو کر دوں گا لیکن میری ایک بات مانو گی؟“

وہ گھبرانے لگی۔ جانے وہ کیسی بات منوانا چاہتا تھا۔ وہ بولی۔ ”میں مراد سے الگ ہونے والی کوئی بات نہیں مانوں گی۔“

”تم مراد کی ہو اور آخری سانسوں تک اسی کی رہو گی۔ میں ایسی کوئی غلط بات نہیں کہوں گا جو معروف صاحب کہہ چکے ہیں۔“

”سائیں! پھر تو میں آپ کی ہر بات مانوں گی۔“

وہ بولا۔ ”ایک چھوٹی سی بات یہ ہے کہ مجھے سائیں نہ کہو۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ بڑے ہیں۔ مالک ہیں، آقا ہیں۔“

”تم میری کنیز نہیں ہو۔ اور نہ ہی میں تمہارا آقا ہوں۔ تم پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے اس لیے تمہارا مالک و مختار بھی نہیں ہوں۔ لہٰذا مجھے سائیں نہ بولو۔“

”پھر کیا بولوں؟“

”میرا نام محبوب ہے۔ بہت آسان سا نام ہے۔ جیسے مراد کا نام لیتی ہو۔ میرا بھی نام لو۔“

”مراد سے گہرا رشتہ ہے۔“

”ضروری نہیں ہے کہ گہرا رشتہ ہو۔ ہم عام آدمیوں کو ان کا نام لے کر مخاطب کرتے ہیں۔“

”آپ عام آدمی نہیں ہیں۔“

”اپنے دل سے پوچھو۔ خاص بھی نہیں ہوں۔ انسانی تعلقات کے حوالے سے بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوں۔ جو کچھ نہیں ہوتا اسے نام سے پکارا جاتا ہے۔“

”خدا کے لیے اس مطالبے سے مجھے نہ الجھائیں۔ میں آپ کا نام نہیں لوں گی۔“

”نہ لو۔ معافی بھی نہ مانگو۔“

”میں محبوب صاحب کہوں گی۔“

”صاحب اپنی بیگم کا ہوتا ہے یا اپنے ملازموں کا۔ نہ تم بیگم ہو نہ کنیز ہو۔“

”خدا کا واسطہ ہے۔ نہ الجھائیں۔ میں نام لوں گی تو سننے والے کیا سمجھیں گے؟“

”سننے والے نہ ہوں۔ تب نام لو۔ لوگوں کے سامنے نام کے بغیر اور مخاطب کیے بغیر بھی باتیں کی جا سکتی ہیں۔“

ماروی نے سوچا۔ ”مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا ہے۔ بیس تاریخ کے بعد یہاں سے جانا ہی جانا ہے۔“

وہ بولی۔ ”آپ کی بات ماننی ہی ہو گی۔“

”شکریہ۔ دل سے سوچو۔ میں نے مراد سے تمہیں چھین لینے والی کوئی بات نہیں منوائی ہے۔ جبکہ یہ جانتی ہو کہ میں کیسی دیوانگی سے تمہیں چاہتا ہوں یہ بھی سوچو کہ میرے سینے میں دل ہے۔ یہ دل تم سے کچھ تو چاہتا ہے۔ کچھ تو اسے ملنا چاہیے۔ شکر یہ آج ایک فرمائش پوری ہو رہی ہے۔“

وہ دل میں کہہ رہی تھی۔ ”میں ایسا موقع آنے نہیں دوں گی کہ نام لے کر مخاطب کرنا پڑے۔“

وہ بولی۔ ”میرے سامنے ایک بڑی رقم ہے۔ اسے الماری میں رکھنے جا رہی ہوں۔ کیا فون بند کروں؟“

”ہاں مجھے اتنی لمبی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ میرا نام لے کر خدا حافظ کہو۔ میں فون بند کروں گا۔“

وہ گڑبڑا گئی۔ جلدی سے بولی۔ ”خدا حافظ کہنے کے لیے نام لینا کیا ضروری ہے؟“

”وہاں کوئی سننے والا نہیں ہے۔ ضرورت کے بغیر بھی میرا نام لے سکتی ہو۔ یہ بات میں بڑے دکھ سے کہہ رہا ہوں۔ میرا نام دل سے نہ لو۔ دل رکھنے کے لیے جھوٹا وعدہ پورا کر دو۔“

”آ..... آپ ایسا نہ سمجھیں۔ میں نے جھوٹا وعدہ نہیں کیا ہے۔ ابھی مجھے ذرا سوچنے دیں۔“

”میں تمہاری اُلجھن سمجھ گیا۔ رہنے دو۔ تمہیں جھوٹے وعدے سے آزاد کر رہا ہوں۔ خدا حافظ...“

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے پریشان ہو کر فون کو دیکھا۔ ایکدم سے ضمیر نے ملامت کی۔ ”وہ تجھے مراد سے نہیں چھین رہا تھا۔ وہ بھی عاشق ہے، تیرا دیوانہ ہے۔ اپنا حق مانگ رہا تھا۔

اس نے بہت چھوٹی سے تمنا کی تھی۔ تیرے لبوں سے اپنا نام سننا چاہتا تھا۔ وہ تجھے مراد کے پیار کی سلامتی دے رہا ہے۔ کیا تُو اپنی زبان سے ایک بار بھی اس کا نام نہیں لے سکتی تھی؟

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

محبوب فون بند کرنے کے بعد کار ڈرائیو کرتا ہوا اپنی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ان لمحات میں بہت ہی دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اسے یہ اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ مسیحا کو اس کی مسیحائی کا صلہ کبھی نہیں ملے گا۔

وہ انسان تھا کوئی فرشتہ نہیں تھا کہ نیکیاں کرتا چلا جاتا۔ کوئی اس کا نام جھوٹے منہ سے بھی نہ لیتا اور اسے تکلیف نہ پہنچتی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیو کر رہا تھا اور زیر لب کہہ رہا تھا۔ ”میں کہاں جا رہا ہوں؟ جہاں جا رہا ہوں ادھر بزنس اور منافع بھول گیا ہوں۔ ہر قدم پر خسارہ اٹھا رہا ہوں۔ مجھے ماروی کے حوالے سے دیکھنے والے کچھ تو مہذب الفاظ میں عاشق اور دیوانہ کہتے ہیں۔ کچھ دبی زبان سے الّو کا پٹھا کہہ کر ہنستے ہوں گے۔

ہنسنے کی بات ہے۔ ایک لڑکی کے لیے کوئی اپنے اربوں روپے کے کاروبار کو نہیں بھلاتا۔ کوئی اپنا سیاسی کیریئر تباہ نہیں کرتا۔ ایک لڑکی کے لیے کوئی شریف آدمی غنڈوں سے خون خرابا نہیں کراتا۔ میں ہوں اس قابل کہ میری ہنسی اڑائی جائے۔“

وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار آگے جانے کا راستہ دکھائی دیتا ہے۔ اسے ماروی دکھائی دے رہی تھی۔ زیر لب گنگنا رہی تھی۔

میں ترے سنگ کیسے چلوں سجنا
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا

☆☆☆

ماروی چاچی کے کمرے میں آئی تو وہاں چاچا سے اس کی تو، تو میں، میں ہو رہی تھی۔ وہ غصہ سے بولی۔ ”تم دونوں میں سے کسی ایک کو مر جانا چاہیے تب ہی یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہوگا۔“

چاچا جھمرو نے کہا۔ ”اس نے وعدہ کیا تھا کہ میرے حصے کی رقم مجھے دے گی۔ آج چار دنوں سے ٹالتی آ رہی ہے۔ اسے سمجھاؤ۔ نہیں تو غصہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“

چاچی منتی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”کیا کر لے گا؟ ہڈیوں کے ڈھانچے...! ایک ہاتھ ماروں گی تو زمین میں آدھا دھنس جائے گا۔“

”تو کیا مارے گی موٹی بھینس میں بھاگتا ہوں تو پکڑ نہیں سکتی۔ ہانپنے لگتی ہے۔“

منتی بھی جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ماروی نے چیخ کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ بالکل چپ... منہ بالکل بند۔ کوئی بولا تو گارڈ کو بلاؤں گی۔ اسے حکم دوں گی تو دونوں کو باہر نکال دے گا۔“

انہوں نے اپنے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔ پھر چاچا نے عاجزی سے آہستگی سے کہا۔ ”میری ایک بات سن لو۔“

”کچھ نہیں سنوں گی۔ منہ کھولو گے تو باہر جانے کا دروازہ کھلے گا۔ کتنے افسوس کی بات ہے، تم دونوں کو میری پریشانیوں کا، میری مشکلوں کا ایک ذرا احساس نہیں ہے۔“

پھر اس نے چاچی کے سامنے آ کر، اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”کبھی سوچا ہے کہ میں نہیں رہوں گی تو یہاں تمہیں کون پوچھے گا؟ ذرا سوچو۔ ذرا سی بھی عقل ہے تو سوچو۔

کیا اتنی شاندار کوٹھی میں کوئی بوڑھوں کی پرورش کرے گا؟ محبوب سائیں ہوں یا زمین میں رہنے والا کوئی بھی فرشتہ ہو، وہ جوانی کو کلیجے سے لگاتا ہے بڑھاپے کو دیکھتا بھی نہیں ہے۔“

وہ دونوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ منتی نے کہا۔ ”خدا تمہیں ہماری بھی زندگی دے۔ تم لمبی عمر جیو۔ ہم یہاں تمہارے ہی دم سے تینوں وقت عزت سے روٹیاں کھا رہے ہیں۔“

”اگر اللہ سائیں نے مجھے وسیلہ بنایا ہے۔ میری وجہ سے یہاں عیش کر رہے ہو تو تمہارا فرض کیا ہے؟“

چاچا نے کہا۔ ”فرض یہ ہے کہ منتی مجھ سے جھگڑا نہ کرے۔ ہمارے جھگڑے سے تم پریشان ہو جاتی ہو۔ یہ میرا حصہ مجھے دیدے۔ پھر میں اس سے بات بھی نہیں کروں گا۔“

ماروی نے کہا۔ ”لعنت ہے تمہارے روپے پیسے پر۔ اپنا حصہ لے کر کتنے دن جی لو گے؟“

پھر وہ چاچی سے بولی۔ ”تم بھی ان کاغذ کے ٹکڑوں کو اپنے بدن سے لپیٹ کر رکھتی ہو جیسے وہی تمہارا دین ایمان ہیں۔ جاؤ یہ دو لاکھ لے کر دونوں یہاں سے نکلو۔ چلو جاؤ اور دیکھو یہ کتنے دن تمہارے کام آئیں گے؟“

چاچی منتی نے کہا۔ ”باہر انہیں چھپا نہیں سکوں گی۔ چور بدمعاش دو روپے کے لیے جان لے لیتے ہیں۔ یہ دو لاکھ دیکھتے ہی ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

وہ بولی۔ ”جان رہے یا جائے۔ تم دونوں کو ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ کیونکہ مجھے یہاں سے جانا ہے۔“

”ہم تو تمہارے ہی ساتھ جائیں گے۔ تمہارے ساتھ ہی جئیں گے اور مریں گے۔“

”جو میرے دکھ کو نہیں سمجھتے، میں ان کے ساتھ مٹی میں ملنے کہاں جاؤں گی؟“

منتی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”یہاں تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے، اسے میں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارا دکھ سمجھ رہی ہوں۔ بیٹی! میں بانجھ ہوں۔ میں

نے کوئی اولاد پیدا نہیں کی ہے تو کیا ہوا۔ تمہیں کلیجے سے لگا کر پالا ہے۔ تم میری وہ بیٹی ہو، جس نے میرے اندر ممتا پیدا کی ہے۔“

”تو پھر بتاؤ تمہاری ممتا میرے لیے کیا کر سکتی ہے؟ میری پریشانیاں کیسے دور کرے گی؟“

وہ ماروی کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تمہاری پریشانیاں کیسے دور ہوں گی؟ تمہاری جان تو اُدھر پنجرے میں بند ہے۔ میں ایک نادان عورت کی عقل سے سوچتی تھی کہ تم تمام عمر خوشیاں حاصل کرنے کے لیے جلد ہی محبوب سائیں کو قبول کر لو گی۔ یہ پیار ویار کچھ نہیں ہوتا۔“

وہ ماروی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”تمہارا پیار سلامت رہے۔ میری بچی...! میں غلط سوچ رہی تھی۔ عورت کے دل میں محبت نہ ہو، وفا نہ ہو تو وہ مردوں کے بازار میں بک جانے والی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔“

چاچا نے کہا۔ ”یہ بڈھا سمجھ رہا ہے۔ مراد کے لیے تمہاری محبت اور ضد کو سمجھ رہا ہے۔ اِدھر آؤ بیٹی! میرے پاس بیٹھو۔ یہ بات ابھی میری عقل میں آ رہی ہے کہ میں تمہاری چاچی سے اپنے ایک لاکھ وصول کرنے کے لیے مر رہا ہوں اور تم محبوب سائیں کے لاکھوں اور کروڑوں روپے کو منہ نہیں لگا رہی ہو۔“

ماروی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بولا۔ ”تم درست کہتی ہو۔ ہمارے دو لاکھ دور تک نہیں چلیں گے۔ اس بڑھاپے میں دور تک تم ہی ساتھ رہو گی۔“

”یہ بتاؤ چاچا...! اگر میں اس کوٹھی میں نہیں رہوں گی۔ جگی میں واپس جاؤں گی تو میرے ساتھ کیسے رہو گے؟ میں محبوب سائیں سے ایک پیسا تو کیا ایک تنکا بھی نہیں لوں گی پھر میرے ساتھ کیسے گزارا کرو گے؟“

”اتنی اچھی جگہ چھوڑ کر جگی میں کیوں جاؤ گی؟“

”وہاں کوئی مجھے کسی کی داشتہ نہیں کہے گا۔ میں یہاں بدنام ہو رہی ہوں تو تمہیں اچھا لگ رہا ہے؟“

”نہیں اچھا تو نہیں لگ رہا ہے۔ لیکن تمہارے اور مراد کے مقدر میں یہی لکھا ہے۔ وہ قتل کے جھوٹے الزام میں پھنس گیا ہے اور تم اِدھر جھوٹ موٹ کی بدنامی اٹھا رہی ہو۔“

چاچی منتی نے کہا۔ ”لوگ کتنے دن بدنام کریں گے؟ آخر تھک کر چپ ہو جائیں گے۔“

”چاچی! جو بدنامی پھیل چکی ہوگی وہ کیا ان کے چپ ہونے سے ختم ہو جائے گی۔ مجھ پر تو داشتہ کی مہر لگ چکی ہے۔“

”لگ ہی چکی ہے تو آگے ایک ہی راستہ ہے۔ سائیں سے شادی کر لو۔ ایکدم سے ساری بدنامیاں ختم ہو جائیں گی۔ عزت اور شہرت بھی ملے گی اور دولت بھی۔“

”تم یہ کہہ رہی ہو کہ مراد کو ٹھکرا دوں۔“

”تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”یہ میں جانتی ہوں کہ میری بہتری کس میں ہے۔ یہاں سے کہیں بہت دور جا کر انجانے لوگوں میں رہوں گی تو وہاں کوئی داشتہ جیسی گالی نہیں دے گا۔ مراد کی رہائی تک وہاں رہوں گی۔ وہ آئے گا، میرے سر پر سہاگ کا آنچل رکھے گا تو ساری الجھنیں اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

چاچی نے کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اتنا سکھ آرام چھوڑ کر کہاں جاؤ گی؟ کھانا پینا رہنا سہنا کہاں ہوگا؟ کوئی بھی کچھ وصول کیے بغیر تمہیں ایک وقت کی روٹی نہیں کھلائے گا۔“

”آپ کو عیش و آرام کا چسکا پڑ گیا ہو تو یہ الگ بات ہے۔ ورنہ تنہا اور بے سہارا لڑکیاں عزت آبرو سے جی لیتی ہیں۔ مجھے سلائی کڑھائی کا ہنر آتا ہے۔ میں اپنی زندگی جی لوں گی۔“

”بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ اکیلی جوان لڑکی جنگل میں بھی عزت سے نہیں رہ سکتی۔ وہاں بھی ہوس کے کُتے بُو سونگھتے ہوئے پہنچ ہی جاتے ہیں۔“

”میرے پاس زہر اور چاقو ہوگا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے خودکشی کر لوں گی۔“

چاچا جھمرو نے کہا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟“

”مجھے اس لیے پاگل کہہ رہے ہو کہ تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر جاؤں گی۔ اس کے بعد جانتے ہو کیا ہوگا۔ تمہیں بھی یہاں کوئی رہنے نہیں دے گا۔“

منتی نے کہا۔ ”یہ سچ ہے، یہاں تم ہو تو ہم ہیں۔ تم نہ رہیں تو ہمیں کوئی نہیں پوچھے گا۔“

”پھر کیا کرو گی؟ میں تو پھر وہی غریب ماروی بن جاؤں گی۔ یہ تو اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میرے ساتھ جاؤ گی تو دودھ مکھن کباب پراٹھے کھانے کو نہیں ملیں گے۔“

جھمرو نے عاجزی سے کہا۔ ”کیوں ہمارے منہ سے جنت کی خوراک چھین رہی ہو۔ یہاں سے جانے کی حماقت نہ کرو۔ ہمیں اس بڑھاپے میں پھر سے غریب نہ بناؤ۔“

وہ اٹھ کر جھمرو سے دور ہو کر بولی۔ ”مجھے اپنے پاس اس لیے بٹھایا تھا کہ میں بیٹی نہیں ہوں۔ کمائی کا ذریعہ ہوں۔“

وہ چاچی کو دیکھ کر بولی۔ ”بیٹی ہوتی تو تم کہتیں کہ جہاں جاؤ گی، ماں بھی وہیں سایہ بن کر جائے گی۔ لیکن تم

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں کے منہ سے یہ بات نہیں نکل رہی ہے۔

تمہیں یہی فکر ہے کہ اس جنت سے نکالے جاؤ گے تو پھر سے غریبی کے جہنم میں کیسے رہو گے؟ یہاں رہنے کے لیے میں بہت ضروری ہوں۔ تم دونوں کے دماغوں میں یہی بات پک رہی ہے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ کسی بھی طرح مجھے یہاں پکڑے رہو۔ مجھے یہاں گالی پڑتی ہے تو پڑتی رہے۔"

وہ ان سے ذرا دور ہو کر بولی۔ "بیس تاریخ کو مراد سے ملنے جاؤں گی۔ یہ سُن لو کہ اس کے بعد کسی بھی دن کسی بھی وقت چھپ کر یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

وہ دروازے کی طرف گئی پھر وہاں رک کر بولی۔ "ایک بات اچھی طرح یاد رکھو..... سائیں کو، معروف صاحب کو اور میڈم روزی کو معلوم نہ ہو کہ میں یہ کوٹھی چھوڑ کر جانے والی ہوں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر منتی نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم سائیں کو بتائے بغیر، یہاں سے پھوٹی کوڑی لیے بغیر خالی ہاتھ جاؤ گی؟"

وہ بولی۔ "ہاں۔ اس بڑی کوٹھی میں جو سونے کے زیورات مجھے پہننے کے لیے دیے گئے ہیں۔ وہ بھی چھوڑ کر جاؤں گی۔"

جھمرو نے کہا۔ "تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔ ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ ہماری بات نہیں مانو گی تو سائیں کو بتا دیں گے کہ تم کیسی نادانی کرنے والی ہو۔"

ماروی نے دونوں کو گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔ "سائیں کو بتاؤ گے۔ مجھ سے دشمنی کرو گے؟"

"یہ دشمنی نہیں ہو گی۔ تم سے بھلائی ہو گی۔"

وہ غصہ سے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ "اتنی سی بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ جہاں بدنام ہو رہی ہوں۔ وہاں بھلائی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی نے میرے خلاف سائیں سے چغلی کھائی تو جانتے ہو کیا کروں گی؟"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "جب انہیں معلوم ہو گا تو وہ مجھ پر پہرا بٹھا دیں گے۔ میں نہیں جا سکوں گی۔ تب یہاں رہنے کی ایک شرط پیش کروں گی۔ سائیں سے کہوں گی کہ تم جیسے آستین کے سانپوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔"

"ہائے بیٹی! ہمیں یہاں سے نکلوا دو گی؟"

"سوچ لو سمجھ لو۔ میرے خلاف بولو گے تو اپنے خلاف بھی میرا فیصلہ سنو گے۔ یہاں میں رہوں گی تو دشمنوں کو اپنے ساتھ رہنے نہیں دوں گی۔"

منتی نے کہا۔ "ہم تو دونوں طرف سے مارے جا رہے ہیں۔ تم رہو یا نہ رہو۔ اب ہمارا ٹھکانا یہاں نہیں رہے گا۔ تمہارا ساتھ دے کر بھی یہاں سے نکلنا ہو گا۔"

جھمرو نے کہا۔ "ہم سائیں سے کچھ نہیں بولیں گے۔ اگر انہیں کسی طرح معلوم ہو گا اور وہ تمہیں جانے سے روک دیں گے تب ہمیں الزام نہ دینا۔"

"میں بچپن سے تم دونوں کی رگ رگ کو سمجھتی آئی ہوں۔ اگر میں یہاں سے جا نہ سکی اور مجھے روک لیا گیا تو تم دونوں ہر حال میں یہاں سے نکلو گے۔"

وہ دروازہ کھول کر انہیں ناگواری سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ انہیں پہلی بار خیال آیا کہ جو ماروی کبھی ان کی محتاج تھی۔ آج وہ اس کے محتاج بن کر رہ گئے ہیں۔ اگر وہ کہیں چلی جائے گی تو نہ ان کا ٹھکانا ہو گا نہ گزارے کے لیے دال روٹی ملے گی۔

وہ دو لاکھ روپے خرچ کرتے ہوئے منتی کی جان نکل جاتی تھی اور اگر وہ خرچ کرتی تو وہ کتنے دن چلتے؟ اوّل تو گھر میں ہی چور تھا۔ چاچا جھمرو پر بھروسا نہیں تھا۔ وہ رقم چرا کر بھاگ جاتا یا چور لے جاتے تو بڑھاپا کیسے گزرتا؟"

وہ دونوں پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر پہلی بار ایک دوسرے کے قریب ہو کر بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئے۔ جھمرو نے کہا۔ "کیسا نرم بستر ہے اور کمرے... میں جنت کی ہوا آتی رہتی ہے۔ یہ ہمیں پھر نہیں ملے گا۔"

وہ بولی۔ "کسی کو بھی خوشیاں ہمیشہ کے لیے نہیں ملتیں۔ دکھ مصیبتیں بہت کچھ چھین لیتی ہیں۔ اس بچی کو میں نے بچپن سے پالا ہے۔ کلیجے سے لگا کر رکھا ہے۔ ہم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ وہ حیا والی ہے۔ بے داغ ہے۔ مگر گالیاں کھا رہی ہے۔ اگر گھبرا کر یہاں سے بھاگ رہی ہے تو کیا بُرا کر رہی ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں۔ جہاں پتھر لگتے ہیں وہاں سے بھاگنا ہی پڑتا ہے۔"

"وہ یہاں کبھی نیک نام نہیں رہے گی۔ کہیں عزت سے رہنا چاہتی ہے اور ہم اس کا ساتھ صرف اس لیے نہیں دے رہے ہیں کہ یہ عیش و آرام چھوٹ جائے گا۔"

"وہ نہ رہی۔ تب بھی چھوٹ جائے گا۔"

"ہم عمر کے سوکھے پتے ہیں۔ ہوا اُڑا کر لے جائے گی۔"

"عقل کہتی ہے ہم ماروی کے ہاتھ میں رہیں اور ماروی ہمارے ہاتھوں میں رہے۔ ہاں منتی...! ہم حوصلہ کریں گے تو آندھی بھی ہم تینوں کو اُڑا نہیں سکے گی۔"

منتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی طرف جانے لگی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی، فکر اور پریشانی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جا رہی تھی۔ جھمرو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے ہو گیا۔ اس کمرے کے ساتھ ہی ماروی کا کمرا تھا۔ منتی نے دستک دیے بغیر دروازے کو آہستگی سے کھولا۔ ماروی ایک صوفہ پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر چاچا چاچی کو دیکھا۔ چاچی نے پلٹ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر اس کے سامنے آ کر بولی۔ "تو اکیلی نہیں جائے گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ چاچی نے کہا۔ "تیری ماں تجھے پیدا کرتے ہی مر گئی۔ تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں تجھے چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ تو جہاں جائے گی وہاں تیرے ساتھ رہوں گی۔"

چاچا نے کہا۔ "میں بھی اکیلی جوان بیٹی کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ ہم نے تیرے ساتھ اچھے دن دیکھے ہیں۔ بُرے دن بھی دیکھیں گے مگر ساتھ مل کے دیکھیں گے۔"

ماروی نے خوش ہو کر دونوں بوڑھوں کو دیکھا۔ منتی نے جھمرو سے کہا۔ "تم اُدھر دروازے کی طرف منہ کرو۔"

اس نے پوچھا۔ "منہ اُدھر کیوں کروں؟"

"بس تھوڑی دیر کے لیے جو کہتی ہوں، وہ کرو۔"

اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ منتی نے کہا۔ "خبردار! بے شرمی نہ کرنا۔ ادھر نہ دیکھنا۔"

جھمرو نے ایک گہری سانس لے کر سر ہلا کر کہا۔ "میں سمجھ گیا تو کیا کر رہی ہے۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ لباس کی سرسراہٹ سنائی دی تھی۔ پھر منتی نے کہا۔ "اِدھر منہ کر لے۔"

وہ ادھر گھوم گیا۔ منتی کپڑے کے سلائی کیے ہوئے بیلٹ سے دو لاکھ روپے نکال کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "یہ ابھی کام نہ آئے تو کب کام آئیں گے۔ ہم یہاں سے نکل کر بھوکے اور بے آسرا نہیں رہیں گے۔ کہیں بہت دور جا کر اپنا ٹھکانا بنا لیں گے۔"

ماروی نے چاچی کے گلے لگ کر کہا۔ "آج مجھے ماں باپ کا سچا پیار مل رہا ہے۔"

جھمرو نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ چاچی سے الگ ہو کر اپنی الماری کے پاس آئی پھر اسے کھول کر بڑا سا پیکٹ نکالا۔ وہ دونوں اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے قریب آ کر پیکٹ کو کھول کر نوٹوں کی گڈیاں بیڈ پر پھینک دیں۔

وہاں پہلے ہی چاچی کے دو لاکھ تھے۔ بیڈ کی وسیع سطح پر نوٹ ہی نوٹ بکھر گئے۔ اس دنیا کا سب سے موثر اور محافظ ہتھیار ان کے سامنے تھا۔ وہ تینوں عزت سے ایک نئی زندگی گزار سکتے تھے اور مراد کی رہائی تک مخالف حالات سے طویل جنگ لڑ سکتے تھے۔ وہ بھرپور اعتماد اور حوصلوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

☆☆☆

شکاری گھات میں بیٹھے تھے۔

کتنے ہی موبائل فون کی رنگ ٹونز کتنی ہی کمین گاہوں میں چیخ رہی تھیں اور کانوں میں رازدارانہ گوشیاں کر رہی تھیں۔

"ہیلو۔ میں نے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ اس کوٹھی میں ایک وقت پر دو مسلح گارڈز ہوتے ہیں۔"

"پھر تو ٹارگٹ آسان ہے۔ آدھی رات کے بعد گارڈز اونگھنے لگتے ہیں۔ انہیں گولی مار کر اسے اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"ٹارگٹ آسان نہیں ہے۔ کوٹھی کے آگے پیچھے غنڈے پہریدار ہیں۔ یہ ہم نے سیکیورٹی کا نیا طریقہ دیکھا ہے۔ چانڈیو نے چوروں اور بدمعاشوں کو جان و مال کا رکھوالا بنایا ہے۔"

"ہم ناکام ہونے والی کوئی بات نہیں سنیں گے۔"

"ہم ناکام نہیں رہیں گے۔ وہ کوٹھی سے باہر نکلے گی تو پھر واپس نہیں جا سکے گی۔"

"پتا نہیں وہ کب کوٹھی سے نکلے گی۔ وڈیرا اس کے لیے پھڑپھڑا رہا ہے۔"

"اسسٹنٹ جیلر سے معلوم ہوا ہے کہ وہ بیس تاریخ کو گھر سے نکلے گی اور اپنے یار سے ملنے جیل جائے گی۔ اسی دن ہمیں جو کرنا ہے، کر گزریں گے۔"

"اس روز چانڈیو اسے اپنی گاڑی میں لے جائے گا۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے پاس گن رکھتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں کاؤنٹر فائرنگ میں ہمارے آدمی جائیں گے تو چانڈیو بھی جائے گا۔ چڑیا کو ہم لے آئیں گے۔"

"اسے آج کل میں اٹھاؤ۔ زیادہ دن نہ لگاؤ۔ ہاں اگر موقع نہ ملے تب بیس تاریخ کا انتظار کرو۔"

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پلاننگ کر رہے ہیں کہ اسے کوٹھی سے باہر آنے پر کیسے مجبور کیا جا سکتا ہے... او کے۔ میں کل صبح رپورٹ دوں گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ ببلو شاہ نے فون کو قریب ہی صوفہ پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھینک کر بھرا ہوا جام اٹھالیا۔ پھر اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کھڑکی کے پار سمندر کو دیکھا۔ رات کی تاریکی میں ساحل روشن تھا۔ اسپاٹ لائٹس کی روشنی میں اچھلتی اور مچلتی ہوئی لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہاں ہر رات عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کا میلا لگا رہتا تھا۔

وہ گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ ان لمحات میں ماروی شراب سے بھرا ہوا جام دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے اندر نشے کی طرح سُلگ رہی تھی۔ اس نے دو چار گھونٹ پیئے پھر جام کو چومتے ہوئے کہا "آ... میں تجھے چوم لوں۔ تو نے تو یہاں سے اسلام آباد تک ہلچل مچادی ہے۔"

وہ پھر اسے چوم کر بولا۔ "تجھ میں ضرور کوئی بات ہے۔ تب ہی تو تیری دھوم مچی ہے۔ سنا ہے غریب ہے مگر آتش بدن ہے۔ تب ہی تو ماہتابی کی طرح زمین سے چھوٹ کر چانڈیو کے فلک تک پہنچی ہے۔"

اس نے اور دو گھونٹ پیئے۔ "کچھ تو جادو ہے اس میں۔ تب ہی چانڈیو نے اس کے لیے کوٹھی خریدی ہے۔ لاکھوں لٹا رہا ہے۔"

اس نے غٹاغٹ پی کر خالی جام کو میز پر پٹخ کر کہا۔ "ارے تو کیا ہم گئے گزرے ہیں۔ مجھے مڈل مین کہتے ہیں۔ میں بڑے بڑے سیاستدانوں کے درمیان رہ کر ان کی ٹوپیاں گھماتا رہتا ہوں۔ ایک لڑکی کو گھمانا کون سی بڑی بات ہے؟"

اس نے فون کو اٹھا کر نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگایا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ "اے سنو! اسے اٹھا کر وڈیرے کی حویلی میں نہ لے جانا۔ وہاں اس کا دیوانہ چانڈیو پولیس فورس کے ساتھ پہنچ جائے گا۔ اسے پہلے میرے اڈے میں لاؤ گے۔"

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ "شاہ صاحب! آپ کسے اُٹھانے کی بات کر رہے ہیں؟ میں نجومی بابا بول رہا ہوں۔"

اس نے نشے میں جھومتے ہوئے فون کو دیکھا پھر کہا۔ "اوسوری! غلطی سے آپ کا نمبر پنچ ہوگیا۔"

بابا نے کہا۔ "جناب عالی...! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمائیں۔ یہ ناچیز حاضر ہے۔"

"آں۔ ہاں اچھا ہوا آپ سے رابطہ ہوگیا۔ آپ ستاروں کی چال دیکھیں اور بتائیں وہ گھر سے کب نکلے گی۔"

"کون...؟"

"اور کون؟ وہی شعلہ جوالہ شیطان کی خالہ جو شیطان کی طرح دل میں اچھل رہی ہے۔"

"شاہ صاحب! اس کا کوئی نام تو ہوگا۔ آپ اس کا اور اس کی ماں کا نام بتائیں۔ میں زائچہ دیکھ کر بہت کچھ بتا سکوں گا۔"

"اس کا نام ماروی ہے۔ باقی رہا ماں کا نام تو یہ اس کے باپ کو معلوم ہوگا۔"

وہ ایک اور جام بنانے لگا۔ بابا نے کہا۔ "پھر تو میں زائچہ نہیں بنا سکوں گا۔ ویسے ماروی کا نام ہی بتا دیتا ہے کہ اس کے ساتھ خوش نصیبی اور بدنصیبی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"

وہ ایک گھونٹ پی کر بولا۔ "آگے بولیں۔"

"ایسی نام والی پیار کے معاملے میں مالا مال ہوتی ہے۔ اسے یار بھی چاہتا ہے اور رقیب بھی اس کا دیوانہ ہوتا ہے۔"

"اور بدنصیبی کیا ہے؟"

"بدنصیبی یہ ہے کہ یار سے جدا کر دی جاتی ہے اور رقیب کے شکنجے میں رہتی ہے۔"

وہ غٹاغٹ پینے کے بعد بولا۔ "کام کی بات کرو۔ یہ بتاؤ، ہمارے شکنجے میں کب آئے گی؟"

"میں کیا جانوں وہ ماروی کون ہے۔ اگر سامنے ہو تو اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کچھ بول سکوں گا۔"

"اچھا تو انتظار کرو۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ میں وہ ہاتھ آپ کو پڑھنے دوں گا۔"

پھر وہ بولا۔ "ہت تیری کی۔ میرا مغز پھر گیا ہے۔ جب وہ ہاتھ آ ہی جائے گی تو پھر کیا معلوم کرنا رہ جائے گا۔ میں اس کا ہاتھ اس بڈھے نجومی کے ہاتھ میں کیوں دوں گا؟"

وہ بوتل کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھے چڑھ گئی ہے؟"

رنگ ٹون چیخنے لگی۔ اس نے فون اُٹھا کر بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ "ہاں۔ بولو کون ہے؟"

"میں صمدو بول رہا ہوں۔"

"ہاں۔ بولو۔"

"ابھی معلوم ہوا ہے اور یہ پکی خبر ہے، وہ آج سے ٹھیک تیسرے دن گھر سے نکلے گی۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ہمارے ایک انفارمر نے بتایا ہے۔ وہ اندر کی بات نکال لاتا ہے۔ اس کی اطلاع کبھی غلط نہیں ہوتی۔"

وہ نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ "ٹھیک

ہے اسے اُٹھاؤ اور میرے پاس پہنچاؤ۔"

صمدو فون بند کر کے بڑبڑانے لگا۔ "کیا مصیبت ہے؟ ایک انار ہے۔ اسے کتنے بیماروں کے پاس پہنچایا جائے...؟"

وہ حکم کا بندہ اُلجھ گیا تھا۔ کئی شکاری گھات میں تھے۔ سب ہی اسے فون پر حکم دیتے رہے تھے۔ وڈیرا حشمت جلالی اسے اپنی حویلی میں طلب کر رہا تھا۔ ببلو شاہ نے بھی اس کی فرمائش کی تھی۔ اور تو اور پارٹی کے چیئرمین نے کہا تھا کہ اسے اسلام آباد پہنچایا جائے۔

اور یہ اطلاع واقعی درست تھی۔ ماروی دو دنوں کے بعد چاچا اور چاچی کے ساتھ گھر سے نکلنے والی تھی۔

اور یہ بات حیران کن تھی کہ اندر کی بات دشمنوں تک کیسے پہنچ گئی تھی؟

☆☆☆

وڈیرے حشمت جلالی کی زوجہ کا نام رابعہ خاتون تھا۔ وہ عرف عام میں ربیعہ کہلاتی تھی۔ وہ ایک وڈیرے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس نے بچپن سے وڈیرا شاہی کے شاہانہ تماشے دیکھے تھے۔ حشمت جلالی کی زوجہ بن کر آئی تو میکے سے یہ سیکھ کر آئی کہ وڈیرے شوہر کی کس طرح ہاں میں ہاں ملانا ہے اور اس سے یہ منواتے رہنا ہے کہ وہ بلا سے حسین عورتوں کو داشتائیں بناتا رہے۔ لیکن کسی کو اس کی سوکن نہ بنائے۔

پھر یہ کہ رابعہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اپنے باپ کی تمام جائداد لے کر آئی تھی۔ اس لیے حشمت جلالی کی قدر اس کے دباؤ میں رہتا تھا۔ اب تک بڑی شرافت سے یہ شرط مانتا آرہا تھا کہ اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس پر سوکن نہیں لایا تھا۔

رابعہ نے دو بیٹوں برکت جلالی اور رحمت جلالی کو اور ایک بیٹی زلیخا کو جنم دیا تھا۔ جب وہ جوان ہوئے تو یہ انکشاف ہوا کہ بیٹے باپ کی طرح عیاش اور خود غرض تھا۔ بہن کو تمام دولت اور جائداد سے محروم کرنے کے لیے اس کی شادی قرآن سے کرنا چاہتے ہیں۔

رابعہ نے پہلی بار اعتراض کیا۔ "میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں تم باپ بیٹوں کے معاملات میں کبھی کچھ نہیں کہوں گی لیکن یہ میری بچی کی پوری زندگی کا سوال ہے۔ اسے اپنی فطری تقاضوں کے مطابق ازدواجی گھریلو مسرتیں حاصل کرنے دو۔"

بیٹوں نے کہا۔ "قرآن پڑھتے رہنے سے اور دن رات قرآن کے ساتھ رہنے سے زیادہ روحانی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم اپنی بہن کی بہتری چاہتے ہیں۔"

"تم لوگ قرآن کا ایک لفظ نہیں پڑھ سکتے۔ یہ نہیں جانتے کہ تمہاری فلاح اور بہبود کی کیسی اچھی اچھی باتیں سمجھائی گئی ہیں پھر بھلا بہن کی فلاح کیا چاہو گے؟ میں صاف کہہ دیتی ہوں، اپنی زلیخا کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی۔"

حشمت جلالی نے اسے تنہائی میں سمجھایا۔ "اری نیک بخت! ہماری بات مان لے۔ زلیخا میری اور تیری لاکھوں کی زمینیں جہیز میں لے جائے گی۔"

"میں بھی سات کروڑ کی زمین لے کر آئی تھی۔"

"اس لیے آگئی کہ تیرا کوئی بھائی نہیں تھا۔ باپ کی تمام جائداد تیرے نام ہوگئی تھی۔ یہاں زلیخا کے دو بھائی ہیں۔ وہ اسے ایک تنکا بھی یہاں سے لے جانے نہیں دیں گے اور میں بھی اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ کسی غیر کو بیٹی بھی دوں اور زمینیں بھی دوں۔"

وہ بولی۔ "آپ نہ دیں۔ میں اپنی زمینیں دوں گی۔"

"ہم تجھے ایسی غلطی کرنے نہیں دیں گے۔"

"آپ کیسے باپ ہیں؟ آپ کے دل میں بیٹی کو دلہن بنانے اور اس کا گھر بسانے کے ارمان کیوں نہیں ہیں؟"

"ہم تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہیں۔ ہمارے دل میں گھاٹے کا سودا کرنے والے ارمان پیدا نہیں ہوتے۔"

"کیا آپ نہیں جانتے کہ لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے تو وہ بہک جاتی ہیں؟ گناہ کی طرف مائل ہوجاتی ہیں؟"

"ایسی لڑکیاں حرام موت ماری جاتی ہیں۔ خود سمجھو اور بیٹی کو سمجھاؤ۔ ورنہ کاروکاری کے الزام میں ماری جائے گی۔"

اس دھمکی نے اثر کیا۔ ماں بیٹی کو اپنی زمینیں دیتی تب بھی باپ بیٹے کاروکاری کے مجرمانہ دستور پر ضرور عمل کرتے۔ حویلی کی عورتیں کئی طرح سے مجبور ہوتی ہیں۔ اپنے مردوں کو من مانی کرنے سے روک نہیں پاتیں۔

زلیخا کو جاہلانہ دستور کے مطابق شادی اور ازدواجی زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ نتیجہ وہی ہوا کہ وہ بہک گئی۔ مراد کو بھی بہکنے پر مجبور کر دیا۔

ماں نے سمجھایا۔ "یہ گناہ ہے۔ کسی دن پکڑی جاؤ گی۔ مراد کے ساتھ بھاگ جاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ کہیں جا کر اس کی منکوحہ بن کر عزت سے زندگی گزارو۔"

زلیخا نے بڑی مایوسی سے کہا۔ "میں بہت بدنصیب

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں۔ اس کی نظروں میں میری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ ایک غریب یتیم لڑکی ماروی کا دیوانہ ہے۔"

وہ دیوانہ دوسرے ہی دن اسے چھوڑ کر گوٹھ سے بھاگ گیا تھا۔ زلیخا پاگل ہوگئی تھی۔ ایک مرد کی قربت پاکر محروم ہونے کے باعث کسی قدر ہسٹیریا کی مریضہ بن گئی تھی۔ ماں نے پریشان ہو کر حشمت جلالی سے کہا۔ "خدا کے لیے باپ کے دل سے سوچیں۔ بیٹی کی بیماری کو سمجھیں۔ اسے پیار سے دلہن بنا کر رخصت کردیں۔ یہ آپ کی جائداد سے ایک تنکا نہیں لے جائے گی۔"

وہ بولا۔ "ہم جانتے ہیں تم نے بیٹی کے لیے میکے میں بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ ہم اس کا مطالبہ تو نہیں کرسکتے لیکن یہ یقین ہے کہ تمہاری وفات کے بعد وہ خفیہ دولت بھی ہمارے بیٹوں کو ہی ملے گی۔ وہ کسی غیر کی جھولی میں نہیں جائے گی۔"

باپ کے اور بھائیوں کے دلوں میں زلیخا کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے والا نہیں تھا۔ ان کے مزاج اور ان کے تیور دیکھ کر یہ شبہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی دن اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیں گے۔

ماں نے گھبرا کر کہا۔ "بیٹی تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کسی کو سہارا بنا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں۔ تمہیں کچھ ہوا تو میں صدمہ سے مرجاؤں گی۔"

وہ تنہا کہاں جائے؟

اتنی بڑی دنیا چھوٹی لگ رہی تھی۔ خوف تھا کہ جہاں جائے گی پکڑی جائے گی۔ پھر ایک رازدار ملازمہ کے ذریعہ جمال نامی ایک جوان سے رابطہ ہوگیا۔ اس نے دلیری سے کہا۔ "میں کسی وڈیرے سے نہیں ڈرتا۔ زلیخا کو یہاں سے بلوچستان لے جاؤں گا۔ ہمارے پاس بڑی رقم ہوگی تو ہم دبئی یا سعودی عرب چلے جائیں گے۔"

وہ جوان بہت بڑا سہارا بن گیا۔ زلیخا کے پاس لاکھوں روپے کے زیورات تھے۔ ماں نے بھی اسے سونا اور نقد روپے دیے۔ ایسے ہی وقت یہ انکشاف ہوا کہ زلیخا ماں بننے والی ہے۔ ماں نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔ "ہائے میری بچی! کیسے وقت مجھ سے بچھڑ رہی ہے۔ ان دنوں میں مائیں اپنی بیٹیوں کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی ہیں۔ پتا نہیں تم یہاں سے جا کر کہاں کہاں بھٹکتی رہو گی۔"

وہ ماں بیٹی بچھڑتے وقت گلے لگ کر روتی رہیں۔ دوسری صبح حویلی کی ایک بڑھیا نے حشمت جلالی کے کان میں یہ بات پھونکی کہ وہ نانا بننے والا ہے۔ اس کے منہ پر جیسے جوتا پڑا تھا۔ وہ غصہ سے اچھل پڑا۔ پاؤں پٹختا ہوا بیوی کے پاس آیا۔ گرجتے ہوئے بولا۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ زلیخا کہاں ہے؟"

اس نے پوچھا۔ "آپ اس طرح کیوں گرج رہے ہیں؟"

"ہماری بات کا جواب دو۔ کیا اس نے منہ کالا کیا ہے؟"

"وہ تو میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا۔ لڑکیوں کی شادی نہ کی جائے تو وہ بہک جاتی ہیں۔ گناہ کی طرف مائل ہوجاتی ہیں۔"

"وہ تمہاری شہہ کے بغیر گناہ گار بن ہی نہیں سکتی تھی۔"

"میں خدا سے ڈرتی ہوں۔ بیٹی کو میں نے نہیں، آپ نے گناہ کے راستے پر پہنچایا ہے۔ لیکن آپ نے نہ کبھی کوئی غلطی مانی ہے۔ نہ بیٹی کے معاملے میں اس سچائی کو تسلیم کریں گے۔"

وہ رائفل کی نال اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری سچائی ایک گولی میں دم توڑ دے گی۔"

وہ بے باکی سے بولی۔ "آپ جانتے ہیں مجھے قتل کرنے کے بعد کیا ہوگا؟"

حشمت جلالی نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس کا مرحوم سسر یعنی رابعہ کا باپ یہ وصیت لکھ کر گیا تھا کہ تمام جائداد اس کی بیٹی رابعہ خاتون کی نگرانی میں رہے گی۔ اس کی موت کے بعد وہ جائداد اس کے بچوں میں منصفانہ تقسیم کی جائے گی اور اگر رابعہ خاتون غیر طبعی موت مرے گی یا اسے کوئی بھی قتل کرے گا یا وہ کسی حادثہ کے نتیجے میں وفات پائے گی تو اس کی تمام جائداد محکمۂ اوقاف میں منتقل کردی جائے گی۔ جائداد میں سے ایک تنکا بھی نہ حشمت جلالی کو ملے گا نہ ہی اس کی بیٹوں کو ملے گا۔

اس نے رائفل کی نال کو جھکاتے ہوئے کہا۔ "تم اتنی قدرتی موت تک جیو گی۔ مگر زلیخا مرے گی۔"

وہ وہاں سے پاؤں پٹختا ہوا زلیخا کے کمرے کی طرف جانے لگا۔ رابعہ نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟ وہ نہیں ہے۔"

وہ گرجتا ہوا اس کے کمرے میں آیا۔ "کیسے نہیں ہے؟ یہاں سے کہاں جائے گی؟ اب تو یہاں سے سیدھا قبرستان جائے گی۔"

اس نے کمرے میں آکر ہر طرف دیکھا۔ بیٹی نہیں تھی۔ رابعہ نے آکر کہا۔ "کوئی ضروری نہیں ہے کہ بندوق میں گولی ہو تو وہ چل ہی پڑے۔ خدا نے ہم ماں بیٹی کو سزا دی

دی ہے۔آپ مجھے نہیں مار سکیں گے۔میری طبعی موت کا انتظار کریں گے اور بیٹی کے لیے ہوا میں گولی چلائیں گے کیونکہ وہ سامنے نہیں ہے۔"

اس نے غصّے سے پاؤں پٹخ کر حلق پھاڑ کر پوچھا۔"کہاں ہے وہ؟ کیا یہ سچ ہے کہ اس نے منہ کالا کیا ہے اور وہ ماں بننے والی ہے؟ ہم شرم سے مر جائیں گے۔اس سے پہلے اسے اتنی گولیاں ماریں گے کہ اسے چھلنی کر کے رکھ دیں گے۔"

وہ اور اس کے دونوں بیٹے اپنے حواریوں کے ساتھ اسے ڈھونڈنے نکل گئے پھر ناکام ہو گئے اسے نہ پا سکے تو جلالی نے کہا۔"ربیعہ! ہمیں اپنی عزت رکھنی ہے۔گوٹھ والوں کو اور پولیس والوں کو زلیخا کی لاش دکھانی ہوگی۔یہ ثابت کرنا ہوگا کہ زلیخا مراد کے یا جمال کے فریب میں آ گئی تھی۔ان میں سے کسی نے اسے کھیت میں لے جا کر ہلاک کیا ہے۔تیزاب سے اس کی صورت بگاڑی ہے پھر اسے قتل کر کے لاکھوں کے زیورات لے گیا ہے۔"

وہ بے پروائی سے بولی۔"آپ کو جو کرنا ہے کریں۔میری بیٹی اب آپ کے ہاتھ نہیں آئے گی۔"

"تم پولیس کو بیان دو گی کہ کھیت میں جس کی لاش پائی گئی ہے۔وہ ہماری بیٹی زلیخا ہی ہے۔"

"ایک شرط پر بیان دوں گی۔آپ مراد علی پر قتل کا الزام لگائیں گے۔"

"اس نے نمک حرامی کی ہے۔الزام اسی پر آئے گا۔ہم اسی کو گرفتار کرائیں گے۔"

رابعہ کو مراد سے سخت نفرت تھی۔کیونکہ اس نے اس کی بیٹی کو ٹھکرا کر ایک غریب ماروی کو ترجیح دی تھی۔حویلی والوں کی انا اور غرور کو ٹھیس پہنچائی تھی۔زلیخا کو ہسٹیریا کے مرض میں مبتلا کر دیا تھا۔وہ جمال کی احسان مند تھی اگر محبت سے سہارا نہ دیتا تو وہ دماغی مریضہ بن کر رہ جاتی۔

اگر مراد جلالی گوٹھ میں رہتا تو وہ حویلی کی مالکہ اس کا جینا محال کر دیتی۔حویلی کے ٹکڑے ملازم اس کی ایسی پٹائی کرتے کہ اسے اپاہج بنا کر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیتے۔

اس نے گوٹھ سے فرار ہو کر جان بچائی تھی۔رابعہ خاتون کے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔چونکہ پکڑ میں آنے والا نہیں تھا۔لہٰذا اس پر قتل کا جھوٹا الزام لگا کر اپنی توہین کا بدلہ لیا جا سکتا تھا۔

پھر جس روز رابعہ خاتون کو معلوم ہوا کہ مراد قتل کے الزام میں آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا ہے تو وہ خوشی سے رو پڑی۔اس کی بیٹی کو ٹھکرانے والا قانون کی ٹھوکریں کھا کر پھانسی پانے والا تھا۔

رابعہ خاتون کو اس لیے بھی رونا آیا کہ بیٹی اب دنیا میں نہیں رہی تھی۔داماد نے اسے فون کے ذریعہ اطلاع دی تھی کہ زلیخا دوسری بار زچگی کے کیس میں وفات پا چکی ہے۔

اسے بیٹی کی موت کا صدمہ تھا اور مراد کو سزائے موت تک پہنچانے کی خوشی تھی۔اس نے بہت سوچ سمجھ کر حشمت جلالی اور بیٹوں سے یہ بات چھپائی کہ زلیخا اب اس دنیا میں نہیں رہی ہے اور اب ان کے اندیشے دور ہو گئے ہیں۔

وہ باپ اور بھائی بھی زلیخا کے بدترین دشمن تھے۔رابعہ کو بھی ان سے نفرت تھی۔وہ چاہتی تھی کہ تینوں باپ بیٹے ہمیشہ اس اندیشے میں مبتلا رہیں۔یہ خوف طاری رہے کہ زلیخا کسی دن بھی واپس آ سکتی ہے۔اپنی زندگی کا ثبوت دے کر قتل کے مقدمے کو ان تینوں کے خلاف پلٹ سکتی ہے۔

اپنی بیٹی کے سلسلے میں رابعہ خاتون کے اور بھی جذباتی معاملات تھے۔داماد نے پہلے سال بتایا تھا کہ زلیخا نے مراد کے بیٹے کو جنم دیا ہے۔بیٹی بھی ماں سے فون پر کبھی کبھی باتیں کرتی تھی۔جب وہ باپ بیٹے حویلی میں نہیں ہوتے تھے تب رابعہ خاتون چھت پر جا کر فون کے ذریعہ بیٹی اور داماد سے باتیں کیا کرتی تھی۔

ایک دن بیٹی نے کہا۔"امی! جمال ابھی نہیں ہیں۔میں اکیلی ہوں۔آپ سے اپنے دل کی بات کہنا چاہتی ہوں۔"

ماں نے کہا۔"ہاں بولو۔کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔"مراد میری زندگی کا پہلا مرد ہے۔میں اسے کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔"

ماں نے کہا۔"میں عورت ہوں۔تمہارے ان جذبات کو سمجھ سکتی ہوں۔لیکن بیٹی! یہ نہ بھولو کہ اس نے ماروی کو تم پر ترجیح دے کر تمہاری توہین کی ہے۔"

"امی آپ دوسرے پہلو سے سوچیں۔اس نے توہین نہیں کی تھی۔وہ خود کو اور مجھ کو گناہ سے باز رکھنا چاہتا تھا۔اس وقت تو مجھے بھی غصہ آیا تھا۔میں جذبات میں اندھی ہو رہی تھی۔اب سوچتی ہوں کہ وہ درست تھا۔میں غلط تھی۔"

"ماں کی جان! تم پتا نہیں کیوں جذباتی ہو کر اس کے حق میں سوچ رہی ہو؟ وہ پتا نہیں گوٹھ چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے۔کسی نہ کسی دن تو ضرور تمہارے قتل کے الزام میں پکڑا جائے گا۔"

"یہ کیسی بات ہے کہ میں زندہ ہوں اور میرے باپ اور بھائیوں نے اسے میرا قاتل بنا دیا ہے اور آپ ان کا ساتھ دے رہی ہیں۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔"امی! میں اس وقت مراد کے بیٹے کو دودھ پلا رہی ہوں۔میرے اندر سے اس بچے کے لیے ایسی ممتا پھوٹ رہی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔"

ماں نے کہا۔"ہاں یہ عورت کی ممتا بھری کمزوری ہے۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں جمال سے محبت نہیں کرتی ہوں۔میں تو مرتے دم تک اس سے محبت بھی کرتی رہوں گی اور اس کی عزت بھی کرتی رہوں گی۔"

"ہاں بیٹی! جو تمہیں اس جہنم سے نکال کر لے گیا ہے۔وہی افضل، برتر اور قابل قدر ہے۔تم خوامخواہ جذباتی انداز میں مراد کو اہمیت نہ دو۔میدان چھوڑ کر بھاگنے والے قابل نفرت ہوتے ہیں۔تم اس کے لیے زیادہ جذباتی نہ بنو۔"

جب بیٹی سے رابطہ ختم ہوا تو رابعہ نے سوچا۔"میری بیٹی کے سینے میں پیار کرنے والا دل ہے۔جو اس سے منہ پھیر کر چلا گیا ہے اس سے بھی محبت کر رہی ہے۔نادان ہے۔"

چار ماہ بعد معلوم ہوا پھر اس کے پاؤں بھاری ہو گئے۔اس بار وہ جمال کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔اس وقت اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔زچگی کا وقت قریب آیا تو ڈاکٹروں نے کہا۔"ماں اور بچہ دونوں ہی کمزور ہیں۔میجر آپریشن کے ذریعہ ڈیلیوری ہو سکے گی۔"

زلیخا نے آپریشن سے پہلے فون پر کہا۔"امی! خدا حافظ۔مجھے آپریشن کے لیے لے جا رہے ہیں۔مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچوں کا کیا ہوگا؟"

ماں نے تڑپ کر کہا۔"اللہ نے چاہا تو آپریشن کامیاب رہے گا۔تم گھبراؤ نہیں۔دو چار گھنٹوں کے بعد تم دوسرے بچے کی خوشخبری سناؤ گی۔"

وہ نقاہت سے بولی۔"جب وقت آ جاتا ہے تو ماں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔میں چاہتی ہوں۔کسی طرح میرے بچے آپ کی گود میں پہنچ جائیں۔وہاں دشمن نہ ہوں اور وہ نانی کی پیار بھری سرپرستی میں پرورش پائیں۔کیا ایسا ہو سکے گا؟"

"اللہ تعالیٰ چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔میں دعائیں مانگتی رہوں گی کہ اللہ تمہیں سلامتی اور نئی زندگی عطا کرے۔بچے تمہاری ہی ممتا کی چھاؤں میں پرورش پاتے رہیں گے۔"

ماں اور بیٹی کے درمیان مختصر سی جذباتی گفتگو ہوتی رہی پھر وہ آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔اس نے درست کہا تھا کہ جب وقت آ جاتا ہے تو ماں کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔دو گھنٹے بعد ہی داماد نے فون پر بھاری دل سے اطلاع دی کہ زلیخا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔زچہ اور بچہ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔...

ایک ماں کے دل کو ٹکڑے کر دینے والی خبر ملی تھی۔وہ حویلی کی چھت پر بیٹھی بڑی دیر تک روتی رہی۔کوئی اس کے دکھ کو نہیں جان سکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے غم میں شریک کر سکتی تھی۔

شوہر کو اور بیٹوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے چھت پر آ کر پوچھا۔"یہاں بیٹھی کیوں رو رہی ہو؟"

وہ منہ ڈھانپ کر بلک بلک کر روتے ہوئے بولی۔"بیٹی یاد آ رہی ہے۔نہ وہ تمہیں کبھی یاد آئے گی۔نہ کبھی میری ممتا کو سمجھ سکو گے۔ہائے میرے بچی! تیرے ساتھ جو ہوا ہے، وہ کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ ہو۔"

وہ بین کرنے کے انداز میں بول رہی تھی۔اس نے دشمنوں کو یہ نہیں بتایا کہ وہ مر چکی ہے۔

حشمت جلالی نے کہا۔"وہ ہمارے خاندان کی عزت پر کیچڑ اچھال کر گئی ہے۔ہمارا سر جھکا کر گئی ہے۔کہیں سکون سے نہیں رہ سکے گی۔میں تو کہتا ہوں، حرام موت مر چکی ہوگی۔"

وہ ماں بننے کا اعزاز حاصل کر کے اس دنیا سے گئی تھی۔رابعہ نے تڑپ کر کہا۔"میری بچی عزت سے جیئے گی۔موت آئے گی تو عزت سے مرے گی اور ایک دن یہاں ضرور آئے گی۔"

"بکواس مت کرو۔یہ لکھ لو کہ آئے گی تو ہم اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

"اور اگر نہ مار سکے۔اگر اسے قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا تو آپ کیا کریں گے؟"

بڑے بیٹے برکت جلالی نے کہا۔"وہ مر چکی ہے۔ہمارے سر پر بس اندیشوں کی تلوار لٹک رہی ہے۔وہ نہیں آئے گی۔"

دوسرے بیٹے رحمت جلالی نے کہا۔"وہ بہن نہیں ہے۔ہماری نیندیں حرام کر کے گئی ہے۔میں تو دعا مانگتا ہوں کہ کل آنے والی آج آ جائے پھر وہ اپنا کل نہیں دیکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سکے گی۔"

وہ تینوں اسے کوستے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ ماں کے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ ابھی اس کی موت کی اطلاع ملی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ ایسے میں باپ اور بھائی اس کی ممتا کو پتھر مارتے ہوئے گئے تھے۔

ایسے میں ایک ماں کے اندر یہ انتقامی سوچ پک رہی تھی کہ بیٹی کے ان دشمنوں کو سکون سے رہنے نہیں دے گی۔

☆☆☆

وہ تینوں باپ بیٹے شہر میں تھے۔ ان کے مخبر نے اطلاع دی تھی کہ ماروی اپنی ایک سہیلی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے میمن گوٹھ جانے والی ہے اور ببلو شاہ نے اپنے غنڈے اس کے پیچھے لگا دیے ہیں۔

حشمت جلالی نے بھی پارٹی کے ان غنڈوں کو خریدا تھا جو ببلو شاہ اور چیئرمین بابر بشیر کے بھی وفادار تھے۔ وہ تمام واردات کرنے والے ایک ہی تھے۔ لیکن حشمت جلالی، بابر بشیر اور ببلو شاہ اپنے اپنے مقاصد کے لیے اپنے طور پر ان سے کام لینا چاہتے تھے۔

بہ ظاہر یہ سوال تھا کہ ماروی کو کہاں پہنچایا جائے گا۔ در پردہ یہ حقیقت تھی کہ سب ہی غنڈے بنیادی طور پر پارٹی کے چیئرمین بابر بشیر کے وفادار تھے اور اس کے حکم کے مطابق ماروی کو دیکھتے ہی، پہچانتے ہی گولی مارنے والے تھے۔

رابعہ خاتون نے گوٹھ سے فون کیا تھا کہ وہ پھر پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ یہ تکلیف کئی مہینوں سے تھی۔ گاؤں کا ڈاکٹر دوائیں دیتا تھا۔ اسے عارضی طور پر آرام آتا تھا۔ بیماری تھی کہ جاتی نہیں تھی۔ کیونکہ گاؤں کا ڈاکٹر اناڑی تھا۔ اس کی بیماری کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

اس نے فون پر کہا۔ "بہت ہو چکا، میں چھوٹے ڈاکٹروں سے علاج نہیں کراؤں گی۔ کراچی کے بڑے ڈاکٹروں سے اپنا علاج خود ہی کراؤں گی۔"

حشمت نے کہا۔ "ابھی ہم ضروری معاملات میں مصروف ہیں۔ تمہیں اگلے ماہ یہاں لے کر آئیں گے تب..."

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "میں آج بیمار ہوں اور علاج ایک ماہ بعد کرائیں گے یعنی انتظار کریں گے کہ میں بیمار رہ کر مر جاؤں اور آپ باپ بیٹوں پر الزام نہ آئے۔ میں آج رات تک وہاں آ رہی ہوں۔ آپ سے اور اپنے بیٹوں سے ایک ضروری بات کہوں گی۔"

وہ اسی رات اپنے ایک چچا زاد بھائی عظمت کے ساتھ آ گئی۔ اسے جب سے زلیخا کی موت خبر ملی تھی۔ تب سے شوہر اور بیٹوں سے زیادہ نفرت ہو گئی تھی۔ بیٹوں نے بہن کو در بدر کر کے پردیس میں مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ یوں بہن جو زمینیں لے جاتی انہیں اپنے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

اب ماں کی کروڑوں روپے کی زمینیں کسی نہ کسی دن ان کی ہونے والی تھیں۔ رابعہ نے دیکھ لیا کہ خون کے اور دودھ کے رشتوں کی کوئی اہمیت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ وہ کسی دن بہن کی طرح ماں کو بھی بے موت مار ڈالیں گے اور وہ باپ اپنے بیٹوں کا بھرپور ساتھ دیتا رہے گا۔

رابعہ کے باپ نے وصیت لکھ دی تھی کہ رابعہ خاتون قتل کی جائے گی یا کسی حادثے میں ماری جائے گی تو اس کی ساری زمینیں محکمۂ اوقاف میں منتقل کر دی جائیں۔ اگر قدرتی طور پر موت ہو تو زمینیں اس کے بچوں کے نام ہو جائیں گی۔

ایسی وصیت کے پیش نظر وہ باپ بیٹے اس کی طبعی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک صورت یہ بھی تھی کہ اگر رابعہ کو کوئی ایسی بیماری لگ جائے کہ وہ لاعلاج ہو جائے تو جلد ہی مرے گی۔ یوں باپ بیٹوں پر الزام نہیں آئے گا۔ اس کی تمام زمینیں بیٹوں کے نام ہو جائیں گی۔

وہ تینوں رابعہ کے چچا زاد بھائی عظمت سے خار کھاتے تھے۔ کیونکہ وہ وصیت کے مطابق رابعہ کی زمینوں کے معاملات سنبھالتا تھا اور قانونی معاملات میں بھی اپنے خاندانی وکیل سے رابطے میں رہتا تھا۔

جب وہ باپ بیٹے گوٹھ سے شہر آتے تھے تو عظمت حویلی میں آ کر رابعہ خاتون کے مسائل قانونی طور پر وکیل کے ذریعہ حل کرتا تھا۔ ایسے وقت حشمت جلالی قانوناً اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ تلملا کر رہ جاتا تھا۔

رابعہ کراچی شہر کے مکان میں عظمت کے ساتھ پہنچی تو آدھے گھنٹے میں اس کا خاندانی وکیل بھی آ گیا۔ اس نے حشمت جلالی سے کہا۔ "آپ کی زوجہ حویلی چھوڑ کر یہاں آ گئی ہیں۔ مستقل یہیں رہنا چاہتی ہیں۔ اور اپنا علاج خود اپنے بھروسے کے ڈاکٹر سے کرانا چاہتی ہیں۔"

حشمت نے کہا۔ "ہم نے ربیعہ کی یہ بات مانی کہ اس پر کبھی سوکن نہیں لائیں گے۔ یہ حویلی کی تنہا مالکہ ہے۔ اسے حویلی میں ہی رہنا ہوگا۔ ورنہ میں دوسری تیسری شادیاں کروں گا۔ اس پر سوکنیں لاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "جتنی شادیاں کرنا چاہتے ہیں کریں۔ میں نے سوچا تھا کہ کوئی سوکن نہیں آئے گی تو شوہر صرف میرا ہی رہے گا۔ لیکن آپ تو برسوں سے بازاری عورتوں کے بن کر

رہ گئے ہیں۔ میری قدر صرف اس لیے ہے کہ میں اپنے والد کی زمین جائداد کی مالک ہوں اور جب میں مروں گی تو میرا سب کچھ آپ باپ بیٹوں کو ملے گا۔"

اس نے بیٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ایک بیوی کی حیثیت سے، ایک ماں کی حیثیت سے کچھ بھی نہیں ہوں۔ اگر میرا باپ ذہانت سے وصیت لکھ کر نہ جاتا تو میں کہاں ہوتی؟ اب تک مجھے بھی قتل کر دیا جاتا۔"

بڑے بیٹے برکت نے کہا۔ "اماں! آپ خوامخواہ ہم پر شبہ کرتی رہتی ہیں۔ ہم بیٹے ہیں قسائی نہیں ہیں۔"

"بیٹے! قسائیوں کے ہاتھوں میں چھرا ہوتا ہے۔ تم قسائی نہیں ہو... آستین کے سانپ ہو۔ تمہارے پاس بہ ظاہر ہتھیار نہیں ہے۔ تم دونوں اپنی کمینگی اور ذلالت سے کسی دن ڈس لو گے۔"

وہ حشمت سے بولی۔ "ایک حویلی کی مالکہ اپنے وڈیرے شوہر کی رگ رگ کو پہچانتی ہے۔ اس لیے میرے بھروسے کی بات نہ کی جائے۔ جب سے بیٹی گئی ہے۔ حویلی مجھے کاٹ رہی ہے۔ میرا کلیجا نوچ رہی ہے۔ میں وہاں سے اپنا ضروری سامان لے کر آ گئی ہوں۔ اب واپس نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمہارا شوہر ہوں۔ تمہیں میرے حکم کے مطابق حویلی میں رہنا ہوگا۔"

"میں نے کہہ دیا۔ میں وہاں سے آ چکی ہوں۔ حویلی چھوڑ سکتی ہوں تو آپ کو بھی چھوڑ سکتی ہوں۔"

حشمت جلالی نے اس کے وکیل کو اور عظمت کو دیکھا۔ ان کی موجودگی میں غصہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ ویسے غصہ دکھا کر اسے جبراً حویلی میں واپس لے جانا چاہتا تو کیا ہوتا؟ وہ اسے بھی چھوڑنے کی دھمکی دے چکی تھی۔

باپ بیٹے چپ تھے۔ وہ کروڑوں کی جائداد سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ نہ بیٹے ماں کو اور نہ شوہر بیوی کو چھوڑ سکتا تھا۔

حشمت نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم میاں بیوی اتنی زندگی ساتھ گزار چکے ہیں کہ اب اس عمر میں ایک دوسرے سے دور رہنے پر مجھے اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو یہاں آتا ہی رہتا ہوں۔ ہم یہاں ساتھ رہا کریں گے۔

لیکن ربیعہ...! مجھ سے اس قدر بد دل نہیں ہونا چاہیے کہ کسی بھی معاملے میں مجھ پر بھروسا نہ کرو۔ میں تمہاری صحت اور سلامتی چاہتا ہوں۔ یہاں ایک بہت ہی مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹر ہے۔ میں اس کے ذریعہ تمہارا علاج کراؤں گا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں کہہ چکی ہوں۔ اپنے بھروسے کے ڈاکٹر سے علاج کراؤں گی۔ میرا بھائی عظمت آپ سے زیادہ اس شہر کے ڈاکٹروں کو جانتا ہے۔ حویلی چھوڑ کر آنے کا مقصد یہی ہے کہ آپ میرے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہیں کر سکیں گے۔"

رابعہ کا باپ ایسا کام کر گیا تھا کہ وہ اپنے وکیل اور بھائی عظمت شاہ کے سہارے وڈیرے شوہر سے محفوظ ہو گئی تھی۔ وہ ان تینوں کے لیے اس لیے بھی اہم تھی کہ مراد کے خلاف بہت ہی اہم گواہ تھی۔ اگر وہ عدالت میں کہتی کہ کھیت میں پائی جانے والی لاش اس کی بیٹی کی نہیں ہے تو ایک پیدا کرنے والی ماں کے

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بک شاپ
پی او بکس: 27869 کرامہ، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار۔ کراچی
فون: 32633151, 32639581 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیان کو یقین کی حد تک تسلیم کیا جاسکتا تھا۔

موجودہ حالات میں کہا جاسکتا تھا کہ وہ باپ بیٹوں کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گئی تھی۔ وہ نہ تو اسے اُگل سکتے تھے اور نہ ہی نگل سکتے تھے۔

☆☆☆

بعض اوقات ایک معمولی سی بات بہت اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اتنی اہمیت کہ وہ بات انتہائی سنگین مسئلہ بن جاتی ہے۔

بات اتنی سی تھی کہ میمن گوٹھ میں ماروی کی ایک سہیلی رومانہ تھی۔ دونوں میں بڑا پیار تھا۔ رومانہ کی شادی ہونے لگی تو دوسری سہیلیوں نے اسے طعنے دیے۔ ''کہاں ہے تیری ماروی، جس کی دوستی کا دم بھرتی تھی؟''

دوسری نے کہا۔ ''جب سے بڑی کوٹھی والی ہوگئی ہے۔ تب سے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ غریب رومانہ کس حال میں ہے۔''

رومانہ نے کہا۔ ''اسے یہاں سے گئے مہینا بھی نہیں ہوا پھر وہ مراد کے لیے پریشان ہے۔ اس کی شادی تو مجھ سے پہلے ہونے والی تھی مگر وہ جیل چلا گیا ہے۔ ایسے میں وہ خود کو بھولی ہوئی ہے مجھے کیا یاد کرے گی؟''

ایک عورت نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''دکھ مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ ایسے میں انسان خوشیوں کو نہیں بھولتا۔ اسے تیری خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔''

ماروی کے حالات سے میمن گوٹھ میں سب ہی رہنے والوں کو دلچسپی تھی۔ دلچسپی یہ نہیں تھی کہ مراد قتل کے کیس میں گیا ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ بلکہ یہ تجسس تھا کہ ماروی کوٹھی والی بن گئی ہے۔ کیا وہ اس کے ساتھ رہتا ہے، جس نے اسے کوٹھی والی بنا دیا ہے؟

وہاں رہنے والیوں کے دلوں میں بھی کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ چاچی منتی سے ملنے اور کھوج لگانے کے لیے بے چین تھیں۔ ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''جب دولت ملتی ہے تو مزاج آسمان کو پہنچ جاتا ہے۔ وہ تیری سہیلی ہے اسے آزما کے دیکھ...''

رومانہ محلے میں جہاں جاتی تھی وہاں عورتیں اور لڑکیاں طعنے دیا کرتی تھیں اور چیلنج کے انداز میں بھی کہتی تھیں کہ ماروی کے گن گاتی ہو تو اسے شادی میں بلاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہاری عزت رکھے گی یا نہیں؟

آخر اس نے طے کیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کوٹھی میں اس سے ملنے جائے گی۔ اگر وہ مغرور نہیں ہوگی۔ سہیلی کی طرح ملے گی تو اسے شادی میں آنے کی دعوت دے گی۔

کئی عورتوں اور مردوں نے سنا تو کہا۔ ''ہم بھی چلیں گے۔ دیکھیں گے کتنی بڑی کوٹھی ہے۔''

رومانہ نے کہا۔ ''پورا محلہ وہاں جائے گا تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ ہمیں باہر سے ہی ٹال دے گی۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''ہم اسے دکھائیں گے کہ دیکھو آج بھی پورا میمن گوٹھ تمہیں کس قدر چاہتا ہے۔ تم ہم میں سے ہو۔ ہماری خوشیوں میں شریک ہو جاؤ۔''

اس بات پر سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ سب ہی وہاں جانا چاہتے تھے اور وہاں بھیڑ لگانا مناسب بھی نہیں تھا۔ یہ فیصلہ ہوا کہ صرف دس عورتیں اور مرد رومانہ کے ساتھ جائیں گے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی دس افراد کا قافلہ میمن گوٹھ سے چلا تو کوٹھی پہنچتے پہنچتے بیس افراد ہو گئے۔ وہ جبراً آئے تھے، انہوں نے کہا۔ ''ہم کسی کی اجازت کے پابند نہیں ہیں۔ ہمیں یہاں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔''

سب ہی کے اندر تجسس بھرا تھا۔ سب ہی کوٹھی کو اندر اور باہر سے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بھی کھوج لگانا چاہتے تھے کہ ماروی اندر سے کیسی زندگی گزار رہی ہے؟ اس کی چمک دمک کے پیچھے جو بھید ہوگا۔ اس بھید کو پالینا چاہتے تھے۔

ماروی نے کوٹھی سے باہر آکر اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو حیرت اور مسرتوں سے کھل گئی۔ رومانہ سے لپٹ کر رونے لگی پھر وہ ایک ایک خاتون کے گلے لگتی رہی۔ مرد حضرات کو سلام کر کے ان کے آنے کا شکریہ ادا کرتی رہی۔

وہ سب حیران تھے، یہ سوچ کر آئے تھے کہ ماروی مغرور ہو گئی ہوگی کسی کو منہ نہیں لگائے گی۔ اونچی کوٹھی والی انہیں گری ہوئی نظروں سے دیکھے گی۔ لیکن وہ تو ایک ایک پر جیسے صدقے واری جا رہی تھی۔

وہ ان سب کو بڑے سے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں صوفہ پر بٹھا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''آج مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرے بچھڑے ہوئے سگے رشتے دار برسوں بعد ملنے آئے ہیں۔ آج میں بالکل اپنوں میں پہنچ گئی ہوں۔''

انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ماروی ان کا ایسا والہانہ استقبال کرے گی۔ وہ ڈرائنگ روم کے مہنگے آرائشی سامان کو دیکھ کر اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ وہ انہیں کوٹھی کا ایک ایک حصہ دکھانے لگی۔ میڈم روزی

ملازموں کے ساتھ مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کر رہی تھی۔ عورتیں آزادی سے مختلف کمروں میں یوں جا رہی تھیں۔ جیسے کسی تاریخی قلعہ کی سیر کر رہی ہوں۔

دو عورتیں اس کے بیڈ روم میں آئیں۔ ایک نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر کہا۔ ''ہائے کیسا لچکدار ہے۔''

دوسری نے دونوں ہاتھوں سے گدے کو دباتے ہوئے کہا۔ ''ایسا بچھونا ہمارے نصیب میں کہاں؟''

پھر وہ دوسری کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ ''یہ اکیلی تو نہیں سوتی ہوگی۔''

پھر وہ دونوں منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔ کوٹھی کے دوسرے حصے میں عورتیں اپنے مردوں سے کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ''یہ کروڑوں کی کوٹھی اور لاکھوں کا سامان کوئی ایسے ہی کسی کو نہیں دیدیتا۔''

ماروی ان سب کی خدمت کرنے کے لیے اِدھر سے اُدھر جاتی تھی تو اِدھر والے دھیمی آواز میں کہتے تھے۔ ''مرد عورت کو کوٹھی دے یا جھگی دے۔ سیدھی سی بات ہے۔ کچھ بھی دیتا ہے تو بدلے میں وصول بھی کرتا ہے۔''

ماروی اُدھر سے اِدھر آتی تھی تو اُدھر والے کانا پھوسی کرتے تھے۔ ''یہ اتنی اونچی جگہ آکر بیٹھ گئی ہے کہ کوئی اس کے منہ پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہ غریبوں کے کسی بھی علاقہ میں ایسا کرتی تو بدنامی کے پتھر کھاتی رہتی۔''

''کچھ بھی کہو۔ بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔''

ہماری دنیا میں نیکی اور شرافت عام ہو تو کوئی کسی پر شبہ نہ کرے اور پتھر نہ مارے۔ ذلالت اور کمینگی ہر سُو ہو تو شریف انسان کی شرافت پر بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔

اس بیچاری نے فی الحال اپنی بدنامی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ ایسی بدنامیوں سے بہت دور جانے کا فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی تھی۔ جہاں جانے والی تھی، وہاں نہ کوئی مہربان ہوتا نہ مہربانی ہوتی اور نہ اس کی طرف پتھر آتے۔

اس نے رومانہ سے کہا۔ ''جب تک مراد رہا ہو کر نہیں آئے گا۔ تب تک دنیا کی کوئی خوشی میرے دل کو نہیں چھو سکے گی۔ لیکن تم میری ایسی سہیلی ہو کہ تمہاری خوشی کی خاطر شام کو آؤں گی۔ تمہیں دلہن بن کر رخصت ہوتے دیکھوں گی۔ خدا تمہیں عزت آبرو سے خوشحال ازدواجی زندگی عطا کرے۔''

ماروی نے میمن گوٹھ سے آنے والوں کو عزت دی۔ محبتیں دیں۔ اس بات سے بے نیاز رہی کہ ہزار محبتیں دینے اور ایک ایک کو گلے لگانے کے باوجود بعض کم ظرف اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے رہے تھے۔

میڈم روزی نے ان سب کے جانے کے بعد محبوب سے فون پر کہا۔ ''ماروی پرسوں جمعہ کے دن میمن گوٹھ جائے گی۔ اس کی ایک عزیز سہیلی شادی کی دعوت دینے آئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارا میمن گوٹھ اُٹھ کر آگیا ہو۔ ماروی کو جیسے بچھڑے ہوئے رشتے دار مل گئے تھے۔ آج وہ بہت خوش تھی۔''

محبوب نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے وہ کسی بہانے خوش تو ہوئی۔ ایک عرصہ بعد اس کی خوشی کی خبر سُن رہا ہوں۔''

''کیا اس کا میمن گوٹھ جانا مناسب ہوگا؟''

''مناسب تو نہیں ہے۔ مجھے خطرات کا علم ہے۔ پہلے ایک دشمن حشمت جلالی تھا۔ اب پارٹی چھوڑنے کی وجہ سے چیئرمین بابر بشیر مجھے دشمن سمجھ رہا ہے۔ مجھے لنگڑے جانی نے بتایا ہے۔ وہ ماروی کے خلاف کچھ کرنے والا ہے۔ لنگڑے مخبر کی انفارمیشن غلط نہیں ہو سکتی۔ مجھے بہت محتاط رہنا ہوگا۔ میں نئے دشمنوں کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ ناگہانی حملے کہیں سے بھی ہو سکتے ہیں۔''

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ماروی کو سمجھائیں۔ وہ کچھ عرصے تک کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔''

''تم نے اس کی خوشیاں دیکھی ہیں۔ میں نے نہیں دیکھیں۔ اندازہ کر سکتا ہوں، وہ اپنے بچھڑے ہوئے گوٹھ کے لوگوں سے مل کر کیسی خوش ہو رہی ہوگی۔ وہ اپنی عزیز سہیلی کو زبان دے چکی ہے۔ اگرچہ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ اسے نہیں جانا چاہیے لیکن میں جانے سے نہیں روکوں گا۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ ''میں اسے ہنستے مسکراتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ پتا نہیں کتنے عرصہ کے بعد وہ سہیلیوں کے ساتھ ناچے گی، گائے گی۔ میں نے یہ مسرتیں اسے نہ دیں تو پھر کیا دیا؟''

اس نے رابطہ ختم کیا۔ روزی نے اپنے فون کو دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''دیوانہ تو دیوانہ ہوتا ہے۔ دیوانے کو کیا سمجھائیں۔ میں جانتی ہوں صاحب اس کی سیکیورٹی کے لیے دن رات ایک کر دیں گے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ جانیں اور ان کی دیوانگی جانے۔''

محبوب نے ماروی کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولی۔ ''میں آپ سے بات کرنے والی تھی۔ آج میری بہت ہی پیاری سہیلی آئی تھی۔''

اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔ روزی نے مجھے بتایا ہے۔ تم ان لوگوں کے ساتھ بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ تمہاری سہیلی دلہن بننے والی ہے۔ تمہیں اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوشیوں میں شریک ہونا چاہیے۔"

وہ مسرتوں سے سرشار ہوکر بولی۔ "خدا کا شکر ہے۔ میں سمجھ رہی تھی۔ آپ اعتراض کریں گے۔"

"اعتراض تو کرنا چاہیے۔ دشمن حالات کے پیش نظر تمہیں کوٹھی سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے خلاف کیسی سازشیں ہو رہی ہیں؟"

"میں سمجھ رہی ہوں۔ مگر کیا کروں؟ اگر آپ میری سہیلی کی خوشیاں دیکھتے اور گوٹھ سے آنے والوں کا پیار پاتے تو ضرور کہتے کہ مجھے سہیلی کو دلہن بنانے کے لیے جانا ہی چاہیے۔"

"بے شک جانا چاہیے۔ ہنسنے بولنے اور ایک ذرا لائف انجوائے کرنے کا موقع نصیب سے ملے تو ضرور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے حالات کو بدلنا چاہیے۔"

"کیا آپ صرف میری خوشیوں کی خاطر جانے کو کہہ رہے ہیں۔ ورنہ مجھے یہاں سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔"

"حالات دھمکیاں دے رہے ہیں۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ کچھ نہ ہو۔"

"کیا آپ گارڈز کو میرے ساتھ رکھیں گے؟"

"تمہارے آگے پیچھے مسلح گارڈز کو دیکھ کر لوگ باتیں بنائیں گے۔ ویسے بھی کچھ کم باتیں نہیں بنائی جارہی ہیں۔ بہرحال میں خفیہ طور سے حفاظتی انتظامات کروں گا۔"

"ایسا ہے تو میں تھوڑی دیر کے لیے جاؤں گی پھر جلد ہی واپس آجاؤں گی۔"

"نہیں ماروی! سہیلیوں کے ساتھ دل کھول کر خوشیاں مناؤ۔ اللہ نے چاہا تو تمہیں کچھ نہیں ہوگا اور شاید دشمن بھی تمہارے پیچھے نہیں آئیں گے۔ اور اللہ کرے کہ یہ محض ہمارا وہم ہو اور تم بھرپور خوشیاں سمیٹ کر آؤ۔"

رابطہ ختم ہوا تو ماروی نے اس سے متاثر ہوکر خلا میں اسے دیکھا اور سوچا۔ وہ اسے خوش کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا تھا۔ خوشیاں میدان جنگ میں ملنے والی تھیں۔ وہ وہاں بھی اس کی مسرتوں کو بحال رکھنے کے لیے محاذ آرائی کرنے والا تھا۔

☆☆☆

ببلو شاہ نے پچھلی رات بہت پی لی تھی۔ نشے کی حالت میں ماروی اس کے حواس پر چھائی رہی تھی۔ وہ اپنے خاص کارندے سے بولتا رہا تھا۔ "یہ دیکھو...! وہ جو سب کی زبان پر چڑھی ہوئی ہے اور جس کا ذکر اسلام آباد میں ہونے لگا ہے۔ اسے اٹھا کر لے آؤ۔"

کارندے نے اسے سمجھایا کہ وہ اپنی کوٹھی سے باہر نہیں نکلتی ہے۔ فی الحال وہ کسی کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ وہ نشے کی حالت میں نہ کسی کی سنتا تھا نہ کسی کی بات سمجھتا تھا۔ کارندے اسے دل ہی دل میں گالیاں دے کر رہ جاتے تھے۔

پھر ایک کارندے نے آکر کہا۔ "سائیں! ابھی معلوم ہوا ہے ماروی جمعہ کے دن کوٹھی سے نکلے گی اور اپنی سہیلی کی شادی میں شریک ہونے میمن گوٹھ جائے گی۔"

اس نے دوسرے دن ہوش وحواس میں رہ کر اپنے دست راست سے پوچھا۔ "کل رات مجھے کس نے کہا تھا کہ ماروی پرسوں کوٹھی سے نکلنے والی ہے؟"

دست راست نے کہا۔ "آپ کی کوٹھی کا ایک نوکر صمدو ہے۔ وہ میمن گوٹھ میں رہتا ہے۔ کہہ رہا تھا' پرسوں وہاں ایک شادی ہے۔ محلے میں دھوم مچی ہے' بچے بچے کی زبان پر ہے کہ ماروی اس شادی میں آنے والی ہے۔"

ببلو شاہ نے کہا۔ "اس کمبخت کی اتنی شہرت ہے کہ پورے میمن گوٹھ میں اس کا ذکر ہو رہا ہے؟"

"حضور! دنیا کی ساری حسین عورتیں آپ جیسے بڑے لوگوں سے شہرت پاتی ہیں۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "ہم لوگوں سے؟"

"جی ہاں۔ حشمت جلالی جیسا وڈیرا اور اسمبلی کا رکن محبوب علی چانڈیو جیسا ارب پتی سرمایہ دار' آپ جیسا سیاست کا کھلاڑی اور پارٹی کے چیئرمین بابر بشیر جیسی اونچی ہستیاں اس کی باتیں کرتے ہیں۔ اسے اٹھوانا چاہتے ہیں تو لامحالہ سب ہی کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ رہی ہے کہ وہ کیسی ہوگی' جس کے لیے بڑے لوگوں کے درمیان رسا کشی ہو رہی ہے۔"

ببلو شاہ نے سوچتے ہوئے قائل ہوکر کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے بھی اسے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن وہ دماغ میں گھس گئی ہے۔ کل بیتے وقت مجھ پر چڑھ بیٹھی تھی۔ پھر بھی اس کی صورت نظر نہیں آئی تھی۔"

وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خلا میں تکتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ کل رات وہ اپنا مکھڑا لے کر نہیں آئی تھی یا میں نشے میں دیکھ نہیں پایا۔ وہ کیسی ہوگی' جس کے سب دیوانے ہیں۔"

سوال پیدا ہوا کیا سب اس کی صورت کے دیوانے ہیں؟

"نہیں۔ میں تو دیکھے بغیر باؤلا ہو رہا ہوں۔ اور

شدت سے اسے طلب کر رہا ہوں۔ تعجب ہے' یہ کیسی طلب ہے؟"

طلب ایسی بھی ہوتی ہے' جس کے پیچھے صرف اور صرف شرمناک ہوس ہوتی ہے۔

ہاں عورت کیسی بھی ہو۔ کالی پیلی بھی ہو اگر بڑے لوگ اس کے لیے تاج محل بنانے لگیں تو وہ تمام دیکھنے اور سننے والوں کے بھی دلوں میں دھڑکنے لگتی ہے۔

اس نے دست راست کی طرف جھک کر پوچھا۔ "تم نے تو اسے دیکھا ہوگا؟"

اس نے بے خیالی میں پوچھا۔ "کس کو؟"

وہ غصہ سے بولا۔ "اپنی ماں کو... گدھے کہیں کے۔ میں اور کس کی باتیں کر رہا ہوں۔"

"معافی چاہتا ہوں۔ میں کسی اور کے دھیان میں تھا۔"

"کس کے دھیان میں تھے؟"

"اپنی گھر والی کا خیال آرہا تھا۔"

"ابے تُو سچ مچ گدھا ہے۔ گھر والی تو گھر میں آگئی۔ اب اسے کیا دھیان میں رکھنا ہے۔ وہ تو اپنے ہی پاس رکھی رہے گی۔"

"کچھ بھی ہو حضور! آپ ساری دنیا کا حسن کھنگال ڈالیں۔ ان کی ہوس میں جوانی گزار دیں۔ بڑھاپے میں صرف وفادار بیوی ہی ساتھ رہ جاتی ہے۔"

اس نے ایک قہقہہ لگایا پھر کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم جیسے لوگ کسی مہنگی ماروی کا بوجھ اٹھا نہیں پاتے۔ اس لیے مجبوراً ایک ہی بیوی پر صبر کرتے رہتے ہیں۔"

وہ اپنے آقا سے بحث نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے چپ رہا۔ ببلو شاہ نے ایک ملازم کو بلا کر پوچھا۔ "صمدو کہاں ہے اسے بلاؤ۔ اب اسے ہمارے پاس رہنا ہوگا۔"

ملازم چلا گیا۔ دست راست نے کہا۔ "صمدو میمن گوٹھ میں رہتا ہے۔ اس نے ماروی کو دیکھا ہوگا۔"

"جب وہاں رہتا ہے تو ضرور دیکھا ہوگا۔ اسے تو دن رات دیکھتا ہوگا۔ پرسوں جو کارندے اسے اٹھانے جائیں گے انہیں بھی ماروی کی صورت پہلے سے دیکھ لینی چاہیے۔ ورنہ وہ کسی ایسی ویسی کو اٹھا کر لے آئیں گے۔"

پھر وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ "کیا چیز ہے؟ نہ ہم نے دیکھا ہے نہ ہمارے آدمیوں نے۔ ابھی تو جیسے پرچھائیں کے پیچھے دوڑے جارہے ہیں۔"

"حضور! ہمارے کارندے اسے دیکھ لیں گے۔ جب وہ میمن گوٹھ میں آئے گی تو اپنے رکھ رکھاؤ سے الگ ہی نظر آئے گی۔ وہاں غریب عورتوں کے ہجوم میں سب سے قیمتی لباس پہنے ہوگی۔ بدن پر سونے کے زیورات ہوں گے۔"

"ہاں۔ اس طرح وہ سب سے الگ دکھائی دے گی پھر بھی جو اسے اٹھانے والے ہیں' انہیں صورت سے پہچاننا چاہیے۔"

"آپ صمدو کو حکم دیں۔ اس کی بیوی چھپ چھپ کر ہمارے کارندوں کو اس کی صورت دکھائے گی۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "ہاں تب دھوکا نہیں ہوگا۔ وہ سیدھی میرے پاس لائی جائے گی۔"

وہ بولا۔ "حضور! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ آپ جو حکم دیں گے' وہی کریں گے۔ لیکن کچھ بولنا چاہتا ہوں۔"

اس نے گھور کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "بولو۔"

"چیئرمین نے حکم دیا ہے کہ ماروی کو دیکھتے ہی گولی مار کر گزر جاؤ۔ اسے اغوا کریں گے تو جلالی صاحب اور چانڈیو صاحب اس کے پیچھے دوڑیں گے۔ ان کی دوڑ اور ہٹ دھرمی کو ختم کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ ماروی کا وجود نہ رہے۔"

"اونہہ۔ چیئرمین اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ یہاں کیا ہوگا' وہ دیکھنے نہیں آئیں گے۔ ماروی ایک رات کے لیے میرے پاس لائی جائے گی۔ پھر دوسری صبح اس کی لاش کا فوٹو چیئرمین کو دکھا دیا جائے گا۔ یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

کراچی سے اسلام آباد تک سیاسی پارٹی کے جو غنڈے تھے۔ وہ سب وفاداری کے حوالے سے چیئرمین بابر بشیر کے تابعدار تھے۔ ماروی کے متعلق جو اطلاعات ببلو شاہ اور حشمت جلالی تک پہنچ رہی تھیں' وہی اطلاعات کسی تاخیر کے بغیر چیئرمین تک پہنچ گئی تھیں۔ جو غنڈے ببلو شاہ کے رازدار تھے' وہی چیئرمین بابر بشیر کے بھی وفادار تھے۔

بابر بشیر کو معلوم ہوا کہ ببلو شاہ اصول کے خلاف شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ پہلے شکار کو مارا جاتا ہے پھر بھون کر کھایا جاتا ہے۔ وہ ماروی کو پہلے چبانا چاہتا تھا پھر اسے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ اب وہ جانور تو نہیں تھی کہ اسے ہلاک کرنے کے بعد بھونا اور چبایا جاتا۔ ببلو اپنی طلب میں درست تھا اور بابر بشیر بھی اپنے سیاسی کھیل میں غلط نہیں تھا۔

چیئرمین نے ایک میٹنگ میں اپنے اعلیٰ عہدیداروں

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے کہا۔ ”ہماری پارٹی میں ببلو شاہ جیسے کئی عہدیدار ایسے ہیں جو ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے ہمارے احکامات پر عمل نہیں کرتے پھر بھی ہم انہیں برداشت کرتے ہیں کیونکہ وہ دوسرے تمام سیاسی معاملات میں ہماری قوت بن کر رہتے ہیں۔“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”ہم تو ببلو شاہ کو چھوٹ دیں گے۔ وہ ماروی کو اپنے کسی خفیہ اڈے میں رکھے گا۔ لیکن اس کا دیوانہ ہو جائے گا تو پھر پتا نہیں کب تک چھپا کر رکھے گا؟“

”چانڈیو اور جلالی بڑے باخبر رہتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہوگا کہ ببلو شاہ نے ان کی ماروی کو اُڑایا ہے تو وہ اس پر چڑھ دوڑیں گے پھر ایک بار یہ بدنامی ہمیں للکارے گی کہ ہماری پارٹی کے اب تین سیاستدان آپس میں لڑنے لگے ہیں۔“

”جی ہاں پریس اور الیکٹرونک میڈیا والے تو ہر نیوز بلیٹن میں پارٹی کو بدنام کرتے رہیں گے۔ ببلو شاہ کو سمجھانا ہوگا کہ وہ ماروی کو دماغ سے نکال دے۔ کوئی دوسری مٹھائی کھالے۔“

”چانڈیو کو اور وڈیرے کو بھرے اجلاس میں سمجھایا گیا تھا۔ کیا وہ اس کی طلب سے باز آگئے تھے؟“

”وہ باز کیا آئیں گے۔ انہوں نے تو اس کی خاطر پارٹی چھوڑ دی۔ تعجب ہے، عورت کی ایسی بھی کیا طلب...؟“

”لوگ عورت کے پیچھے پاگل کیوں ہو جاتے ہیں؟“

”ہماری دنیا میں ایسی حسین عورتیں ہیں جن کی خاطر شاہ تخت چھوڑ دیتے ہیں اور بڑے بڑے شمشیر زن کے ہاتھوں سے تلوار گر جاتی ہے۔“

”کیا ماروی ایسی ہوگی؟“

”پتا نہیں۔ ہم میں سے کسی نے اسے نہیں دیکھا ہے۔“

”تعجب تو یہ ہے کہ ببلو شاہ نے بھی اسے نہیں دیکھا ہے اور اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ گامے سے کہہ دیں، ماروی کسی بھی حال میں ببلو شاہ کے پاس نہ پہنچے۔“

چیئرمین بابر بشیر نے کہا۔ ”ببلو شاہ میری ہدایت کے خلاف اس لڑکی کو اپنے اڈے میں لے جائے گا اور یہ بات مجھ سے چھپا تا رہے گا۔ میں بھی ایسی چال چلوں گا کہ وہ الّو بن کر رہ جائے گا۔“

وہ اپنا فون اٹھا کر کراچی کے غنڈے دادا گامے سے رابطہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ پچھلے دس برسوں سے میرا وفادار ہے۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ لنگڑا جانی در پردہ محبوب علی چانڈیو کا تابعدار بن گیا ہے اور اسی کے لیے کام کر رہا ہے۔“

گامے سے رابطہ ہو گیا۔ بابر شبیر نے پوچھا۔

”پرسوں میمن گوٹھ میں کیا ہوگا؟“

”جو آپ نے حکم دیا ہے، وہی ہوگا۔“

”ببلو شاہ کے آدمی ماروی کو لے جانا چاہیں گے۔“

”وہ دراصل ہمارے ہی آدمی ہوں گے۔ ماروی کو شاہ صاحب کے ڈیرے پر نہیں پہنچائیں گے۔ وہیں شادی کی بھیڑ بھاڑ میں گولی مار دیں گے۔“

بابر بشیر نے کہا۔ ”اس پلاننگ میں ایک ذرا تبدیلی کرو۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ ببلو شاہ نے ماروی کی صورت نہیں دیکھی ہے۔“

”جی ہاں۔ ہم نے بھی نہیں دیکھی ہے۔ شاہ صاحب کا ایک ملازم صمدو اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ عورتوں کے ہجوم میں صمدو اور اس کی بیوی ہمیں چھپ چھپ کر بتائیں گے کہ ماروی کون ہے؟“

”اب تم یہ کرو گے کہ ببلو شاہ کو مایوس نہیں کرو گے۔ کوئی دوسری لڑکی اس کے پاس پہنچا دو گے۔ اسے کرائے پر حاصل کرو گے۔ وہ خود کو ماروی کہے گی۔ یوں ببلو کو بہلا دیا جائے گا۔“

”جناب! بعد میں بھید کھلے گا کہ ماروی کو وہیں میمن گوٹھ میں گولی مار دی گئی ہے۔“

”تب ببلو شاہ سے کہا جائے گا کہ تم سب دھوکا کھا گئے تھے کیونکہ جسے اغوا کیا گیا تھا اس کا نام بھی ماروی تھا اور صمدو یا اس کی بیوی نے غلط نشاندہی کی تھی۔“

”سمجھ گیا جناب! آپ نے زبردست چال سمجھائی ہے۔ اب تو ہم یہی کریں گے۔“

بابر بشیر فون بند کر کے مسکرانے لگا۔ کہنے لگا۔ ”ببلو مڈل مین سیاستدان ہے۔ اسے سیاست آتے آتے آئے گی۔ وہ ماروی کے مرڈر پر ہم پر شبہ کرے گا تو اسے سمجھایا جائے گا کہ وڈیرے حشمت جلالی نے اسے چانڈیو سے چھین لینے کے لیے قتل کرایا ہے۔“

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ڈاکٹر مقبول حسین

مالِ غنیمت

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اگر انسان کسی کام کو کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اسے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے ہلا سکے... اور ایسا وہی کرتے ہیں جو اپنی زبان کے دھنی ہوتے ہیں... وہ بھی فولادی ارادے رکھتا تھا۔ کتنے رشتوں نے اسے پگھلانے کی کوشش کی مگر... وہ جن رستوں کا انتخاب کر چکا تھا ان سے پلٹنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

وعدوں کا دھنی اور ضد کا پکا..... ایک ایسے ہی مستقل مزاج کا ماجرا

”ایسی ذلیل کافی میں نے زندگی میں کبھی نہیں پی اور آئندہ بھی کوئی اُمید نہیں۔“ ٹام نے کافی کی پہلی چسکی لیتے ہوئے پیالی میز پر رکھ دی اور زبان تالو پر پھیری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریستوران والوں نے بالٹی بھر پانی میں کافی کا ایک چمچہ ڈال کر یہ فرض کر لیا کہ کافی تیار ہو گئی۔ ان سے کوئی شکایت کرنی بھی فضول تھی اسے یہی جواب ملتا کہ اگر آپ کو ہماری کافی پسند نہیں ہے تو وہ رہا دروازہ کسی دوسری جگہ جا کر نوش فرمائیں۔ آج کل کوئی بھی ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

معاملات کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا۔

ٹام بہت دیر تک وہیں بیٹھا اس گرم پانی کی چسکیاں لیتا رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس ریستوران کے علاوہ اور کہیں نہیں جاسکتا تھا، خواہ اسے کافی پسند آئے یا نہ آئے کیونکہ اب اس کی جیبوں میں پانچ سینٹ کا سکہ بھی نہیں تھا۔ وہ بالکل قلاش تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ قلاش ہونے والا تھا کیونکہ ابھی اس کی جیب میں اس گرم پانی کے ایک ایک کپ کی قیمت ادا کرنے کے لیے رقم موجود تھی اور جوں ہی وہ ریستوران سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا وہ اس سکے سے محروم ہوجاتا۔ وہ کسی طرح بھی نظریں بچا کر وہاں سے فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ اس وقت ریستوران میں صرف دو ہی افراد تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور گاہک بھی تھا۔ اتنی چھیڑ چھاڑ میں کوئی خواہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو، ریستوران کی انتظامیہ کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتا۔

باہر بلا کی سردی تھی اور ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ریستوران میں ایک خوبی تھی اور وہ یہ کہ انہوں نے ماحول کو گرم رکھنے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ جب تک پیالی میں نام نہاد کافی موجود تھی۔ وہ وہاں بیٹھے رہنے کا حق دار تھا اور ٹام اپنا یہ حق پوری طرح وصول کرنے کا تہیہ کرچکا تھا۔ اس نے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور ایک ہلکی سی چسکی لی۔

"کمال ہے اس شخص کو کافی بدذائقہ محسوس نہیں ہو رہی۔" ٹام نے ریستوران میں موجود دوسرے گاہک کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا جو کافی کے بڑے بڑے گھونٹ لے رہا تھا۔ وہ اپنے لباس سے انسانی برادری کا ایسا فرد نظر آتا تھا جو بہترین ریستوران میں بہت عمدہ کافی سے لطف اندوز ہوسکتا تھا۔ جب ٹام نے ..... اس متمول آدمی کو کاؤنٹر پر جا کر دوسری پیالی طلب کرتے ہوئے دیکھا تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اس کی خالی کی ہوئی پیالی میز پر رکھی تھی اور اس نے چمچہ چینی کے پیالے میں چھوڑ دیا تھا۔ چینی کے بڑے بڑے پیالے ہر میز پر بھرے رکھے تھے جو شخص جتنی چاہے چینی استعمال کرسکتا تھا۔ کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ اس ریستوران کی دوسری خوبی تھی۔ ٹام نے اسے ایک دوسری میز پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس نے چینی سے بھرے ہوئے پیالے میں چمچہ گھسیڑا اور اسے اندر ہی اندر گھمانے لگا۔ یہ شخص نیچے سے شکر نکالنا چاہتا ہے تاکہ اوپر سطح پر جمنے والی دھول سے محفوظ رہ سکے۔ ٹام نے سوچا اور پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھورتے ہوئے کسی خیال میں ڈوب گیا۔ یوں تو ہر انسان کے ساتھ مسائل لگے رہتے ہیں۔ لیکن مفلسی خود اتنا بڑا مسئلہ ہوتی ہے کہ دوسرے تمام مسائل اس کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔

اچانک کسی قسم کی حرکت نے اسے نظرات کی وادی سے واپس کھینچ لیا۔ ٹام نے اس شخص کو کاؤنٹر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ کاؤنٹر پر سے تیسری پیالی طلب کررہا تھا۔ ٹام کو پہلے تو اپنے ذہنی توازن کی درستگی پر شک ہوا اور جب اسے اپنا توازن درست نظر آیا تو پھر اسے اس شخص کی دماغی صحت پر شک ہونے لگا۔ اس شخص نے کاؤنٹر سے کافی کی جو دوسری پیالی طلب کی تھی اس میں سے اب بھی بھاپ نکل رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس پیالی کو محسوس کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو۔ ٹام نے سوچا۔

وہ شخص تیسری پیالی اٹھائے اس مرتبہ تیسری میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹام کی طرف اس طرح دیکھا کہ کہیں وہ اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ ٹام نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اس بات سے قطعی نہیں ڈرتا تھا کہ کوئی اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا نہ پکڑ لے لیکن اسے معلوم تھا کہ لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی انہیں دیکھے۔ وہ خود بھی ایسے لوگوں سے نفرت کرتا تھا جو اس کی طرف نظریں جمائے دیکھتے رہتے تھے۔

وہ شخص ایک تیسری میز پر بیٹھ کر بڑے انہماک سے پیالے میں بھری ہوئی چینی چمچے سے الٹ پلٹ رہا تھا۔ شاید یہ شخص بچپن میں چینی سے محرومی کا شکار رہا ہے تب ہی بچوں کی طرح چینی سے لبالب بھرے ہوئے پیالوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس مرتبہ جب اس شخص نے کافی کی پیالی ہونٹوں سے لگائی تو ٹام نے چور نظروں سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ اس نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور کافی حلق سے اس طرح نیچے اتاری جیسے وہ جبر کر کے کوئی ناپسندیدہ ... مشروب پینے کی کوشش کررہا ہو۔

کمال ہے جب اسے یہ بدذائقہ کافی بالکل پسند نہیں تو یہ کیوں پی رہا ہے؟ اور یہ اس کی تیسری پیالی ہے۔ اگر یہ کسی وجہ سے کافی پینے پر مجبور ہے تو کسی اچھے ریستوران میں کیوں نہیں جاتا۔ جہاں خوش ذائقہ کافی ملتی ہو؟ اس نے دیکھا کہ اب وہ شخص کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے اعصاب کھنچے کھنچے محسوس ہوتے تھے۔ ایک منٹ بعد اس شخص نے چپکے سے کافی کی پالی میز کے کنارے پر سرکائی۔ کاؤنٹر کی طرف کلرک کو دیکھا جو پشت پھیرے شراب کے گلاس صاف کرنے میں مشغول تھا اور پیالی ترچھی کر کے کافی زمین پر گرا دی چند لمحوں بعد وہ اسے پھر کاؤنٹر پر کافی کی چوتھی پیالی طلب کرتا ہوا نظر آیا۔ اس مرتبہ پھر اس نے بیٹھنے کے

لیے ایک نئی میز کا انتخاب کیا اور بیٹھتے ہی چمچہ لے کر چینی بھرے پیالے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ چمچے سے چینی اچھی طرح الٹ پلٹ رہا تھا۔ جیسے گھریلو خواتین چینی استعمال کرنے سے پہلے چمچے سے کیڑے مکوڑے تلاش کرتی ہیں۔

تب ٹام کی سمجھ میں آیا کہ وہ شخص آخر کیوں اس قدر بدذائقہ کافی بار بار پینے پر مجبور ہے اور اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ بچپن میں چینی سے محرومی کا شکار بھی نہیں رہا۔ وہ شخص دراصل چینی کے پیالوں میں کوئی چیز تلاش کررہا تھا جس کے بارے میں اسے علم نہیں تھا کہ وہ کس پیالے میں پوشیدہ ہے۔ ضرور وہ شے بہت قیمتی تھی تب ہی ایسا متمول آدمی اس تیسرے درجے کے ریستوران کی مختلف میزوں پر بیٹھنے کے لیے بار بار ایسی بدذائقہ کافی کی پیالیاں کاؤنٹر سے خریدنے پر مجبور تھا نئی پیالی طلب کرنے کے لیے اسے پرانی کافی پینی پڑ رہی تھی۔

ٹام کو شکر سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنی کافی میں ملانے کے لیے پیالے میں سے اوپر سے ایک چمچہ چینی اٹھائی تھی۔ اب اس نے دوبارہ اپنا چمچہ اٹھایا اور مضبوطی سے تھام لیا۔ آخر وہ کیوں خزانے کی تلاش میں شریک نہیں ہوسکتا، ٹام نے سوچا۔ اس نے بھی کافی کی ایک پیالی پی ہے۔ اس طرح ایک میز کے پیالے میں وہ بھی خزانہ تلاش کرنے کا حق دار بن جاتا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس شخص کی محبوبہ نے کسی پیالے میں اس کے لیے کوئی پیغام لکھ کر چھپا دیا ہو۔ کیونکہ اس وقت وہ اپنے حاسد شوہر کے ساتھ اس ریستوران میں بیٹھی تھی اور اسے شکر کا پیالہ ہی پیغام رسانی کے لیے بہترین ڈاک خانہ نظر آیا ہو۔ ٹام اس قسم کی صورتِ حال میں پیغام رسانی کے لیے اس عورت کو چینی کے پیالے سے زیادہ بہتر ذرائع بتا سکتا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چینی کے پیالے میں ایسی کوئی چیز چھپائی گئی ہو جو اس کے لیے قطعی بیکار ثابت ہو بشرطیکہ وہ چیز اس کے اپنے پیالے میں موجود ہو جیسے کوکین کی کوئی پڑیا۔ اسے شراب کے علاوہ اور کسی نشے سے رغبت نہیں تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چیز اس ریستوران کے کسی پیالے میں موجود نہ ہو۔ سرے سے یہاں چھپائی نہ گئی ہو یا اسے پہلے ہی کوئی دوسرا نکال کر لے گیا۔ ٹام کو وہ شخص نہ تو محبوبہ باز نظر آتا تھا نہ ہی کوکین جیسی منشیات کا عادی۔

ٹام نے پیالے پر رکھا ہوا ٹین کا ڈھکن چپکے سے ایک طرف رکھ دیا۔ اور کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا کہ کہیں وہ اس کی جانب تو متوجہ نہیں ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر اس نے چمچہ شکر کے پیالے میں تہ تک گھسا دیا اور آہستہ آہستہ چینی کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔ چینی کے صاف شفاف ..... دانے اِدھر اُدھر کھسکنے لگے اسے اندر سے روشنی کے ذرات منعکس ہوتے نظر آئے۔ چمچے کی آزادانہ نقل و حرکت میں بھاری پن پیدا ہوگیا تھا۔ جیسے کانٹے میں کوئی مچھلی پھنس گئی ہو۔ اس نے آہستہ سے چمچہ اوپر نکالا چینی کے ذرات تیزی سے پھسل کر اِدھر اُدھر گرنے لگے اور چند لمحوں بعد اس کی نظروں کے سامنے ہیروں کا نیکلس موجود تھا۔

ٹام سانس لینا بھول گیا۔ ایک لمحے کے لیے ہیروں نے برقی قمقموں کی روشنی کو اپنے اندر مقید کرلیا تب لاشعوری طور پر اس نے ہیروں کا نیکلس بڑی پھرتی کے ساتھ میز پر سے اٹھا کر اپنی گود میں ڈال لیا اور میز پر آگے کی طرف جھک گیا تاکہ وہ اس کے بدن کے اوپری حصے کے نیچے روپوش ہوجائے اسے خطرے کا پورا احساس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سب سے پہلے اسے چینی کا پیالہ دوبارہ ڈھک دینا چاہیے تاکہ اس شخص کو یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس نے اپنے پیالے کو کھنگالا ہے۔ اس نے ٹھیک وقت پر ڈھکنا پیالے پر رکھا تھا کیونکہ جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ گہرے نیلے رنگ کے سوٹ والے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، کیا اسے ہیروں سے منعکس ہونے والی روشنی کا احساس ہوگیا تھا؟ ٹام نے غنودگی کی کیفیت طاری کرتے ہوئے فرش کی طرف سر جھکا لیا اور اونگھنے لگا۔

ضرور یہ شخص مسلح ہوگا۔ ٹام نے سوچا، اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ ہیروں کا نیکلس میں نے تلاش کرلیا ہے تو یہ پہلے مجھے گولی مارے گا اور پھر نیکلس طلب کرلے گا۔ اگر اس موقع پر میں ریستوران سے نکل جاؤں تو اسے مجھ پر شک ہوجائے گا۔ لیکن اگر میں انتظار کرتا رہوں تو یہ تمام میزوں کے پیالے کھنگال کر یہ نتیجہ اخذ کرے گا کہ نیکلس میرے پیالے میں ہے۔ بلاشبہ ہیروں کا وہ نیکلس چوری کیا گیا تھا یا اسے اسمگل کیا گیا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کی ملکیت غیر قانونی تھی۔ ٹام بڑی آسانی سے یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ آخر ہیروں کا نیکلس چینی کے پیالے میں کس طرح پہنچا۔ گہرے ..... نیلے رنگ کے سوٹ والا دن میں کسی وقت اس ریستوران میں آیا ہوگا۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہوسکتی کیونکہ ریستوران والے چوبیس گھنٹوں بعد چینی تبدیل کردیتے ہیں یا تو اسے ریستوران میں داخل ہونے کے بعد احساس ہوا ہوگا کہ پولیس سراغرساں اس کے پیچھے لگے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے ہیں یا اس نے پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لیے وقتی طور پر ریستوران میں پناہ لی ہوگی تاکہ وہ ان سے جان چھڑانے کے لیے کوئی ترکیب سوچ سکے۔

سراغرساں ضرور ریستوران کے باہر کھڑا ہوا اس کی واپسی کا منتظر ہوگا۔ نیلے سوٹ والے کو جب یہ احساس ہوا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا تو اس نے یہی بہتر سمجھا کہ نیکلس ریستوران میں کسی جگہ چھپا دے تاکہ پولیس چوری یا اسمگلنگ کا مال برآمد نہ کرسکے اور بعد میں کسی وقت واپس آکر نیکلس حاصل کرلے۔ شاید اس نے ریستوران کے دروازے میں لگے ہوئے بڑے سے شیشے میں پولیس والوں کو اندر داخل ہوکر اسے گرفتار کرنے کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً نیکلس اپنے سامنے رکھے ہوئے چینی سے بھرے ہوئے پیالے کی تہ میں چھپا دیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کرکے جب جامہ تلاشی لی ہوگی تو مسروقہ مال برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے وہ بلا ثبوت اس پر کوئی الزام عائد نہیں کرسکے۔ انہیں نیلے سوٹ والے کو رہا کرنا پڑا۔ اسے یہ اندیشہ بھی ہوگا کہ کہیں پولیس اس کی نگرانی شروع نہ کردے۔ رات گئے جب اطمینان ہوگیا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا تو وہ لوٹ کا مال حاصل کرنے آگیا۔ اس نے کچھ اتنی عجلت میں نیکلس چھپایا تھا کہ اسے وہ میز یاد نہیں رہی جہاں وہ بیٹھا تھا یا وہ سمجھ رہا تھا کہ دن کے وقت چینی کے پیالے اِدھر اُدھر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اب تک وہ پتا نہیں کافی کی کتنی بدذائقہ پیالیاں حلق سے نیچے اتارنے کے باوجود ہیرے کا نیکلس تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ٹام اس ناکامی پر اس شخص کی ذہنی حالت کا اندازہ کرسکتا تھا۔ یقیناً اندر سے اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی ہوگی لیکن وہ خود نیکلس چرا کر کس صورتِ حال میں پھنس گیا تھا۔

اگر وہ جلد ہی اس ریستوران سے باہر نہیں نکلا تو اس کے بدن میں کئی سوراخ ہوجائیں گے۔ جن سے زندگی خون بن کر بہہ جائے گی۔ وہ شخص میزیں تبدیل کرتا ہوا اس کے بالکل قریب والی میز تک پہنچ گیا تھا اور تب ٹام کو کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بھاری بھرکم ابھار نظر آیا۔ ایسا ابھار جو ریوالور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عشقیہ خطوط یا کرنسی نوٹوں کا بنڈل اس قسم کے ابھار پیدا نہیں کرتے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ خود رضاکارانہ طور پر ہیروں کا نیکلس اس شخص کو لوٹا دے لیکن یہ خیال پیدا ہوتے ہی اس نے مسترد کردیا۔ وہ منظر کچھ اس قسم کا ہوتا کہ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر نیلے سوٹ والے کے پاس جاتا اور ہیروں کا نیکلس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہتا۔ ''یہ لیجیے جناب! یہ رہا آپ کا نیکلس جسے آپ اتنی دیر سے تلاش کررہے ہیں۔ میں ذرا آج کل قلاش ہوں۔ شاید آپ مجھے پچیس پچاس ڈالر انعام دینا پسند کریں۔'' اس کے جواب میں نیلے سوٹ والا کہتا۔ ''آہ۔ آپ بہت ایماندار آدمی ہیں اگر آپ جیسے چند لوگ اور پیدا ہوجائیں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ یہ لیجیے پچاس ڈالر کا نوٹ۔ میری طرف سے یہ حقیر نذرانہ قبول فرمایئے۔'' وہ نوٹ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ قیام کرتا اور جیسے ہی وہ ریستوران سے باہر نکل کر کسی تاریک کونے پر پہنچتا۔ کسی نامعلوم سمت سے چلائی گئی کئی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوکر اسے آنجہانی بنا دیتیں۔ کیونکہ نیکلس کے بارے میں اس کی زبان بند رکھنے کا صرف یہی ایک یقینی راستہ تھا کہ اسے گولی مار کر ہلاک کردیا جائے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ جی نہیں شکریہ۔ وہ اب اتنا احمق بھی نہیں تھا۔

نیلے سوٹ والا برابر والی میز پر رکھے ہوئے چینی کے پیالے کی تلاشی سے فارغ ہوگیا تھا اور اس کے بعد ٹام کی میز کا نمبر تھا خوش قسمتی سے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کلرک جو باورچی خانے میں چلا گیا تھا۔ واپس آگیا اور اس طرح نیلے سوٹ والے کو براہ راست ٹام کی میز پر آنے کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ بلا جواز ایک میز سے دوسری میز پر جانے سے کاؤنٹر کلرک اس کی طرف سے مشکوک ہوسکتا تھا۔ جس کے بعد وہ اس کی نقل و حرکت میں دلچسپی لینے لگتا اور وہ شخص یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی نقل و حرکت میں دلچسپی لے۔

شاید اس شخص کا حوصلہ جواب دے چکا تھا۔ وہ مزید ابلا ہوا پانی پینے کی تاب نہیں رکھتا تھا لیکن اسے ٹام کی میز پر آنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی میز پر سے اٹھ کر کاؤنٹر کے پاس اس سمت میں جانے لگا۔ جہاں ٹھنڈے پانی کا برقی کولر رکھا ہوا تھا۔ ٹام سمجھ گیا کہ پانی کا گلاس لے کر وہ سیدھا اس کی میز پر آئے گا اور اس کے بعد کھیل ختم ہوجائے گا۔ اسے نیکلس چھپانے کے لیے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

جسم کے جو مقامات سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ وہی کوئی چیز چھپانے کے لیے سب زیادہ محفوظ بھی ہوتے ہیں۔ کئی سال پہلے ٹام سے کسی نے یہ بات کہی تھی۔ نیکلس جیبوں میں رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص سب سے پہلے جیبوں کی تلاشی لیتا ہے موزوں میں

نیکلس چھپانے میں بہت وقت لگتا اور اس کے لیے نیچے کی طرف جھکنا بھی ضروری تھا اور اس کی یہ حرکت نیلے سوٹ والے کو مشکوک کرسکتی تھی۔ برقی کولر کی سطح اتنی چمک دار تھی کہ کوئی بھی اس میں دیکھ کر بال بنا سکتا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ گلاس میں پانی بھرتے ہوئے گو کہ نیلے سوٹ والے کی پشت اس کی طرف ہوگی لیکن کولر کی سطح آئینے کا کام انجام دیتے ہوئے اس کی ایک ایک حرکت اس شخص پر ظاہر کردے گی۔ نیکلس اس کی گود میں پڑا تھا جس پر اس نے ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا اس نے نیکلس سمیٹ کر ہتھیلی میں چھپا لیا اور مٹھی بند کرلی۔ میز سے اوپر اس کا جسم بالکل ساکت اور آنکھیں غنودگی کی حالت میں بھاری ہورہی تھیں۔ تب اس نے میز کے نیچے سے بند مٹھی نکالی اور دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرکے ایک لمبی انگڑائی لینے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی پشت کولر کی طرف تھی۔ اس نے بند مٹھی ذرا سی کھولی اور نیکلس کی لڑی کا ایک سرا مٹھی سے باہر نکل آیا۔ اس کی قمیص کی آستینیں ڈھیلی ڈھالی اور بدشکل تھیں اس نے آہستہ آہستہ نیکلس پر گرفت ڈھیلی کی اور لڑی ہتھیلی پر سے پھسلتی ہوئی کلائی کی طرف بڑھتے بڑھتے آستین کے اندر داخل ہوگئی۔ جب آدھا نیکلس آستین میں داخل ہوگیا تو اس نے آہستہ سے پوری مٹھی کھول دی۔ ہیرے کا نیکلس کسی نوکیلے جسم والے سانپ کی طرح کلبلاتا ہوا' کہنی کو چھوتا ہوا بغل میں جا کر اٹک گیا۔ اس نے فوراً اسے بغل میں دبوچ لیا اور انگڑائی توڑتا ہوا ہاتھ نیچے گرا دیے... اس کے بعد اس نے پہلے اس ہاتھ کی آستین گہنی سے اتنے اوپر چڑھائی کہ وہ اس کے بھرے ہوئے بازو پر لپٹ کر اتنی سخت ہوگئی کہ اس کا مزید اوپر چڑھنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے بغل ڈھیلی کردی۔ نیکلس پھسل کر نیچے آیا اور اوپر چڑھی ہوئی آستین کے کنارے پر پہنچ کر رک گیا۔ اس کے باہر نکلنے کا راستہ بند ہوچکا تھا تب اس نے دوسرے ہاتھ کی آستین بھی چڑھالی اور منہ کھول کر جمائی لی۔ نیلے سوٹ والا بھرا ہوا گلاس تھامے اس کی میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹام نے میز پر رکھا ہوا بل اٹھایا اور اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔ وہ بڑی کاہلی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور پتلون کی جیب میں موجود دس سینٹ کا واحد سکہ نکال کر کلرک کے سامنے رکھ دیا جو اس وقت اخبار میں اپنا پسندیدہ کالم پڑھنے میں مشغول تھا۔ اس نے سر اٹھایا اور گھور کر ٹام کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس گاہک کو ایک پیالی کافی پی کر اتنی دیر ریستوران میں بیٹھنے کے جرم میں اٹھا کر باہر پھینکنا چاہتا ہو۔

ٹام ریستوران سے باہر نکلتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس نے سر موڑ کر سرسری انداز میں نیلے سوٹ والے کی جانب دیکھا۔ وہ اس کی خالی کی ہوئی میز پر ساکت بیٹھا چینی بھرے پیالے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چمچے کی مدد سے پیالہ کھنگالنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ پیالے میں موجود چینی کی حالت سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اسے پہلے کھنگالا جاچکا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بہت تیزی سے آگے بڑھا لیکن ابھی وہ ریستوران کے برابر والی عمارت کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اسے عقب سے نیلے سوٹ والے کی آواز سنائی دی۔

''اے مسٹر، سنو، ذرا ایک منٹ!'' آواز میں ریشم جیسی نرمی اور سرسراہٹ تھی۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جسے محسوس کرکے ٹام کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ نیلے سوٹ والا ریستوران کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ٹام نے پلٹ کر جیسے ہی اگلا قدم اٹھایا۔ وہ شخص اس کے قریب پہنچ گیا۔ ٹام نے اسے حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''ماچس ہوگی دوست؟'' اس نے کہا۔

اب بھاگنے کا موقع نکل چکا تھا۔ اس نے بے دلی کے ساتھ جیبوں پر ہاتھ مارا۔ ''ریستوران والوں کے پاس کیا ماچس نہیں تھی؟''

''پتا نہیں دوست، میں نے پوچھا نہیں۔'' اس نے بے حد نرم لہجے میں جواب دیا۔ ''ٹھہرو میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ میں جیبوں سے چیزیں برآمد کرنے کا ماہر ہوں۔ ذرا پیچھے ہوجاؤ۔ اس دروازے کے پاس۔'' اس نے آنکھوں سے عمارت کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ''کہیں تمہیں ٹھنڈی ہوا نہ لگ جائے۔''

اس کی آواز کی نرمی اور سرسراہٹ سننے والے کو پاگل بنا دیتی تھی شاید وہ یہ لب و لہجہ اسی لیے اختیار کرتا تھا کہ مقابل غصے میں آکر کوئی غلط حرکت کر بیٹھے جس پر اسے قتل کرنے کا جواز پیدا ہوجائے۔ ٹام غصے میں کوئی حرکت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے جنبش کرنے سے پہلے نیلے سوٹ والے کے ہاتھ میں ریوالور چمک رہا تھا۔

''یہ کیا ہے؟ تم مجھے لوٹنا چاہتے ہو؟ ٹام نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس کیا رکھا ہے، کسی مالدار.....''

''خاموش ہوجاؤ دوست، کوئی ایسی بات مت کہنا کہ جس پر بعد میں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ کھڑے رہو۔'' آواز

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلے سے زیادہ دھیمی ہوگئی تھی۔ ٹام کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عمارت کے بند دروازے سے پشت لگا کر کھڑا ہوگیا۔ نیلے سوٹ والے نے ریوالور والا ہاتھ ذرا سا پیچھے ہٹایا اور خود اس کے قریب آگیا۔ ایک گز کے فاصلے سے گزرنے والا راہگیر بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے جلدی سے سڑک کے دائیں بائیں دیکھا۔ اس پھرتی کے ساتھ کہ اس مختصر وقفے میں ٹام کوئی حرکت نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ ٹام اس وقت کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر اس کے پاس ہیرے کا نیکلس نہیں ہوتا تو اس کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی لیکن اب اسے زندگی سے لطف اندوز ہونے کا ایک بہت مضبوط سہارا مل گیا تھا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ ہیرے زندگی نہیں لوٹا سکتے بس زندگی کو پُرلطف بنا سکتے ہیں۔

نیلے سوٹ والے کی مہارت دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ساری زندگی دوسروں کی جامہ تلاشی لیتا رہا ہے۔ اس کی انگلیوں نے لباس کی کوئی سلائی بھی نہیں چھوڑی۔ اوپر چڑھی ہوئی آستین میں نیکلس کا وزن ایک نقطے پر بڑھتا جا رہا تھا۔ شاید اس مقام پر آستین کا کپڑا اچھی طرح لپٹا نہیں تھا۔ وہاں کوئی درز چھوٹ گئی تھی۔ یا کپڑا ڈھیلا رہ گیا تھا۔ نیکلس آہستہ آہستہ اس کمزور مقام کے اندر گھس رہا تھا۔ ٹام کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ دروازے کے پاس کافی اندھیرا تھا۔ اور نیلے سوٹ والا اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''واقعی تم بالکل پھکو ہو۔ تمہارے پاس ایک سکہ بھی نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''اب نیچے جھک کر جوتے اتار دو۔'' اس نے نیا حکم دیا۔

ٹام کے پاس حکم کی تعمیل کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ جھک کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔ وہ نیکلس والے ہاتھ کو بڑی احتیاط سے حرکت دے رہا تھا لیکن نیکلس نیچے کی طرف کھسکتا جا رہا تھا۔ اس نے جوتے اتار کر فٹ پاتھ پر رکھ دیے۔ نیلے سوٹ والے نے جوتے ہلا کر دیکھے اور پھر انہیں عمارت کے دروازے کی طرف پھینک دیا۔

''ٹھیک ہے اب تم ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ۔''

اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر ٹام کے موزے ٹٹولے اور پھر یہی عمل دوسرے موزے کے ساتھ دہرایا۔ پھر ناکام ہو کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک منٹ تک وہ خالی خالی نظروں سے چپ چاپ ٹام کو گھورتا رہا۔ اس نے ہر جگہ تلاش کر لی تھی۔ بس صحیح مقام پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔

''میرے پاس کیا رکھا ہے؟ تم کیا تلاش کر رہے تھے؟'' ٹام نے جھگڑنے والے انداز میں پوچھا۔

''میں طب کا طالب علم ہوں اور تمہیں ٹٹول کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم آخر کیسے زندہ ہو۔'' اس نے پھنکارتے ہوئے کہا پھر شاید اسے وہ چند میز پر یاد آگئیں جن پر رکھے ہوئے پیالے اس نے اب تک نہیں دیکھے تھے۔ ''اپنی زبان بند رکھنا کسی سے اس کا ذکر مت کرنا۔'' نیلے سوٹ والے نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور پلٹ کر ریستوران کی طرف چل دیا۔

ٹھیک اس وقت زمین کی کشش اپنا کام دکھا گئی نیکلس کو باہر نکلنے کا راستہ مل گیا۔ وہ آستین کے اندر سے پھسلتا ہوا ٹام کے قدموں کے پاس گر گیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود ہیرے ہلکی روشنی کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ فوراً ہی ٹام نے نیکلس پر موزے والا پیر رکھ دیا۔

نیلے سوٹ والا چند قدم ہی بڑھا تھا۔ وہ رکا پلٹا اور اس نے جیب سے ایک سکہ نکال کر ٹام کی طرف اچھالا۔ ''یہ لو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میں تمہیں لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔''

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیلے سوٹ والا اپنے قدموں کی چاپ میں نیکلس کے گرنے کی آواز نہیں سن سکا یا شاید وہ خیالوں میں بری طرح ڈوبا ہوا تھا۔ سکہ لڑھکتا ہوا ٹام سے دور چلا گیا تھا۔ وہ شخص پلٹا اور دوبارہ ریستوران کی طرف چل دیا۔ ٹام اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ جگ مگ کرتے ہوئے نیکلس پر سے پیر ہٹانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کا سارا بدن سردی کے باوجود پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔

اس نے جھک کر نیکلس اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ریستوران کی مخالف سمت کی طرف چل دیا۔ اس نے فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے پچیس سینٹ کے سکے کو اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ وہ سکہ اب اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا جو آدھے گھنٹے پہلے اگر اسے ملتا تو اس کے لیے کسی خزانے سے کم ثابت نہیں ہوتا۔ بہت دور نکلنے کے بعد اسے یاد آیا کہ ریستوران میں نیلے سوٹ والے کے علاوہ کاؤنٹر کلرک بھی موجود تھا۔ نیکلس تلاش کرتے ہوئے اس کی تمام تر توجہ سوٹ والے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس نے کلرک پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ہوسکتا ہے نیلے سوٹ والا واپس

جا کر کلرک سے سوالات کرے تو وہ بتا دے کہ ہاں وہ قلاش آدمی شکر کے پیالے میں چمچہ گھما تو رہا تھا اور تب اسے ایک بات اور بھی یاد آئی کہ اس نے پچیس سینٹ کا سکہ فٹ پاتھ پر سے نہ اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی ہے اگر نیلے سوٹ والا اسے تلاش کرتا ہوا دوبارہ اسی جگہ آیا تو سکہ اسے نظر آجائے گا اور پھر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ جس شخص کی تلاشی لینے پر ایک سینٹ بھی برآمد نہ ہوا جو اس قدر پھکو ہو۔ وہ آخر کیوں پچیس سینٹ کا سکہ اس طرح چھوڑ کر چلا گیا اور وہ اس سے یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ اس قلاش کے پاس ہیرے کا نیکلس موجود تھا۔ اس لیے وہ بڑی عجلت میں فرار ہوا اور پچیس سینٹ کا سکہ بھی اٹھانا بھول گیا۔

ٹام نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ بہت دور اسے ریستوران کے دروازے سے باہر نکلنے والی روشنی نظر آرہی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص دروازے سے باہر نکلا اور بڑی عجلت سے اس طرف بڑھا جہاں تین منٹ قبل ٹام نے جامہ تلاشی دی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کلرک نے اسے پیالے میں چمچہ گھماتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور نیلے سوٹ والے کو یہ اطلاع مل گئی تھی۔ ٹام نے اس سائے کو لمحے بھر کے لیے رک کر فٹ پاتھ پر جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے زمین پر سے کوئی چیز اٹھائی۔ چند لمحے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ ٹام نے رخ پھیرا اور عمارتوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ تاریکی میں دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی ذرا سی بے پروائی نے پانسا پلٹ دیا تھا۔ اب نیلے سوٹ والے کو یقینی طور پر اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ نیکلس اسی کے پاس ہے۔

وہ تیزی سے گلیوں میں مڑتا ہوا اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ اسے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی نہیں دیں۔ جب مزید بھاگنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا تو وہ ایک عمارت کا سہارا لے کر اکھڑی ہوئی سانسوں کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ فی الحال وہ اپنے دشمن کو چکما دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ لیکن وہ ان سے زیادہ عرصے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ نیلے سوٹ والے نے بہت قریب سے اچھی طرح اس کی صورت دیکھی تھی اور اب اس کا پورا گروہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔ ٹام کو یقین تھا کہ نیلے سوٹ والا ضرور کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو اس کی گفتگو اور انداز سے ظاہر ہو رہا تھا۔ جب تک نیکلس اس کے پاس رہے گا۔ وہ اسے شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتے رہیں گے اور وہ دہشت زدہ خرگوش کے مانند کونوں کھدروں میں پناہ لیتا رہے گا۔ یہ کھیل نیکلس کی بازیابی اور اس کی موت پر ہی ختم ہوگا۔ نیکلس پولیس کے حوالے کرنے پر بھی اس کی جان نہیں بچتی۔ وہ انتقام کے لیے اسے ضرور تلاش کریں گے اور پولیس بہرحال غیر معینہ مدت تک اس کی حفاظت نہیں کر سکتی جب کہ وہ انتقام لینے کے غیر معینہ مدت تک انتظار کر سکتے ہیں۔ پولیس کے پاس جانے میں اور بھی کئی قباحتیں مضمر تھیں۔ ایک آوارہ گرد کے ہاتھ میں ہیرے کا نیکلس دیکھ کر وہ نیکلس چرانے کے الزام میں اسے بند بھی کر سکتے تھے۔ وہ اس کی کہانی پر کبھی یقین نہیں کریں گے کہ ہیرے کا نیکلس اسے شکر کے پیالے میں پڑا ملا تھا اور یہی سمجھیں گے کہ وہ خود بھی اس گروہ کا فرد ہے اور اس نے ڈبل کراس کر کے نیکلس ہضم کرنے کی ناکام

مشرقی مشروبات

مشرقی و مغربی مشروبات کا موازنہ کرنے سے پہلے یہ بنیادی اصول ذہن نشین کر لینا ازبس ضروری ہے کہ ہمارے یہاں پینے کی چیزوں میں کھانے کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اپنے قدیم مشروبات مثلاً یخنی، ستو اور فالودے پر نظر ڈالیے تو یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ستو اور فالودے کو خالصتاً لغوی معنوں میں نہ آپ کھا سکتے ہیں اور نہ پی سکتے ہیں بلکہ اگر دنیا میں کوئی ایسی شے ہے جسے آپ بامحاورہ اردو میں بیک وقت کھا پی سکتے ہیں تو یہی ستو اور فالودہ ہے جو ٹھوس غذا اور ٹھنڈے شربت کے درمیان ایک ناقابل بیان سمجھوتہ ہے لیکن آج کل ان مشروبات کا استعمال خاص خاص تقریبوں میں ہی کیا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اب ہم نے عداوت نکالنے کا ایک اور مہذب طریقہ اختیار کیا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی چراغ تلے سے اقتباس
مرسلہ: گل ناز رئیس، گلستان جوہر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوشش کی ہوگی اور جب گروہ اس کے پیچھے لگ گیا تو پناہ کے لیے یہ ہمارے پاس آگیا اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ممکن ہے وہ اس کی حفاظت کرنے کی ذمے داری قبول نہ کرتے اور اگر قبول کر بھی لیتے تو غیر معینہ مدت تک وہ حفاظت جاری نہیں رہ سکتی تھی۔

اس کے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی پیسا نہیں تھا۔ اس کا کوئی اثر ورسوخ نہیں تھا۔ ان کے بغیر ایک گروہ کے خونی پنجوں سے بچنا انتہائی مشکل کام تھا جو ناممکن بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے نیکلس تلاش نہ کیا ہوتا۔ وہ اسے شکر کے پیالے میں ہی چھوڑ دیتا۔ ایک دفعہ اسے خیال آیا کہ وہ نیکلس کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دے لیکن یہ اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔

وہ ہر نئے موڑ پر مڑنے سے پہلے احتیاط کے ساتھ دائیں بائیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ آوارہ گرد بے فکروں کے بڑے مزے ہوتے ہیں۔ وہ پرندوں کی طرح نقل وحرکت کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے اور صرف ایسے آوارہ گرد پر صادق آتا ہے جس کی جیبوں میں رقم ہو، لباس اچھا ہو لیکن پھکو اور قلاش لوگ انتہائی بدقسمت ہوتے ہیں۔ رات گئے اگر گشتی پولیس والوں کی نظریں پڑ جائیں تو وہ بلاتکلف اسے اٹھا کر بند کردیتے ہیں۔ ان کی عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد اپنے علاقوں میں محدود ہوجائیں جہاں کے گشتی پولیس والے بھی ان کی صورت سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس موقع پر وہ پولیس کے ہاتھوں گرفتاری اور جامہ تلاشی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

پارکوں کے دروازے اس پر بند ہوچکے تھے۔ وہ رات بارہ بجے بند کردیے جاتے تھے۔ شہر کے اچھے علاقوں کی سڑکوں پر پہنچتے ہی اس کا دھر لیا جانا یقینی امر تھا۔ اس جیسے مفلس اور قلاش لوگوں کے لیے آدھی رات کے بعد سر چھپانے کے لیے صرف دو مقام ہوتے ہیں۔ زمین دوز ریل کے اسٹیشن یا تیسرے درجے کے انتہائی گھٹیا ہوٹل جہاں غریب قسم کے لوگ سستی سی طوائفوں کے ساتھ رات گزارتے ہیں۔ اس کے پاس جب کبھی پیسے ہوتے تھے۔ وہ راتیں اسی قسم کے ایک ہوٹل میں گزارتا تھا۔ اب سوال پیسوں کا تھا۔ وہ ایک ایسا ٹھکانا جانتا تھا جہاں وہ رات کے اس پہر کوئی چیز فروخت کرکے عجلت میں کچھ پیسے بنا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا ہوا تھا کہ وہ نیکلس جوڑنے والے کڑے کو علیحدہ کرکے فروخت کردے گا اور پھر سیدھا ہوٹل میں کمرا لے کر سوجائے گا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کڑا چاندی کا بنا ہوا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ سفید سونا ہو یا پھر اس سے زیادہ قیمتی دھات پلاٹینم کا بنا ہوا ہو۔ اب وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ ان حالات میں وہ نیکلس کا کوئی ہیرا فروخت کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے فوری طور پر کچھ رقم کی ضرورت تھی تاکہ وہ سڑکوں پر سے غائب ہوکر کسی بند کمرے میں پناہ لے سکے اور اس طرح پولیس اور بدمعاشوں کی نظروں سے اوجھل ہوجائے۔

اس کے سامنے کڑے کو باقی نیکلس سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ تھا۔ وہ جس علاقے کی طرف جارہا تھا۔ وہاں اگر کوئی اس کے پاس ہیرے کا نیکلس دیکھ لیتا تو فوراً اس جیسے آوارہ گردوں میں یہ خبر پھیل جاتی اور پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے کوئی اس کا حلق کاٹ کر نیکلس اڑا لے جاتا۔ یہ تو ہیروں کا نیکلس تھا۔ وہ لوگ تو سو دو سو ڈالر کے لیے بھی کسی کو قتل کرنے سے نہیں چوکتے، تیسرے ایونیو کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ پاور ہاؤس کی جالیوں کے پاس رک گیا جس کا چوکیدار اس کی شکل وصورت سے واقف تھا اور کئی بار ان کے درمیان دعا سلام بھی ہوئی تھی۔ چوکیدار تمام رات وقفے وقفے سے پاور ہاؤس کے گرد چکر لگاتا رہا تھا۔ وہ اس کی آمد کا انتظار کرتے ہوئے مشینوں کو گھورنے لگا۔ چوکیدار جالی کے دوسری طرف اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"سنو دوست!" ٹام نے چوکیدار سے کہا۔ "تمہارے پاس کوئی پلاس وغیرہ ہوگا؟ میں ابھی تمہیں واپس کردوں گا۔ بس ایک منٹ کے لیے چاہیے۔"

"تم پلاس کا کیا کروگے؟" چوکیدار نے اسے شک بھری نظروں سے دیکھا۔

"میرے جوتے میں کیل نکل آئی ہے جس نے میرا پیر زخمی کردیا ہے۔" ٹام نے جواب دیا۔ "وہ کیل نکالنی ہے۔"

چوکیدار چند لمحے اس کے بیان کی سچائی کو تولتا رہا پھر خاموشی سے پلٹا اور اندر سے ایک چھوٹا سا اوزار لے آیا۔ جس سے تار کاٹے جاتے تھے۔ "یہ واپس کردینا۔" اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے اسے بیچنے کی کوشش کی تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"فکر نہ کرو دوست، بس ایک منٹ میں آیا۔" ٹام لنگڑاتا ہوا قریبی عمارت کے دروازے پر بیٹھ گیا جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے جیب سے تہ کیا ہوا اخبار کا ٹکڑا نکالا

جو اس نے راستے میں کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھالیا تھا اور اسے گود میں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ وہاں بہت زیادہ اندھیرا تھا لیکن وہ روشنی میں یہ حرکت کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے نیکلس نکال کر انگلیوں سے اس کا کڑا ٹٹولا۔ خوش قسمتی سے اس کی دھات نرم تھی اور وہ پلاس سے ذرا زور لگانے پر باقی نیکلس سے فوراً علیحدہ ہوگیا۔ اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر کڑا اس میں لپیٹ دیا اور پھر وہ اندھیرے میں انگلیوں سے ٹٹول کر اس کے ہیرے علیحدہ کرنے لگا۔ اس سارے کام میں اسے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس نے ہیرے اخبار کے دوسرے ٹکڑے میں لپیٹے اور دونوں پڑیاں الگ الگ جیبوں میں رکھ لیں۔

پاور ہاؤس کا چوکیدار بڑی بے تابی سے اس کی واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ اس نے تقریباً چھینتے ہوئے پلاس اپنے قبضے میں کرلیا اور گھور کر ٹام کو دیکھنے لگا۔ "کہاں رہ گئے تھے؟ کیا چرس بھری سگریٹ کا دم لگا رہے تھے؟ آئندہ کبھی میرے پاس کوئی چیز مانگنے مت آنا۔ سمجھ گئے؟"

ٹام نے اثبات میں سر ہلایا۔ اپنی منزل کی طرف بڑھ گیا۔ بدقسمتی سے چوری کا مال خریدنے والوں کی دکانیں اس وقت تک نہیں کھلی تھیں۔ وہ فیڈرل بار نامی شراب خانے میں چلا گیا۔ اس کے پاس کبھار ہی اتنی رقم ہوتی تھی کہ وہ شراب پی سکے لیکن اس شراب خانے کا مالک ایک رحم دل آدمی تھا اور اکثر کڑاکے کی سردیوں میں اسے شراب خانے کے ایک کونے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیتا تھا۔

اتنی رات گئے بھی وہاں دو تین گاہک موجود تھے اور کاؤنٹر پر چپ چاپ بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ٹام نہیں چاہتا تھا کہ وہ شرابی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنیں۔ وہ شراب خانے کے ایک کونے میں چلا گیا اور بارٹینڈر کو اشارہ کرکے اپنی طرف بلایا۔ بارٹینڈر کو خطرہ محسوس ہوا کہ وہ شاید مفت شراب پینے کے چکر میں ہے۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی اور کاؤنٹر پر ہی سے بولا۔ "کیا بات ہے؟"

"ادھر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔" ٹام نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ زیادہ بلند نہیں تھا لیکن تینوں گاہک چونک کر گردنیں گھماتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بارٹینڈر کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر اس کے پاس آگیا۔ ٹام نے اپنی پشت گاہکوں کی جانب پھیر لی نروس انداز میں اخبار کی ایک پڑیا جیب سے نکالی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں بارٹینڈر چاندی کے ایک ٹکڑے کے عوض اسے ایک ڈالر دے گا یا نہیں۔ دوسری طرف اسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں شراب خانے میں موجود کوئی گاہک اسے پڑیا میں سے چاندی کا ٹکڑا نکالتے ہوئے نہ دیکھ لے۔ وہ ان تفکرات ..... میں اس قدر گم تھا کہ اسے غلط پڑیا کھولنے کا احساس نہیں ہوسکا۔

بارٹینڈر کی نیند سے بوجھل آنکھیں ہیروں کی چمکا چوند سے یکایک بیدار ہوکر خوب پھیل گئیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ حالانکہ ہیروں کی ایک جھلک نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ پڑیا کھلتے ہی ٹام کے ہوش وحواس اڑ گئے۔ چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے پڑیا بند کردی۔

"ٹھہرو، ٹھہرو۔ ذرا صبر کرو۔ دیکھنے تو دو یہ کیا ہے؟" بارٹینڈر کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے کی کوشش کررہی تھیں۔

ٹام اتنی دیر میں پڑیا واپس پتلون کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ اب دوسری پڑیا نکالنا فضول ہوگا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ خوف بھری نظروں سے بارٹینڈر کو دیکھتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا ایک شرابی اسٹول کھسکاتے ہوئے ان کی طرف آنے لگا۔ اس نے بارٹینڈر کے چہرے پر تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ لیے تھے اور اب وہ اس کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

"کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔" ٹام نے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "شیشے کے ٹکڑے ہیں۔ کچھ دیر پہلے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھائے تھے۔ بالکل اصلی لگتے ہیں؟"

شیشوں کے ٹکڑوں کا اصلی یا نقلی ہونے کا تو ٹام کے چہرے سے ہی پتا چل رہا تھا۔

"مجھے ذرا قریب سے دیکھنے دو۔ میں اصل اور نقل میں تمیز کرسکتا ہوں۔" بارٹینڈر نے کہا اور جب اس نے دیکھا کہ ٹام شراب خانے سے باہر نکلنے والا ہے تو اس نے جلدی سے کہا۔ "ادھر آؤ دوست، ایسی بھی کیا جلدی، میری طرف سے سرخ شراب کا ایک جام پی لو۔"

ٹام تیزی سے باہر نکل آیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اب اسے بہت جلدی کوئی ٹھکانا تلاش کرنا پڑے گا اور اس کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ بارٹینڈر کو بے وقوف نہیں بنا سکا تھا۔ ویسے بھی وہ ہیروں کو شناخت کرچکا تھا۔ اب وہ ہر آنے جانے والے گاہک سے اس واقعے کا تذکرہ کرے گا بلکہ اس وقت بھی وہ شراب خانے میں موجود گاہکوں کو اس سنسنی خیز تجربے کے متعلق

WWW.PAKSOCIETY.COM

بتا رہا ہوگا اور یہ بھی ممکن تھا اسے تلاش کرتا ہوا اگر وہ یا اس کا کوئی بد معاش وہاں پہنچ جائے اگر ایسا ہوا تو انہیں ابھی صرف اس کے حلیئے کا علم ہے۔ تب اس کے نام کا بھی پتا چل جائے گا اور پھر اس کی تلاش آسان ہو جائے گی۔ اس وقت اسے کسی پناہ گاہ کی شدت سے ضرورت تھی جس کے لیے اسے صرف پچاس سینٹ درکار تھے۔ وہ سیدھا سلور فلیش نامی شراب خانے میں داخل ہوا۔ وہاں بھی لوگ اس سے واقف تھے۔ اس مرتبہ پڑیا کھولنے میں اس سے کوئی غلطی نہیں ہوئی لیکن ایسا کرتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ بارٹینڈر نے غور سے سفید کڑے کو دیکھا اور ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔

"یہ کیا ہے؟ میں اس کا کیا کروں؟ تمہیں کہاں سے ملا؟"

"ایک دوست نے مجھے دیا ہے۔" ٹام نے جواب دیا۔ "خالص چاندی کے بنے ہوئے ہیں، انہیں رکھ لو مجھے کل تک کے لیے صرف ایک ڈالر دے دو۔"

"مجھے کیا پتا یہ چاندی کے بنے ہوئے ہیں؟ اور میں یہاں قرض دینے کا کاروبار تو نہیں کرتا۔"

شراب خانے میں اس وقت کوئی گاہک نہیں تھا۔ گفتگو کی آوازیں سن کر شراب خانے کا مالک اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے ملازم کے ہاتھ سے کڑا لے کر غور سے اسے دیکھا۔ جیسے وہ خود کبھی جوہری رہا ہو یا کسی سنارے پر ملازمت کی ہو پھر وہ کڑا روشنی کے قریب لے گیا۔ چند لمحوں بعد وہ واپس لوٹ آیا۔

"یہ چاندی کا تو نہیں ہے۔ پھر بھی اسے ایک ڈالر دے دو۔" مالک نے ملازم سے کہا اور دونوں کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔ مالک نے کڑے پر چودہ کیریٹ خالص سونا کی لگی ہوئی مہر دیکھ لی تھی۔ اور وہ سمجھ گیا تھا کہ کڑا سفید سونے سے بنا ہوا ہے۔

شراب خانے سے باہر نکل کر اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اب اس کے پاس کچھ پیسے آگئے تھے اور پچھتر سینٹ ادا کر کے تو وہ پورے ایک کمرے کا چوبیس گھنٹے تک مالک بن سکتا تھا۔ اس کے بعد بھی پچیس سینٹ بچ جائیں گے جن سے وہ عمدہ قسم کا ناشتا بھی کر سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب وہ سڑکوں پر سے غائب ہو سکتا تھا اور اب بدمعاشوں کا گروہ اسے آسانی کے ساتھ تلاش نہیں کر سکے گا۔ وہ قریب ترین ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے کاؤنٹر پر پچھتر سینٹ ادا کیے تو کلرک نے اسے ایک چابی تھما کر کمرے تک پہنچنے کا راستہ بتایا۔ وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا دوسری منزل پر پہنچا۔ کوریڈور کے کنارے پر ایک میز رکھی تھی۔ جس پر گزشتہ شام کے کئی اخبار رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چلتے چلتے ایک اخبار اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

وہ خبر اخبار کے پہلے صفحے پر موجود تھی۔ گزشتہ صبح دس بجے شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں واقع ایک اپارٹمنٹ میں نقاب پوش ڈاکو داخل ہوا اس نے ریوالور دکھا کر مالکہ اور ملازمہ کو رسیوں سے باندھ دیا اور 25 ہزار ڈالرز کی مالیت کا نیکلس لے کر فرار ہو گیا..... ٹام کی نظریں پچیس ہزار..... ڈالرز کے ہندسوں پر آ کر پتھرا گئیں۔ وہ اس سے آگے نہیں پڑھ سکا نہ ہی اسے واردات کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی تھی۔

"پچیس ہزار ڈالرز" اس کا دل پوری قوت سے دھڑکنے ..... لگا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنا چاہتا ہو۔ اس کی پنڈلیاں بے جان ہو گئیں اور وہ بستر پر گر پڑا۔ اچانک اس کا سارا بدن برف کی طرح سرد ہو گیا تھا اور ٹانگیں کپکپانے لگیں اس کا اپنا تخمینہ ہزار ڈالرز سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن اب اسے پتا چلا کہ تمام رات اس کی جیبوں میں 25 ہزار ڈالرز کی مالیت کا نیکلس پڑا رہا۔ اس انکشاف نے اسے دہشت زدہ کر دیا۔ بہت دیر تک وہ بستر پر پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔

پولیس کے پاس نہ جانے کے سلسلے میں اس کے ذہن نے جتنے منطقی دلائل پیش کیے تھے۔ وہ سب دھرے رہ گئے۔ وہ ہر قیمت پر جلد از جلد اس نیکلس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ نیکلس چوری کرنے کے الزام میں اسے دھر لیتے ہیں تو دھر لیں اگر اسے بدمعاشوں کے خلاف تحفظ مہیا نہیں کیا جاتا تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہر افتاد کے لیے تیار تھا لیکن اتنا قیمتی نیکلس اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے فوراً پولیس کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ اتنا وقت ضائع کر کے اس نے بڑی حماقت کا ثبوت دیا اور نیکلس توڑ کر اس کا کڑا فروخت کرنے والی حماقت کا تو کوئی جواب ہی نہیں تھا لیکن جب وہ خود پولیس کو نیکلس کے ہیرے واپس کرے گا تو وہ ضرور رعایت سے کام لیں گے۔ اس کے ساتھ اتنی سختی نہیں کی جائے گی۔

اگر وہ نیکلس اپنے پاس رکھتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر وہ اتنے قیمتی نیکلس کو فروخت کرتا تو اس کوشش کے دوران ہی پکڑ لیا جائے گا یا ممکن ہے انہیں اسے تلاش کرنے میں چند گھنٹے لگ جائیں۔ اتنی مہنگی چیز بیچ کر کوئی بھی گرفتار

ہونے سے نہیں بچ سکتا۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ نیکلس فروخت نہ کرے اور اسے اپنے پاس ہی رکھ لے۔ اس کے پاس رہے گا۔ بدمعاشوں کا گروہ اس کے پیچھے لگا رہے گا۔ اس کے ساتھ جب بارٹینڈر کی زبانی یہ خبر اس علاقے میں پھیلے گی تو کچھ اور لوگ بھی قسمت آزمانے نکل کھڑے ہوں گے کیونکہ وہ تنہا تھا۔ بے یارومددگار، اس لیے کسی کا اس سے خوف زدہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ فوراً ہی ایک فیصلہ کرکے اچھل کر بستر پر سے کھڑا ہوگیا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پاس 25 منٹ موجود تھے۔ وہ ٹیلی فون پر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے گا اور پھر اپنے کمرے میں آکر ان کا انتظار کرے گا۔ یہ آسان اور قابلِ عمل ترکیب تھی۔ اس میں زیادہ ہمت وجرأت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تھانے جاکر ان کی نظروں کے سامنے پورا واقعہ دہرانے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

ہوٹل میں کوئی فون نہیں تھا۔ وہ فون تلاش کرنے نکل کھڑا ہوا اور اپنے خیالوں میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ فیڈرل نامی شراب خانے کے دروازے پر ایک لمبی سیاہ کار بھی نہ دیکھ سکا۔ یہ وہی شراب خانہ تھا جس کے بارٹینڈر کے سامنے اس نے غلطی سے ہیروں والی پڑیا کھول دی۔ اس علاقے میں فیڈرل جیسے شراب خانوں کے گاہک ایسی کاریں استعمال نہیں کرتے۔ اس کی آنکھیں نیلے اور سفید رنگ کے اس بورڈ کو تلاش کررہی تھیں۔ جن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اندر پبلک بوتھ موجود ہے۔ اور کوئی بھی اسے استعمال کرسکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی نظریں سرسری انداز میں اس لمبی سی سیاہ رنگ کی گاڑی پر پڑیں لیکن اس کا ذہن اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہا۔

پبلک ٹیلی فون ایک چھوٹے سے ریستوران میں تھا جو کھلی دیوار پر نصیب تھا۔ اس کے گرد بوتھ نہیں تھا اور وہاں اس وقت چند گاہک بھی موجود تھے جو اس کی آواز سن سکتے تھے، مجبوری تھی۔ دوسرے کسی فون کی تلاش میں اسے بہت دور جانا پڑتا۔ اس کے سامنے ایک صورت یہ تھی کہ وہ باہر سڑکوں پر کسی گشتی سپاہی کو تلاش کرے۔ اس میں دو قباحتیں تھیں ایک تو یہ کہ اسے پتا نہیں کتنی دیر تلاش کرنا پڑتا دوسرے یہ کہ کانسٹبل اس کا حلیہ دیکھ کر کہ وہ معمولی قسم کا آوارہ گرد ہے۔ اس کے ہتھکڑیاں بھی ڈال سکتا تھا اور نیکلس کی بازیابی کو اپنا کارنامہ بنا کر پیش کرسکتا تھا کہ اس کی ترقی کے امکانات زیادہ روشن ہوجائیں۔ وہ معمولی قسم کے پولیس والوں کی ہٹ دھرمی اور بدنیتی سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے دس سینٹ کا سکہ آلے میں ڈالا اور آپریٹر کو پولیس ہیڈکوارٹر سے رابطہ ملانے کی ہدایت کی۔ اس نے ماؤتھ پیس کے گرد ہتھیلی کا حصار کھڑا کردیا تھا تاکہ اس کی آواز زیادہ دور تک نہ پھیلے۔

"پولیس ہیڈکوارٹر۔"

ٹام نے ایک گہرا سانس لیا۔ "میں، میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" اس نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"وہ..... وہ 25 ہزار ڈالرز کا نیکلس جو کل صبح کسی عورت سے ڈاکو چھین کرلے گئے تھے۔ اس کے بارے میں۔"

ٹیلی فون پر ایک آواز بھری جو زیادہ تحکمانہ تھی۔ "تم نیکلس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو۔" اس تحکمانہ لب ولہجے نے اس کی ہمت بالکل ہی ختم کردی۔

"میں..... میرا خیال ہے کہ وہ میرے پاس ہے۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ نیکلس تمہارے پاس ہے! تم کون ہو؟"

"میں..... میں۔" وہ گڑبڑا گیا۔ اسے اپنا نام استعمال کیے ہوئے اتنی مدت ہوگئی تھی کہ ان نازک لمحات میں اس کے ذہن سے اپنا نام نکل گیا۔ "میں ٹام ہوں جناب۔" اسے اپنا نام ٹھیک وقت پر یاد آگیا اور اس کی وجہ سے اس کی کچھ خود اعتمادی بھی بحال ہوگئی۔ "اس میں پندرہ ہیرے ہیں۔ جناب وہ مجھے آٹھویں شاہراہ پر واقع ایک ریستوران میں شکر کے پیالے کی تہ میں ملا تھا۔" اچانک اس کے سارے بدن سے پسینا پھوٹنے لگا۔ پولیس والے کبھی اس کی کہانی پر یقین نہیں کریں گے۔ اس نے سوچا، کس قدر احمقانہ بات تھی۔ 25 ہزار ڈالرز کی مالیت کا نیکلس اور ایک گھٹیا سے ریستوران میں شکر کے پیالے میں پڑا ہوا تھا۔ کون یقین کرے گا بھلا۔ "میں..... میرا مطلب ہے کہ میں لعل امریکا ہوٹل کی تیسری منزل پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہاں بولری کے علاقے میں۔ کیا میں آپ کا انتظار کروں جناب؟" اس نے جلدی سے بات ختم کردی۔

"ضرور ہم جلدی وہاں پہنچ جائیں گے۔" جواب ملا۔ ٹام کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ افسر ساتھ یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ اور پھر تمہاری اچھی طرح خبر لیں گے۔

اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور آستین سے پیشانی خشک کرتا ہوا ریستوران سے باہر نکل آیا۔ پولیس افسر کا لب ولہجہ اس کے مستقبل کی نشاندہی کررہا تھا۔ اس کے باوجود ٹام خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا پانچ دس منٹ

بعد اسے نیکلس کے بارے میں کوئی فکر نہیں رہے گی۔ پولیس والے جانیں اور ان کا کام جانے۔ وہ اس ذمے داری سے سبک دوش ہوجائے گا۔ اسے اپنی پروا نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ پولیس یہی کرسکتی تھی کہ اس پر نیکلس چوری کرنے کا الزام عائد کردیں اور عدالت اسے پانچ سات سال کی سزا سنادے اور اس طرح کم از کم وہ بدمعاشوں کے انتقام سے تو محفوظ ہوجائے گا۔ جب وہ واپس اپنے ہوٹل کی طرف جارہا تھا تو فیڈرل نامی شراب خانے کے قریب سے گزرا۔ سیاہ رنگ کی لمبی کار اب وہاں نہیں تھی۔ وہ دوسرے شراب خانے میں جھانکتی نظر آئی جہاں اس نے نیکلس کا ٹکڑا ایک ڈالر کے عوض فروخت کیا تھا لیکن اس مرتبہ بھی وہ اس گاڑی کی اہمیت نہیں سمجھ سکا اگر وہ پہلی مرتبہ اس کار کو فیڈرل شراب خانے کے دروازے پر دیکھ کر اس کی موجودگی محسوس کرلیتا تو شاید اب اسے دوسرے شراب خانے پر اسی کار کی موجودگی معنی خیز نظر آتی۔ وہ ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوا۔ استقبالیہ کلرک کی نشست خالی پڑی تھی۔ وہ سیڑھیاں طے کرتا ہوا تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے کے دروازے کے پاس جاکر اس کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔ جس کی بہ ظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی پھر اس کے دوسرے حواس بھی چھٹی حس کی مدد پر آگئے اس نے دروازے کے نیچے اپنے کمرے میں روشنی دیکھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بتی گل کرکے گیا تھا۔ کیونکہ اس قسم کے ہوٹلوں میں ایسی حرکتوں پر خفا ہونے کا قانون رائج ہوتا ہے پھر اسے اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"وہ کمرے میں کیوں چھوڑ کر جائے گا؟ تم ساری رات اس کمرے کی تلاشی لیتے رہو، کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ اسے ہماری سن گن مل گئی تھی۔ اس لیے وہ یہاں سے رفوچکر ہوگیا۔"

ٹام نے مزید کچھ سننے کی کوشش نہیں کی۔ کمرے میں جو لوگ موجود ہیں۔ ان کا تعلق پولیس سے تو نہیں ہوسکتا تھا اور وہ پولیس والوں کے علاوہ کسی دوسرے سے ملنا..... نہیں چاہتا تھا۔ پولیس کو فون کرنے کے فیصلے نے اس کی جان بچادی تھی ورنہ وہ تو کسی چوہے کی طرح اپنے بل میں مارا جاتا۔ ایک بار پھر وہ پناہ سے محروم ہوگیا تھا۔ اس کے پاس صرف پندرہ سینٹ بچے تھے اور اب فروخت کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ کیا اس دہشت ناک خواب کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا؟

وہ احتیاط سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک ذرا سی آہٹ بھی اسے اپنی جان کی دشمن نظر آرہی تھی۔ وہ بار بار مڑکر اوپر دیکھتا جارہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور سانس لینے میں تکلیف ہورہی تھی۔ دوسری منزل سے پہلی منزل کی طرف مڑتے ہوئے وہ ٹھٹک گیا۔ وہاں تاریکی اسے زیادہ گہری محسوس ہوئی۔ یہ اس کا وہم تھا یا..... وہ اس کا وہم نہیں تھا۔ ایک ٹھوس وجود تاریکی سے جدا ہوکر اس کے راستے میں حائل ہوگیا اور پھر اسے وہی آواز سنائی دی۔ ریشم کی طرح نرم اور سرسراتی ہوئی۔

"گاڑی میں بیٹھے بیٹھے مجھے کچھ شک ہوا تھا کہ میرا پرانا دوست اس ہوٹل میں داخل ہوا ہے۔ تم سے دوبارہ ملاقات کرکے بڑی مسرت ہوئی دوست چلو اوپر تمہارے کمرے میں چلتے ہیں۔ کچھ بھولی بسری یادیں تازہ کریں گے۔"

ٹام کو اندھیرے میں ریوالور کی چمک دکھائی دی۔ وہ اوپر جانے کے لیے مڑگیا۔ ریوالور کی نال اس کی پشت میں چبھنے لگی۔ ٹام کو احساس تھا کہ یہ اس ڈرامے کا آخری منظر ہے۔ اب خاتمہ قریب ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اس کا جبڑا اس طرح ہل رہا تھا جیسے وہ اپنے خالق سے رحم کی دعائیں مانگ رہا ہو۔ کمرے کے دروازے پر وہ رک گئے۔

"دروازہ کھولو، میں اسے لے آیا ہوں۔" نیلے سوٹ والے نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اچانک دروازہ کھلا۔ نارنجی روشنی کا مستطیل انہیں نگلتا ہوا غائب ہوگیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ راہداری پر پھر تاریکی مسلط ہوگئی۔

☆☆☆

گولی چلنے کا دھماکا اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے والا تھا۔ ٹام کو اس کا بہت انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے ہی بدمعاشوں کو ہیرے ملیں گے، وہ بلاتوقف گولی مار کر اسے ہلاک کردیں گے۔ وہ پورے کمرے کی تلاشی لے رہے تھے۔ آٹھ منٹ گزر گئے پھر دس منٹ..... وقت آہستہ آہستہ اذیت ناک طریقے پر آگے بڑھ رہا تھا اور ٹام اب تک زندہ تھا اور پھر اسے گولی چلنے کی آواز سنائی دی وہ آواز دور سے آئی تھی اور اس کی گونج بہت بلند تھی۔ ایک بے بس انسان کو ختم کرنے کے لیے اتنے فاصلے اور ایسے دھماکے کی ضرورت نہیں تھی پھر یکے بعد دیگرے دوسری گولیاں چلیں اور ٹام کو احساس ہوا کہ یہ آوازیں کمرے کے اندر سے بلند نہیں ہورہیں، یہ نیچے کہیں سیڑھیوں پر سے آرہی تھیں۔

گولیاں دوستوں سے چلائی جارہی تھی۔ سیڑھیوں کے اوپر سے اور سیڑھیوں کے نیچے سے۔ اوپر سے نارنجی

WWW.PAKSOCIETY.COM

رنگ کے شعلے تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے نیچے کی طرف لپک رہے تھے۔ اور جواب میں سیڑھیوں کے نیچے سے آتش کے شعلے اوپر پھینکے جارہے تھے پورا ہوٹل گولیوں کے دھماکوں سے گونج رہا تھا اور اس میں ٹھہرے ہوئے مسافر آنکھیں ملتے ہوئے پناہ گاہیں تلاش کررہے تھے۔

پہلی گولی اس پولیس والے کو لگی تھی جس نے سب سے پہلے سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا عمارت کے دروازے پر ڈھیر ہوگیا اور چند لمحوں بعد سیڑھیوں پر سے ایک بدمعاش کا جسم لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور پولیس والے کے ساکت بدن سے ٹکرا کر رک گیا۔ نیچے سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اور پھر بھاری بھرکم قدم اوپر کی طرف بے تحاشا گولیاں چلاتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ بدمعاشوں کے پسپا ہوتے ہوتے قدموں کی آوازیں ٹام کے کمرے کے قریب سے گزرتی ہوئی راہداری کے دوسرے کنارے کی طرف چلی گئیں لیکن اس طرف کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی کمرا خالی نہیں تھا۔ سب دروازے مضبوطی سے بند تھے۔

سیڑھیوں پر چڑھنے والے بھاری بھرکم قدموں کی آوازیں تیسری منزل پر آکر رک گئیں پھر اچانک تیسری منزل کی راہداری نارنجی شعلوں سے منور ہوگئی اور ہوٹل کی عمارت دھماکوں کی گونج سے لرزنے لگی۔ اس بوچھاڑ میں کوریڈور میں موجود کسی انسان کے زندہ بچنے کا امکان نہیں تھا۔ پھر ہر طرف سکوت طاری ہوگیا۔ قدموں کی آوازیں ایک بار پھر بیدار ہوگئیں اور وہ ٹام کے کمرے پر آکر رک گئیں۔ باہر سے دروازہ توڑنے کی کوششیں ہونے لگیں۔

''تم مجھے زندہ ہاتھ نہیں لگا سکتے۔'' نیلے سوٹ والے نے پھنکارتے ہوئے کہا اور کمرے میں گولی چلنے کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ دروازہ ٹوٹ کر چوکھٹ سے علیحدہ ہوگیا۔ وہ آخری مجرم کے گرد کھڑے ہوگئے جس کی بجھتی ہوئی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

''اسے تو پیدا ہوتے ہی خودکشی کرلینی چاہیے تھی۔'' کسی نے کہا۔ ''اس نے بہت دیر کردی۔''

نیلے سوٹ والے کی آنکھیں پتھرا گئیں اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ٹام کو بستر کی چادر پھاڑ کر اس کی پٹیوں کی مدد سے بستر کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ ایک کاندھے پر سے اس کی قمیص نیچے کھسکائی گئی تھی اور بازو پر تازہ جلے ہوئے گوشت کے بدنما داغ نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ ٹام نے نظروں ..... ہی نظروں میں ان سے رہائی کی التجا کی۔ ایک پولیس افسر نے جیبی چاقو سے پٹیاں کاٹ دیں۔

''تم کون ہو؟''

''میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا جناب۔'' ٹام نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔

انہوں نے سہارا دے کر ٹام کو کھڑا کردیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔

''کیا ہوا؟''

ٹام نے جلے ہوئے نشانات والا بازو اوپر اٹھا دیا۔ سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا اس کی بغل میں سے پھسل کر نیچے گر گیا۔

''اس سے اتنی تکلیف تو نہیں ہوسکتی۔'' اس نے تبصرہ کیا۔

ہوٹل کے باہر ایمبولینس کا سائرن خاموش ہوگیا۔ ایک منٹ بعد ایک ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ ایک سراغرساں ٹام سے سوالات کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن وہ پیٹ دبائے بار بار تکلیف کی شدت سے دہرا ہوجاتا تھا۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور تھا اور اذیت برداشت کرتے ہوئے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

''تم ایک منٹ کے لیے سیدھے کھڑے نہیں ہوسکتے؟'' سوال کرنے والے افسر نے جھلا کر کہا۔ ''تم نے کہا تھا کہ نیکلس تمہارے پاس ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ نیکلس کی بازیابی پر بیمہ کمپنی نے پانچ ہزار ڈالرز کا انعام مقرر کیا ہے اگر تم ہنسی خوشی نیکلس ہمارے حوالے کردو تو تم پانچ ہزار ڈالرز کے حق دار بن جاؤ گے ورنہ پھر مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔''

پانچ ہزار ڈالرز کے انعام کا تصور کرکے ٹام کے ہوش اڑ گئے ''لیکن میں کس طرح دوں..... میرا مطلب ہے کہ میں نیکلس دینا تو چاہتا ہوں لیکن دے نہیں سکتا۔'' اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ پھر پیٹ دبا کر درد کی شدت سے دہرا ہوگیا۔

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ ٹام نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ''آپ میں سے کوئی صاحب بھاگ کر کیمسٹ کی دکان پر جائیں اور تھوڑا نائٹریٹ آف میگنیشیا لے آئیں۔'' ڈاکٹر نے پولیس والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب سمجھ میں آیا کہ یہ بار بار پیٹ کیوں دباتا ہے اس کے معدے میں ہیرے کے پندرہ دانے موجود ہیں۔''

حقوق اللہ اور حقوق العباد کے رموز سے آگاہ کرتی ایک یادگار تحریر

دنیا میں سرکشی اور بے خودی کے بھی کئی روپ اتارے گئے ہیں... جبکہ بہترین روپ اپنے نفس کے خلاف سرکشی اور اللہ کی یاد میں بے خودی کے ہیں... ان روپ میں ڈھلنے والا ہی اللہ کے قرب کا حقدار ہے... ماضی گواہ ہے کہ جس نے بھی یہ روپ اپنایا اللہ نے اسے اپنا برگزیدہ بندہ بنالیا۔ آپ کا تعلق بھی اس قبیلے سے تھا جسے ولی کے نام سے پکارا جاتا ہے اور جو اللہ کی راہ میں ہر قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

خوردہ فروش ولی

ضیا تسنیم بلگرامی

بغداد کے بازار میں ایک شخص کی خوردہ فروش کی دکان تھی۔ اس دکان میں بساط خانے کے سامان کے علاوہ کھانے پینے کی چیزیں بھی مل جاتی تھیں۔ انہوں نے دکان کے پچھلے حصے میں ایک پردہ ڈال رکھا تھا۔ یہ اکثر و بیشتر اس حصے میں رہتے۔ گاہک آتے اور آواز دیتے۔ ''اے بھائی سَری! کہاں چلے گئے؟''

بھائی سَری کی طرف سے کوئی جواب نہ ملتا۔ گاہک دوبارہ زور سے مخاطب کرتا۔ ''بھائی سَری! اندر موجود بھی ہو یا نہیں؟ جواب کیوں نہیں دیتے؟''

اندر سے پھر کوئی جواب نہ آتا۔ گاہک ہمت کرکے دکان میں داخل ہوجاتا اور پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ بھائی سَری نماز نفل ادا فرما رہے ہیں۔ وہ انہیں ایک بار پھر مخاطب کرتا۔ ''ارے بھائی اگر تم یوں ہی نمازیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑھتے رہو گے تو میں خوب جانتا ہوں کہ دکان داری کر چکے!"

آپ نے یوں بے نیازی اختیار کیے رکھی، گویا گاہک کی کوئی بات سن ہی نہیں رہے۔ گاہک عاجز آ کر چلا جاتا۔

نمازِ فجر ادا کر کے آپ نے دکان داری سنبھال لی۔ ابھی دکان پر بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک شخص دکان میں داخل ہوا۔ اس نے متجسس نظروں سے دکان کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد انہیں مخاطب کیا۔ "سرّی آپ ہی کا نام ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "ہاں سرّی میرا ہی نام ہے۔ یوں میری کنیت ابوالحسن ہے، کہو، مجھ سے کیا کام ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "جناب والا! میں کوہِ لگام سے حاضر ہوا ہوں، وہاں ایک عرصے سے ایک بزرگ تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس خاص طور پر سلام کہنے کے لیے روانہ کیا ہے۔"

آپ نے کراہیت سے جواب دیا۔ "مخلوق سے منقطع ہو کر عبادت کرنا مُردوں کا کام ہے، میرے نزدیک زندہ وہ لوگ ہیں جو مخلوق سے وابستہ رہ کر یادِ الٰہی میں لگے رہتے ہیں۔"

اجنبی اپنا سا منہ لے کر واپس چلا گیا۔

یہ سرّی سقطی بغداد کے مشہور ترین بزرگ صوفی حضرت معروف کرخیؒ کے شاگرد و مرید تھے۔ جنید بغدادی ان کے بھانجے تھے۔ یہ سقطی اس لیے کہلائے کہ ان کا پیشہ خوردہ فروشی تھا اور عربی میں خوردہ فروش کو سقطی کہتے ہیں۔

بغداد کے بازاروں کا ایک مشہور دلّال آپ کی دکان میں داخل ہوا اور عرض کیا۔ "ابوالحسن! کیا تم باداموں کا سودا کرنا پسند کرو گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، میں تجارت کرتا ہوں۔ اس تجارت میں پھل کا کاروبار کروں یا خشک میووں کا، کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

دلّال نے کہا۔ "میرے کہنے سے آپ ساٹھ دینار میں باداموں کا ذخیرہ خرید لیجیے اور جب میں کہوں بیچ دیجیے گا۔ پھر دیکھیے گا کہ آپ آناً فاناً کتنا سرمایہ کما لیں گے۔"

آپ نے اسی وقت ساٹھ دیناروں میں باداموں کا ذخیرہ خرید لیا۔ دوسرے ہی دن بادام کے دام چڑھ گئے اور ساٹھ دینار پر ایک سو ساٹھ دینار ملنے کی امید بندھی۔ دلّال بھاگا بھاگا آپ کے پاس دوبارہ آیا اور خوشی سے دیوانہ وار آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، بولا۔ "قربان جایئے ان ہاتھوں کے، انہی سے تو آپ نے ساٹھ دینار میں باداموں کی خرید کی تھی۔ اب بفضلِ خدا آپ کے باداموں کا ذخیرہ ایک سو ساٹھ دینار میں بہ خوبی بک جائے گا، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس ذخیرے کو کھڑے کھڑے بکوا دوں اور اگر کچھ زیادہ نفع کمانے کا ارادہ ہے تو دو چار دن اور صبر کرنا پڑے گا۔ کہیے کیا ارادے ہیں؟"

آپ نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "میں نے یہ بادام اس لیے ہرگز نہیں خریدے تھے کہ ان پر مجھے دوگنا یا تین گنا نفع کمانا ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو کل قیامت میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ رسولؐ اللہ کے روبرو کیا منہ لے کر جاؤں گا؟"

دلّال کا چہرہ اتر گیا۔ ان باداموں کے نفع میں اس کی دلالی بھی شامل تھی۔ اپنے نفع کی رقم کو مرتا ہوا دیکھ کر وہ بلبلا گیا، بولا۔ "تب پھر آپ تجارت کر چکے ابوالحسن! نفع کمانے کو نہ تو اللہ نے منع کیا ہے اور نہ رسولؐ اللہ ہی مانع آئیں گے۔ پھر یہ ڈر خوف کیسا؟"

"واہ کیا بات ہوئی۔" سرّی نے کہا۔ "ساٹھ دینار پر ایک سو ساٹھ دینار کمانا نفع ہرگز نہیں، یہ تو ایک قسم کی لوٹ ہے، ڈکیتی ہے، ڈاکا زنی ہے اور میں اس جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔"

دلّال نے پوچھا۔ "اچھا جناب، اب آپ یہ بتایئے کہ آپ نے نفع کی کیا شرح رکھی ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "دس دینار پر آدھا دینار، ساٹھ دینار پر تین دینار۔"

دلّال جھنجلا گیا، چڑ کر بولا۔ "تو جناب کر چکے کاروبار۔ میں تو آپ کو نہایت سمجھ دار اور ہوشیار سمجھتا تھا لیکن آپ تو پیدل ہی نکلے۔ نفع کی یہ شرح تو چند ہی دنوں میں آپ کو کاسۂ گدائی تھما دے گی۔"

"کچھ بھی ہو، مجھے اس کی کوئی پروا نہیں لیکن یہ طے ہے کہ میں اتنی بڑی بددیانتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا، میں لوگوں کی جیبوں پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔"

دلّال غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "بس جناب! آج سے میرا آپ کا لین دین بند، نہ تو میں آپ کو آئندہ کوئی کاروباری

مشورہ دوں گا اور نہ ہی کسی قسم کا تعاون کروں گا، آج سے تعلقات ختم۔"

آپ نے نہایت نرمی سے کہا۔ "خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے ایک ایسے شخص سے بچا لیا ہے جس کا کام نفع اندوزی کے نام پر ڈاکا زنی تھا۔"

دلّال بڑبڑاتا ہوا دکان سے چلا گیا اور کچھ دور جا کر ایک بار پھر گھوما اور زور سے کہا۔ "ابوالحسن! تم نے میری بے عزتی کی ہے، میں اس کا بدلہ لوں گا، میں ہرگز ہرگز معاف نہ کروں گا چاہے کچھ ہی ہو جائے۔"

آپ نے اسی صبر و تحمل سے فرمایا۔ "دشمن اگر قوی تو نگہباں قوی تر است۔"

اس ناخوش گوار واقعے کو کئی دن گزر گئے لیکن کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔

☆☆☆

تقریباً ایک ماہ بعد دلّال نے آپ کی دکان سے متصل دکان میں آگ لگا دی۔ اس نے یہ سوچا تھا کہ اس طرح آپ کی دکان بھی جل جائے گی اور اس کی دشمنی کی طرف سرّی کا خیال بھی نہ جائے گا۔ یہ آگ آندھی کی طرح پورے بازار میں پھیل گئی اور آگ کے شعلے میلوں دور سے دکھائی دینے لگے۔ اس وقت ہوا بھی تیز تھی لوگ پانی سے لبریز برتنوں سے آگ پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن آگ ان کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس ہنگامۂ آتش زدگی میں دلّال بھاگا بھاگا آپ کے گھر پہنچا اور منہ لٹکا کر افسوس سے کہا۔ "ابوالحسن! افسوس کہ آج کی آتش زدگی میں نصف بازار پھُنک گیا۔ اس میں آپ کی دکان بھی جل کر خاکستر ہو گئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔"

آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اوپر اٹھا دیے اور فرمایا۔ "خدایا! میں تیرا بے حد شکر گزار ہوں کہ تو نے میرا متاع دنیا سے پیچھا چھڑا دیا۔"

اس وقت کچھ اور لوگ بھی آپ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے کہا۔ "سری! ہم بازار کے آتش زدہ حصے سے آ رہے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ وہاں ایک کیسا محیر العقول واقعہ پیش آ گیا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "مجھے علم غیب نہیں آتا، وہاں کون سا ایسا واقعہ پیش آ گیا ہے جس نے تم سب کو حیران و پریشان کر دیا ہے؟"

آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔ "اجی حضرت! نصف بازار پھُنک گیا۔ جلنے والی دکانوں کے بیچوں بیچ آپ کی دکان تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی دکان کی جگہ راکھ اور خاک کے سوا کچھ بھی نہ ملتا لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ کی دکان بالکل محفوظ ہے اور آگ تو آگ، ایسا لگتا ہے کہ آگ کا دھواں تک وہاں نہیں پہنچا، اب ہم سب اس کو کیا کہیں؟"

آپ آب دیدہ ہو گئے، فرمایا۔ "لوگو! یہ مقام خوشی ہرگز نہیں، میرے لیے تو اس سے زیادہ دکھ پہنچانے والا کوئی اور لمحہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

ان لوگوں نے بہ یک آواز پوچھا۔ "حضرت! یہ کیا فرما رہے ہیں، ہم سب آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "بھائی! میرے غمزدہ ہونے کی وجہ بالکل واضح اور فطری ہے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے مقابلے میں محفوظ رہا جبکہ وہ اس آتش زدگی میں بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں، لوگو! اب تو میں ان سے آنکھیں تک نہیں ملا سکتا۔"

لوگوں نے سوچا یہ کیا بات ہوئی، کہیں ابوالحسن ماؤف العقل تو نہیں ہو گئے۔

یہ لوگ انہی خیالوں میں الجھے ہوئے تھے کہ آپ نے بہ آواز بلند ارشاد فرمایا۔ "مسلمان بھائیوں کے ساتھ نقصان میں موافقت کرنا واجبات میں سے ہے۔"

اس کے بعد آپ نے دکان کا سارا مال راہ خدا میں لٹا دیا۔

آپ کی بزرگی اور عظمت کا چرچا گلی گلی، کوچہ بہ کوچہ ہونے لگا۔

جہاں بھی چار آدمی یکجا ہوتے، سرّی سقطی کی عظمت اور بزرگی کا ذکر چھڑ جاتا۔ صبح، دوپہر، شام آپ کے در پر حاضری دی جانے لگی۔ آپ ان سے بہت کم باتیں کرتے۔ ایک دن کسی مرید نے دریافت کیا۔ "حضرت! یہ تو بتایئے کہ آپ نے یہ بلند مرتبہ کس طرح حاصل کر لیا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

آپ نے جواب دیا۔ ''عرصہ گزرا کہ میری دکان کے سامنے سے ایک بار مشہور صوفی بزرگ حبیب راعی گزرے۔ میں نے انہیں کچھ دیا جس پر انہوں نے خوش ہو کر مجھے دعا دی۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔''

اتنا کہہ کر آپ نے سکوت اختیار کیا، لوگ سمجھے کہ آپ کو جو کچھ فرمانا تھا، فرما چکے لیکن خلاف امید آپ نے بولنا شروع کر دیا..... ''حبیب راعی کے بعد دوسرے دن معروف کرخی میری دکان میں تشریف لائے اس وقت ان کے ساتھ ایک یتیم بچہ بھی تھا۔ معروف کرخی نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابوالحسن! اسے کپڑا دلا دو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کون سی بڑی بات ہے، ابھی لیجیے۔'' اس کے بعد میں نے بچے کو اس کی پسند کے کپڑے دلا دیے۔ اس وقت معروف کرخی نے مجھے دعا دی، فرمایا۔ ''ابوالحسن میری دعا ہے کہ اللہ اموال دنیا کو تیرے لیے دشمن کر دے۔'' پھر پیر و مرشد حضرت معروف کرخی نے فرمایا کہ ان بدبختوں سے اس طرح دور رہو جس طرح نیولے سے سانپ اور روشنی سے تاریکی بھاگتی ہے۔ اس دن سے میرا اندر روشنی سے منور ہے۔''

☆☆☆

ہبری سقطی کے مریدوں میں ایک ایسی عورت بھی شامل تھی جس کے استغنا اور توکل کا خاص شہرہ تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جسے اس نے ایک معلم کے پاس پڑھنے بٹھا دیا تھا۔ ایک دن یہ معلم گھبرایا ہوا ہبری سقطی کے پاس آیا اور سراسیمہ لہجے میں کہنے لگا۔ ''حضرت! میں آپ سے کچھ عرض کرنے آیا ہوں، خدا کے لیے میری مدد فرمائیں۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا؟ کھل کر عرض کرو۔''

معلم نے کہا۔ ''میں نے آپ کی مرید عورت کے بیٹے کو دریا کے کنارے پن چکی پر بھیجا تھا، وہ لڑکا معلوم نہیں کیوں دریا میں اتر گیا اور شاید فنِ پیراکی سے نابلد تھا، پانی میں ڈوب گیا۔''

اتنا کہہ کر معلم اور زیادہ سوگوار ہو گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

معلم نے جواب دیا۔ ''حضرت! مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ یہ دلدوز خبر میں اس لڑکے کی ماں تک پہنچاؤں، اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ یہ نازک فریضہ آپ انجام دے دیجیے۔''

آپ سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ سکوت کے بعد فرمایا۔ ''میں اس جگہ کو دیکھنا چاہتا ہوں جہاں وہ لڑکا ڈوب گیا۔''

معلم نے کہا۔ ''میں آپ کو اس وقت وہاں لیے چلتا ہوں۔''

اور اس نے اسی وقت دریا کے اس حصے کی نشاندہی کر دی جہاں لڑکا ڈوبا تھا۔ آپ نے دریافت کیا۔ ''اس کی لاش کہاں ہے؟''

معلم نے جواب دیا۔ ''حضرت! یہ ستم بالائے ستم ہے کہ اس کی لاش کا بھی کوئی پتا نہیں۔''

آپ نے فکرمندی سے کہا۔ ''بہتر ہے، اب تم گھر جاؤ، میں اس عورت کے پاس جا رہا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اسے میں یہ اندوہناک خبر اس طرح سناؤں کہ اس کے دل کو قرار آ جائے۔''

معلم اپنے گھر چلا گیا۔ آپ سیدھے عورت کے پاس پہنچے۔ عورت نے انہیں خلاف معمول اپنے گھر آیا ہوا دیکھ کر بے پایاں خوشی کا اظہار کیا، بولی۔ ''زہے نصیب کہ حضور نے اس ناچیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما کے اپنی خوش نصیبی پر فخر کرنے کا مجھے ایک موقع عطا فرما دیا۔''

آپ نے کہا۔ ''اے بی بی! آج میں تیرے گھر اس لیے آیا ہوں کہ صبر کے فضائل اور صابرین کے مناقب بیان کروں۔''

عورت نے کہا۔ ''ارشاد! میں آپ کا ایک ایک لفظ سراپا ہوش و گوش سنوں گی۔''

آپ دیر تک صبر اور صابرین کے فضائل اور مناقب بیان فرماتے رہے۔ آخر میں عورت نے کہا۔ ''اب حضرت ایک بات کی وضاحت بھی فرما دیجیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کس بات کی وضاحت؟''

عورت نے کہا۔ ''یہ صبر و رضا پر بیان فرمانے کی آخر ضرورت کیا پیش آ گئی؟''

آپ نے کہا۔ ''کیا تو یہ اقرار کرے گی کہ ہر اس مصیبت پر تو صبر و رضا کا دامن پکڑے رہے گی جو من جانب اللہ نازل کی گئی ہو؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''جو امر من جانب اللہ ہو میں اسے مصیبت ہی تسلیم نہ کروں گی۔ پھر صبر و رضا کی تلقین کے کیا معنی ہیں۔''

آپ نے کہا۔ ''تیرے توکل و استغنا کی بابت جتنا مشہور ہے تو اس میں اس سے کہیں زیادہ ہے۔''

اس کے بعد آپ نے لڑکے کے ڈوب کر ہلاک ہونے کی خبر اسے سنا دی۔

عورت نے یقین نہ کرنے کے انداز میں سوال کیا۔ ''یعنی میرا بیٹا پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں تیرا بیٹا دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا اور افسوس کہ اس کی لاش تک لوگوں کو نہ مل سکی۔''

عورت نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''ذرا مجھے وہ جگہ تو دکھلا دیجیے جہاں میرا بیٹا بہ قول آپ کے ڈوب کر ہلاک ہو گیا اور اس کی لاش تک کا پتا نہ چل سکا۔''

آپ اس عورت کو لے کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں معلم لے گیا تھا۔ آپ نے ڈوبنے کی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس جگہ کی نشاندہی کی ہے دیکھنے والوں نے۔''

عورت نے ادھر منہ کر کے آواز دی۔ ''بیٹے محمد! تم کہاں ہو؟''

جواب میں بیٹے کی آواز سنائی دی۔ ''ماں! میں حاضر ہوں۔''

عورت پانی میں اتر گئی۔ پانی میں ایک ہاتھ نمودار ہوا۔ عورت نے ہاتھ پکڑ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کے اندر سے بیٹے کو زندہ سلامت نکال لائی۔

ہبری سقطی حیرت سے دیکھتے رہے۔ اس واقعے نے اتنی شہرت پکڑی کہ جنید بغدادی ہبری سقطی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا۔ ''ماموں جان! یہ کیا معاملہ تھا؟ میں اس سے کیا سمجھوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جنید! یہ عورت خود کو احکام الٰہیہ کے حلیے سے آراستہ و پیراستہ رکھتی ہے اس کی برکت کا اس طرح ظہور ہونے لگا ہے کہ اس عورت سے متعلق جو کچھ بھی ہونے والا ہوتا ہے خدا اسے پہلے ہی مطلع کر دیتا ہے۔ اس لیے جب اسے میں نے لڑکے کے ڈوب جانے کی خبر پہنچائی تو اس نے اس پر اس لیے یقین نہیں کیا کہ اسے اللہ نے یہ خبر نہیں پہنچائی تھی چنانچہ بندوں کی پہنچائی ہوئی خبر جھوٹی ٹھہری۔ یہ اس کے توکل و استغنا اور صبر و رضا کا بہترین انعام تھا جو اسے مل گیا۔''

☆☆☆

آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں مسجد نبویؐ میں آپ کے گرد ارادت مندوں کا مجمع لگ گیا۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ آپ وعظ فرمائیں۔ آپ نے وعظ شروع فرمایا۔ دوران وعظ ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ وہ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ساتھ چند دوست بھی تھے۔ آپ اس وقت وعظ میں فرما رہے تھے۔ ''لوگو! بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ یہاں ضعیف قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔''

اس فقرے نے نوجوان کے چہرے کا رنگ زرد کر دیا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے دن وہ پھر آیا اور سلام کر کے آپ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''مجھ سے کوئی کام؟''

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''میں آپ سے ابھی بات کرتا ہوں، ذرا دو رکعت نفل ادا کر لوں۔''

اس نے دو رکعت نفلیں پڑھیں اور اس کے بعد آپ کے پاس دوبارہ آ بیٹھا۔ اس نے کہا۔ ''ہبری! میں نے کل آپ سے یہ سنا تھا کہ یہاں ضعیف قوی کی نافرمانی کرتا ہے۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا، ذرا وضاحت فرما دیجیے!''

آپ نے جواب دیا۔ ''اللہ تعالیٰ سے زیادہ قوی اور بندے سے زیادہ کمزور اور کون ہو سکتا ہے لیکن تم غور کرو کہ یہ کمزور بندہ اپنے قوی آقا کی کیسی نافرمانی کرتا رہتا ہے۔''

اس نوجوان کا حال ایک بار پھر بہت برا ہو گیا۔ وہ اسی وقت اٹھ کر چلا گیا اور تیسرے دن اس حال میں داخل ہوا کہ اس کے جسم پر نہایت معمولی کپڑے تھے اور دوستوں میں سے ایک بھی اس کے ساتھ نہ تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ ''ہبری! خدا کے لیے بتائیے کہ اپنے آقا تک کس راہ سے رسائی حاصل کروں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تم عبادت کرنا چاہتے ہو تو اس کا سیدھا سچا طریقہ یہ ہے کہ عبادت کرو۔ دن کو روزے رکھو اور رات کو نمازیں پڑھو لیکن اگر تم محض اللہ کو چاہتے ہو تو پھر اس کے سوا ہر چیز چھوڑ دو۔ مسجدوں، ویران مقامات یا قبرستان

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں سکونت اختیار کرو۔"

وہ نوجوان اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے ہوئے کہا۔ "بتری! خدا کی قسم، میں وہی راہ اختیار کروں گا جو مشکل ہے۔"

آپ اس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔ چند دنوں بعد چند لڑکے آپ کے پاس آئے اور پوچھا۔ "حضرت! یہاں حاکم شہر زید کے کاتب احمد تو نہیں آئے تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں احمد کاتب سے واقف نہیں ہوں لیکن اس حلیے اور لباس میں ایک نوجوان آیا ضرور تھا۔"

لڑکوں نے پوچھا۔ "وہ یہاں کیوں آئے تھے؟"

آپ نے پوری تفصیل بتادی اور کہا۔ "اس کے بعد وہ یہاں سے چلا گیا اور میں نہیں جانتا کہ کہاں گیا؟"

لڑکوں نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "جناب والا! ہم آپ کو خدا کی قسم دیے جاتے ہیں کہ وہ اب جب بھی آپ کو ملیں ہمیں اس پتے پر مطلع ضرور فرمائیں۔"

آپ نے لڑکوں سے ان کا پتا سمجھا اور وعدہ کیا کہ وہ ضرور انہیں مطلع کردیں گے۔ اس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔ ایک روز عشا کی نماز کے بعد آپ گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس وقت آپ تنہا تھے۔ آپ نے کہا۔ "کون ہے؟ اندر آجاؤ!"

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان اندر داخل ہوا، آپ نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ یہ وہی نوجوان تھا۔ اس نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا۔ "بتری! دعا کیجیے، جس طرح خدا نے مجھے دنیا کی غلامی سے نجات دلادی ہے اسی طرح وہ مجھے دوزخ کی آگ سے محفوظ رکھے۔"

آپ نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک ارادت مند سے کہا۔ "جاؤ! اس نوجوان کے گھر والوں کو مطلع کردو کہ تمہارا آدمی آگیا ہے۔ وہ اسی وقت آکر اس سے مل لیں۔"

ارادت مند چلا گیا اور کچھ دیر بعد جب واپس آیا تو اس نوجوان کے بیوی بچے اس کے ساتھ ہی آگئے تھے۔ گود کا بچہ چند زیور بھی پہنے تھا۔ بیوی نے بچے کو شوہر کی گود میں ڈال دیا اور کہا۔ "میاں تم نے تو مجھے جیتے جی بیوہ کردیا اور ان بچوں کو یتیم کردیا، اب آگئے ہو تو میں چاہتی ہوں کہ کوئی فیصلہ ہی ہوجائے۔"

نوجوان نے بیوی کو جواب دینے کے بجائے بتری کی طرف دیکھا۔ شکایتاً کہا۔ "بتری! تم نے مجھ سے بے وفائی کی ہے تمہیں ایسا نہیں کرنا تھا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "مجھے اطلاع دینے کی قسم دی گئی تھی اس لیے میں اس امر کا پابند تھا۔"

اس نوجوان نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا۔ "اے نیک بخت! تو ہمیشہ میرے دل سے قریب رہی ہے اور تیرے یہ بچے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رہے ہیں لیکن میں بھی کیا کروں، اس بتری نے ہی مجھ سے یہ کہا تھا کہ اگر تو اللہ کو راضی رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سوا ہر شے سے قطع تعلق کرلے، میں نے ان کے کہنے پر عمل کیا اور اب جہاں پہنچ چکا ہوں وہاں سے واپسی ناممکن ہے۔"

بیوی نے جل کر کہا۔ "اگر ایسا ہے تو یہ گود کا بچہ بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔ بچوں کی پرورش کی ذمے داری مجھ پر ہی نہیں تم پر بھی عائد ہوتی ہے۔"

بیوی کا خیال تھا شوہر یہ ذمے داری کسی طرح بھی نہیں قبول کرے گا لیکن خلاف توقع شوہر نے یہ پیشکش بہ خوشی قبول کرلی۔ کہا "بہتر ہے، میں اس بچے کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"

اس کے بعد اس نے بچے کے زیور اتار کر بیوی کے حوالے کردیے اور اپنے کمبل میں سے ذرا سا ٹکڑا پھاڑ کر بچے کے جسم پر ڈال کر گود میں اٹھالیا، بیوی سے کہا۔ "یہ زیور گھر لے جاؤ اور انہیں بیچ کر بھوکے ننگوں کو کھلا پلا دینا۔ یہ بچہ میرے ساتھ چلا جائے گا۔"

بیوی نے بچے کو بھی ہاتھ سے جاتے دیکھا تو مچل گئی۔ تڑپ کر بولی۔ "قسم خدا کی، میں اپنے بچے کو اس حلیے میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔"

یہ کہتے ہوئے بچے کو چھین لیا۔ شوہر نے کہا۔ "عجیب بات ہے کہ تو نے ہی تو اس بچے کو میرے حوالے کردیا تھا اور اب تو

نے ہی اسے چھین بھی لیا، آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم جہاں بھی جانا چاہتے ہو، چلے جاؤ، لیکن میرا ایک بچہ بھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔" شوہر نے کہا۔ "میں نے تو ایسی کوئی خواہش نہیں کی تھی۔ جب تو نے مجھے میری ذمے داری یاد دلائی تو میں اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوگیا۔"

اس کٹنی میں کافی رات گزر گئی۔ نوجوان نے بتری کو مخاطب کیا۔ "جناب! اس جھگڑے نے تو مجھے خدا کی یاد تک سے غافل کردیا۔" پھر بیوی سے کہا۔ "اب تم بچوں کو لے کر گھر جاؤ اور مجھے اللہ کی بارگاہ میں جھک جانے کا موقع دو۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں تو ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

نوجوان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا۔ "اچھا اگر تم نہیں جانا چاہتیں تو نہ جاؤ، میں خود چلا جاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بیوی بچوں نے رونا پیٹنا شروع کردیا۔ سری نے انہیں بڑی تسلیاں دیں۔ عورت نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "بتری! تمہیں اس خدا کی قسم ہے جس کی یاد اور محبت نے میرے شوہر کو تارک الدنیا بنادیا۔ میرا شوہر جب بھی تم سے ملنے آئے تم مجھے مطلع ضرور کردینا۔"

آپ نے کہا۔ "مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ تم قسم دے کر مجھے مجبور کردیتی ہو اور تمہارا شوہر اس رویے کو بالکل پسند نہیں کرتا، ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے، میں الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہوں۔"

عورت نے کہا۔ "بہرحال میں تو یہ جانتی ہوں کہ تمہیں میری قسم کا پاس ضرور کرنا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اچھا، اس وقت تو تو چلی جا۔ میں تجھے مطلع کرنے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔"

☆☆☆

اس واقعے کو گزرے ایک عرصہ بیت گیا تھا کہ ایک رات آپ کی طبیعت میں کچھ عجیب سا انتشار پیدا ہوگیا۔ سونے کی کوشش کی تو نیند بھی نہ آئی۔ تہجد پڑھنا چاہی تو اس سے بھی محروم رہے۔ یہ کیفیت صبح تک طاری رہی، آخر بہ مشکل فجر کی نماز ادا کی اور پریشانی میں گھر سے باہر نکل گئے۔ دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے آخر جامع مسجد میں داخل ہوگئے وہاں کوئی واعظ بڑے جوش و خروش سے وعظ گوئی میں مشغول تھا۔ آپ یہاں سے اٹھ کر ایک طبیب کے پاس پہنچے۔ طبیب نے آپ کی کیفیت سنی تو اس کی بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ "حضرت! آپ کا مرض کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی تشخیص اطبا نہیں کرسکتے، کسی ایسے شخص سے رجوع فرمائیں جو محب کو محبوب کی راہ بتاتا ہو۔"

آپ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچ گئے، اس نے اضطراب اور بے چینی کا حال سن کر جواب دیا۔ "بتری! مقام حیرت ہے کہ جو شخص دوسروں کا علاج کرتا رہا ہو وہ آج مجھ جیسے ناچیز کے پاس آکر اپنا علاج کرانا چاہتا ہے۔"

آپ کے دل کی گدازیت ختم ہوچکی تھی اور پتھر کا ٹکڑا ہوکر رہ گیا تھا۔ آپ نے نہایت کرب سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں، میرا دل کسی طرح پگھل ہی نہیں رہا۔ اگر تادیر یہی حالت قائم رہی تو میں کسی کام کا نہ رہ جاؤں گا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، میری سانس رکی جارہی ہے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "حضرت! اگر آپ میرا مشورہ قبول فرمائیں تو میں آپ کو یہ رائے دوں گا کہ سیدھے کوتوالی تشریف لے جائیں وہاں لوگوں کو بڑی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں وہاں لوگوں کو سزا پاتے دیکھ کر ضرور آپ کا دل پگھل جائے گا۔"

آپ سیدھے کوتوالی پہنچ گئے۔ وہاں کا عبرت ناک منظر بھی آپ کے دل کو گداز نہ بخش سکا۔ اس وقت آپ کا اتنا برا حال تھا کہ رونا چاہتے تھے لیکن دل رونے سے انکار کررہا تھا۔ آپ کے کان میں جیسے اچانک کسی نے سرگوشی کی۔ "بتری! قید خانے چل، وہاں کے مبتلائے عذاب تیرے دل کو یقیناً گداز کردیں گے۔"

آپ قید خانے پہنچ گئے۔ قید خانے میں داخل ہوتے ہی دل بھر آیا اور آپ نے زار و قطار رونا شروع کردیا۔ آپ نے قید خانے میں ایک عورت دیکھی۔ اس وقت وہ نہایت قیمتی اور خوب صورت اوڑھنی میں تھی۔ اس کے پاس سے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ اس عورت نے بھی آپ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اس نے آنکھیں بند کرلیں اور دعائیہ انداز میں گڑگڑانے لگی۔

"اے اللہ! میں پناہ مانگتی ہوں کہ بغیر گناہ کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

حالانکہ ان ہاتھوں نے نہ تو کبھی چوری کی ہے اور نہ خیانت کی ہے اور میرے پیر کبھی بھی گناہ کی راہ پر نہیں چلے۔ میں قسم کھا کر یقین دلاتی ہوں کہ اگر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں تو بھی یہ تیری یاد سے غافل نہ ہوگا، یہ تجھ سے کسی حال میں بھی نہ پھرے گا۔"

آپ نے قید خانے کے نگراں سے پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ کیا اس پر جنون کا دورہ پڑتا ہے؟"

نگراں نے جواب دیا۔ "حضرت! یہ ایک لونڈی ہے، اسے یہاں اس کے مالک نے بند کرایا ہے تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔"

نگراں کا جواب اس لونڈی نے بھی سن لیا، آنکھوں میں آنسو بھر لائی، بولی۔ "اللہ تیرا شکر ہے کہ لوگ مجھے دیوانہ کہنے لگے ہیں حالانکہ میں پاگل نہیں ہوں۔"

حضرت بہزی کی آنکھیں بھر آئیں، ان آنسوؤں کو لونڈی نے بھی دیکھ لیا، بولی۔ "بہزی! میں تمہیں خوب اچھی طرح جانتی ہوں، تم جو رو رہے ہو تو یہ رونا اس کی صفت سن کر آیا ہے اور سوچو کہ اگر کسی طرح تم اس کو پہچان لو تو تمہارا کیا حال ہو جائے گا؟"

یہ کہتے کہتے وہ بے ہوش ہو گئی۔ کافی دیر بعد جب اسے ہوش آیا تو آپ نے اسے پکارا۔ "اے لونڈی! مجھے یہ بتا کہ تو نے مجھے پہچانا کس طرح؟"

لونڈی نے جواب دیا۔ "بہزی! جب سے مجھے معرفت حاصل ہوئی ہے میں جاہل نہیں رہی اور جب سے وصل ہوا ہے میں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہیں ہوئی۔ اس میدان میں عہدے مناصب رکھنے والے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔"

آپ نے کہا۔ "میں نے تو یہ سن رکھا ہے کہ تو کسی سے محبت کرتی ہے، تیرے محبوب کا کیا نام ہے؟"

لونڈی نے جواب دیا۔ "وہ ذات جس نے اپنے محبوں کے ساتھ مجھ کو بھی معرفت عطا فرمائی۔ بہزی! کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ ذات بالکل دل کے قرین ہے، وہ ذات حد درجہ سخی ہے، وہی ہر جاندار کا پیدا کرنے والا ہے، وہ حکمت والا، سخی، کریم اور بخشنے والا غفور و رحیم ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "اچھا یہ تو بتا، یہاں تجھ کو قید کس نے کیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "حاسدوں نے۔" اس کے بعد وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ شیخ بہزی سمجھے، لونڈی جاں بحق ہو گئی ہے لیکن کچھ دیر بعد وہ خود بخود ہوش میں آ گئی۔ بہزی نے قید خانے کے نگراں سے کہا۔ "بھائی! اگر تم مجھے کچھ سمجھتے ہو تو میری خواہش اور درخواست پر تم اسے رہا کر دو۔"

نگراں بولا۔ "خواہش یا درخواست مت کہیے۔ مجھے تو حکم دیجیے، میں آپ کی بات کسی طرح بھی نہیں ٹال سکتا۔ میں اسے اسی وقت رہا کیے دیتا ہوں، بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

نگراں نے اسے رہا کر دیا۔ عورت رہائی پا کر کھڑی سوچتی رہی، پھر بہزی سے پوچھا۔ "اب میں پریشان ہوں کہ کہاں جاؤں؟"

بہزی نے جواب دیا۔ "جہاں تیرا دل چاہے چلی جا۔"

لونڈی نے کہا۔ "بہزی! تم میری بات نہیں سمجھ رہے، اسے چھوڑ کر میں جا بھی کہاں سکتی ہوں، میرے ساتھ یہ ستم ظریفی بھی تو ہے کہ میرے دل کے دوست نے اپنے مملوک کو میرا مالک بنا دیا ہے۔ یہاں سے میں اسی وقت کہیں جا سکتی ہوں جب میرا مالک بھی جانے کی اجازت دے دے گا۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوا تو میں صبر کر لوں گی۔"

بہزی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، بولے۔ "لڑکی! خدا کی قسم، تو بہت زیادہ عقل مند اور صاحب اسرار ہے، میں تجھ سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔"

بہزی کی باتیں ابھی جاری ہی تھیں کہ لونڈی کا مالک بھی وہیں پہنچ گیا۔ اس نے قید خانے کے نگراں سے پوچھا۔ "میری لونڈی کہاں ہے؟"

نگراں نے لونڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ رہی، کیا تجھے دکھائی نہیں دے رہی؟"

لونڈی کے مالک نے لونڈی کو ایک نظر دیکھ کر بہزی کی طرف دیکھا اور تعظیماً ذرا جھک گیا، مصافحہ کیا۔ بہزی نے لونڈی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اے شخص! تیری تعظیم اور ادب کی میری بہ نسبت یہ لونڈی زیادہ مستحق ہے اور میں حیران ہوں کہ اس کی وہ کون سی بات ہے جس نے شکایت کا موقع پیدا کیا اور تو نے اسے قید خانے میں ڈلوا دیا۔"

مالک نے جواب دیا۔ "اس کی ایک بات بھی ایسی نہیں جس پر آدمی حیرت زدہ نہ ہو، یہ نہ تو اچھی طرح کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ رات سونے کے لیے بنی ہے لیکن یہ سوتی ہی نہیں۔ اس کے دل میں پارے جیسی بے قراری محسوس ہوتی ہے، کیونکہ ہر وقت بے چین، مضطرب اور متفکر سی رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتی ہے ہر وقت نالہ و فغاں کرنا مشغلہ سا بن گیا ہے اور نالہ و فغاں کا بہ ظاہر کوئی سبب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ بہزی! ذرا میرے اس دکھ پر بھی غور کیجیے کہ میں نے اسے بیس ہزار درہم میں خریدا تھا اور یہی میری کل پونجی تھی، میں نے خریدتے وقت یہ سوچا تھا کہ میں اس سے کئی فائدے اٹھا سکوں گا لیکن، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

بہزی نے پوچھا۔ "اس کے حسن و جمال کے علاوہ تجھے اس میں اور کیا خوبیاں نظر آئی تھیں؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ بہترین گانا جانتی ہے اور آواز اس بلا کی پائی ہے کہ سننے والا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، میں اس کی آواز کے سوز کا بھی تو کشتہ ہوں۔"

بہزی نے پوچھا۔ "لیکن اس کی یہ حالت کب سے ہے؟"

مالک نے جواب دیا۔ "تقریباً ایک سال سے۔"

"وہ کس طرح؟"

مالک نے جواب دیا۔ "ایک دن یہ عود بجا رہی تھی کہ یک لخت اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اس نے پاگل پن میں عود توڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ میرے دل میں گمان گزرا کہ غالباً یہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔ میں نے اسے اس بدگمانی کا طعنہ بھی دیا لیکن اس نے انکار کیا۔ میں نے خاموشی سے اس کی تحقیقات کی لیکن کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہو سکی جس سے میری بدگمانی کو تقویت پہنچتی، آخر عاجز آ کر میں نے اسی سے پوچھا کہ سچ سچ بتا یہ معاملہ کیا ہے اس نے دل جلے لہجے میں جواب دیا، کیا تو میری باتیں سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ کیا میں تیرے جواب میں سچ سچ جو کچھ کہوں گی تو اس پر یقین کر لے گا؟ میں نے کہا۔ ایسی بھی کیا بات ہے کہ میں تیری باتیں نہ سمجھ سکوں اور اگر تو سچ بولے گی تو سچ کا یہ قاعدہ ہے کہ یہ دل سے نکلتا ہے اور دل ہی میں گھر کرتا ہے، تجھے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دے۔ میرے جواب میں اس نے تیز تیز ذرا دل جلے انداز میں کہا، جب میں عود بجا رہی تھی اس وقت خدا خود مجھ سے مخاطب ہو گیا، میرا وہ گیت جو عود کے ساتھ میری زبان سے ادا ہو رہا تھا میرے لیے وعظ بن گیا اور اس بعد کو جو میرے اور خدا کے درمیان پایا جاتا تھا خدا نے اپنے قرب میں بدل دیا اور خدا نے مجھے اپنا خاص بندہ بنا لیا۔ جب مجھے خدا نے اپنی مرضی سے اپنی طرف بلا لیا تو میں اس کی اس کرم فرمائی کو کس طرح مسترد کر سکتی تھی۔ ایک طرف میں خدا کی آواز پر لبیک کہہ رہی تھی دوسری طرف دل میں ڈر رہی تھی کہ آخر ان گناہوں کا کیا ہوگا جو ماضی میں سرزد ہو چکے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوف یوں دور ہو گیا کہ جس خدا نے مجھے اپنا قرب بخشا ہے وہی میرے گناہوں کو معاف بھی کر دے گا۔"

بہزی اس کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے۔ اس عجیب و غریب لونڈی کی جو باتیں ظاہر ہو رہی تھیں ان سے اس کی عزت اور وقعت بہت زیادہ بڑھتی جا رہی تھی۔ آپ نے اس شخص سے کہا۔ "اے شخص! اگر تو واقعی میرا احترام کرتا ہے تو میں تجھ سے جو کہوں اس پر عمل کر۔"

اس نے کہا۔ "میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں، فرمائیں!"

بہزی نے جواب دیا۔ "میں چاہتا ہوں تو اس لونڈی کو آزاد کر دے۔"

اس شخص نے حیرت سے بہزی کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کہا۔ "حضرت! میں پریشان ہوں کہ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، آپ کو ایسی درخواست کرتے وقت یہ تو سوچنا ہی چاہیے تھا کہ آپ کی یہ بات میں کس طرح مان لوں گا۔"

بہزی نے پوچھا۔ "میری بات ماننے میں آخر کون سا امر مانع ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "حضرت! سیدھی سی بات یہ ہے کہ میں نے اس لونڈی کو بیس ہزار درہم میں خریدا تھا۔ اب

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتنی قیمتی شے سے میں محض آپ کے کہنے سے تو دستبردار ہونے سے رہا۔"

آپ نے کہا۔ "میں اس کی بیس ہزار درہم سے زیادہ قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں، تم اسے آزاد کرنے کی ہامی تو بھرو۔"

وہ شخص بے ساختہ ہنسنے لگا، بولا۔ "حضرت! آپ ایسی باتیں خدا کے لیے نہ کیجیے کیونکہ اگر میں زیادہ صاف گوئی سے کام لوں گا تو آپ کی شان میں گستاخی ہو جائے گی۔"

آپ نے فرمایا۔ "اس وقت تم میری درویشانہ حیثیت کو نظر انداز کر کے بات کرو۔"

اس نے کہا۔ "حضرت! صاف بات تو یہ ہے کہ آپ ٹھہرے ایک مردِ فقیر، آپ اس کی قیمت آخر ادا کہاں سے کریں گے، ہائے ری غربت اور افلاس، سبھی جانتے ہیں کہ اس سے مرد کا اعتبار چلا جاتا ہے۔"

آپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر تم پھر بھی عجلت سے کام نہ لو، کل تک میرا انتظار کرو، میں اس کی قیمت کا انتظام کرنے جا رہا ہوں، انشاءاللہ کل ملاقات ہوگی۔"

اس کے بعد بہتری وہاں سے چلے آئے، رات تک بے حد غمگین رہے۔ ان کا دل رو رہا تھا، وہ خدا کی بارگاہ میں گر گئے اور رو رو کر عرض کرنے لگے۔ "اے اللہ! تو خوب جانتا ہے کہ اس وقت میرے پاس ایک درہم بھی موجود نہیں اور میں نے وعدہ اتنا بڑا کر لیا ہے، تو خوب جانتا ہے کہ یہ سودا بھی میں نے تیرے ہی سہارے کر لیا ہے، خداوندا! تجھ پر میرا ظاہر اور باطن عیاں ہے اور مجھے تیری ذات پر جتنا اعتماد اور بھروسا ہے تو خوب جانتا ہے، میں نے تجھ پر اعتماد کیا ہے اس لیے کل مجھے اس لونڈی کے مالک کے سامنے شرمندہ نہ ہونے دے۔"

اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکے، بس گریہ وزاری میں لگے رہے۔ صبح ہوتے ہوئے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، آپ نے دریافت کیا۔ "کون ہے؟"

جواب ملا۔ "آپ کے دوستوں میں سے ایک دوست۔"

"آنے کا مقصد؟" اندر سے آواز آئی۔

جواب ملا۔ "مجھے میرے خدا نے یہاں تک آنے کا حکم دیا ہے۔"

بہتری نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا، دروازے پر ایک آقا اپنے ملازموں کے ساتھ کھڑا ہوا ہے، ایک غلام کے ہاتھ میں شمع تھی۔ اس آدمی نے بہتری سے کہا۔ "بہتری! مجھے اپنی محفل سے دور کیوں رکھنا چاہتے ہو؟"

بہتری نے کہا۔ "میں نے تو تمہیں نہیں روکا، تم خود ہی دروازے پر رکے ہوئے ہو، اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

وہ شخص اندر داخل ہو گیا، آپ نے دریافت کیا۔ "تم کیوں آئے ہو اور کون ہو؟"

اجنبی نے جواب دیا۔ "میرا نام احمد بن مثنیٰ ہے۔ میں ایک ایسی ذات کے حکم سے یہاں آپ کے پاس آیا ہوں جو بخیل نہیں مخیر ہے۔ بہتری! میں رات نہایت غافل نیند سویا ہوا تھا کہ ایک آواز نے مجھے بیدار کر دیا، اس آواز میں دہشت تھی، حکم تھا، مجھے حکم دیا گیا کہ میں اشرفیوں کے پانچ توڑے آپ کو پہنچا دوں، اب یہ اشرفیاں حاضر ہیں، قبول فرمائیں!"

بہتری نے اشرفیاں لے لیں اور اس اجنبی کا شکریہ ادا کیا۔ آپ سیدھے قید خانے پہنچے، اس وقت آپ کے ساتھ وہ اجنبی بھی تھا۔ آپ نے اجنبی سے کہا۔ "میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ تم یہ بھی دیکھ لو کہ میں ان اشرفیوں کے عوض خریدنا کیا چاہتا ہوں۔"

قید خانے کے نگراں نے بہتری سقطی کو دیکھتے ہی کہا۔ "بہتری! مرحبا کہ آپ تشریف لے آئے، رات مجھے ایک غیبی آواز نے حکم دیا ہے کہ میں اس لڑکی کی رہائی میں آپ کی پوری پوری مدد کروں۔"

لڑکی نے ان سب کو دیکھا اور رونے لگی۔ اس نے بہتری سقطی کو خاص طور پر مخاطب کیا۔ "بہتری! تم نے مجھے لوگوں میں خوب اچھی طرح رسوا کر دیا۔"

اس وقت لڑکی کا مالک بھی پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق تھا اور اس کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ بہتری سقطی نے اسے تسلی دی، کہا۔ "اے شخص! مت رو، میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس لڑکی کو تو اس کی پوری قیمت لیے بغیر رہا کر دے، حسبِ وعدہ میں اس کی قیمت لے آیا ہوں، وہ مجھ سے لے کر اسے آزاد کر دے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بہتری! نہیں، خدا کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا۔"

آپ نے کہا۔ "ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں اس لڑکی کی قیمت میں جو کچھ دے رہا ہوں اس میں دس ہزار درہم کی زائد رقم بھی شامل ہے۔"

لڑکی کے مالک نے اسی دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "بہتری! خدا کی قسم! اگر آپ اس لڑکی کی قیمت میں پوری دنیا کی دولت بھی میرے قدموں میں ڈھیر کر دیں تب بھی میں قبول نہ کروں گا، میں اسے خدا کے لیے آزاد کرنے پر تیار ہوں۔"

بہتری نے حیرت سے پوچھا۔ "لیکن کل تو اس کی قیمت مانگ رہا تھا، آج یہ کیسا انقلاب آگیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں کل میں اس کی قیمت طلب کر رہا تھا۔ لیکن رات خواب میں خدا کی طرف سے سخت جھڑکی دی گئی ہے اور تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر میں نے اس لڑکی کو آزاد نہ کیا تو اس کی مجھے بڑی سخت سزا دی جائے گی۔ اب میں اس حکم خداوندی کو کس طرح ٹال سکتا ہوں۔ میں اس لڑکی کو اپنی خوشی سے آزاد کر رہا ہوں تاکہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکوں۔"

جو اجنبی بہتری کے ساتھ آیا تھا زار و قطار رونے لگا۔ بہتری نے پوچھا۔ "آخر تو کیوں رو رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے ملول ہوں کہ خدا نے جو کام مجھ سے لینا چاہا تھا، شاید اس سے وہ راضی نہیں ہوا، اب میں کیا کروں میرے لیے یہ رقم بے کار ہے، میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

بہتری نے کہا۔ "خدا کے حکم کی تم نے تو تعمیل کر ہی دی تھی، اس لیے خدا اس کا تمہیں اجر بھی دے گا، اب اگر تم پسند کرو تو اس رقم کو خدا کے نام پر مستحقین میں تقسیم کر دو۔"

اس نے یہ رقم اسی وقت غربا میں تقسیم کر دی۔

بہتری نے لڑکی سے کہا۔ "اب تو آزاد ہے، جہاں جانا چاہے چلی جا۔"

لڑکی نے شکر آمیز نظروں سے بہتری کی طرف دیکھا اور ایک گوشے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب واپس آئی تو اس کے جسم کا قیمتی لباس دور ہو چکا تھا، اس کی جگہ کمبل لپٹا ہوا تھا، وہ روتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

بہتری بھی ان دونوں کے ساتھ واپس ہوئے۔ اجنبی اتنا ملول اور افسردہ تھا کہ اس صدمے نے اسے راستے ہی میں ہلاک کر دیا۔ لڑکی کا مالک مستقلاً بہتری کی صحبت میں رہنے لگا۔ اس نے بھی درویشی اختیار کر لی۔ انہوں نے اس لڑکی کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

☆☆☆

ایک دن ایک بڑھیا آپ کے پاس آئی اور کہا۔ "بہتری! شونیز نامی جگہ پر ایک نوجوان تمہیں بہت یاد کر رہا ہے۔ میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ اس نے مجھے آواز دی کہ اے ماں! کیا تم بہتری کے ٹھکانے سے واقف ہو؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں جانتی ہوں، بولو کیا کام ہے؟ اس نے کہا۔ "بہتری سے کہہ دو تمہیں ایک دیوانہ یاد کر رہا ہے خدا کے لیے جلد ملاقات کر لو۔"

بہتری اسی وقت مقام شونیز روانہ ہو گئے، یہ ایک قبرستان تھا۔ یہاں ایک شخص کچی اینٹ کا تکیہ لگائے آنکھیں بند کیے پڑا تھا، آپ نے جاتے ہی سلام علیک کہی، اس نے آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے اسے پہچان لیا یہ وہی شخص تھا جس نے اپنے بیوی بچوں کو خدا کی یاد میں چھوڑ دیا تھا، آپ نے پوچھا۔ "کیا حال ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بہتری! اس وقت میں بہت پریشان ہوں اور یہ فکر مجھے پریشان کیے ہوئے ہے کہ کیا اللہ مجھے معاف کر دے گا۔ کیا میرے گناہوں سے خدا چشم پوشی کر لے گا؟"

آپ نے کہا۔ "وہ غفور الرحیم ہے، وہ ضرور معاف کر دے گا۔"

اس شخص نے کہا۔ "بہتری! جب میں حاکم شہر زید کا کاتب تھا تو میں نے لوگوں پر بڑے ظلم کیے تھے۔"

آپ نے کہا۔ "اللہ کی طرف سے مایوس مت ہو۔"

وہ کہنے لگا۔ "میں نے اپنے بیوی بچوں کے حقوق بھی ادا نہیں کیے۔ اب میں پریشان ہوں کہ وہ حقوق جو اللہ کی ذات سے متعلق ہیں خدا انہیں تو معاف کر سکتا ہے لیکن مجھ سے حقوق العباد میں جو کوتاہیاں یا مظالم سرزد ہوئے ہیں ان کا کیا بنے گا؟"

بہتری نے جواب دیا۔ "حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس نے خدا کی محبت میں سب کچھ ترک کر دیا اور توبہ کر لی، اس کے ساتھ قیامت میں یوں معاملہ ہوگا کہ اللہ اس کے حقداروں کو طلب کرے گا اور انہیں حکم دے گا کہ وہ اس بندے کے حق میں اپنے حقوق سے باز آجائیں وہ تامل اختیار کریں گے تو خدا فرمائے گا، اگر تم اپنے حقوق سے باز آجاؤ گے تو میں تمہیں اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا ایسا معاوضہ ادا کروں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

وہ شخص اس جواب سے بہت خوش اور مطمئن ہو گیا۔ بولا۔ "اب میرے دل سے تردد نکل گیا۔" پھر سرہانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بسّری! میرے سرہانے چند درہم رکھے ہیں۔ یہ میری حلال کی کمائی کے ہیں، میں عنقریب مرنے والا ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے کفن دفن کا انتظام اسی حلال کی کمائی سے کرنا اور میری موت کی میرے گھر والوں کو خبر بھی نہ کرنا ورنہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ میری آخری رسوم ادا کرنے آ جائیں گے اور میرے کفن دفن میں حرام کی کمائی صرف ہوگی۔"

بسّری اس کے پاس کچھ دیر ٹھہرے رہے، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پڑھنے لگا۔ "لمثل هذا فليعمل العاملون" (عمل کرنے والوں کو ایسے ہی اجر کے لیے عمل کرنا چاہیے)

بسّری نے دیکھا اس کا حال غیر ہوتا جا رہا ہے یہاں تک کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے رخصت ہو گیا۔ آپ نے اس کے سرہانے سے درہم نکالے اور آخری رسوم کی تیاری کے لیے بازار روانہ ہو گئے۔ جب وہ واپس آ رہے تھے تو انہوں نے لوگوں کے ایک ہجوم کو شونیز کے قبرستان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ گھبرائے گھبرائے اور ملول سے تھے۔ بسّری نے ان سے دریافت کیا۔ "لوگو! خیریت تو ہے، تم لوگ پریشان کیوں ہو؟"

ان لوگوں نے جواب دیا۔ "شونیز کے قبرستان میں ایک ولی کا انتقال ہو گیا ہے ہم سب اس کی نماز جنازہ پڑھنے اور تجہیز و تدفین کرنے جا رہے ہیں۔"

بسّری سقطی نے دریافت کیا۔ "تمہیں اس ولی کے انتقال کی خبر کس نے دی؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "ایک شخص یہ اعلان کرتا ہوا ہمارے سامنے سے گزرا کہ اگر تمہیں ایک ولی کی نماز جنازہ پڑھنا ہے اور اس کی تدفین کی رسوم میں شرکت کرنا ہے تو اسی وقت شونیز کے قبرستان میں پہنچ جاؤ۔"

بسّری سقطی نے کہا۔ "اللہ اکبر، اللہ نے اسے ولی کا درجہ عطا فرما دیا، تم لوگ میرے ساتھ آؤ، میں بھی اسی ولی کی آخری رسوم ادا کرنے جا رہا ہوں۔"

یہ لوگ قبرستان پہنچے اور مرنے والے کی آخری رسوم ادا کیں۔

کچھ عرصہ بعد اس کی بیوی بسّری سقطی کے پاس آئی اور دریافت کیا۔ "حضرت! میرے شوہر کا کوئی پتا چلا یا نہیں؟"

آپ نے موت کی اندوہناک خبر سنانے میں ذرا تامل سے کام لیا، عورت نے کہا۔ "حضرت! آپ مجھ سے کچھ بھی نہ چھپائیے، جو کچھ معلوم ہو صاف صاف بتا دیجیے!"

آپ نے نہایت افسوس سے کہا۔ "تیرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔"

عورت کی چیخ نکل گئی۔ اس نے روتے ہوئے شوہر کی قبر کا پتا دریافت کیا۔ آپ نے کہا۔ "میں قبر کا پتا بتا تو سکتا ہوں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ تو کہیں اس کی قبر کو پختہ نہ کرا دے۔ دوسرے یہ کہ مرنے والے کے بہ قول تو حرام کی رقم سے ایسی رسمیں نہ ادا کرنے لگے جس سے مرحوم کی روح کو اذیت پہنچے کیونکہ اس نے مرنے سے پہلے مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ میں اس کی آخری رسوم یا کبھی بھی کسی رسم کی ادائی میں حرام کی کمائی میں سے کچھ نہ خرچ کرنے دوں۔"

بیوی نے رو رو کر کہا۔ "حضرت! آپ میری بات کا یقین کریں میں کوئی بھی ایسی بات نہ کروں گی جس سے مرحوم کی روح کو شکایت پیدا ہو۔"

آپ نے اسے اس کے شوہر کی قبر پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ وہ غش کھا کر قبر پر گر گئی۔ دیر بعد جب ہوش آیا تو اس نے از خود رفتگی میں کہا۔ "میرے آقا، میرے مالک! میں نے تیری زندگی میں تجھے نہیں پہچانا اور تیرے اعلیٰ مرتبے سے بے خبر اور لاعلم رہی لیکن اب مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تو کس بلند مرتبے پر فائز ہے، اب میں جب تک زندہ ہوں تیری قبر کی مجاور بنی رہوں گی اور تیری دولت خدا کی راہ میں لٹا دوں گی۔"

عورت نے جو کچھ کہا تھا اس پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھا دیا۔ وہ اس قبر کی مجاور بن گئی اور سارا مال و منال خدا کی راہ میں دے ڈالا۔ بسّری اپنے گھر واپس آنے لگے تو اس عورت نے کہا۔ "بسّری! میں خوب جانتی ہوں کہ میرے شوہر کی روحانی دنیا میں جو انقلاب آیا تھا وہ آپ ہی کے طفیل آیا تھا، کچھ مجھ پر بھی نظر کرم ہو جائے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تیری طلب صادق ہے تو تجھے مایوس نہیں ہونا پڑے گا کیونکہ خدا کسی کو مایوس نہیں کرتا۔"

عورت نے کہا۔ "میری طلب صادق نہ ہوتی تو میں دنیا تج کے اس قبر کی مجاور نہ بن جاتی۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تب پھر تو بھی کوئی نہ کوئی مرتبہ ضرور حاصل کر لے گی۔"

اس عورت نے پوری زندگی قبر پر گزار دی اور کہا جاتا ہے کہ اس کا شمار بھی ولی عورتوں میں کیا جانے لگا۔

☆☆☆

جس لونڈی کو قید خانے سے آزاد کرایا تھا اس کا مالک بھی بسّری سقطی کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ آپ مختلف اطراف میں گھومتے پھرتے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو وہ شخص بھی آپ کے ساتھ ہی تھا۔ ایک دن آپ خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ قریب ہی سے کسی کی نہایت درد بھری آواز سنائی دی۔ "اے خدا! تیرا دوست دنیا کا بیمار ہے اور اس کی جتنی لمبی عمر ہوتی جاتی ہے گویا اس کا مرض بھی اتنا ہی طویل ہوتا جا رہا ہے۔ تو نے اسے اپنی محبت کی شراب کا پیالہ پلا کر بے خود کر دیا ہے اور یہی نشہ اس کے مرض کا علاج بھی ہے، میں اس نشے میں تیری طرف اس طرح متوجہ اور منہمک ہو گئی ہوں کہ کسی اور طرف میرا دھیان نہیں جاتا، میں تیری محبت میں حیران ہوں اور یہ حیرانی اس وقت تک طاری رہے گی جب تک تیرا دیدار میسر نہیں آ جاتا۔"

بسّری اس آواز کی سمت گئے، ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچا پڑا ہوا ہے، اس نے آنکھیں کھول دیں اور بسّری کو مخاطب کیا۔ "اے بسّری! خیریت سے تو ہو؟"

آپ نے جواب دیا "لبیک، خدا تجھ پر رحم کرے، تو ہے کون؟"

اس نے کہا۔ "بسّری! تجاہل عارفانہ سے کام نہ لو، کیا تم واقعی مجھے نہیں پہچان سکے؟"

آپ نے کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے کہا۔ "تیرا یہ حال کیا ہو گیا، تو تو خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔"

اس نے کہا۔ "بسّری! میں ہی کیا، پوری دنیا ایک خیال کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے پوچھا۔ "لڑکی! آج میں تجھ سے چند سوال ضرور کروں گا، امید ہے کہ تو ان کے دل لگتے جواب دے گی۔"

اس نے کہا۔ "کیجیے سوال، میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

آپ نے پوچھا۔ "قید خانے کے بعد تجھ پر کیا بیتی؟"

اس نے جواب دیا۔ "بسّری! تم خود بھی عاشق ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ کون سی آگ ہے جو تمہیں آوارہ و سرگرداں رکھتی ہے اور ایک ہجر و فراق کے مارے غم زدہ عاشق پر زندگی بھر کیا کچھ گزرتا رہتا ہے، کیا اس سوال کا جواب میں تم سے بہتر دے سکتی ہوں؟"

آپ نے تیز اور شدید سوال کیا۔ "لڑکی! خلق سے جدائی اور رجوع الی الحق سے تجھے حاصل کیا ہوا؟ اس سے تجھے فائدہ کیا پہنچا؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس سے مجھے فائدہ یہ پہنچا کہ غیر سے نفرت اور خدا سے شدید محبت ہوتی چلی گئی۔"

آپ نے کہا۔ "احمد بن مثنیٰ جو تیری قیمت لے کر میرے پاس آئے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔"

اس نے کہا۔ "ہاں مجھے معلوم ہو چکا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خدا نے انہیں بڑا بلند مرتبہ بخشا ہے اور جنت میں وہ میرے پڑوسی ہوں گے۔"

آپ نے کہا۔ "تیرا مولیٰ و مالک دنیا کو ترک کر کے میرے ساتھ پھر رہا ہے اور وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہی ہے۔"

اس نے کہا۔ "اچھا۔" اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ کوئی دعا مانگنے لگی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہونٹ کچھ دیر تو حرکت کرتے رہے، اس کے بعد ساکت ہو گئے۔ آپ نے اسے پکارا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا جب اسے ہلایا جلایا تو معلوم ہوا کہ اس کا وصال ہو چکا ہے، اس وقت اس کا مالک بھی وہاں آ گیا۔ اس نے اسے مردہ جو دیکھا تو برداشت نہ کر سکا، اس کے قدموں میں گر کر اپنی جان بھی دے دی۔ آپ نے ان دونوں کو برابر دفن کر دیا۔

ان دونوں کی موت نے آپ کے دل پر گہرا اثر کیا اور آپ نے صدمے سے نڈھال ہو کر سکوت اختیار کر لیا۔

☆☆☆

آپ کی زبان میں ایسا جادو تھا کہ لوگ اپنے آپ میں نہ رہتے، دوران وعظ گوئی آپ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی کہ کسی بات کا احساس ہی باقی نہ رہتا یہاں تک کہ بڑی سے بڑی اذیت پر اف نہ کرتے۔ ایک بار آپ وعظ گوئی میں مشغول تھے کہ ایک بچھو نے آپ کے پیر پر ڈنک مارا، آپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، بچھو نے دوبارہ ڈنک مارا، پھر کوئی اثر نہ ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

تیسری بار ڈنک مارا اور اس بار پھر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس خبر پر جنید بغدادی نے یہ تبصرہ کیا کہ بچھو کی پرتو خدا کا سایہ ہے۔ اسے کوئی بھی موذی کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ۔ ''مال دار ہمسایہ، بازاری قاری اور امیر علما سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔''

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ''مخلوق سے کچھ نہ طلب کرتے ہوئے دنیا سے متنفر رہنے کا نام زہد ہے۔''

آپ نے آخری دنوں میں فرمایا۔ ''جنید کو بلا دیا جائے۔''

جنید کو حاضر کر دیا گیا۔ آپ نے کہا۔ ''میرے عزیز بھانجے! میں مرنے کے بعد بغداد کی زمین کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔''

جنید نے دریافت کیا۔ ''یہ کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے یہاں کی زمین مجھے پسند نہیں کرے گی اور یہاں مجھ سے حسنِ ظن رکھنے والے بدظنی کا شکار ہو جائیں گے۔''

جنید نے سکوت اختیار کیا۔ اس وقت گرمی اپنے شباب پر تھی اور بچھو سقطی کی حالت غیر تھی، جنید نے انہیں پنکھا جھلنا شروع کر دیا لیکن آپ نے انہیں روک دیا اور کہا۔ ''جنید! پنکھا مت جھلو، اس سے آگ اور بھڑک اٹھے گی۔''

جنید نے روتے ہوئے دریافت کیا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جنید! بندہ تو مملوک ہوتا ہے اس لیے اسے کسی چیز پر بھی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔''

جنید نے کہا۔ ''کوئی نصیحت فرمایئے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جنید! مخلوق میں رہتے ہوئے خالق سے غافل نہ ہونا۔'' یہ کہتے ہوئے آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حضرت جنید بغدادی نے روتے ہوئے فرمایا۔ ''لوگو! میں نے عبادت میں کسی کو اپنے ماموں بچھو سقطی سے زیادہ کامل نہیں پایا۔ آپ اٹھانوے سال زندہ رہے اور پوری زندگی زمین پر پہلو نہیں رکھا۔''

آپ کے وصال کے بعد آپ کی بہن نے بتایا کہ ایک بار جب میں اپنے بھائی سے ملنے ان کے گھر گئی تو گھر میں ہر طرف کوڑا کرکٹ پڑا دیکھا۔ انہوں نے بھائی سے کہا۔ ''اگر اجازت دو تو میں گھر کی صفائی کر دوں۔''

آپ نے منع کر دیا۔ دوسرے دن بہن نے دیکھا ایک بڑی بی جھاڑو دینے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے بھائی سے جل کر کہا۔ ''بھائی! سبحان اللہ، مجھے تو آپ نے جھاڑو دینے کی اجازت نہ دی اور اس نامحرم سے جھاڑو دلوا رہے ہو، یہ کیا بات ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''بہن! یہ بوڑھی عورت نہیں ہے، دنیا ہے، یہ میرے عشق میں جلتی تھی اور مجھ سے محروم تھی، اب اس نے اللہ تعالیٰ سے چاہا کہ اپنا نصیبہ مجھ سے حاصل کرے اس لیے اسے میرے گھر کی جاروب کشی پر مامور کر دیا گیا ہے۔''

آپ کا قول ہے کہ مرد وہ ہے جو بازار میں بھی ذکرِ حق سے غافل نہ رہے، خرید و فروخت بھی کرے لیکن یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو۔

پھر یہ بھی فرمایا۔ ''بہادر وہ ہے جو اپنے نفسِ امارہ پر غالب آ جائے۔'' اور یہ بھی فرمایا کہ ادب دل کا ترجمان ہے۔ جو شخص اپنے نفس کی تربیت و تادیب سے عاجز رہے وہ دوسروں کو کیا ادب سکھا سکتا ہے۔

آپ کی تاریخ وفات اس قطعے سے نکلتی ہے۔

شیخ سری امین سرخدا — محرم راز، واقف تقدیر
سال وصلش بجوز قطب الحق — بازخواں سن ارتحالش میر

250ھ — 250ھ

ماخذات روضۃ الریاحین، اردو ترجمہ، محمد عبداللہ ابن سعد یمنی۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ نوید الدین عطار۔ خزینۃ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث

بے داغ منصوبہ

امجد رئیس

اکثر ایسا ہوتا ہے ایک جانب مجرم منصوبہ بنا رہا ہوتا ہے اور دوسری جانب کاتبِ تقدیر اس کی کامیابی یا ناکامی کا رستہ طے کر رہا ہوتا ہے... اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے بے داغ منصوبے پر کتنے داغ پڑنے والے تھے۔ جیسے شفاف آئینے پر کسی نے اچانک گرد اچھال دی ہو... ایسے ہی اس کی آنکھوں میں بھی تمام چہرے دھندلا گئے تھے۔

ذہانت کی بلندی سے لڑھکنے والے چند بے وقوفوں کا ماجرا

ابتدا میں پرویز کا آئیڈیا میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا تھا لیکن وہ مصر تھا کہ اس مرتبہ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اتنا ہی آسان ہے جتنا پر کٹے کبوتر کو پکڑنا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے اکتاہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

''وہ ایسے، جان جگر کہ اس مرتبہ میرا منصوبہ مختلف نوعیت کا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ میں نے اس پر بہت سائنٹیفک انداز میں کام کیا ہے۔

''بہت اچھے۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ''تم میٹرک فیل ہو اور سائنٹیفک انداز میں کام کر رہے ہو؟'' میرا انداز استہزائیہ تھا۔ وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا۔ اس نے قطعی برا نہیں منایا۔

میں کبھی کبھار اس کے ساتھ ضرور تاً یا دوستی کی خاطر شامل ہو جاتا تھا۔ تاہم میری شمولیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ پرویز کبھی کسی خطرناک کام میں ہاتھ نہیں ڈالتا تھا اور نہ ہی بہت اونچا ہاتھ مارنے کے خواب دیکھتا تھا۔ اس کا اپنا ہی ہلکا پھلکا انداز تھا۔ ناکامی یا کامیابی کی صورت میں اس کے دن

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزر ہی جاتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک ایسا چور بلکہ اچکا تھا جو قناعت پسند تھا۔ اچکا اور قناعت پسند..... عجیب امتزاج تھا۔ اسے صبح کو شام کرنے میں دلچسپی تھی..... اور بس، چاہے اگلے روز جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو۔

"پوری بات نہیں سنو گے؟"

"چلو سناؤ۔"

"اس مرتبہ میں نے ایک پوسٹ آفس چنا ہے....."

"ملازمت کے لیے؟" میری آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ "چلو اچھا ہے کہ تم بھی ملازمت کی طرف تو آئے۔"

"بکواس کیے جاؤ گے یا پوری بات سنو گے؟" اس بار پرویز بھنا گیا۔

"اچھا یار، سنا۔ پوسٹ آفس میں کون سا خط پوسٹ کرنا ہے اور اس میں میری ضرورت کہاں سے آن پڑی؟"

"تجھے پتا ہوگا کہ پوسٹ آفس بھی سیونگ سینٹر کا کام کر رہے ہیں؟"

"ہاں پتا ہے۔" میں نے حیرت سے جواب دیا۔

"تو پوسٹ آفس لوٹے گا؟" مجھے یقین نہیں آیا۔ "کیا افتاد آن پڑی ہے تجھ پر..... تو انڈے روٹی چرانے والا، اکیلی عورتوں کے پرس چھیننے والا....."

"بس کر یامین یار..... مجھ اکیلی جان پر کیا افتاد آئے گی۔ بس ذرا کچھ روز آرام کروں گا۔" وہ بولا۔

"پہلے بہت محنت کرتا رہا ہے؟" میں نے طنز اور تفریح کا ملا جلا تیر چلایا۔

"دیکھ یہ پوسٹ آفس جس پلاٹ پر ہے وہ کچھ زیادہ ہی بڑا ہے۔ ضرورت سے زیادہ....." اس نے سنی ان سنی کردی۔ "اتنے بڑے آفس میں چند افراد ہوتے ہیں..... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہمارے علاقے میں اتنے بڑے آفس کی کیا ضرورت تھی..... نہ میں نے اس پر سر کھپایا۔"

"تو سائنس کی بات کر رہا تھا؟"

"ہاں یہ میرا پہلا پروجیکٹ ہے جس پر میں کئی ماہ سے کام کر رہا ہوں....." اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ لفظ پروجیکٹ پر مجھے پھر ہنسی آگئی۔

"کیا ہوا؟" اس نے منہ بنایا۔

"پروجیکٹ کیا ہوتا ہے؟ کیا کوئی بلڈنگ کھڑی کر رہا ہے؟ سیدھی طرح "منصوبہ" بول نا....."

"ہاں ہاں..... وہی وہی..... میں کہہ رہا تھا کہ میں نے ممنون صاحب پر کئی ماہ سے نظر رکھی ہوئی ہے۔"

"فرعون صاحب پر؟"

"اے ممنون صاحب....."

"تو، تو نے یہ بدنظری کا کام کب سے شروع کردیا، نظر رکھی ہوئی ہے، کیا یہ لڑکی کا نام ہے اور کیوں نظر رکھی ہوئی ہے تو نے؟"

"تو مذاق کے موڈ میں ہے، میں جا رہا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابے بیٹھ جا، شہزادے....." میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ابے او بودی ذرا ایک ٹھنڈی بوتل پکڑ۔" میں نے پرانی گاڑی پر ٹھک ٹھک کرتے ہوئے چھوٹے کو آواز دی۔

"ابھی لایا، استاد۔" چھوٹا فوراً تیر ہوگیا۔ شاید تھک گیا تھا۔

"ممنون صاحب کی عمر پچاس سے اوپر ہے۔" پرویز بیٹھ گیا "اور وہ پوسٹ آفس میں ملازم ہیں۔ وہاں دو ادھیڑ عمر کی خواتین ہیں اور ایک لڑکا....."

"گارڈ کتنے ہیں؟"

"دو، جن افراد یا خواتین نے بچت کی ہوئی ہے، وہ منافع کی رقم لینے، ممنون صاحب کے پاس جاتے ہیں۔ ممنون صاحب کا دوسرا کام، گیس، بجلی کے بل وصول کرنا ہے لہٰذا ان کی دراز میں ہر وقت اچھی خاصی رقم موجود رہتی ہے..... کم پڑتی ہے تو لڑکے کے ذریعے عقبی کمرے سے منگوا لیتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی لاکر ٹائپ کی چیز ہے جہاں مزید رقم ضرورت کے لیے موجود رہتی ہے۔" پرویز نے تیزی سے بات آگے بڑھائی۔ اسے خطرہ تھا کہ میں مزید کوئی شوشا نہ چھوڑ دوں۔ تاہم اس بار میں خاموش رہا۔ بودی گنجا ابھی تک بوتل نہیں لایا تھا۔

"میں آگے تیری بات اس وقت سنوں گا۔ جب تو مجھے بتائے گا کہ یہ ساری رام لیلا، مجھے کیوں سنائی جا رہی ہے؟"

"یار یامین، تو ڈیسنٹنگ پینٹنگ کا کام کرتا ہے..... کوئی بھی گاڑی اٹھا کر لے آنا۔ جب میں رقم لے کر آؤں تو ہم دونوں گاڑی میں نکل جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اپنا فیصلہ اس وقت سناؤں گا جب تیری پوری بات سن لوں گا اور وہ مجھے ہضم ہوجائے گی..... سمجھ رہا ہے نا؟"

"ہاں، ہاں..... میں سمجھ گیا۔ وہ تیرا چھوٹا کہاں رہ گیا؟ بوتل لینے کمپنی چلا گیا کیا؟" پرویز نے گرمی کی شدت سے خشک ہوتے ہونٹوں کو زبان سے تر کرنے کی کوشش کی۔

"راستے میں ہوگا، وہ بھی ہڈحرام ہے..... گالیاں کھا

کر ٹھیک رہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تو اپنی کہانی سنا۔"

"ممنون صاحب سیدھے سادے اور ڈرپوک آدمی ہیں۔ پہلی اور اہم بات یہی ہے..... کون کون منافع کی رقم لینے آتا ہے، کن اوقات میں آتا ہے..... بل زیادہ تر کن تاریخوں میں جمع ہوتے ہیں۔ رش کب ہوتا ہے۔ ٹریفک کی صورتِ حال کب کیسی ہوتی ہے۔ کون سا دن اور کون سا وقت موزوں ہوگا..... وغیرہ وغیرہ۔"

"ابے مردود تو ہالی وڈ کی فلمیں تو نہیں دیکھ رہا؟" مجھے اس کی پیش کردہ تفصیلات سن کر تعجب ہوا تھا۔

"نہیں یار۔"

"پھر یہ سب کچھ..... یہ تو تیرے اسٹائل سے رگڑا نہیں کھاتا۔"

"اسٹائل بدل بھی جاتے ہیں..... میں نے کہا تھا نا کہ یہ ایک سائنٹیفک منصوبہ ہے۔" اس نے سینہ پھلایا۔

"الو، گارڈز کا کیا کرے گی تیری سائنس اور ممنون کون سے تیرے مقروض ہیں کہ تیرے مطالبے پر خاموشی سے رقم ہاتھ پر رکھ دیں گے؟"

"گارڈز کی بات بعد میں..... پہلے ممنون صاحب کی سن۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "میں مخصوص اوقات میں پوسٹ آفس میں داخل ہوں گا اور ایک پرچی، شیشے کے نیچے سے ان کے آگے کردوں گا۔ ساتھ ہی پستول کی جھلک دکھاؤں گا۔"

"کیا.....!.....!....." میں واقعتاً اچھل پڑا۔

"ابے وہ نقلی پستول ہوگا، پلاسٹک کا..... کھلونا پستول!"

"اور تو سمجھ رہا ہے کہ وہ تیری ہدایات پر خاموشی سے من وعن عمل کریں گے؟" میں نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"99.9 فیصد، ایسا ہی ہوگا۔ میں کئی ماہ سے ان کی شخصیت کا گہرا مطالعہ کر رہا ہوں....."

"شخصیت کا مطالعہ.....؟" میری رگ پھر پھڑکی۔ "کبھی کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا ہے؟"

"دیکھ تو پھر پٹڑی سے اتر رہا ہے۔"

"میں تو پٹڑی پر ہوں..... تو یہ بتا کہ آج کل کہاں اٹھ بیٹھ رہا ہے؟"

"یار، کہاں اٹھنا بیٹھنا ہے..... تو جانتا ہے کہ اپنے بس دو تین ہی یار ہیں۔ خیر تو آگے سن....." پھر اس نے مجھے ممنون صاحب کی سادگی اور بزدلی کے چند واقعات سنائے۔ میں تقریباً قائل ہوگیا کہ نقلی پستول دیکھ کر واقعی ممنون صاحب کی روح فنا ہوجائے گی۔

"میرے بچے، میرے گلاب کے پھول..... تو یہ بھول رہا ہے کہ آج کل بینکوں اور سیونگ سینٹرز میں خطرے کا الارم کئی جگہ پر موجود ہوتا ہے۔ بلکہ کیمرے بھی ہوتے ہیں....."

"یامین یار تو مجھے پورا گدھا سمجھتا ہے۔"

"نہیں، جگر پورا نہیں سمجھتا۔"

پرویز کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ "وہاں کیمرے نہیں ہیں..... البتہ ممنون صاحب کے قریب فرش پر ایک الارم بٹن ہے۔"

"اگر انہوں نے پیر سے الارم بجا دیا تو؟"

"جوان، میں اتنے دنوں سے جھک نہیں مار رہا ہوں، پستول دیکھتے ہی ان کا خون خشک ہوجائے گا۔"

"اور وہ اس قابل بھی نہیں رہیں گے کہ دراز میں سے رقم نکال کر تجھے پکڑا سکیں۔" میں لقمہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"تو باز نہیں آئے گا..... خیر گارڈز کی سن..... اس پوسٹ آفس میں آج تک کوئی واردات نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وارداتیں لمبی رقم کے چکر میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ گارڈز عرصہ ہوا سست پڑ چکے ہیں۔ ان کی موجودگی وہاں رسمی سی ہے۔ ویسے بھی وہ مجھے ایک عام صارف کے طور پر پہچانتے ہیں....."

"وہ کیسے؟" میں چونکا۔

"میں ازراہ ہمدردی، کئی ماہ سے پڑوس کی بڑی بی کے بل جمع کرانے وہاں جاتا ہوں۔"

"یار، تو مجھے پرویز نہیں لگتا....." میں واقعی متاثر ہوچکا تھا۔ پھر بھی میں نے اعتراض کیا۔ "اگر گارڈز نے تیری شناخت کرادی تو کیا ہوگا؟"

"ممنون صاحب کچھ بتائیں گے تو بات آگے بڑھے گی..... میں ان کو جو پرچی دوں گا، اس پر خاموش رہنے کی خوفناک دھمکی بھی درج ہوگی۔"

"لیکن پولیس انہیں کیسے خاموش رہنے دے گی؟"

"پوسٹ آفس کا جو نقشہ ہے..... اس کے مطابق میں نے خوب مشق کرلی ہے۔ ایک سیاہ نقاب میری جیب میں ہوگا، جس کی آنکھوں کی جگہ پر بھی جالی لگی ہوگی۔ یہ کنٹوپ اوڑھنے اور اتارنے میں مجھے چند سیکنڈ لگیں گے۔ میں جب اندر جا کر ممنون صاحب کی طرف بڑھوں گا تو مجھے ایک ستون کے پاس سے گزرنا پڑے گا۔ بس وہیں میں چند سیکنڈ میں کنٹوپ چڑھا لوں گا اور کھانا تناول کرتے ہوئے ممنون کے سامنے آجاؤں گا۔ باقی کام میرا پرچہ اور مصنوعی پستول کردے گا۔" اس نے اپنے ماسٹر پلان کی مزید تفصیل

WWW.PAKSOCIETY.COM

بتائی۔ ''واپسی پر ستون کی آڑ میں کٹوپ اتارنے میں چند سیکنڈ لگیں گے اور میں صاف نکل جاؤں گا۔ پھر بھی میں احتیاطاً فوراً ہی بس کے اڈے پر پہنچ کر شہر چھوڑ دوں گا۔ آدھی رقم تیرے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ جب تک بات کھلے گی تو پولیس نامعلوم ملزم کو ڈھونڈتی رہ جائے گی..... چند ماہ بعد میں واپس آجاؤں گا، مزید احتیاط کے طور پر حلیہ مکمل بدل کر آؤں گا۔''

میں آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہا تھا۔

''آواز کا کیا کرے گا؟''

''کئی ماہ سے مشق کر رہا ہوں، آواز کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' پرویز نے مجھے اطمینان دلایا۔

''یہ لو استاد۔'' ٹھنڈی بوتل آگئی تھی۔

''کہاں مر گیا تھا۔'' میں غرایا۔

''استاد وہ سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا..... وہ..... میں..... بڑا مزیدار جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔''

''چل دفع ہو..... کام سے لگ.....'' میں نے آنکھیں دکھائیں۔ دوسری جانب پرویز بوتل اچک کر آدھی خالی کر چکا تھا۔

''یار پرویز، کوئی چیز کھٹک رہی ہے۔ اگر کوئی انہونی ہو گئی۔'' میں نے سر کھجایا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ سارا ٹائمنگ کا کھیل ہے۔ لنچ کا وقت ہوگا۔ دونوں خواتین ایک ساتھ دوسرے کمرے میں کھانا کھاتی ہیں۔ ممنون صاحب گھر سے لاتے ہیں اور اپنی جگہ پر ہی کھانا کھاتے ہیں..... لڑکا نماز پڑھنے چلا جاتا ہے۔ گارڈز بھی گھر سے لاتے ہیں۔ اس دوران پبلک ڈیلنگ بند ہوتی ہے۔ خطرہ کہاں سے ٹپکے گا؟'' وہ مسکرایا۔

''میرے ذہن میں نیا سوال ابھرا۔ ''پبلک ڈیلنگ بند ہوتی ہے تو..... تو کیسے اندر جائے گا؟''

پرویز نے قہقہہ لگایا۔ ''بتایا تو ہے کہ گارڈز کے ساتھ جان پہچان کر چکا ہوں اور ممنون صاحب بھی جانتے ہیں..... مجھے جانے دیں گے اور احتیاطاً ایک آدھ بار میں ٹیسٹ بھی کر چکا ہوں۔'' پرویز نے قائل کیا۔

میں اش اش کر اٹھا۔ اس نے ہر بات کا دھیان رکھا تھا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''لیکن یہ بات کھل جائے گی کہ لنچ کے دوران تو آیا تھا۔ میرا مطلب ہے گارڈز تو یہی بیان دیں گے؟'' میں نے سوچ کر آخری اعتراض کیا۔

''اوگھامڑ، مجھے پتا ہے..... میں جو پرچہ ممنون صاحب کو دوں گا..... اس کے مطابق وہ کم از کم لنچ کے ایک گھنٹے بعد کا بیان دیں گے..... وہ بھی بات کھل گئی تو یہ بیان لنچ سے دو گھنٹے آگے بھی جا سکتا ہے۔''

''تیرے منصوبے کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ ممنون صاحب تیری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کریں گے۔''

''ہاں، یقیناً کریں گے..... میں مختلف طریقوں سے ٹیسٹ کر چکا ہوں۔ یہ منصوبہ میرے دماغ میں اس وقت رینگنا شروع ہوا تھا۔ جب ایک دن میں نے ممنون صاحب کو ایک بے ضرر کتے کے بھونکنے پر خوفزدہ ہو کر دوڑنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا۔''

میں نے کچھ دیر مزید اس کے ساتھ بحث کی اور بالآخر تیار ہو گیا۔ اس نے ہر اعتراض کا تسلی بخش جواب دیا تھا۔

یہ چھوٹا سا منصوبہ مجھے بھی نہایت بے داغ لگا تھا لیکن نہ جانے کیوں ممنون صاحب کی شخصیت مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بچے تو نہیں تھے۔ آج کل تو بچوں کا بھی بھروسا نہیں ہوتا۔

بہرحال میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے پرویز کو بتا دیا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں نکل جاؤں گا..... دوسرے میں گاڑی گارڈز کی نظروں میں نہیں لاؤں گا اور دوسری گلی میں اس کا انتظار کروں گا۔

پرویز نے بہ خوشی دونوں شرطیں منظور کر لیں۔ منصوبے پر عملدرآمد کے لیے اس نے کئی دن اور لیے۔ پھر وہ دن بھی آگیا جب منصوبے پر عملدرآمد ہونا تھا۔

حیرت انگیز طور پر سب کچھ اسی طرح ہوا، جیسے پرویز نے سوچا تھا۔

مجھے بہت آسان معلوم ہوا۔

لیکن نہیں، وہ ہو گیا جو کسی کے گمان میں نہ تھا۔ میں تو دھماکے کی آواز سنتے ہی کھسک لیا تھا۔ پوسٹ آفس میں جو کچھ ہوا، اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔ پرویز پوسٹ آفس سے باہر ہی نہیں نکل سکا۔ گارڈ کی گولی نے اس کا کندھا اڑا دیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟

بوڑھا ممنون، مصنوعی پستول کی جھلک دیکھ کر اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ دوسری سانس نہ لے سکا۔ وہ فرش پر گرنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ سیاہ کٹوپ نے پرویز کو سفاک ڈاکو کا روپ دے دیا تھا۔

ممنون صاحب کی لاش عین الارم کے بٹن پر گری تھی۔

انوکھی سزا

بابر نعیم

جیسے تصویر کے دورخ ہوتے ہیں جیسے... آدھا گلاس پانی دو مختلف نظریات کو جنم دیتا ہے جیسے... دور زمین سے آسمان کا ملاپ کتنا دلکش مگر جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے اور اسی طرح صیاد جب پنچھی کے تعاقب میں خود ہی جال میں پھنس جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی تو ناممکن نہیں... دولت ہو یا طاقت کبھی ایک ہی ہاتھ کی قیدی نہیں رہتیں بلکہ اپنے دائرے میں متحرک رہتی ہیں۔ اسے بھی جب ٹھوکر لگی تو اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ وہ کس قدر کمزور ہو چکا ہے۔

غلط اقدام اٹھا کے درست نتائج کی امید لگانے والے بے وقوفوں کا قصہ

وہ عورت جب کیس بل کی ادائیگی کرنے کاؤنٹر پر آئی تو رچرڈ مرفی نے اسے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے اس کی بیٹی کو مار ڈالا تھا۔ اس نے جو نوٹ دیے وہ سب مڑے تڑے تھے۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ کاغذ کے نوٹوں کو کس طرح رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی رچرڈ نے بہت سی باتیں نوٹ کیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ملائم ہاتھ، خوب صورتی سے تراشیدہ گلابی ناخن، سنہرے بال، گہری لپ اسٹک اور ہلکے رنگوں کا لباس۔ اس نے اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شخصیت کو بدلنے اور نرم خو نظر آنے کے لیے پوری کوشش کی تھی تاکہ رچرڈ اور دوسرے لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں اس عورت کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ اگر رچرڈ کی بیٹی نے اس کی بات کا غلط مطلب لیا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔

اس نے اپنی اصلیت کو چھپانے کی کوشش کی تھی اور اب وہ رچرڈ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی جسے یہاں کام کرتے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ وہ سارا دن کاؤنٹر پر بیٹھا گاہکوں سے گیس کا بل وصول کرتا اور لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرتا تھا۔ وہ تین سال سے اپنے منیجر کی کڑوی کسیلی باتیں سن رہا تھا جو اس کے ہر اچھے برے کام پر بے جا تنقید کرتا۔ اس کے طرز زندگی کا مذاق اڑاتا اور بعض اوقات اس کی ذاتی زندگی پر بھی تبصرہ کرنے سے باز نہ آتا لیکن رچرڈ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے خول میں بند کر لیا تھا جس میں مکمل طور پر خاموشی چھائی ہوئی تھی، وہ اسٹور کے شیشوں کے باہر دیکھتا تو وہاں بھی اسے خالی پن نظر آتا اور اس کا سینہ درد سے بھر جاتا لیکن اسے یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا جب تک اس کا انتظار ختم نہ ہو جاتا۔

تین سال بعد وہ لمحہ بھی آ گیا جس کا وہ شدت سے منتظر تھا۔ اس کی بیٹی کی قاتلہ سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"پمپ نمبر تین، پینتیس ڈالرز۔" رچرڈ نے نوٹ گنے۔ وہ بیس، دس اور پانچ ڈالرز کے نوٹ تھے۔ ان کی حالت سے لگ رہا تھا جیسے وہ یہ نوٹ کوڑے کے ڈھیر سے نکال کر لائی ہے، رچرڈ نے ناگواری سے نوٹوں کو دیکھا اور سوچنے لگا کہ ان لوگوں کو پیسے رکھنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔

رچرڈ نے اسے رسید دی تو وہ شکریہ ادا کر کے چل دی لیکن رچرڈ کی نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اسے لگا جیسے اس عورت کا سب کچھ مصنوعی تھا۔ اس نے اپنی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اسے پہچان گیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کی دراز سے نوٹ پیڈ اور قلم نکالا پھر تیزی سے اسٹور کے شیشے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کی سیاہ فورڈ کار روانہ ہونے والی تھی کہ رچرڈ نے پھرتی دکھاتے ہوئے کار کا نمبر نوٹ کر لیا۔ واپس آتے ہی منیجر جیری نے اسے گھورا اور کہنے لگا۔ "تم اس کے پیچھے کیوں گئے تھے؟"

"اس نے کچھ رقم زیادہ دے دی تھی۔ وہ واپس کرنے گیا تھا۔" رچرڈ نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

"اچھا۔ میں سمجھا کہ وہ عورت تمہیں پسند آ گئی اور تم اس کا اتا پتا معلوم کرنے گئے تھے۔"

رچرڈ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ منیجر اس کی سرخ ہوتی ہوئی جلد کو دیکھے۔

جیری کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ "بے وقوف۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

رچرڈ نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "مجھے اس طرح کا مذاق پسند نہیں۔"

☆☆☆

اس کا نام سارہ جین تھا۔ رچرڈ کی بیٹی کے مرنے کے ایک سال بعد اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ سامان پیک کیا اور اپنا بڑا سا آرام دہ گھر فروخت کر کے تین سو میل دور شمال میں واقع ایک لیک ہاؤس میں منتقل ہو گئی۔ رچرڈ کو اس کے جانے کا پتا بعد میں چلا۔

"مجھے خوشی ہے کہ وہ یہاں سے چلی گئی۔" اس کی بیوی گلوریا نے ایک رات سونے سے پہلے کہا۔

"کون؟" رچرڈ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

"سارہ جین۔" اس کی بیوی نے تنک کر کہا۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں؟"

رچرڈ نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کر دی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ بیٹی کی موت کے بعد ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار حائل ہو گئی تھی اور گلوریا اس کے بستر پر آنے سے پہلے ہی منہ پھیر کر لیٹ جایا کرتی تھی۔ اس نے کافی دنوں بعد اپنی بیوی کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسے دلکش اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا تمہیں اس کے جانے کی خوشی نہیں ہوئی؟" گلوریا نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"وہ کہیں نہیں گئی۔" رچرڈ نے تلخی سے کہا۔ "وہ اب بھی میرے دل اور دماغ میں موجود ہے۔"

گلوریا کو غصہ آ گیا اور اس نے کروٹ بدل کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ تین ہفتے بعد گلوریا نے عدالت میں طلاق کی درخواست دائر کر دی اور رچرڈ صبر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اس میں ہمیشہ سے ہی صبر اور برداشت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ پہلے وہ فوٹو گرافر تھا اور فطری مناظر کی عکاسی کیا کرتا تھا جس میں بہت زیادہ صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔

بیٹی کے قتل کے بعد اس نے فطرت کی عکاسی کرنا چھوڑ دی تھی۔ اسے ان مناظر کو دیکھنے اور عکس بند کرنے میں کوئی

لطف نہیں آتا تھا۔ جب سے اس نے اپنی بیٹی کو اسپتال کے بستر پر موت سے لڑتے دیکھا' اس کے لیے زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی سانسوں کو بحال رکھنے کے لیے وینٹی لیٹر لگا دیا گیا تھا لیکن ایک دن وہ مشین بھی جواب دے گئی۔ راکیل کے دل اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور اب وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

اس کی بیوی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا۔ "جو کچھ ہو گیا۔ اسے بھول جاؤ۔ اس کی اتنی ہی زندگی تھی۔ میں ماں ہوں لیکن صبر کر رہی ہوں۔ کیا مجھے اس کی موت کا دکھ نہیں ہے؟"

لیکن رچرڈ ایسا نہیں کر سکا۔ ابھی تک اس کے ذہن سے وہ واقعہ نہیں نکل سکا تھا۔ وہ صرف انصاف چاہتا تھا جو اسے کہیں سے نہیں مل رہا تھا۔ پولیس، وکیل یہاں تک کہ اس کی بیوی اس کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ رچرڈ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ انصاف حاصل کرنے کے لیے اپنے طور پر کوشش جاری رکھے گا۔

گلوریا کے جانے کے بعد اس نے اپنا فوٹو گرافی کا سامان بیچ دیا اور مستقل گاہکوں کو بتا دیا کہ وہ یہ کام چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا رہا ہے لیکن اس نے کسی کو اپنی منزل کے بارے میں نہیں بتایا بلکہ پوچھنے والوں کو گول مول جواب دے کر ٹال دیا۔ اس نے شہر کے مضافات میں ایک چھ کمروں پر مشتمل کاٹیج خریدا جس کے ساتھ تین ایکڑ زمین اور ایک تہ خانہ بھی تھا اور ایک نزدیکی گیس اسٹیشن پر ملازمت کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ضرورت کے مطابق کاٹیج میں تبدیلیاں بھی کرتا گیا۔ تین سال اسی طرح گزر گئے۔ وہ ہر شام کام ختم کر کے کاٹیج لوٹتا جہاں تنہائی اور سناٹے کا راج تھا۔ پھر وہ تہ خانے کا دروازہ کھول کر اس کے اندر جھانکتا اور وہاں کا خالی پن دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ جاتی۔

"تم جانتے ہو کہ شادیاں کیوں کامیاب نہیں ہوتیں؟" ایک دن جیری نے اس سے کہا۔ اس وقت وہ کاؤنٹر بند کر کے کیش گن رہا تھا۔

رچرڈ کو کام ختم کرنے کی جلدی تھی تاکہ وہ گھر جا کر اپنے منصوبے پر عمل کر سکے۔ اس نے جیری کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ جیری نے اس کی ازدواجی زندگی پر طنز کیا ہے جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ خود جیری نے ایک کاک ٹیل ویٹرس سے دوستی کی تھی جو صرف ڈیڑھ ہفتہ بعد ہی ختم ہو گئی لیکن رچرڈ اس کا حوالہ دے کر جیری کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس کا باس تھا اور ایسی کوئی بات اس کی طبع نازک پر گراں گزر سکتی تھی۔ اس نے بیس ڈالرز کے نوٹوں کی گڈیاں بنائیں اور رجسٹر میں ان کا اندراج کرتے ہوئے بولا۔ "تم ہی بتا دو کہ شادیاں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟"

"مرد اس امید پر عورتوں سے شادی کرتے ہیں کہ وہ نہیں بدلیں گی اور عورتوں کو امید ہوتی ہے کہ وہ مرد کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گی لیکن دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔"

رچرڈ نے نوٹوں کی گڈیاں ایک باکس میں رکھیں اور اسے دیوار میں لگی سیف میں رکھ کر مخصوص نمبروں کے ذریعے لاک کر دیا۔

"جانتا ہوں کہ تم ذاتی زندگی پر بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی، میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔"

"میں نے تو اپنے آپ کو بدل لیا تھا لیکن وہ نہیں بدلی۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس نے احتیاطاً اپنا والٹ نکال کر دیکھا۔ اس میں وہ پرچار کھا ہوا تھا جس میں سارہ جین کی کار کا نمبر درج تھا۔

"تم کچھ بھول کر جا رہے ہو۔" پیچھے سے جیری نے آواز لگائی۔

رچرڈ نے پلٹ کر دیکھا۔ منیجر شوکیس کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے وہاں سے ایک پیکٹ اٹھایا اور اسے اپنی جیکٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم اس کے بغیر یہاں سے جا سکتے ہو۔" جیری نے گویا اس پر احسان جتایا۔

رچرڈ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اسے یاد آیا کہ سارہ جین نے کبھی اس حادثے پر معذرت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر شیلڈن نے یہ بات اسے کئی مرتبہ جتائی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے کبھی سوری بھی نہیں کہا۔

سولہ سالہ راکیل کی آواز میں برف جیسی ٹھنڈک تھی۔ ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ "ڈیڈی۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔" اس وقت وہ بیٹی کے سرہانے بیٹھا اس کی صحت یابی کی دعا مانگ رہا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ راکیل کی آواز سن کر اسے یوں لگا جیسے اس نے خواب دیکھا ہو لیکن جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی بیٹی جاگ چکی تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ڈاکٹر شیلڈن کو مفروضے قائم کرنے کا شوق تھا۔ ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

دن رائیل کا معائنہ کرنے کے دوران اس نے رچرڈ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں اور سارہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے تو تم کیا کرو گے؟''

رچرڈ نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور غصے سے بولا۔ ''میں اسے جان سے مار دوں گا۔''

☆☆☆

اس نے تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہاں کا جائزہ لیا۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ اس سے پہلے گھر آنے کے فوراً بعد اس نے کمپیوٹر آن کیا اور آن لائن سروس میں سارہ جین کی کار کا نمبر ٹائپ کر دیا۔ وہ گزشتہ تین سال سے اس سروس کی فیس ادا کر رہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں ساری معلومات کمپیوٹر اسکرین پر آ گئیں اور وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ سارہ کا گھر بیس منٹ سے بھی کم کی مسافت پر تھا۔ اس کے کانوں میں ڈاکٹر شیلڈن کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''یہ تمہارا غصہ بول رہا ہے رچرڈ۔ تم اسے کبھی نہیں مار سکتے، کیا تم ایسا کرو گے؟''

''شاید نہیں۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

وہ جلد بازی میں کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور اس میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دیکھا۔ وہ ان کی مضبوطی کا اندازہ کرنا چاہ رہا تھا۔ وہاں فرش پر ایک گدا، واش بیسن اور بیڈ پین بھی موجود تھا۔ سلاخوں کے باہر اس نے کمرے میں دو قد آدم آئینے نصب کروا دیے تھے تاکہ کسی کو اپنا عکس دیکھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ رچرڈ نے ایک بار پھر پوری قوت سے سلاخوں پر زور آزمائی کی۔ عین اسی لمحے اس کے کانوں میں بیٹی کی آواز آئی۔ ''ڈیڈی۔ کیا تم میرے ساتھ کھیلو گے؟''

''نہیں۔ اس وقت میں مصروف ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تم سے نہیں بولتی۔''

رچرڈ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو آواز دینا چاہ رہا تھا۔ اسے منع کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ کسی آزمائش میں اپنے آپ کو نہ ڈالے بلکہ گھر چلی جائے اور اپنی ماں کے ساتھ ٹھہرے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن لفظ حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔

رچرڈ نے تہ خانے کا دروازہ بند کیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ گیا۔ اس نے آن لائن سروس سے نقشے کا پرنٹ نکالا اور گیرج میں چلا گیا جہاں اس نے اپنے ٹول باکس سے سیاہ ٹیپ کے دو رول نکالے۔ ایک موٹی رسی اور ٹاٹ کی بوری اٹھائی اور ان سب چیزوں کو ایک بڑے سیاہ بیگ میں رکھ دیا جو اس نے بہت عرصہ پہلے خریدا تھا۔ پھر اس نے وہ بیگ اپنی کار میں رکھا۔ اگنیشن میں چابی لگائی اور کار اسٹارٹ کر کے اپنی منزل کی جانب چل دیا۔ باہر سرد ہوا چل رہی تھی اور اس میں ایک عجیب قسم کی مہک تھی۔ اس خوشگوار موسم میں کار چلاتے ہوئے رچرڈ کو لگا جیسے وہ فیملی کے ساتھ تعطیلات منانے جا رہا ہے۔ فیملی کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں اور گزشتہ واقعات ایک فلم کی طرح اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔

''مجھے تم سے ہمدردی ہے مسٹر اور مسز مرفی!'' یہ آخری وکیل تھی جس کے پاس وہ بڑی امید لے کر گئے تھے۔ ''میں کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کیس میں بالکل جان نہیں ہے بلکہ یہ سرے سے کیس ہی نہیں بنتا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' رچرڈ نے کہا۔ ''اس عورت نے ہماری بیٹی کو مار ڈالا پھر ہم اس پر مقدمہ کیوں نہیں کر سکتے؟''

''تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو لیکن کسی بھی قانون کے تحت اس پر مقدمہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ تکنیکی طور پر اسے قتل نہیں کہا جا سکتا۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' رچرڈ کو اس عورت پر شدید غصہ آ رہا تھا جو وکیل سے زیادہ کوئی ایکٹریس یا ماڈل لگ رہی تھی۔ اس نے گہرے رنگ کا میک اپ کیا ہوا تھا اور کمرے کی روشنی میں ایسا لگ رہا تھا کہ کسی دیوار پر رنگ کر دیا گیا ہو۔ اس کی وضع قطع دیکھ کر رچرڈ کو اس کی اہلیت پر شک ہونے لگا، وہ عورت آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''مس سارہ بہت ہی بے حس عورت ہے۔ اسے کسی کے جذبات کی پروا نہیں۔''

رچرڈ کو اس کی رائے جان کر اطمینان ہو گیا اور وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ بے حس اور جذبات سے عاری ہے۔''

''ممکن ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''لیکن وہ مجرم نہیں ہے۔''

''اس نے میری بیٹی کا قتل کیا ہے۔ وہی اس کی موت کی ذمے دار ہے۔'' رچرڈ جذباتی ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے تمہاری بیٹی کی موت پر افسوس ہے لیکن قانونی طور پر ہم مس سارہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔''

رچرڈ نے گلوریا کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چراتے

ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''ممکن ہے کہ رائیل کی موت ہماری غلطی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ کیا تم نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے؟''

رچرڈ کو اپنی بیوی پر بہت غصہ آیا جو شوہر کا ساتھ دینے کے بجائے دوسرے لوگوں کی باتوں میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

سارہ کا مکان پہلے والے کی نسبت کافی چھوٹا تھا۔ اس کے چاروں طرف گھنی باڑھ لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ پڑوسیوں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔ یہ کاٹیج نما مکان ان لوگوں کے لیے بالکل مناسب تھا جو تعطیلات گزارنے آئے ہوں یا الگ تھلگ رہنے کے عادی ہوں۔ مکان کے سامنے والے حصے میں بڑی بڑی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے ایک میں سے روشنی نظر آ رہی تھی لیکن اطراف کے مکانات میں بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سارہ کی فورڈ بھی پورچ میں کھڑی ہوئی تھی۔ ستمبر کا مہینا شروع ہو چکا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ تعطیلات ختم ہو جانے کی وجہ سے اڑوس پڑوس کے مکانات خالی ہو گئے ہوں گے تبھی وہاں اندھیرے کا راج تھا۔ اس کے باوجود رچرڈ بہت محتاط تھا۔ ابھی صرف دس بجے تھے اور ممکن ہے کہ پڑوس کا کوئی مکان آباد ہو اور اس میں رہنے والے اندھیرا کر کے سو گئے ہوں۔

اس نے اپنی کار فورڈ کے پیچھے پارک کی اور آہستہ سے سیاہ بیگ فرنٹ سیٹ پر سے اٹھا لیا۔ پھر دبے قدموں اینٹوں سے بنے ہوئے راستے پر چلتا ہوا بیرونی دروازے تک آیا۔ اس نے کینوس شوز پہن رکھے تھے تاکہ کسی کو قدموں کی چاپ نہ سنائی دے۔ اس نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مکان کا سرسری انداز میں جائزہ لیا۔ سامنے کی جانب ایک چھوٹا سا لان تھا لیکن وہاں کوئی پھولوں کا پودا نظر نہیں آیا جس سے سارہ کی بدذوقی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

اس نے بیگ سیڑھیوں پر رکھا اور ڈور بیل کا بٹن دبا دیا۔ یہ عمل اس سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوا کیونکہ اس نے مکان میں داخل ہونے کے لیے دوسری ترکیب سوچ رکھی تھی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے نتیجے کا انتظار تھا۔ پھر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ جانتا تھا کہ سارہ دروازہ کھولنے سے پہلے کی ہول سے اسے دیکھنے کی کوشش کرے گی لیکن وہ رچرڈ کو پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے ڈاڑھی بڑھا لی تھی اور اس کے بالوں میں بھی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اب اس کا لباس بھی پہلے کے مقابلے میں مختلف تھا۔ اب وہ گہرے رنگوں کے چست کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے سر سے پاؤں تک سیاہ لباس زیب تن کر رکھا تھا اور اندھیرے کا حصہ لگ رہا تھا۔

دروازہ کھلا تو اس کے سامنے سارہ جین کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ٹی شرٹ اور سیاہ جینز پہن رکھی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری اور رچرڈ نے سوچا کہ شاید وہ اسے پہچان گئی ہے۔

''کیا میں وہاں کچھ چھوڑ آئی تھی؟'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' رچرڈ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''تم گیس اسٹیشن پر کام کرتے ہو۔ میں نے آج تمہیں وہاں دیکھا تھا۔ کیا میں اپنی کوئی چیز وہاں چھوڑ آئی تھی؟''

''نہیں۔ تم نے وہاں کچھ نہیں چھوڑا تھا۔''

''پھر یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے ناگواری سے کہا۔

رچرڈ نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''تمہیں رائیل مرفی یاد ہے؟''

''کون؟''

رچرڈ کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس کا دل چاہا کہ اس مکار عورت کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دے لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''رائیل مرفی، جو چیئر لیڈر بننا چاہتی تھی۔''

سارہ یوں گھبرا کر پیچھے ہٹی جیسے اسے کسی سانپ یا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے اپنا ہاتھ کمر پر رکھا اور رچرڈ کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس نے کوئی ایسا لطیفہ سنا دیا جو وہ سمجھ نہیں پائی، اس کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا۔ ''تم اس وہمی لڑکی کے باپ ہو؟''

یہ الفاظ رچرڈ کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کے مانند اتر گئے۔ اس نے سارہ کے پیٹ پر ضرب لگائی تو وہ تکلیف کی شدت سے دُہری ہو گئی۔ رچرڈ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن وہ عورت نہیں تھی بلکہ وہ تو انسان بھی نہیں تھی۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ رچرڈ نے جلدی سے ٹاٹ کی بوری نکالی اور اس کے سر کو اس سے ڈھانپ دیا پھر ٹیپ کے ذریعے اس کے نچلے حصے کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس نے سارہ کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر ٹیپ سے باندھ دیے اور اسے قیدیوں کی طرح دھکیلتا ہوا کار کی جانب چل دیا۔ وہ پوری قوت سے چلا رہی تھی لیکن موٹی بوری کی وجہ سے اس کی آواز دب کر رہ گئی تھی پھر اس نے کار کی ڈکی کھول کر اسے کسی سامان کی طرح رکھ دیا اور ڈکی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازہ بند کر کے چند سیکنڈ خاموش کھڑا رہا۔ اب کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ کام تو بڑی آسانی سے ہوگیا۔

گاڑی چلانے کے دوران کئی سالوں بعد اس نے پہلی بار اس منحوس دن کے بارے میں سوچا، اس کی نظریں خالی سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور پورے چاند کی روشنی نے ماحول میں ٹھنڈک پیدا کردی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر رکھے اور اس دن کو یاد کرنے لگا جب چیئرلیڈر کے لیے آزمائشی مقابلے ہورہے تھے جس دن سارہ جین نے اس کی بیٹی کو مارڈالا تھا۔

لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھ میں کوئی آنسو نہیں آیا۔ وہ بہ دستور خشک تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رچرڈ نے جو منصوبہ بنایا تھا، اب تک اس میں اسے کامیابی ہوئی تھی۔ اس کی بیٹی کی قاتل کار کی ڈکی میں بند تھی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کے لیے سزا تجویز کرنے والا تھا۔

ایک بار پھر اس کے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جم کا منظر گھوم گیا جب وہ اپنی بیٹی کی کوچ سے ملنے گیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"مسٹر مرفی۔ ہر لڑکی چیئرلیڈر نہیں بن سکتی۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" رچرڈ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اس کے باوجود تم مجھ سے بحث کرنے چلے آئے۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایک بچی کا دل کیوں توڑا؟"

"وہ بچی نہیں ہے۔ اب چودہ سال کی ہوگئی ہے اور اگر اسے اس دنیا میں رہنا ہے تو ایسی بہت سی باتیں برداشت کرنا ہوں گی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کمرا بند کر کے مسلسل روئے جارہی ہے اور ہمارے بار بار کہنے کے باوجود باہر نہیں آنا چاہتی اور نہ ہی ہم سے کوئی بات کرنا چاہ رہی ہے۔ تم نے جو کچھ راکیل سے کہا تھا۔ وہ اس نے مجھے بتادیا ہے۔"

"مسٹر مرفی۔ وہ مجھ سے وجہ جاننا چاہ رہی تھی سو میں نے اسے بتادی۔"

"یہ ظلم ہے۔" مرفی نے احتجاج کیا۔

"نہیں، بلکہ یہی سچ ہے۔"

"تم نے ایک چودہ سالہ حساس لڑکی سے یہ کہہ دیا کہ وہ موٹی ہے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ بچے ایسی باتوں کو دل پر لے لیتے ہیں۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا....."

"میرا خیال ہے کہ ہم کافی بحث کر چکے۔" کوچ سارہ جین اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں قدرتی طور پر دبلی نہیں ہوں لیکن اپنے کھانے پینے کا خیال رکھتی اور باقاعدگی سے ورزش کرتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر تمہاری بیٹی نے کھانا نہیں کھایا تو وہ مر نہیں جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ یہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی آخری گفتگو تھی۔ لیکن رچرڈ اسے بھول نہیں پایا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اسے انصاف کے کٹہرے میں نہ لاسکا، تاہم وہ تہیہ کر چکا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بیٹی کے قتل کا بدلہ ضرور لے گا اور آج وہ دن آگیا تھا۔

☆☆☆

"تم پاگل ہوگئے ہو!" سارہ نے تہ خانے میں پڑے ہوئے گدے پر مچلتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ ابھی تک اس کا سر بوری سے ڈھکا ہوا تھا۔

اب اس نے چلّانا بند کردیا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ جس جگہ اسے لایا گیا ہے۔ وہ ساؤنڈ پروف ہے۔ اس لیے چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" وہ غرّاتے ہوئے بولی۔ "تمہاری سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ میں نے تمہاری بیٹی کو نہیں مارا۔"

"تمہیں یاد ہے کہ ہمارے درمیان جم میں کیا گفتگو ہوئی تھی؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن بوری کے اوپر نیچے ہونے سے لگ رہا تھا جیسے وہ زور زور سے سانس لے رہی ہے۔

"تم نے کہا تھا کہ اگر راکیل ایک وقت کھانا نہ کھائے تو وہ مر نہیں جائے گی۔"

"ہاں۔ تو کیا میں نے غلط کہا تھا؟" وہ بپھرتے ہوئے بولی۔

"راکیل ایک حساس لڑکی تھی۔ چیئرلیڈنگ سے اس میں اعتماد پیدا ہوتا لیکن تم نے اسے اس سے محروم کردیا۔ اس کے جذبے کو مارڈالا۔"

"یہ بہت ظالم دنیا ہے اگر میں اسے یہ بات نہ کہتی تو کوئی اور بتادیتا۔"

"جانتی ہو وہ اس بات سے کیا سمجھی کہ وہ تمہارے مضحکہ خیز جسمانی معیار پر پوری نہیں اترتی۔"

"اگر تمہاری بیٹی نے جائز تنقید کو اتنی سنجیدگی سے لیا تو اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔"

"یہ جائز تنقید تھی۔" رچرڈ غصے سے بولا۔ "تم نے اس سے کہا کہ وہ موٹی ہے۔"

"میں نے اسے سچ بتایا تھا۔"

"جانتی ہو۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اس نے رات کا کھانا چھوڑ دیا پھر دوپہر کا کھانا بھی گول کرنے لگی۔ ایک سال کے اندر یہ حالت ہوگئی کہ اس کا کھانا بالکل ختم ہوگیا، جب ہمیں اس کا پتا چلا تو علاج کے لیے گئے۔ سب نے اس کا معائنہ کیا۔ ان میں غذائی ماہرین، دماغی امراض کے ماہر اور فزیشن شامل تھے لیکن کسی کے علاج سے فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ اس کے بال، دانت سب گرنے لگے۔ سولہویں سالگرہ پر اس کا وزن صرف اڑسٹھ پاؤنڈز رہ گیا تھا پھر وہ کوما میں چلی گئی اور سترھویں سالگرہ سے پانچ ماہ قبل اس کا انتقال ہوگیا۔"

یہ کہتے ہوئے رچرڈ کی آواز بھرا گئی۔ یوں لگا جیسے پورے جسم میں آگ لگ گئی ہو۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ گھونسے مار مار کر سارہ جین کا منہ توڑ دے تاکہ وہ ساری عمر بولنے کے قابل نہ رہے لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سارہ کو یہاں طویل عرصہ رہنا تھا لیکن وہ اسے کبھی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ یہ اس کے منصوبے میں شامل تھا اور وہ اس پر سختی سے عمل کرنا چاہ رہا تھا۔

"میں قدرتی طور پر دبلی نہیں ہوں۔" سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے اپنی غذا کا خیال رکھا۔ بہت سی چیزوں سے پرہیز کرتی ہوں تاکہ میرا وزن نہ بڑھنے پائے۔ میں نے اپنے اوپر کئی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔"

کام سے واپس آتے وقت وہ جیری کے اصرار پر شوکیس سے ایک پیکٹ اٹھالایا تھا۔ وہ اب بھی اس کی جیب میں تھا۔ اس نے وہ پیکٹ نکال کر اس ڈھیر میں سب سے اوپر رکھ دیا جو تہ خانے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ ان ڈبوں اور پیکٹوں میں طرح طرح کی اشیا تھیں۔ جن میں بسکٹ، کیک، پھلوں کے جوس، مکرونی، خشک دودھ اور دیگر سربمہر کھانے پینے کی چیزیں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ کوک اور اورنج سوڈا کے بھی لاتعداد باکس رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب وہ چیزیں تھیں جن سے وزن بڑھتا ہے اور کبھی خراب نہیں ہوتیں۔ تین سال سے اس کا یہی معمول تھا۔ شفٹ ختم ہونے پر وہ شوکیس سے ایک پیکٹ نکالتا اور جیری سے کہتا۔

"یہ میرا شام کا ناشتا ہے۔" اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ البتہ خود کھانے کے بجائے وہ انہیں تہ خانے میں جمع کرتا گیا اور اب وہاں ایک ہزار سے زائد پیکٹ قطار در قطار اوپر نیچے رکھے ہوئے تھے۔

"تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" سارہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

رچرڈ نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور سر پر سے بوری ہٹانے کے بعد تہ خانے سے باہر چلا گیا اور تالا لگادیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"تم نے مجھے یہاں اس سامان کے ساتھ کیوں بند کردیا ہے؟"

"کیونکہ تم قدرتی طور پر دبلی نہیں ہو اور ظاہر ہے کہ تمہیں بھوک بھی لگے گی۔"

سارہ نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اب پوری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ایک ہفتے، ایک مہینے یا ایک سال بعد اس کی کیا حالت ہوجائے گی۔ اس نے دیوار میں لگے ہوئے دونوں آئینوں میں اپنے آپ کو دیکھا اور چلاتے ہوئے بولی۔ "تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"تم دو سال میں کھا پی کر خوب موٹی ہوجاؤ گی۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سارہ کی چیخیں اس کا پیچھا کررہی تھیں۔ "تم درندے ہو۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔ تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتے۔ میں تمہیں جان سے ماردوں گی۔"

رچرڈ ایک ایک کر کے سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ اسے امید تھی کہ مکان میں کی گئی تبدیلیاں کارآمد ثابت ہوں گی اور ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے سارہ کی آواز باہر نہیں آسکے گی۔ اس طرح کسی کو بھی اس کی موجودگی کا پتا نہیں چل سکے گا۔ اس کی بیٹی نے کھانا چھوڑ دیا اور مرگئی۔ اب سارہ کھاتے کھاتے اتنی موٹی ہوجائے گی کہ کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہے گی اور یہی اس کی موت ہوگی جس کا الزام کسی بھی قانون کے تحت رچرڈ پر نہیں آئے گا۔ اگر وہ پکڑا گیا تو زیادہ سے زیادہ اسے سارہ کو جبسِ بے جا میں رکھنے کے الزام میں معمولی سزا ہوسکتی تھی اور اپنی بیٹی کی قاتلہ کو اس انجام تک پہنچانے کے لیے اسے یہ سزا قبول تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

چال

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

بات چال کی ہو یا چلن کی... انسان اپنے قول و فعل میں مترادف یا متضاد ہونے کا اظہار کرتا ہے... وہ جو خود کو بہت خوش نصیب سمجھتی تھی جس کے خوابوں اور امنگوں کی پرواز بہت بلند تھی کہ اچانک اس کے پر زخمی ہوگئے... اس سے پہلے کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر زمین پر گر جاتی کسی کی خاموش دعاؤں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا... جیسے اپنے بلکتے بچے کو ماں اپنی گود میں چھپا لیتی ہے... بہ ظاہر ان کے درمیان بھی کوئی خاص تعلق نہ تھا مگر... کچھ تو ایسا تھا کہ کانٹا ایک کو چبھتا اور زخم دوسرے کو آتا... سالوں سے جو بات ایک راز تھی اس کے انکشاف نے زندگی کو ایسے الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا جیسے کِھلتے مسکراتے پھولوں کو اچانک زرد موسم اپنی لپیٹ میں لے لے... دل تھا کہ کچھ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھا لیکن... دل کو سمجھانا اور منانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر روٹھے ہوئے مقدر مانتے ہیں اور زرد موسم اپنا چولا بدلتے ہیں مگر... بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقدر مان بھی جاتے ہیں... بہار اپنے جوبن پہ آجاتی ہے۔ موسم کی زردی گلاب رنگ اپنا لیتی ہے لیکن... مہک کہیں گم ہو جاتی ہے... اس بار اسے اسی گم شدہ مہکار کی تلاش ہے... اسی امید پر وہ محوِ سفر ہے۔

بھولے ہوئے رشتوں اور بھٹکے ہوئے رستوں کے درمیان ایک روشنی

ہوئی حسینہ کی ہنگامہ خیزیاں

سگنل کی بتی سرخ ہوگئی۔

"کیا مصیبت ہے، جس دن جلدی ہو، دیر بھی اسی روز ہوتی ہے۔" مبارک احمد جھلایا۔ اسٹیئرنگ پر مکا مار کے بولا۔ "کوئی آٹھ بار سگنل پر رکنا پڑا ہے اور جام ٹریفک میں بھی چار بار پھنسے ہیں۔" اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی صفیہ سلطانہ بھی کچھ اس قسم کی کیفیات سے دوچار تھی، پھر دفعتاً اس کی نگاہ ٹریفک کے ہجوم میں سائیڈ پر کھڑی ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا پر پڑی، اندر بیٹھے اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی جیسے یکلخت وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔ وہ شخص کار میں تنہا تھا، اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے اور لوگوں کی طرح وہ بھی سگنل کھلنے کا بے چینی سے منتظر تھا، صفیہ سلطانہ کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی، اس کی یک ٹک نگاہیں ہنوز مذکورہ شخص پر جمی گئی تھیں، وہ اندر سے ایک طوفانی ہلچل کا شکار تھی۔ ٹھیک اسی وقت سگنل کی بتی سرخ ہوگئی، گاڑیاں یوں تیزی سے حرکت میں آئیں کہ لمحے بھر کو دیر ہوئی تو کہیں دوبارہ سگنل نہ بند ہوجائے۔

"کک..... کیا یہ وہی تھا، یا میری آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے؟" صفیہ نے سوچا۔ "..... نہیں..... میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں، یہ وہی خبیث شخص تھا۔"

"تم نے کچھ کہا؟ سوری! ٹریفک کے شور میں کچھ سنا نہیں میں نے۔" دفعتاً اس کے شوہر مبارک احمد نے کہا۔ تب صفیہ کو احساس ہوا کہ جوش نفرت کے احساس تلے..... روح میں اترے ہوئے زخم کی چبھن نے زبان کو بے اختیار کھدیڑ ڈالا تھا۔

"آں..... نن..... نہیں..... میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" وہ چونک کر بولی، پھر غیر ارادی طور پر اس کار کی طرف دیکھا جو تیزی کے ساتھ اب ان کے برابر سے گزرتی چلی گئی تھی، ان کی کار کی رفتار بھی کم تھی، شاید مذکورہ کار کی منزل بھی مشترکہ تھی جو ابھی تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

آج حرا اور گوگی کا "رزلٹ ڈے" تھا اور اسکول کی طرف سے بچوں کے والدین کو شرکت کرنے کی بھی دعوت دی گئی تھی۔ اس سے پہلے مبارک احمد اور صفیہ صرف ایک بار ہی شریک ہوئے تھے، مگر بچوں کی ضد سے مجبور ہوکے دونوں کو اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اسکول جانا پڑا تھا۔

ایسا ہی ہوا تھا، ان کی کار جب اسکول کے احاطے میں داخل ہوئی تو صفیہ کو پارکنگ میں وہی سفید کرولا کار کھڑی نظر آگئی تھی مگر اس میں وہ شخص سوار نہ تھا۔

☆☆☆

ڈائس پر کوآرڈی نیٹرس فرح بچوں کا رزلٹ اناؤنس کررہی تھی، سب سے پہلے تیسری پوزیشن لینے والے بچے کا نام پکار کے اسے ڈائس پر آنے کا کہا گیا۔ پھر دوسری پوزیشن حاصل کرنے والے بچے کا نام پکارنے کے بعد عاقب (گوگی) کا نام پہلی پوزیشن پر آنے کا اعلان ہوا تو مبارک احمد اور صفیہ سلطانہ نے بڑے جوش و خوشی سے تالیاں بجائیں، ساتویں کلاس میں گوگی نے پہلی پوزیشن اٹھائی تھی۔

صفیہ کی نگاہیں ہنوز گاہے بہ گاہے والدین کے لیے مخصوص کی گئی نشستوں کا بھی طواف کررہی تھیں۔ ساتھ میں کلاس میں پوزیشن حاصل کرنے والے بچوں کے والدین کو بھی بعد میں ڈائس پر بلایا گیا تو صفیہ سلطانہ کو پھر وہی شخص دکھائی دے گیا۔ اس کے بیٹے نے دوسری پوزیشن اٹھائی تھی۔ اس شخص کو دیکھ کر صفیہ کی حالت پھر غیر سی ہونے لگی اور پھر جس وقت صفیہ اس شخص کو دیکھ رہی تھی، اس کی بھی نگاہ اچانک ہی صفیہ پر پڑی تھی۔ اس کے بشرے پر بھی کچھ لمحوں کے لیے..... شناسائی کے آثار ابھرے تھے۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی جمشید رضا!" صفیہ دل ہی دل میں اس کی طرف دیکھ کر یوں زیرلب بڑبڑائی جیسے وہ اس سے مخاطب ہو۔

☆☆☆

اس نے اپنے سیل فون سے "شاہانہ پیلس" کا نمبر ملایا۔ تیسری بیل جانے پر ایک نسوانی آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

"کیا میں شاہانہ پیلس کی باوقار خاتون، میڈم صفیہ سلطانہ سے شرف کلام حاصل کررہا ہوں؟" بولنے والے کا لہجہ بہ ظاہر شائستہ تھا مگر اس "شائستگی" میں ایک طنزیہ عنصر بھی غالب تھا۔

"جی! آپ کون؟" دوسری طرف سے وہی نسوانی آواز ابھری۔ لہجہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

"میں کون ہوں، کیا ہوں، اسے چھوڑیے خاتون!" بولنے والے کی شائستگی پل کے پل مفقود ہوکے گمبھیرتا میں بدل گئی۔ "البتہ میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"شٹ اپ، نان سنس۔" اس کی بات پر صفیہ سلطانہ کو غصہ آگیا اور پھر انہوں نے یہ کہہ کر ریسیو کریڈل پر پٹخ دیا۔ "جانے کون بے وقوف اور بدتمیز شخص تھا۔" وہ ہولے سے غصے کے عالم میں بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے جانے لگی تو دوبارہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

وہ رک گئی۔ چند ثانیے کچھ سوچا پھر پلٹ کر دوبارہ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے وہی آواز ابھری۔ "اگر آپ چاہتی ہیں کہ جو ضروری اور اہم بات میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں، وہ میں آپ کے شوہر نامدار..... مبارک احمد سے کرڈالوں تو اس پر مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس میں سراسر آپ کا ہی نقصان ہوسکتا ہے۔" بولنے والے نے اس بار دوٹوک لہجے میں اور گہری متانت سے کہا تھا۔ صفیہ سلطانہ اپنے شوہر کے نام اور ایک اجنبی شخص کے تنبیہی لہجے پر چند سیکنڈوں کے لیے خاموش ہوگئی پھر جی کڑا کر کے بولی۔

"بولو! کیا بات ہے؟ مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

بولنے والے نے وقت ضایع کیے بغیر کہا۔ "میں آپ کی بیٹی..... میرال..... کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

صفیہ سلطانہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ ایک اجنبی کی زبان سے اپنی بیٹی میرال کا نام اتنی پریشانی کا باعث اگرچہ نہ تھا، مگر اپنی بیٹی میرال کا نام ایک راز کی صورت میں یوں اجنبی شخص کی زبان سے آشکارا ہورہا تھا، جسے برسوں تک صفیہ سلطانہ نے اپنے سینے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اسے اپنے وجود میں لرزش سی محسوس ہونے لگی اور یکدم چکر سا آگیا۔ ٹانگیں کپکپانے لگیں، اس میں کھڑے رہنے کی بھی سکت نہ رہی، بڑی مشکلوں سے وہ ٹیلی فون کے قریب دھرے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔

اسے اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ کئی لمحے تک وہ اپنے حلق سے آواز تک نہ نکال پائی تھی۔

"کیوں میڈم! سانپ سونگھ گیا ناں.....؟ اس لیے تو کہہ رہا تھا کہ پہلے آرام سے میری بات سن لیں۔" دوسری جانب سے اجنبی نے جیسے چشم تصور میں صفیہ سلطانہ کی کیفیات دگرگوں کا اندازہ لگاتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تت..... تت..... تم..... کک..... کون ہو؟ اور..... میری بیٹی کو کیسے جانتے ہو؟" بالآخر صفیہ سلطانہ نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بہ مشکل کہا۔

"پھر وہی فضول سوال، کیا یہ کافی نہیں کہ میں وہ سب جانتا ہوں، جو آپ کے شوہر مبارک احمد نہیں جانتے؟" دوسری طرف سے سنگین لہجے میں کہا گیا۔

"تت..... تم کیا چاہتے ہو؟" صفیہ سلطانہ نے اپنے مرتعش وجود کی رہی سہی قوت کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"میں فقط اتنا چاہتا ہوں، جو راز تم نے اپنے شوہر سے اتنے طویل عرصے چھپائے رکھا، میں بھی اسے اپنے سینے میں دبائے رکھوں۔" دوسری جانب سے گویا حظ اٹھانے والے انداز میں کہا گیا۔

"پھپھ..... پھر.....؟" صفیہ سلطانہ کے کپکپاتے لبوں سے پھسلا۔

"پھر کیا؟ صرف 5 لاکھ روپے کی سل رکھنا پڑے گی میرے سینے پر، تاکہ یہ راز سینے میں ہی دبا رہے۔"

"پ..... پ..... پانچ لاکھ..... یہ..... تو..... بہت زیادہ ہے۔" وہ حواس باختہ سی ہونے لگی۔

"اگر 5 لاکھ اس اہم راز سے زیادہ قیمتی ہیں تو پھر وہ راز میں تمہارے شوہر مبارک احمد کو بتائے دیتا ہوں۔" دھمکی آمیز لہجے میں کہا گیا تو، وہ سرتاپا لرز گئی اور فوراً بولی۔

"نن..... نہیں..... نہ..... خدا کے لیے نہیں۔ ایسا مت کرنا۔ میں برباد ہوجاؤں گی....."

"گڈ! اب تم میری بات کا اچھی طرح مطلب سمجھ گئی ہو۔" دوسری طرف سے اجنبی مردانہ آواز نے کمینے پن سے کہا۔ "چلو شاباش! اب جلدی سے میرے منہ کو بند کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے تیار رکھو، ورنہ میری زبان کم بخت قابو میں نہیں رہے گی، پھر کب پہنچا رہی ہو رقم.....؟"

"مم..... مگر..... میں اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتی۔" صفیہ سلطانہ نے ذرا ہمت سے کام لیا۔

"کیا.....؟ اتنی بڑی رقم؟..... تمہارے لیے.....؟ ایک معروف صنعت کار کی بیوی کے لیے یہ بڑی رقم ہے؟..... نو..... نیور..... تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں میڈم!" زہریلے لہجے میں کہا گیا۔ "مجھے ہر قیمت پر 5 لاکھ روپے چاہئیں۔ میں پرسوں صبح اسی وقت فون کروں گا اور تم مجھے بتاؤ گی کہ تم مجھے کہاں پیسے پہنچا رہی ہو، سمجھیں تم۔"

"ٹھٹ..... ٹھہرو..... تت..... تم فون مت کرنا، میں تمہیں اپنا سیل نمبر دے رہی ہوں۔" صفیہ سلطانہ نے ایک پُراندیش خدشے کے تحت کہا۔

"گڈ.....! یہ زیادہ بہتر رہے گا۔" وہ خوش ہوکے بولا۔ "کیوں کہ میں خود بھی نہیں چاہوں گا کہ میرا معاملہ خراب ہو، مگر اس وقت تک جب تم مجھ سے تعاون کرتی رہو، بہ صورت دیگر....." اس نے دھمکی آمیز انداز میں دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

موسم کے تیور آج صبح ہی سے خراب تھے۔

دوپہر تک تو مطلع پوری طرح ابر آلود ہوچکا تھا۔ جن

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگوں کا خیال تھا کہ کراچی کے آسمان پر چھائے بادل عموماً ڈرا دھمکا کر رخصت ہو جایا کرتے ہیں۔ ان کا خیال آج غلط ثابت ہوا اور آناً فاناً ہی آسمان پر کالے بادلوں کی اندھیری چادر سی تن گئی، بادل پوری قوت سے گرجے اور شرائے دار بارش شروع ہوگئی، پل کے پل جل تھل ایک ہوگیا۔

صغیرہ بانو بری طرح پریشان ہوگئی، وہ ایک پکی عمر کی دبلی پتلی اور سانولے رنگت کی خاتون تھی، ناظم آباد میں ایک دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی جس کا صحن ذرا کشادہ تھا۔ وہ اس وقت برآمدے میں حیران پریشان کھڑی برستے آسمان کو تشویش زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے عام سا گھریلو لباس پہن رکھا تھا۔

"کہا بھی تھا، آج مت جانا، پر وہ سنتی کب ہے کسی کی، ہمیشہ اپنی کرتی ہے۔" صغیرہ بانو چڑے ہوئے انداز میں خود کلامیہ بڑبڑائی۔ "پتا نہیں کیا ہوگیا ہے اسے، میری باتوں کو تو اب یہ ذرا خاطر میں نہیں لاتی۔" وہ برستے صحن میں کھڑی اپنے دل کی بھڑاس نکالے جا رہی تھی۔ "بتاؤ بھلا، اب پتا نہیں وہ اس برستے طوفان میں کہاں خوار ہو رہی ہوگی؟"

"اے اللہ میاں! میری بٹیا کی خیر کرنا۔ اسے خیریت سے گھر پہنچا دے، میرے تو ہول اٹھ رہا ہے خدایا! کیا کروں میں؟ کیا خود یونیورسٹی جا کر بٹیا کو لے آؤں؟ مگر کیسے؟ رکشا ٹیکسی مل جائے گی؟" وہ شور زدہ برآمدے میں کھڑی پریشانی سے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑائے جا رہی تھی۔

اچانک آسمان پر بادلوں کی کڑک دار گرج ابھری اور صغیرہ بانو کا کلیجا دہل گیا وہ روہانسی ہونے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اس کے دل کو لمحے بھر کے لیے بھی قرار نہیں آ رہا تھا۔ تشویش آمیز بے چینی نے اسے بری طرح مضطرب کر دیا تھا۔

وہ موسلا دھار بارش کو گویا کچھ ایسی ملتجیانہ نظروں سے تکنے لگی جیسے اسے اس پر رحم آجائے اور اب تب میں رک جائے، مگر برسات تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اچانک اسے کشادہ صحن کی مشرقی دیوار کے دوسری طرف والے مکان کے صحن میں آپا نُدرت کی چیختی چلاتی آواز سنائی دی۔

"ارے کم بخت! ہڈحرام! یہ ساری چارپائیاں اٹھا لے، ذرا جلدی کر ورنہ بھیگ کر خراب ہو جائیں گی اور .....اور..... یہ اپنے ابا کی پھٹ پھٹی (موٹر سائیکل) بھی برآمدے میں لے آ.....خراب ہوگئی تو پورا گھر سر پہ اٹھا لے گا، پتا ہے ناں اس کا..... ذرا..... جلدی جلدی ہاتھ چلا، مرگلوں کی طرح کیا کر رہا ہے۔"

"کر تو رہا ہوں اماں! انسان ہوں میں، مشین تو نہیں ہوں۔" دیوار کے پار ایک جواں سال لڑکے کی آواز ابھری۔

"بہت لمبی ہوگئی ہے تیری زبان..... آ لینے دے تیرے ابا کو، ذرا کام کرنا پڑتا ہے تو باتیں سنانے لگ جاتا ہے..... کم بخت! ایک ہی انڈا وہ بھی گندا۔" آپا نُدرت کی دوبارہ پُرطیش آواز ابھری۔

"کر دینا ابا سے شکایت میری، مجھے بھی پروا نہیں، ایک یہی تو کام آتا ہے آپ کو۔" اس کے اکلوتے بیٹے جہانگیر کی آواز ابھری، اس کے لہجے میں ازلی ڈھٹائی تھی۔

صغیرہ بانو، ان دونوں ماں بیٹوں کی اونچی آوازیں سن رہی تھی۔ معاً اس کے پریشان ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ اس نے بڑی سی بوری نما برساتی اپنے اوپر ڈالی پھر ایک چارپائی گھسیٹ کر صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ لگا کر اوپر چڑھ کے کھڑی ہوگئی۔

آپا نُدرت کے گھر کا صحن بارش کے پانی میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بھاری بھر کم جثے کی مالک آپا ندرت برآمدے میں جلی بھنی کھڑی اپنے اکلوتے جوان بیٹے جہانگیر کو غیظ بھری نظروں سے گھورے جا رہی تھی۔

ایک بیس، بائیس سالہ جوان، لمبا چھریرا لڑکا، جس کا رنگ سانولا تھا، پانی سے شرابور صحن پر بچھی چارپائیوں کو اپنی ننگی پشت پر اٹھائے برآمدے میں ایک ایک کر کے رکھے جا رہا تھا۔

برآمدے میں کھڑی غصہ ور آپا نُدرت کی نظر دیوار کی منڈیر پر ٹکی ہوئی صغیرہ بانو کی کھوپڑی پر پڑی تو جیسے کچھ سمجھ کر اس نے فوراً ہی وہیں سے اپنا ہاتھ نچا کر ایک تڑ لے دار جملہ صغیرہ بانو کو رسید کیا۔

"اے ہے، بہن! اب تم میرے جہانگیر کو اس وقت کہیں باہر مت جانے کے لیے کہہ دینا، یہاں پہلے ہی بہت سا کام کرنے والا پڑا ہے۔"

منڈیر پر کھوپڑی ٹکائے کھڑی بے چاری صغیرہ بانو اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ مگر جہانگیر برآمدے میں آخری چارپائی رکھنے کے بعد فوراً برستے صحن میں آ کر صغیرہ بانو سے ملائمت سے بولا۔ "خالہ! کیا بات ہے؟ آپ پریشان ہیں، خیریت تو ہے ناں۔" اس کی بات پر صغیرہ بانو کو کچھ حوصلہ ہوا، اس نے کہا۔

"جہانگیر بیٹے! وہ میرال یونیورسٹی گئی تھی، ابھی تک نہیں

لوٹی، اس کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ جانے وہ کس طرح اس برستے طوفانی موسم میں گھر لوٹے گی، تم ذرا جا کر اسے....."

"اے ہے بہن! بھلا یہ کیا بات ہوئی؟" برآمدے میں کھڑی، جہانگیر کی ماں نے صغیرہ بانو کو وہیں سے گھور کر کہا۔ "میرا بیٹا کیا تمہاری بیٹی کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لائے گا؟ وہ خود ٹیکسی یا رکشا کر کے کیوں نہیں آ جاتی، اور پھر..... اس موسم میں بھلا تیری لاڈلی میرال کو یونیورسٹی جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"خالہ! آپ فکر نہ کریں، میں اپنے کام سے فارغ ہو کر جاتا ہوں۔" جہانگیر نے ایک تلخ نگاہ اپنی ماں پر ڈال کر صغیرہ بانو کو تسلی دی۔

"جیتا رہ بیٹا! اللہ تیرا بھلا کرے۔" کہہ کر صغیرہ بانو فوراً دیوار سے ہٹ گئی۔ اسے اب تسلی ہوگئی تھی کہ جہانگیر اپنی ضد کا پکا ہے، اس نے آج تک اس کا کہا کبھی نہیں ٹالا تھا اور پھر معاملہ میرال کا ہو تو جہانگیر کے پیچھے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ دوبارہ برآمدے میں آ کر کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

یونیورسٹی کی ایک بیوائٹ طلبا و طالبات کی پہلی "کھیپ" کو لے کر جا چکی تھی، دوسری پوائنٹ خراب تھی۔ کچھ لڑکے لڑکیاں اپنی گاڑیوں وغیرہ سے جا چکے تھے۔ باقیوں نے اپنے ساتھیوں سے لفٹ لے لی تھی۔ چند آپس میں Donation کر کے رکشا ٹیکسی کروا کے گھروں کو روانہ ہوگئی تھیں۔ مگر وہ ابھی تک کینٹین کے سائبان تلے کھڑی تھی۔ اس نے لان کا سرخ سا پھول دار لباس پہن رکھا تھا جو اس کی شہابی رنگت پر خاصا جچ رہا تھا۔ وہ دلکش نقوش کی حامل جاذب نظر لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پہ ازلی سکون اور بے پروائی تھی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی، اسے اس بات کی بھی ذرا پریشانی نہ تھی کہ اس دھواں دھار بارش میں وہ اپنے گھر تک کس طرح پہنچے گی، نہ ہی اس بات کی پروا کہ گھر پر اس کی ماں اس کے لیے کس قدر پریشان اور فکرمند ہوگی، بہ قول اس کے "اماں کو پریشان ہونے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا۔" حتیٰ کہ اس کی ایک سہیلی نے اسے اپنی کار میں لفٹ بھی دینے کی آفر کی تھی مگر اس نے شکریے کے ساتھ اس کی پیشکش ٹھکرا دی تھی۔

اپنے فیلوز میں وہ عجیب لڑکی مشہور تھی، پل میں تولہ پل میں ماشہ، جب موڈ ہوتا، سہیلیوں کے علاوہ لڑکوں تک میں گھل مل جاتی، ان کے ساتھ سیر سپاٹے پر بھی نکل جاتی، تنہائی پسند بھی غضب کی تھی۔ تنہا رہنے پر آتی تو گھنٹوں خود پر قنوطیت سی طاری کر لیتی، کچھ زیادہ حسین تو نہ تھی۔ مگر قبول صورت تھی، آنکھیں بڑی بڑی اور فطری کاجل لیے ہوئے، ایسی گہری کہ ان میں عجیب سی اسراریت کا گمان ہوتا، کھڑی ستواں ناک، صراحی دار گردن، رنگ شہابی، متناسب جسم، بال بوائے کٹ اور ہلکے بھورے مائل تھے، وہ دراز قامت بھی تھی۔

مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک خاص کشش بھی پنہاں تھی۔

مگر ان ساری باتوں سے قطع نظر اس میں کچھ ایسی خاصیتیں بھی تھیں جو اسے ممتاز بناتی تھیں۔ وہ بلا کی خود اعتماد اور قوت ارادی کی مالک تھی۔ اس کی ذہانت اور فطانت کے تو سبھی قائل تھے، مگر سرکشی اور نڈر پن بھی اس میں بلا کا تھا۔

اس وقت اس کے ہاتھ میں کتابوں اور فائلوں کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھا۔ وہ بڑی دلچسپ اور پراشتیاق نگاہوں سے برستے آسمان کو تکے جا رہی تھی۔ پھر اس نے مڑ کر کینٹین کی سیمنٹ والی "سلیب" کے پیچھے کھڑے سیاہی مائل رنگت والے بابو کی طرف دیکھا جو اس کی جانب ہی تکے جا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ تھی۔ وہ یہاں کا بہت پرانا آدمی تھا، شریف اور سلجھا ہوا شخص تھا۔ سبھی اس کی شرافت کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے۔

"بارش تو ابھی رکنے والی نہیں لگتی، کیوں نا آپ کو ایک کپ چائے پلا دوں؟" اس نے کہا، میرال اس کی جانب مڑی اور مسکرا کر بے تکلفی سے بولی۔

"ہاں یار بابو! بڑا غضب کا دماغ پایا ہے تم نے بھی، اس موسم میں واقعی گرما گرم چائے زبردست مزہ دے گی۔"

کینٹین والے بابو نے اس کے "یار" کہنے پر کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی کھلنڈری اور لاابالی سی فطرت سے بہ خوبی واقف تھا اور یہ اس کے لیے بہتر بھی تھا۔ بہ صورت دیگر ناواقفیت رکھنے والا اس عجیب لڑکی کی اس پرشوخ بے تکلفی پر کسی خوش فہمی کا شکار ہونے لگتا تو اسے پھر منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ میرال، وہیں کینٹین کے سائبان تلے سیمنٹ کی ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔

ذرا دیر بعد بابو نے گرما گرم چائے بنا کر اسے اندر ہی سے تھما دی، اس نے ایک عدد سموسہ بھی گرم کر کے پلیٹ میں اس کی جانب کھسکا دیا۔ پھر سنجیدگی سے بولا۔

"میرال صاحبہ! آپ کو ویسے اب تک اپنے گھر چلے جانا چاہیے تھا، بارش تو رکنے والی نہیں لگتی، شام سرک آئی

تو..... آپ کے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔"
میرال نے گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کی دو تین چسکیاں لیں اور پلاسٹک کی پلیٹ میں پڑے سموسے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بڑے لاابالی پن سے کہا۔
"بابو یار! میرے گھر فکر کرنے والا بلکہ والی..... صرف ایک عورت ہے جو مجھے اپنی بیٹی کہتی ہے، بے چاری.....! اسے کیا معلوم کہ..... میں....."
اچانک آواز اس کے حلق میں ہی نہیں بلکہ سینے تک میں گھٹ کر رہ گئی۔ دل کی عمیق گہرائیوں سے کرب کا ایک گولہ اٹھا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ مارے رقت کے اس کی آواز لڑکھڑانے لگتی، اس نے یکدم اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔
میرال نے جیسے ہی چائے ختم کی، ایک نئی اسپورٹس بائیک پر سوار سرخ و سپید رنگت کا ایک خوبرو نوجوان وہاں آن پہنچا۔ عمر چوبیس پچیس کے لگ بھگ تھی، اس نے نیوی بلیو شرٹ پر سیاہ رنگ کی چست جینز کی پینٹ پہن رکھی تھی۔ بال گھنے تھے، چہرے پہ باریک مونچھیں اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ میرال اسے دیکھ کر شناسا سا انداز میں مسکرائی تھی، پھر اس نے چائے کا خالی کپ "سلیب" پہ رکھ کر بیس کا نوٹ اس کے نیچے دبایا اور لڑکے کی طرف بڑھی۔
بارش کا زور اب کچھ ٹوٹنے لگا تھا۔
"ہیلو صارم! آج تو تم بروقت آ گئے۔" وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے کھلنڈرے پن سے مسکرا کے بولی۔
صارم نے بھی ایک پرشوخ نگاہ اس کے ملیح چہرے پہ ڈالی اور مسکرا کے بولا۔ "مجھے معلوم تھا تم ادھر ہی بیٹھی ملو گی، چلو آجاؤ جلدی، بارش رک گئی ہے، پھر نہ دوبارہ زور پکڑ لے۔"
"تھینکس آلاٹس۔" میرال کہتی ہوئی اس کی نئے ماڈل کی اس بھاری بھرکم اسپورٹس بائیک پر سوار ہو گئی۔ صارم نے میرال کے سوار ہوتے ہی اپنی بائیک کو سیلف اسٹارٹ کیا اور آگے بڑھا دی۔
بائیک جیسے ہی یونیورسٹی کے مین گیٹ سے نکلی تو سامنے جہانگیر اپنے باپ کی کھٹارا سی موٹر سائیکل پر اندر داخل ہو رہا تھا۔ "آ گیا تمہارا بدھو محلے دار..... کیا اس بانگڑو کے ساتھ جانا پسند کرو گی تم؟" صارم نے ایک تضحیک آمیز نظر جہانگیر پر ڈال کر شرارتی لہجے میں اپنے پیچھے بیٹھی میرال سے کہا۔

"ضرور..... اگر یہ تم سے پہلے یہاں آجاتا تو....." میرال نے صاف گوئی سے کہا اور جہانگیر کی طرف دیکھ کر مسکرا کے ہاتھ ہلا دیا، وہ جان گئی تھی کہ اسے یقیناً اماں نے ہی اسے لینے کے لیے بھیجا ہوگا۔
"اچھا.....!" صارم طنزیہ حیرت سے بولا۔
"ہاں! کیونکہ وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔"
"اور تمہاری خاطر یہ بے چارہ اکثر و بیشتر گدھا بنتا رہتا ہے۔" صارم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور میرال نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے جہانگیر نے دونوں کے ہنستے قہقہے لگاتے چہروں کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل روک دی اور انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کے آثار تھے اور چہرہ کسی اندرونی کرب کی غمازی کر رہا تھا۔

☆☆☆

گھر والی گلی میں داخل ہو کر صارم نے میرال کی ہدایت پر بائیک روک دی۔
"پھر کب ملو گی؟" میرال کے بائیک سے اترنے کے بعد صارم نے محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
"کل۔" وہ بولی۔
"کہاں؟"
"یونیورسٹی سے واپسی پر۔"
"نہیں۔"
"تو پھر؟"
"کل شام میں تمہیں لینے کے لیے آؤں گا، ڈنر کریں گے، کسی اچھے سے ہوٹل میں۔"
"چلو! یہ ٹھیک رہے گا۔"
"میں سیل فون پر تم سے رابطہ کروں گا، او کے بائی۔"
صارم یہ کہہ کر پلٹ گیا۔ میرال اپنی کتابوں کا ہینڈ بیگ سنبھالے آگے بڑھی، گلی میں بارش کا اچھا خاصا پانی جمع ہو گیا تھا جو چھوٹے تالاب کا ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ کنارے کنارے ذرا خشک جگہ پر پاؤں رکھتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی تو قریب سے موٹر سائیکل کی آواز ابھری۔ یہ جہانگیر تھا جس نے قریب آ کر اپنی موٹر سائیکل روک دی تھی۔ میرال نے سنجیدہ نظروں سے جہانگیر کی طرف دیکھا اور اسی لہجے میں بولی۔
"کیا تم ہمارا تعاقب کر رہے تھے؟"

"مجھے خالہ نے تمہیں یونیورسٹی سے لانے کے لیے بھیجا تھا، وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی تھیں۔" جہانگیر نے ایک نظر میرال پر ڈال کے سر جھکا لیا۔
"اماں کو تو پریشان ہونے کی عادت سی ہو گئی ہے۔" وہ خود کلامیہ انداز میں بڑبڑائی پھر جھکے ہوئے سر کے ساتھ، موٹر سائیکل سنبھالے کھڑے جہانگیر کی طرف دیکھ کر بولی۔
"لیکن تم مجھے کیوں لینے چلے آئے؟ تم تو جانتے ہی ہو کہ صارم....." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، جہانگیر نے اس کی طرف سر اٹھا کے دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔
"اچھا ٹھیک ہے، تمہارا شکریہ....." میرال نے بات بدلی، پھر دروازے پر دستک دی۔ جہانگیر خاموشی سے موٹر سائیکل کے ہینڈل پکڑے ساتھ والے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نظر میرال پہ ڈالی، وہ اس کی طرف کچھ سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، پھر اسی لمحے دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

مبارک احمد کا شمار شہر کے بڑے نہیں تو درمیانے درجے کے صنعت کاروں میں ضرور ہوتا تھا اور وہ بھی ایسے صنعت کاروں میں جو اپنے سخت کاروباری اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے محنت اور لگن سے تیزی کے ساتھ ترقی کی منزل پر گامزن رہتے ہیں۔ ان کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ صحت اچھی تھی، دیکھنے میں پینتالیس سے زیادہ کے نظر نہیں آتے تھے، رنگت سانولی تھی، وہ اس وقت جلدی جلدی دفتر جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان کے دونوں نوعمر بچے عاقب اور حرا تھے، احمد کو آج شاید زیادہ ہی جلدی تھی، اس لیے وہ صرف بہ عجلت چائے کی آدھی پیالی سپ کر کے روانہ ہو گئے۔
صفیہ سلطانہ اب شاہانہ پیلس میں چند نوکروں کے درمیان تنہا رہ گئی تو اسے جانے کیوں ایکا ایکی انجانے خوف نے گھیر لیا اس کی وجہ کل اس اجنبی کی آنے والی فون کال تھی، جس کے بعد اس کا سکون تہ و بالا ہو گیا تھا۔ جانے کیوں اس کی نظریں اب بھی بار بار قریب پڑے ایک فینسی اسٹینڈ پر دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جیسے ابھی اس کے اندر سے کوئی عفریت نکل کر اسے دہاڑتے ہوئے نگل جائے گا۔ آخر یہ کون تھا؟ جو اس کی زندگی کے ایک اہم راز سے واقفیت رکھتا تھا جو اس کی بیٹی میرال کے بارے میں بھی جانتا تھا کہ وہ اس کی بہن صغیرہ کی بیٹی نہ تھی بلکہ اس کی اپنی سگی بیٹی تھی۔
یہ سوچتے ہوئے ایک ہولناک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی ابھرا تھا کہ..... کیا وہ گمنام بلیک میلر..... یہ بھی جانتا تھا کہ اس نے (صفیہ سلطانہ نے) اپنی بیٹی میرال کو کن حالات میں جنم دیا تھا؟ اس ہولناک راز سے تو صرف تین افراد ہی واقف ہو سکتے تھے، ایک وہ خود، دوسری اس کی رازداں، بہن صغیرہ بانو اور..... تیسرا..... جمشید رضا۔
جمشید رضا کا خیال آتے ہی اسے ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔
"کہیں یہ اس کی حرکت تو نہیں ہے؟"
وہ اچانک اسے دکھائی بھی دیا تھا۔ پھر اسکول کے بچوں کے رزلٹ ڈے پر بھی وہ نظر آیا تھا، اس کی بھی نظر اس پر پڑی تھی، تو کیا پھر یہ وہی تھا جو اسے اب بلیک میل کر کے روپے ہتھیانا چاہتا تھا؟ لیکن..... وہ میرال کے بارے میں کیسے جانتا تھا؟..... وہ تو..... وہ..... تو....." وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی، صورت حال خاصی گمبھیر تھی، وہ جتنا سوچتی، اس گمنام بلیک میلر کے سلسلے میں جس قدر قیاس آرائیاں کرتی، اتنا ہی الجھتی جاتی تھی۔
بہر طور..... اس نے اپنی اندرونی کیفیات پہ بہ مشکل قابو پایا۔ مختصر سی تیاری کے بعد وہ اپنی کار میں روانہ ہو گئی۔ ایک چوراہے پر سگنل کی سرخ بتی پر اس نے کار روکی، برابر کی سیٹ پر رکھے پرس کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور پھر اسے کھول کر دیکھا، اندر ایک پھولا سا خاکی لفافہ رکھا ہوا تھا۔
سگنل کی بتی سبز ہو گئی۔ عقب سے گاڑیوں کے ہارن چیخنے لگے۔ صفیہ سلطانہ نے جلدی سے پرس بند کر کے دوبارہ برابر کی سیٹ پر پھینکا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ذہن میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کا دل و دماغ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، ایسی حالت میں ڈرائیونگ کرنا سنگین ثابت ہو سکتا تھا، بالآخر وہ انہی تشویش آمیز پریشان کن سوچوں کے گرداب میں الجھی گھنٹے بھر بعد ایک متوسط علاقے تک آن پہنچی۔ پھر ایک عام سے محلے کی گلی کے قریب کار لے جا کر روک دی۔ پرس اٹھایا اور دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی۔
"کی چین" ریموٹ سے اس نے کار کے دروازے لاک کرنے کے بعد سیکیورٹی الارم آن کیا اور مذکورہ گلی کی طرف تیز تیز قدم بڑھا دیے۔
گلی بارش کے پانی سے ابھی تک بھری پڑی تھی، وہ اندر داخل ہو گئی۔ آنے جانے والوں نے ادھر ادھر سے کچھ اینٹیں اٹھا کر کہیں کہیں کم پانی میں اس طرح رکھ دی تھیں کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس پر سنبھل کر چلا جا سکتا تھا۔ صفیہ سلطانہ بھی اس طرح چلتی ہوئی ایک بوسیدہ سے گھر کے دروازے پر رک گئی اور فوراً دستک دے ڈالی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔

دروازہ کھولنے والی صغیرہ بانو..... تھی۔ وہ صفیہ سلطانہ کو اندر ایک کمرے میں لے آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ صغیرہ بانو آج کچھ فکر مند سی نظر آرہی تھی۔ صفیہ نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے ناں؟..... صغیرہ! تم کچھ پریشان سی نظر آرہی ہو؟ کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟''

''اے نہیں، صفیہ! تمہارے ہوتے ہوئے بھلا کیا مالی مسئلہ درپیش ہوسکتا ہے، مگر.....''

''مگر کیا؟''

''وہ..... ذرا..... میرال کی طرف سے فکر ہونے لگی ہے۔''

''کیا ہوا میرال بیٹی کو؟..... وہ ٹھیک تو ہے ناں؟'' میرال کے ذکر پر وہ یکدم پریشان ہوگئی تھی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' صغیرہ بانو بولی۔ ''لیکن اسے تمہاری طرف سے کرید لگ گئی ہے۔ لگتا ہے اسے اب تم پر کچھ شبہ سا ہونے لگا ہے۔''

''کس بات کا شبہ؟..... کیسا شبہ؟ کیا وہ نہیں جانتی کہ میں تمہاری بچپن کی سہیلی ہوں؟'' صفیہ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو صغیرہ بولی۔

''اب تک تو اسے تمہارے بارے میں یہی کچھ بتاتی آرہی تھی، لیکن کب تک؟..... وہ تمہاری ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت دیکھتی ہے، پھر مجھے اس حال میں دیکھ کر اکثر مجھے کریدنے لگتی ہے کہ آنٹی سلطانہ..... ایک امیر کبیر خاتون ہیں، بھلا مجھ سے ہی وہ ملنے آتی ہیں، میں کیوں نہ کبھی ان کے ہاں جاتی ہوں؟ میرال مجھے دانستہ اکثر تمہارے ہاں چلنے کا بھی کہتی ہے اور تم جانتی ہو کہ تمہارے ہاں جانا کس قدر ناممکن کام ہے، دیکھو بہن صفیہ! ہم دونوں کے درمیان امیری غریبی کا بہت واضح فرق موجود ہے اور یہی بات میرال کو تمہاری طرف سے شبے میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔''

''تم اسے یہ کہہ کر مطمئن کرسکتی ہو ناں.....! کہ ہم دونوں کے بیچ سگی بہنوں سے بھی بڑھ کر دوستی کا رشتہ ہے۔'' صفیہ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ جواباً بولی۔

''آج کل کے زمانے میں بھی تو کم بخت ایسا گہرا دوستی کا رشتہ کب قابل اعتبار سمجھا جاتا ہے، بہن جی اب تو پاس پڑوس کی عورتیں تک آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگی ہیں کہ آخر خالہ صغیرہ بانو..... جیسی ایک غریب عورت کے پاس ایک لمبی سی کار والی اور ٹھاٹھ باٹھ کی مالک خاتون کیوں کر ملنے آتی ہے؟''

اس کی بات پر صفیہ سلطانہ کو بھی تشویش آمیز سی چپ لگ گئی۔ اس کے ذہن میں پھر اس گمنام بلیک میلر کا خیال آیا، اس کے جی میں تو آئی کہ وہ صغیرہ بانو کو اس کے بارے میں بتا دے، مگر کچھ سوچ کر اس نے ارادہ بدل ڈالا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''دیکھ صغیرہ بہن! جو بات راز میں رہ سکتی ہے ناں اسے بے شک راز میں رہنے دے..... لیکن تو اچھی طرح جانتی ہے یہ بات کہ میرال بیٹی کا معاملہ دوسرا ہے..... ہم دونوں بہنوں کے درمیان ایک ہی تو راز ہے، وہی راز نہ رہا تو پھر کیا باقی بچے گا؟ سب کچھ ختم ہو کر بکھر جائے گا۔ خود میں اپنی بیٹی کو کیا منہ دکھاؤں گی اور یہ راز جاننے کے بعد میرال پہ کیا بیتے گی.....'' صفیہ سلطانہ کے لہجے میں برسوں کا درد آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہہ نکلا۔ بہن کو دکھی دیکھ کر صغیرہ بانو کا اپنا دل بھی بھر آیا، وہ بڑی رسان آمیزی سے بولی۔

''دیکھو صفیہ! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مبارک بھائی کی حد تک بے شک یہ راز، راز ہی رہے لیکن اس صورت میں جبکہ میرال بیٹی کو اس حقیقت پر شبہ بھی ہونے لگا کہ ہم دونوں کے بیچ کوئی راز ضرور چھپا ہوا ہے، اسے اعتماد میں لے کر ساری حقیقت بتا دینی چاہیے کہ اس کی اصل ماں، میں نہیں، تم ہو، البتہ اس کے باپ کے سلسلے میں کوئی جھوٹ بھی بول سکتی ہو، لیکن کم از کم تم اس سے ماں ہونے کا حق تو مت چھینو..... وہ بہت حساس بچی ہے، ڈر مجھے یہ ہے کہ اگر اس نے یہ راز کسی طرح خود کھوج نکالا تو پھر تم جانتی ہو کیا ہوگا؟''

صغیرہ بانو یہ کہہ کر اپنی بہن کا چہرہ تکنے لگی۔ صفیہ سلطانہ اپنی بہن کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولی۔

''وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی..... ہوسکتا ہے اپنے آپ سے بھی.....'' اس کا لہجہ فرطِ رقت سے مرتعش ہوگیا۔

''شاید ایسا کسی حد تک ہو۔'' صغیرہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔ ''مگر یہ سب عارضی بھی ہوسکتا ہے، وہ بہت محبت کرنے والی بچی ہے، پھر ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ ممتا ایک فطری کشش رکھتی ہے، اپنے اندر، وہ تمہاری مجبوری سمجھ سکتی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کیا میرال بیٹی تم پر ایسا کچھ شبہ کرنے لگی ہے کہ تم اس کی سگی ماں نہیں بلکہ خالہ ہو؟" صفیہ نے اچانک بہن سے پوچھ لیا۔

"ہاں! لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" وہ جواباً گومگو سے لہجے میں بولی۔

"تمہیں کس طرح اندازہ ہوا اس کا؟" صفیہ نے بہ غور بہن کے پُرسوچ چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کرنا چاہا تو وہ بتانے لگی۔

"دن بہ دن اس کا رویہ میرے ساتھ کچھ عجیب ہوتا جارہا ہے، وہ سرکش ہوتی جارہی ہے۔ اشاروں کنایوں میں وہ مجھ پر یہ باور کرانے لگتی ہے کہ میں اس سے کچھ چھپا رہی ہوں۔"

"اس عمر میں تقریباً سبھی نوجوان سرکش ہوتے ہی ہیں۔ خوامخواہ کے تجسس کا شکار ہونے لگتے ہیں، تم اس کی فکر نہ کرو۔" صفیہ نے جواز پیش کرتے ہوئے بہن کو تسلی دینا چاہی تو صغیرہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"تم وہ کچھ نہیں سمجھ سکتیں صفیہ! جو میں آج کل میرال کی شخصیت اور انداز و اطوار سے محسوس کرنے لگی ہوں۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

"لگتا ہے، میرال بیٹی آج جلدی یونیورسٹی سے آگئی۔" صغیرہ بانو دروازے پر دستک دینے کے انداز کو پہچان کر بولی۔ صغیرہ سلطانہ کے چہرے پہ پریشانی کی جھلک ابھری، اگرچہ اس انداز میں اس کا میرال سے پہلے بھی اچانک اور غیر متوقع سامنا ہوتا رہا تھا، مگر آج کچھ اور ہی محسوس ہو رہا تھا۔ تاہم اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے پرس کو کھولا پھر اس میں رکھا پھولا ہوا خاکی رنگ کا لفافہ صغیرہ بانو کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے اندر کچھ بڑے نوٹ تھے، اسے تھماتے ہوئے وہ بولی۔

"دروازہ کھولنے سے پہلے اسے فوراً سنبھال لو۔"

صغیرہ بانو نے خاموشی سے لفافہ لے لیا پھر اسے کہیں سنبھال کے رکھنے کے بعد فوراً باہر کا رخ کیا۔

صفیہ سلطانہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر وہاں سے جانے کے لیے وہ بھی کمرے سے نکل گئی۔

صحن میں ہی دونوں کا سامنا ہوگیا۔

بیٹی کا سامنا کرنا صفیہ سلطانہ کے لیے بہت بڑے اور کڑے امتحان کے مترادف ہوتا تھا، اس دوران وہ ممتا بھری پیاسی محبت کے کن کن عذابوں اور حسابوں کے پل صراط سے گزرتی تھی یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

میرال بھی آج واقعی جلدی یونیورسٹی سے آگئی، آج اس نے اس "خاتون" کو دیکھ کر سلام بھی نہیں کیا تھا۔ رک کے اسے برماتی نگاہوں سے گھورا ضرور تھا۔ صفیہ سلطانہ نے بھی اس کے چہرے کے تیوروں سے صاف محسوس کرلیا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس کے اندر پل رہی تھی، میرال کی نظروں کی تپش سے اسے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ ہونے لگا کہ صغیرہ بانو کی پریشانی خالی از علت نہ تھی۔ صفیہ سلطانہ میں پھر بیٹی کا زیادہ دیر تک سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوسکی اور وہ ذرا ٹھہرنے کے بعد تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اپنی بہن کو جمشید رضا کے بارے میں بھی نہ بتا سکی تھی۔

☆☆☆

عاقب اور حرا کے اسکول لوٹنے سے پہلے پہلے صفیہ سلطانہ شاہانہ پیلس لوٹ آئی تھی۔ اسے اب اس گمنام بلیک میلر کی طرف سے ایک نئی پریشانی لاحق ہونے لگی تھی، جس نے دو دن کی مہلت دے رکھی تھی، ایک دن بیت چکا تھا اور کل اس سے سیل نمبر پر رابطہ کر کے پانچ لاکھ روپے پہنچانے کا پتا پوچھنا تھا، مگر اس سے پہلے اسے دینے کے لیے صفیہ سلطانہ کو پانچ لاکھ روپے کا بندوبست کرنا تھا، صفیہ سلطانہ اپنے شوہر مبارک احمد کے مزاج سے بھی واقف تھی کہ وہ روپوں پیسوں کے معاملے میں کس قدر سخت آدمی تھا۔ مزاج کا بھی قدرے سخت اور شکی تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر "کیوں، کیا، کیسے.....؟" کرنے لگتا تھا۔

اپنی بہن صغیرہ بانو اور بیٹی میرال کی پرورش اور ان دونوں کے اخراجات کے لیے ہر ماہ ایک لگی بندھی رقم نکالنا تک بھی صفیہ سلطانہ کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح حیلے بہانوں سے یہ رقم نکالتی رہتی تھی، لیکن اب یکمشت پانچ لاکھ کی رقم اور وہ بھی اس گمنام بلیک میلر کو دینے کے لیے نکالنا صفیہ سلطانہ کو ناممکن حد تک پریشان کیے دے رہا تھا۔

مبارک احمد منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آغاز میں بہت کڑے دن دیکھے تھے اس لیے وہ روپے پیسے کی قدر کرتا تھا۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ گھر میں روپے پیسے کی تنگی رکھتا تھا، ہرگز نہیں، جو جائز اخراجات اور معاشرے میں اچھی اور معیاری زندگی گزارنے کے لیے اخراجات ہوتے، وہ سب کیا کرتا تھا، مگر وہ حساب رکھنے اور حساب لکھنے کا عادی تھا، گویا پیسا یہاں اڑایا یا پھونکا نہیں جاتا تھا، البتہ جائز ضرورتوں

میں ضرور خرچ کیا جاتا تھا۔ صفیہ سلطانہ ایسی ہی کسی "جائز ضرورت" کا جواز پیدا کر کے ہر ماہ تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے پس انداز کرلیا کرتی تھی، جو تقریباً بیس سے تیس ہزار روپے کی رقم بن جایا کرتی تھی اور مبارک احمد کو بھی کسی قسم کا شبہ نہ ہوتا تھا۔

لیکن..... اب یکمشت پانچ لاکھ جیسی خطیر رقم کا اور وہ بھی صرف اڑتالیس گھنٹوں میں بندوبست کرنا صفیہ سلطانہ کے لیے ممکن نہ ہو رہا تھا اور اس میں سے بھی چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے اور اب صرف چوبیس گھنٹے یعنی صرف ایک دن بچا تھا، کل شام اسے پانچ لاکھ کی رقم اس بلیک میلر کو پہنچانا تھی، بہ صورت دیگر وہ اس کا اہم راز فاش کرنے کی حتمی دھمکی دے چکا تھا، وہ بہت پریشان اور متوحش ہو رہی تھی۔

یہ اس روز رات کا ذکر تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد عاقب اور حرا اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، مبارک احمد اور صفیہ سلطانہ اپنے بیڈروم میں آگئے۔ شاہانہ طرز کے بیڈروم میں ایئر کنڈیشن کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ صفیہ سلطانہ نے اپنے تئیں حتی الامکان کوشش کی تھی کہ اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی نہ مترشح ہونے پائے جو اس کے شکی مزاج شوہر کو اس کی طرف سے ٹھٹکا دینے کا باعث بنتی..... مگر ایسا نہ ہوسکا۔

"کیا بات ہے، صفیہ میں دیکھ رہا ہوں، تم کچھ پریشان سی نظر آرہی ہو؟"

چہرہ چھپانے کی غرض سے صفیہ سلطانہ اس وقت نفیس قسم کے فینسی اسٹائل اور بیضوی ڈریسنگ ٹیبل کے خوب صورت ٹمپل اسٹول پر بیٹھی یونہی ہلکے پھلکے میک اپ کو صاف کر رہی تھی، کہ شوہر کے یہ دھیمے لہجے میں کہے گئے الفاظ بھی اس کی سماعتوں پر برچھی کی طرح پیوست ہوئے تھے۔ اس پر ایکا ایکی گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے اپنی گردن موڑنے کے بجائے ٹیبل کے بیضوی آئینے سے شوہر کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا پھر جلدی سے بولی۔

"نن..... نہیں..... تو، آپ نے بھلا یہ کیوں محسوس کیا؟"

"صفیہ! تم کیا مجھے صرف ایک بزنس مین ہی سمجھتی ہو؟" مبارک احمد نے اپنے بیش قیمت سلیپنگ گاؤن کا بیلٹ باندھتے ہوئے بیوی سے کہا۔ اس کے لہجے میں اسرار بھری سرسراہٹ اور ہلکا سا چبھتا ہوا طنز بھی شامل تھا۔

"ہاں! آپ نے پھر بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔"

بالآخر صفیہ سلطانہ نے پچیس سالہ رفاقت کی مزاج آشنائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقرار میں جواب دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ پہلو بچانے کا مطلب مزید جھوٹا ہونا اور شوہر کے شبے کو ابھارنے کے مترادف ہوتا۔ نتیجتاً بدمزگی سے بچنے کا یہی طریقہ تھا کہ ہاں میں ہاں ملائی جائے، چاہے جھوٹ ہی سہی۔

"مجھے نہیں بتاؤ گی اپنی پریشانی کی وجہ؟"

مبارک احمد نے جھک کر سائڈ ٹیبل کی دراز سے سلیپنگ پلز کی چھوٹی شیشی نکالتے ہوئے کہا اور بیڈ پر بیٹھ گئے۔ "آپ ہی کو تو بتانا تھا، مجھے آپ کے موڈ کا پتا نہیں چل رہا تھا۔" صفیہ نے بات بنائی، پھر ڈریسنگ ٹیبل سے فارغ ہوکر اس نے بھی گلابی رنگ کا مہین ریشمی گاؤن پہن لیا۔ مبارک احمد نے دو گولیاں اپنی ہتھیلی پر نکال کر پانی کے ایک بڑے گھونٹ سے نگل لیں۔

"عاقب اور حرا کی پرنسپل مسز ماجدہ سعید نے ان کی لیسن ڈائری میں ریمارکس لکھ کر بھیجا ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"یہ تیسری بار ریمارکس بھیجا ہے انہوں نے، کہ ہمارے دونوں بچوں کی پہلے کے مقابلے میں ایجوکیشنل پروگریس بہت سلو ہوگئی ہے۔ البتہ دیگر غیر نصابی سرگرمیوں میں ان کی دلچسپی بڑھنے کی وجہ سے اس سال انہوں نے زیادہ انعامات....."

"..... اوکے..... گڈ نائٹ..... مجھے نیند آرہی ہے۔"

اچانک مبارک احمد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

صفیہ سلطانہ پریشان سی ہوکے خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی، وہ یہ نہ جان سکی تھی کہ مبارک احمد کے اس طرح اچانک اس کی بات قطع کرنے کا کیا مطلب تھا؟ کیا واقعی انہیں نیند آرہی تھی یا پھر..... یہ ایک اشارہ تھا کہ..... ان کی بیوی ان سے جھوٹ بول رہی تھی۔ ایکا ایکی جانے کیوں صفیہ سلطانہ کو ایک نامعلوم سی تشویش و تفکر نے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بجے تھے۔

حسب معمول بچے اسکول اور مبارک احمد دفتر جاچکے تھے۔ صفیہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے کمرے میں موجود تھی، وہ سمجھ رہی تھی زیادہ دن ایسے نہیں چل سکتا تھا، اس کی اعصاب زدہ اور پریشان کن کیفیات مبارک احمد کو ایک دن سختی سے باز پرس پر مجبور کرسکتی تھیں، حالات معمول پر آنے تک اسے خود پر قابو پائے رکھنا ہوگا، بہ صورت دیگر مبارک احمد کو اس پر ذرا بھی شبہ ہوا تو وہ پھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس سے کرید کر ہی رہے گا۔

گھر میں کوئی خاص کام نہ ہوتا، گھریلو ملازمہ تھی، اس نے سب سنبھالے رکھا تھا مگر پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ اسے مصروف رہنے کی عادت ڈالنا ہوگی، خالی بیٹھنے سے دماغ اور اعصاب تھک جاتے تھے۔ لہٰذا وہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس وقت وہ اپنے شوہر کے کمرے کو درست کرنے میں مصروف تھی، اس کے کمرے میں رکھا سیل فون گنگنایا۔ ہر فون کی بیل اب ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر پڑتی تھی۔ وہ لپک کر اپنے کمرے میں آئی اور سیل فون اٹھا کے کان سے لگایا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو صفی!'' دوسری جانب سے مردانہ مگر شناسا سا انداز کی آواز ابھری اور جس انداز سے اس کا ادھورا نام صفی پکارا گیا تھا، اس سے کسی دیرینہ تعلق کا شائبہ ابھرتا تھا اور وہ آواز صفیہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی، مگر اس آواز کو سن کر اس کے دل و دماغ میں نفرت کی آگ بھر گئی تھی۔

''کون؟'' بہ مشکل اس نے اپنی سلگتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر اجنبی لہجے میں پوچھا تھا۔

''میں تمہارا مجرم ..... جمشید..... جمشید رضا ہوں..... میں نہیں جانتا کہ میں تم سے بات کرنے کا بھی حق دار ہوں کہ نہیں..... لیکن میرے دل کا بوجھ اور میرے ضمیر کی چبھن.....''

''میں تم سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتی اور نہ ہی آئندہ مجھے فون کرنا، سمجھے تم.....؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر پھٹ پڑی۔ ''میں تمہیں حرفِ غلط کی طرح کاٹ کر بھلا چکی ہوں۔''

''تمہیں اس کا حق ہے، صفی۔''

''شٹ اپ۔'' وہ غیظ نفرت سے جھڑک کے بولی۔ ''دوبارہ مجھے صفی کہنے کی بھی جرأت نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر وہ رابطہ منقطع کرنا چاہتی ہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''پلیز! خدا کے لیے صفیہ! مجھے صرف تم سے معافی چاہیے۔'' مگر صفیہ نے کوئی بات کرنا گوارا نہ سمجھا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ اپنے ذہن سے ماضی کے سارے صفحات پھاڑ چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر اس نے اس کا سیل نمبر کہاں سے حاصل کیا؟ تب وہ ایک ہی اندازہ قائم کر پائی تھی کہ اس نے رزلٹ ڈے والے دن اسکول میں اسے دیکھا تھا اور یقیناً کسی طرح اس نے وہیں سے ہی ''پیرنٹی رجسٹر'' سے حاصل کیا ہوگا مگر کیوں؟ وہ اب اس سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا؟ اور بات کرنے کے لیے اب رہ بھی کیا گیا تھا؟

''کیا میرے لیے اب ایک نئی مصیبت اور پریشانی کی ابتدا ہونے والی تھی؟''

اس نے تشویش سے سوچا۔ ایکا ایکی اسے جانے کیوں ایک نامعلوم سی تشویش و تفکر نے گھیر لیا تھا۔

☆☆☆

میرال اس روز یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ یونیورسٹی نہ جانے کے لیے عموماً اس کے پاس کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی تھی۔

سہ پہر چار بجے میرال کے سیل فون پر صارم نے کال کی۔

''آجاؤ، میرال! گھومنے نکلتے ہیں، موسم بھی اچھا ہے.....'' سیل کان سے لگانے کے بعد دوسری جانب سے اس کی چہکتی آواز ابھری۔

''کیا ضروری ہے آج؟ پھر کبھی سہی؟'' میرال نے کہا۔

''اوکم آن یار! آج ہی تو ضروری ہے، ویسے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟'' صارم نے پوچھا۔

''ہاں! میں ٹھیک ہوں، بس! ویسے ہی ذرا باہر نکلنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔'' وہ بے قرار لہجے میں بولی۔

''چلی آؤ، تمہارا موڈ بنا دوں گا میں، گنے کے جوس والے چوراہے پہ میں اس وقت بائیک لیے تمہارا شدت سے منتظر ہوں، باقی۔''

صارم نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''مائی گاڈ! کس قدر پرجوش ہو جاتا ہے یہ.....'' میرال ہولے سے مسکرا کے خود کلامیہ بڑبڑائی۔

بہر طور..... وہ ماں کے کمرے میں گئی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اب کون سی سہیلی کے ہاں جانا ہے تم نے؟'' صغیرہ بانو اس کے لاڈ کا فوراً مطلب سمجھ کر بولی۔

''میری اچھی اماں! بس ابھی آجاؤں گی، آپ تو جانتی ہی ہیں، نبیلہ میری کس قدر عزیز سہیلی ہے اور پھر کون سا دور جانا ہے، چوراہا ہی تو پار کرنا ہے صرف۔''

''بیٹی! شام سر پر ہے۔''

''اماں! میں بچی تو نہیں ہوں۔''

''بچی نہیں ہو مگر لڑکی ذات تو ہو۔'' صغیرہ بانو کے لہجے میں برسوں کے تجربے کی جھلک تھی۔

''لڑکی ذات ہوں تو کیا اب باہر نکلنا چھوڑ دوں؟'' وہ بھی تنک کر بولی مگر پھر اسے ماں پر پیار آ گیا۔ وجہ یہی تھی کہ صغیرہ بانو نے اسے بہت محبت اور جانفشانی سے پالا تھا۔ میرال بھی ان کا احترام کرتی تھی اور محبت بھی..... اسے ماں کی موجودگی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح لگتی تھی، ماں کہنے سے اس کی زبان میں شیرینی سی اتر آتی تھی۔

اس نے کبھی ماں کی نافرمانی نہ کی تھی، اس راز کے افشا ہونے کے باوجود کہ وہ اس کی ماں نہ تھی، مگر اسے اپنی حقیقی ماں سے زیادہ سمجھتی تھی۔ اپنی اصل ماں (صفیہ سلطانہ) سے تو اسے نفرت سی ہو گئی تھی۔ مگر اس خالہ ماں نے تو اسے پالا تھا، گودوں کھلایا تھا، اس پر ہر لمحے صدقے واری جاتی تھی۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ میرال نے ابھی تک صغیرہ بانو پر ظاہر ہونے ہی نہ دیا تھا کہ وہ یہ راز جان چکی تھی کہ آج سے کئی برس پہلے کی عبرت ناک داستان نے اسے کس طرح ایک حقیقی ماں کو اپنی بڑی بہن کی گود میں ڈالنا پڑا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی خالہ اماں افسردہ ہو۔ اس کے لیے یہ راز جاننے کے باوجود میرال اب تک خاموش تھی۔

یہ راز بھی اسے اس روز اتفاقاً ہی معلوم ہوا تھا، جس کے آشکارا ہونے پر وہ بری طرح لرز گئی تھی۔ اسے دکھ بھی ہوا تھا مگر وہ اپنے اس کرب کو پی گئی تھی۔ لاشعور کی راکھ میں ایسی چنگاری کو دبانے سے میرال کی شخصیت کو شکست و ریخت کے عمل سے بھی گزرنا پڑا تھا، یہی سبب اس کے مزاج کی یکدم تبدیلی کا بھی باعث بنا تھا۔ تاہم آج بھی اس کے دل میں یہ خواہش اپنی تمام تر شدتوں سے ابھرتی تھی کہ وہ اپنی اس خالہ اماں صغیرہ بانو..... سے پوچھے تو کہ اس کی ماں نے اپنی سگی اولاد، اپنی لختِ جگر کو کیوں چھوڑا تھا؟ جو آج بھی صفیہ سلطانہ کے روپ میں، اس کے پاس آیا کرتی تھی، اسے چوری چوری ممتا بھری نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی، ایسی نگاہ، جس میں برسوں کی پیاس، ایک گہرے رنج و کرب کی صورت میں جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔

بہر طور..... ماں نے اسے جانے کی اجازت دے دی، وہ چلی گئی۔ سوئے اتفاق، جہانگیر بھی اس وقت اپنے گھر سے برآمد ہوا، جب میرال کو اس نے گلی میں جاتے دیکھا، اس کی اچانک ہی میرال پر نظر پڑی تھی اور ہمیشہ کی طرح میرال کو دیکھتے ہی اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ سامنے جاتی ہوئی میرال کو آواز دے مگر وہ ایسا نہ کر پایا۔ پھر نجانے کیا ہوا، وہ بے اختیار اس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی انجانی کشش تھی یا نادیدہ ڈور تھی کوئی کہ تعلق خاطر کا بے نام و ان کہا احساس تھا شاید، جو کشاں کشاں اس کی طرف اسے کھینچے لیے جا رہا تھا۔

گلی سے باہر نکل کر اس نے چوراہے تک اس کے پیچھے پیچھے آتے دیکھا کہ سڑک کے کنارے سگنل کے قریب وہی خوبرو نوجوان (صارم) اپنی نئی چمچماتی ہوئی ہیوی اسپورٹس بائیک کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ اسے کئی بار میرال کے ساتھ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ رقابت کی آگ اس کی رگوں میں گردش کرتے ہوئے خون کو چنگاری بناتی تھی، پھر صارم کی خوبرو شخصیت اور مردانہ وجاہت دیکھ کر احساس کمتری بھی اسے محسوس ہوتا تھا، جس کا سبب شاید میرال کا اس کی طرف ملتفت ہونا تھا، مگر ان ساری باتوں کے باوجود جہانگیر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا کیونکہ یکطرفہ محبت بہ ذات خود ایک عذابِ نارسائی ہوتی ہے، وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا۔

البتہ جہانگیر اس زاویے سے میرال کے بارے میں سوچا ضرور کرتا تھا کہ اس میں شاید میرال کا بھی قصور نہ تھا، اس نے تو خود ہی اب تک اس سے اپنے دل کی بات تک نہ کی تھی، بلکہ وہ اس کی اب تک ہمت ہی نہ کر پایا تھا شاید اس کی وجہ ایک طرف تو محلے داری تھی یا پھر یہ کہ وہ اکثر ان دونوں ماں بیٹی کے کام آتا رہتا تھا، نجانے اس کے اظہار محبت سے میرال کیا نتیجہ اخذ کرتی؟ کہ شاید وہ اپنے احسانوں کو ''کیش'' کرنا چاہتا تھا۔ یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر وہ میرال کے سامنے اپنے جذبۂ دل کے اظہار میں رکاوٹ محسوس کرتا تھا۔

بہر طور..... جہانگیر نے بڑی حسرت اور کڑے دل کے ساتھ میرال کو مسکراتے ہوئے صارم کی بائیک پر بیٹھتے اور پھر دونوں کو روانہ ہوتے دیکھا پھر یاسیت لیے واپس گھر کی طرف لوٹ آیا۔

رات سر پر آئی تو صغیرہ بانو پریشان ہو گئی۔

ادھر جہانگیر بھی اپنے گھر سے اب تک کوئی بیس، پچیس بار باہر نکل کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ آیا میرال اب تک گھر واپس لوٹی یا نہیں؟ جب آخری بار وہ اس غرض سے اپنے گھر کے دروازے پر نمودار ہوا تو اس نے پاس کے دروازے پر خالہ صغیرہ بانو کو باہر گلی میں پریشانی کے عالم میں جھانکتے پایا۔ اس کی نظر جہانگیر پر پڑ گئی تھی۔

''اے بیٹا! ذرا اندر کو آنا۔'' صغیرہ بانو نے اسے دیکھ کر فوراً کہا اور جہانگیر چپ چاپ اندر صحن میں آ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جہانگیر بیٹا! وہ میرال ابھی تک گھر نہیں لوٹی ہے۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"خالہ! کیا وہ آپ کو بتا کر نہیں گئی تھی کہ وہ کہاں جارہی ہے اور کب تک لوٹے گی؟" جہانگیر نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"ارے بیٹا! وہ بھلا کب مجھے بتائے بغیر کہیں گئی ہے۔" صغیرہ بانو بولی اور اضافہ کیا۔ "کہہ رہی تھی، کسی سہیلی کے ہاں جارہی ہوں، جلد ہی لوٹ آؤں گی، مگر دیکھو تو رات سر پہ آن کھڑی ہے۔"

جہانگیر نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ جانتا تھا کہ میرال اپنی کون سی سہیلی کے ہاں گئی ہے، دل تو چاہا کہ خالہ صغیرہ کو آج اصل بات بتا ہی دے، مگر پھر یہ اس سے نہ ہو پایا۔ وہ جس سے خاموش محبت کرتا تھا، اس کی شکایت نہیں کرسکتا تھا، اس کے رازوں کا امین بن سکتا مگر اسے طشت ازبام کرنا اپنی خاموش وفا کی بددیانتی سمجھتا تھا، وہ بولا۔

"مگر خالہ! پتا نہیں وہ اپنی کون سی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی ہے؟ شکیلہ اور رابعہ کے گھر تو میرے دیکھے ہوئے ہیں، پہلے بھی میں وہیں سے میرال کو لا چکا ہوں، مگر آپ......"

"ہاں! بیٹا! یاد آیا۔" خالہ صغیرہ کو جیسے فوراً یاد آگیا۔

"وہ نبیلہ کے ہاں گئی ہے، یہ سڑک پار ہی تو گھر ہے، جا میرا بیٹا! اسے اپنی موٹر سائیکل پر لے آ۔" جہانگیر کو نبیلہ کا گھر بھی معلوم تھا، ایک سالگرہ کے موقع پر وہ پہلے بھی میرال کو رات گئے وہاں سے لایا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ میرال وہاں نہیں ہوگی، پھر بھی وہ اپنی موٹر سائیکل پر اس کے گھر پہنچا، نتیجہ وہی نکلا، میرال وہاں نہیں تھی، وہ واپس لوٹنے لگا تو، اپنے گھر کی گلی میں اس نے میرال کو دیکھا جو تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھی چلی جارہی تھی۔ اس نے قریب لے جاکر اپنی موٹر سائیکل روک دی۔ میرال چلتے چلتے رک گئی۔

"خالہ نے مجھے تمہیں نبیلہ کے ہاں سے لانے کے لیے بھیجا تھا، مگر تم وہاں نہیں تھیں۔" اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو میرال کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔ وہ چور سی بن گئی۔ پھر یکدم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کے بولی۔

"دیکھو، تم میرے اچھے محلے دار ہو ناں، پلیز! اماں کو یہ مت بتانا، تم ان سے یہی کہنا کہ...... تم مجھے نبیلہ کے گھر سے ہی لے کر آئے ہو، آجاؤ...... تم بھی میرے ساتھ پلیز۔"

اس کا ملتجی لہجہ جہانگیر کو اس پر سو جان سے قربان کر گیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ موٹر سائیکل سے اترا اور پھر اس کے گھر کے دروازے تک پہنچا۔ میرال نے دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ صغیرہ بانو نے دونوں کو کھڑے دیکھا اور پھر جہانگیر کا شکریہ ادا کیا۔ میرال نے ایک نگاہ خاموش کھڑے جہانگیر پر ڈالی اور اندر چلی گئی۔

☆☆☆

گمنام بلیک میلر کی طرف سے دی گئی، دو دنوں کی مہلت آج ختم ہوچکی تھی۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور صفیہ سلطانہ شاہانہ پیلس میں تنہا تھی، مبارک احمد دفتر جاچکے تھے، عاقب اور حرا بھی اسکول جاچکے تھے۔ صفیہ سلطانہ کا پریشانی اور تشویش سے برا حال تھا۔ اب تک پانچ لاکھ کی خطیر رقم کا بندوبست نہیں کرپائی تھی۔ وہ بہت ہراساں ہورہی تھی۔ اب تب میں اس گمنام بلیک میلر کا فون بھی آنے والا تھا، جس میں اس نے یہ بتانا تھا کہ صفیہ نے اسے کب اور کیسے پانچ لاکھ روپے دینا تھے۔

گھر میں اس وقت تین نوکر ہی موجود تھے۔ وہ اس وقت انتہائی پریشانی اور خوف کے عالم میں اپنی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں ٹہل رہی تھی۔ اس گمنام بلیک میلر کا فون کسی وقت بھی آنے والا تھا اور صفیہ سلطانہ یہ سوچ سوچ کر ہراساں ہورہی تھی کہ وہ اسے کیا جواب دے گی؟ پہلی کال پر ہی اس نے گمنام بلیک میلر کے انداز گفتگو سے اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوسکتا تھا اور کس قدر حتمی اور اٹل دھمکی آمیز لہجے میں اس نے اسے وارن کرتے ہوئے کہا تھا کہ...... اسے ہر قیمت پر آج ہی کے دن پانچ لاکھ کی رقم چاہیے، بہ صورت دیگر وہ اس اہم راز کو بلاتاخیر اس کے شوہر مبارک احمد تک پہنچا دے گا اور اس کے عزائم بھی کچھ اس قسم کے ہی ظاہر ہورہے تھے کہ وہ جو کہہ رہا تھا، وہ کر گزرے گا۔

صفیہ سلطانہ اس وجہ سے شدید ذہنی و اعصابی دباؤ کا شکار ہورہی تھی، تب پھر اچانک ہی اس کے متوحش ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔

اسے اپنے زیورات کا خیال آیا۔

صفیہ سلطانہ کے پاس زیورات کی کمی نہ تھی جو مبارک احمد وقتاً فوقتاً اسے بنا کر دیا کرتا تھا، کیونکہ انہیں بیگم کے ساتھ اکثر بیشتر کاروباری اور سوشل قسم کی پارٹیوں اور اس نوعیت کی دیگر تقریبات میں آنا جانا پڑتا تھا اور یہ سب کرنا ان کی مجبوری اور ضرورت میں شامل تھا، اس لیے صفیہ کے پاس

ناپ تول کا حسن

کرشن چندر کے ناولٹ سے

پھر عالمگیر حسن کا معیار کیا ہوگا، کس طرح اس کا فیصلہ کیا جائے گا؟

میں سمجھتا ہوں حسن کو پرکھنے کا یہ معیار غلط ہے۔ ایک عورت کا حسن اس کے عمل ہی سے پہچانا جاسکتا ہے، وہ عمل جس کا تعلق نہ صرف اس کی ذات سے بلکہ اس کے گھر سے ہے۔ اس کے بچوں سے ہے، اس کے کارخانے سے، اس کے کھیت سے۔ عورت کا حسن کوئی خلا میں رکھی جانے والی چیز نہیں ہے کہ ہم اسے عورت کے ماحول سے الگ کرکے ایک غسل کرنے والے تالاب کے کنارے کھڑا کرکے اس کی ناپ تول شروع کردیں۔ حسن کو خلا میں نہیں جانچا جاسکتا۔ حسن کوئی مصری ممی کی طرح حنوط شدہ لاش نہیں ہے۔ وہ تو ایک زندہ آگے بڑھتا ہوا، بدلتا ہوا زندگی کا عمل ہے۔ یہ کس قدر غلیظ اور بدصورت بات ہوتی اگر رومیو جولیٹ کی گولائی کو فیتے سے ناپنا شروع کردیتا۔ اگر پیرس، ہیلن کے حسن کا وزن کسی مشین پر کرنا شروع کردیتا۔ اگر سیتا کی زندہ اور لازوال خوبصورتی کا موازنہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے ٹکڑے سے کیا جاتا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ آپ لوگ اس مقابلۂ حسن میں کان کی لو دیکھتے ہیں مگر وہ آواز کو نہیں سنتے جو اس کان کے اندر جاتی ہے۔ آپ ناک دیکھتے ہیں مگر آنکھ کی شرم نہیں دیکھتے۔ سینے کا ابھار دیکھتے ہیں مگر اس کے اندر چھپی ہوئی ماں کی ممتا نہیں دیکھتے۔

اور میں آپ کے مقابلۂ حسن کے بارے میں کیا رائے قائم کرسکتا ہوں۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ سچا حسن اور سچی خوبصورتی کسی بھی بڑے سے بڑے اشتہار بازی کی غلاموں کی منڈی میں بکاؤ نہیں ہے جہاں رانیں اور پنڈلیاں ناپی جاتی ہیں اور سینے کے ابھار کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اور کمر کا گوشت تولا جاتا ہے اور تیرنے کے تالاب کے کنارے سارنگی تیز دھنوں کے ساتھ ساتھ اصلی دانتوں کے منجن والے اور نقلی دانتوں کے سیٹ فروخت کرنے والے، ناخن کاٹنے کے اوزار والے اور ناخن بڑھانے کے اوزار والے، بال صفا پاؤڈر والے اور بال بڑھانے والے، اونچی ایڑی والے اور نیچی عقل والے سب اپنی اپنی چیزوں کے اشتہار دیتے ہیں۔

اس لیے میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کا یہ مقابلۂ حسن مکمل فراڈ ہے، دھوکا ہے، جعل سازی ہے اور بددیانتی ہے اور میرا اس کے متعلق یہی فیصلہ ہے۔

محمد صدیق عبدالستار میمن۔ شکارپور

اچھی خاصی مالیت کے زیورات تھے اور پھر آج کل تو سونے کی مالیت بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی تھی۔

یہ خیال آتے ہی صفیہ سلطانہ نے فوراً اپنے زیورات کے بکس کا جائزہ لیا، بلاشبہ زیورات لاکھوں مالیت کے تھے، اس نے سوچا کہ اگر وہ ان میں سے پانچ لاکھ تک کی مالیت کا کوئی ایک آدھ آئٹم بیچ دے تو، اس بلیک میلر کا منہ بھی بند ہوجائے گا اور مبارک احمد کو بھی کیا پتا چلے گا؟

اب صفیہ نے کچھ سکون کی سانس لی تھی...... چنانچہ اس نے جڑاؤ کنگن اور ایک عدد انگوٹھی کا انتخاب کیا، یہ دونوں آئٹم وہ کم ہی استعمال کرتی تھی، اس کی کمی کا مبارک احمد کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا، اس نے فوراً ان دونوں چیزوں کو اپنے پرس میں سنبھالا اور کار میں بیٹھ کر صرافہ بازار کی طرف روانہ ہوگئی، وہاں اس نے ایک جیولر کے ہاتھوں جڑاؤ کنگن اور انگوٹھی فروخت کردی، جس کی کم و بیش قیمت پانچ لاکھ سے کچھ اوپر ہی بنی تھی، وہ نقد رقم کی صورت میں بڑے بڑے نوٹوں کی ایک ہی گڈی بنی تھی، جسے پرس میں ڈال کے وہ اپنی کار میں آبیٹھی۔ ٹھیک اسی وقت اس کے موبائل کی بیل گنگنائی۔

کال اسی گمنام بلیک میلر کی تھی مگر اس بار کسی اور نمبر سے اس نے رابطہ کیا تھا۔ صفیہ سلطانہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ، اپنا سیل فون کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

☆☆☆

"میرال! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

اس روز بالآخر جہانگیر سے نہ رہا گیا، وہ موقع بھی ایسا تھا، کہتے ہیں بعض اہم باتوں کے لیے موقع محل کا ہونا بھی لازمی ہونا چاہیے۔ شاید یہ اہم بات کرنے کا بھی وہ ایسا ہی برمحل اور بروقت موقع تھا جب...... اس روز خالہ صغیرہ بانو نے جہانگیر کو باہر گلی میں کھڑے دیکھ کر دو کلو چینی، ایک کلو بیسن اور آدھا کلو سوجی منگوانے کے لیے بھیجا تھا۔ جب یہ چیزیں وہ خرید کر خالہ صغیرہ کے دروازے پر پہنچا اور سودا انہیں تھمانے کے لیے دروازے پر دستک دی۔ مگر خالہ صغیرہ کے بجائے دروازہ میرال نے کھولا تھا۔ وہ شاید غسل کرکے ابھی ابھی نکلی تھی، لان کے بلیو گراؤنڈ والا پھولدار لباس اس کے گیلے سڈول بدن سے چپکا چپکا ہوا نظر آرہا تھا۔ گیلے بکھرے بالوں سے ٹپکتے قطرے شہابی رنگت کے حسین چہرے کو شبنمی نور عطا کیے ہوئے تھے، نرم و گداز بدن کے خم لباس کے چپکنے سے بھرپور طور پر نمایاں ہوکے جوانی کی آمد بہار کا اعلان کرتے دکھائی دے رہے تھے وہ جو اس وقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

عجلت میں بھی دکھائی دیتی تھی سامنے دم بہ خود اور سکتہ زدہ کھڑے جہانگیر سے مترنم لہجے میں بولی۔

"پلیز..... جہانگیر! خود ہی اندر آکر سودے کا یہ تھیلا باورچی خانے میں رکھ دو۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی۔ جہانگیر سودے سلف کا تھیلا سنبھالے اندر داخل ہوا، اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اب کمرے کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی میرال کی طرف جم سی گئی تھیں، وہ اس کی تیز چال کی سبک خرامی میں کھویا کھویا صحن میں ہی کھڑا رہ گیا۔

اندر کمرے میں رکھے اس کے سیل فون کی بیل گنگنا رہی تھی۔ شاید وہی اسے اٹینڈ کرنے کی جلدی تھی۔ نظارہ شباب محبوب کا نظروں سے لمحہ بھر کو ہٹا تو اس کا سکتہ ٹوٹا اور وہ خاموشی سے سودے سلف کا تھیلا پکڑے باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ اسے رکھا تو اچانک کمرے سے میرال کی چہکتی مسکراتی آوازیں سنائی دیں۔ جہانگیر کے قدم آپوں آپ وہیں ٹھہر گئے۔ چند منٹوں کی اس گفتگو کو سن کر جہانگیر کے لیے یہ پتا چلانا مشکل نہ تھا کہ وہ اس وقت سیل فون پر..... صارم سے ہی باتیں کر رہی تھی۔

"تم ابھی تک ادھر ہی کھڑے ہو؟..... تمہیں تو ابھی تک چلے جانا چاہیے تھا؟" صارم سے بات ختم کر کے جب وہ کمرے سے نکلی تو جہانگیر کو وہاں خاموش اور گم صم کھڑا پا کے بولی۔

جہانگیر نے ایک درد بھری سی نظر میرال پہ ڈالی اور پھر جانے کے لیے پلٹا..... ٹھیک اسی وقت پل کے پل..... میرال کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے جہانگیر سے بہت غلط الفاظ کہے تھے۔

"جہانگیر!" بے اختیار اس نے صحن کے دروازے کی طرف خاموشی سے پلٹ کر جاتے ہوئے جہانگیر کو آواز دے ڈالی اور ساتھ ہی خود بھی چند قدم چلتی ہوئی اس کے ذرا قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

"سوری! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ تم نے برا تو نہیں منایا؟"

"کوئی بات نہیں، میں آپ کی کسی بات کا برا نہیں مناتا۔" شرمیلی طبیعت کے جہانگیر نے بالآخر حوصلہ پکڑا۔

"اچھا! کیوں نہیں مناتے میری بات کا برا؟" میرال نے بہ غور اس کے خاموش چہرے کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں پوچھا تو جہانگیر نے مزید حوصلہ پکڑا۔ بات سے بات نکلنا شاید اسی کو کہا جاتا ہے، دل سے دل کی راہ کو پکڑنا ایسا ہی کہلاتا ہے، وہ بولا۔

"تم مجھے اچھی جو لگتی ہو۔"

جہانگیر کو خود نہیں پتا چل رہا تھا کہ اس میں اتنی ہمت کیونکر عود کر آئی تھی۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں، میرال!" دوسرا جملہ بھی شاید بے اختیاری میں برآمد ہوا تھا اور میرال کھڑی پھیلی ہوئی آنکھوں سے منہ کھولے اس کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

"ہاں..... ں..... ں..... کیا کہا؟..... ذرا دوبارہ کہنا؟" میرال کے منہ سے استفسار یہ برآمد ہوا۔

"میرال! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" جہانگیر آج اسے باہمت ہو کے دکھا رہا تھا، یہ جذبہ دل کا دبا ہوا وہ اظہار تھا جو کسی خوابیدہ جوالامکھی کی طرح ابلنے کو کسی ایسی ہی بے اختیاری کی راہ دیکھ رہا تھا۔

اور..... پھر..... تب جانے کیا ہوا، کہ بے اختیار میرال کی ہنسی چھوٹ گئی اور جہانگیر جو کہ اس سے جواباً کسی سخت جملے کی توقع لگائے ہوئے کھڑا تھا، اسے عجیب سی حیرت ہوئی۔

"اچھا! کب سے؟ عشق فرما رہے ہو تم؟ ذرا بتانا تو.....؟"

میرال نے گویا بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ وہ "جھاڑ جھلے" سے کھڑے جہانگیر کی شرماتی گراتی کیفیات سے جیسے حظ اٹھا رہی تھی۔

"پپ..... پتا نہیں....." وہ گھبرا سا گیا۔ میرال کے مزاقیہ سوال نے اس کی ساری ہمتِ اظہار کافور کر دی تھی۔

"ارے..... رے..... رے، تمہیں تو پسینا آ گیا۔" میرال نے ہنسی سے سرخ ہو کے اس کی پیشانی پر نمودار ہوتی ننھی ننھی بوندوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ باز وہ پھر بھی نہیں آئی..... بولی۔ "کب سے اپنے دل میں یہ اظہارِ محبت چھپائے ہوئے تھے تم.....؟"

"مم..... میں..... اب چلوں گا۔" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا..... اور جانے کے لیے پلٹا۔

"بس..... اتنی ہمت تھی؟" میرال کے اس جملے پر دروازے کی طرف جاتے ہوئے جہانگیر کے قدم یکدم رک گئے اور اس نے تیزی سے مڑ کے میرال کی طرف عجیب سی سنسناتی نظروں سے دیکھا تو پل کے پل میرال کو اس کی نظروں کی تپش سے اپنے اندر لمحے بھر کو لرزش محسوس ہوئی، اسے یوں لگا جیسے اس کے مذاق کا پتھر جہانگیر کی سنسناتی نظروں کی گرمی سے بھربھرانے لگا ہو..... وہ کچھ ڈر سی گئی۔

"کیا یہ کوئی ہمت دکھانے کا ارادہ رکھتا ہے؟" لفٹن کا فور ہوا

تو میرال کے اندر یہ پُراندیش خیال ابھرا۔ جہانگیر نے شاید میرال کے چہرے کا بدلتا رنگ بھانپ لیا تھا، یہی سبب تھا کہ میرال نے اس کے باریک مونچھوں تلے ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ ابھرتے پائی۔ پھر جہانگیر نہیں ٹھہرا اور تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

وہ جیولری کی دکان سے ایک خطیر رقم لے کر نکلی تھی، اس لیے کار میں بیٹھتے ہی وہ روانہ ہو گئی تھی۔ اس دوران ہی اس گمنام بلیک میلر کی دوسری بار ایک نئے نمبر سے فون کال موصول ہوئی تو، صفیہ سلطانہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنا سیل فون کان سے لگا کے ہیلو کہا۔

"رقم کا بندوبست تو یقیناً تم نے کر ہی لیا ہو گا، کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟" دوسری جانب سے اس کی آواز ابھری۔ اس نے گویا تصدیق چاہنے والے انداز میں اس سے کہا تھا۔

"ہاں! رقم میرے پاس ہے۔" صفیہ سلطانہ نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"گڈ!" وہ خوش ہو گیا۔

"اب میری بات غور سے سنو۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ "تم رقم لے کر اپنی کار میں نکلو گی اور تین تلوار والے چوراہے پر پہنچو گی، تب تک میں بھی وہاں آ جاؤں گا اور مجھے خود تمہیں فالو کرنا پڑے گا، سیل فون پر ہم رابطے میں رہیں گے، میں تمہارا تعاقب کرتا رہوں گا اور تم پر نظر بھی رکھوں گا، وہاں کسی بھی قریبی جگہ پر موقع دیکھ کر تمہیں کار روکنے کا کہوں گا، تمہاری کار جیسے ہی رکے گی، میں تمہاری کار کے پاس آ جاؤں گا، پھر تم ایک لمحہ بھی ضایع کیے بغیر رقم میرے حوالے کر دو گی اور یاد رکھنا اگر تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کا سوچا بھی تو مجھے بھنک پڑ جائے گی، تم اچھی طرح جانتی ہو، میں کیا کروں گا۔ اب سمجھ گئیں تم سب اچھی طرح سے؟" اس نے آخر میں غراہٹ آمیز لہجے میں تہدید کی تو صفیہ سلطانہ نے اسے اثبات میں جواب دے کر مطمئن کر دیا۔

اور پھر سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا کہ منصوبہ طے پایا گیا تھا۔

تین تلوار چوراہے پر آتے ہی صفیہ سلطانہ نے اسے اپنی کار کے رنگ اور نمبر پلیٹ سے مطلع کر دیا تھا۔ وہ گمنام بلیک میلر پہلے سے ہی وہیں کہیں خفیہ گوشے میں کھڑا اس کا منتظر تھا۔ پھر اس کے کہنے پر صفیہ سلطانہ نے اپنی کار تین تلوار چورنگی سے تھوڑا دور نسبتاً ایک ویران سے پوش رہائشی علاقے کی طرف لے جا کر روک دی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، وہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت تھی، ایسے حالات سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس کے اندر بڑی شدت کے ساتھ یہ تجسس آمیز خواہش ضرور پل رہی تھی کہ آخر وہ اس گمنام بلیک میلر کا چہرہ تو ایک بار ضرور دیکھ لے، جس نے اس قدر اہم راز سے نجانے کس طرح آگاہی حاصل کر لی تھی، کار روکتے ہی، ایک نوجوان تیزی کے ساتھ اس کی ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کی طرف بڑھا تھا، وہ پیدل تھا، عین ممکن تھا اس نے اپنی گاڑی وغیرہ کسی احتیاطی تدبیر کے باعث کہیں قریب ہی کھڑی کر رکھی ہو اور خود پیدل چلا آیا تھا۔

اب یہ جانے بلیک میلر کی دہشت کا اثر تھا یا ان حالات کا، صفیہ سلطانہ اس کا تفصیلی جائزہ نہ لے سکی۔

"رقم میرے حوالے کرو اور ادھر ادھر دیکھے بغیر فوراً کار آگے بڑھا دو۔" قریب پہنچ کر اس نے غراتی ہوئی سرگوشی میں صفیہ سے کہا اور ساتھ ہی اپنے ایک ہاتھ میں پکڑا ہوا چرمی ہینڈ بیگ اس کی گود میں پھینک دیا۔ رقم اس کے حوالے کرتے وقت صفیہ سلطانہ اس بلیک میلر کی محض جھلک ہی دیکھ پائی تھی۔ اپنی وضع قطع سے وہ نوجوان ہی معلوم ہوتا تھا، چہرے پر اس نے بڑے سے فریم والی سیاہ عینک چڑھا رکھی تھی، مونچھیں گھنی تھیں اور چہرے پر سیاہ ڈاڑھی بھی تھی۔

بہرطور..... چشم زدن میں یہ معاملہ نمٹ گیا اور اس کی ہدایت کے مطابق صفیہ سلطانہ نے یکدم کار آگے بڑھا دی تھی۔

☆☆☆

اس روز کے بعد آج دوسری بار صفیہ کو اپنے سیل فون پر اس کی کال موصول ہوئی تھی۔

"مجھے معاف کر دو، اگرچہ میں اس کا حقدار نہیں ہوں۔" دوسری طرف سے وہی مردانہ آواز ابھری۔ جمشید رضا کے لہجے میں درد کی گہرائی تھی اور ندامت کا ایسا احساس بھی تھا جو ایک ٹوٹے اور بکھرے ہوئے انسان کی روح تک کی شکستگی کو ظاہر کرتا تھا۔ مگر صفیہ کو اس کے شکستہ لہجے پر ذرا بھی تاسف نہ ہوا تھا وہ اسی طرح گویا ازلی نفرت سے بولی۔

"میں تمہاری آواز تک بھی سننا نہیں چاہتی۔"

"میں جانتا ہوں، مگر میں تم سے صرف معافی....."

صفیہ سلطانہ نے اس کی بات سنے بغیر ہی انتہائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر رابطہ ہی منقطع کر دیا۔

☆☆☆

اس روز وہ حسب معمول اور پہلے سے مقررہ وقت پر اپنی بہن صغیرہ بانو کے ہاں موجود تھی۔

"اچھا ہوا تم آ گئیں۔" صغیرہ بانو نے گویا چھوٹتے ہی کہا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے ناں آپا صغیرہ؟ میرال تو ٹھیک ہے؟" صفیہ سلطانہ نے قدرے پریشان ہو کے بہن سے پوچھا تو وہ بولی۔

"صفیہ بہن! میرال بیٹی اب جوان ہو گئی ہے۔ میرے بس میں آج تک جو ہوا میں نے وہ ایک بہن اور خالہ کے ناتے کیا۔ مگر اب مجھ میں مزید حوصلہ اور ہمت نہیں رہی ہے۔ میرال بھی اب مجھے بہت پریشان کرنے لگی ہے۔ اب تم ہی اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ لو..... یا پھر میں کوئی کوشش کر کے دیکھوں؟" اس کی بات پر صفیہ کو ایک پرسوچ سی خاموشی لگ گئی، پھر بولی۔

"کیا کوئی ایسی بات ہوئی ہے میرال بیٹی کی طرف سے؟"

"وہ تو اچھی بچی ہے۔" صغیرہ بولی۔ "مگر میں محسوس کر رہی ہوں، وہ آج کل کالج جانے کے علاوہ بھی شام کو اکثر گھر سے باہر جانے لگی ہے۔ کبھی اپنی کسی سہیلی کی شادی کروا دیتی ہے، تو کبھی سالگرہ اور کبھی باہر جانے کے لیے کچھ بہانہ کرتی ہے۔" وہ رک گئی، پھر لحظہ بھر کی چپ کے بعد اضافہ کیا۔ "پتا نہیں میرا دل اب اس کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان رہنے لگا ہے، یوں بھی وہ شادی کی عمر کو تو پہنچ ہی گئی ہے، اس کا اب ہمیں سنجیدگی سے کچھ سوچنا پڑے گا۔"

بہن کی بات پر صفیہ سلطانہ کے چہرے پر پرسوچ شکنوں کا جال سا بن گیا۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ آبدیدہ ہو کر بولی۔ "لیکن بہن صغیرہ! میں تمہاری قربانی اور احسان کا تو بدلہ ساری زندگی نہیں چکا سکتی۔ تم نے مجھ بدنصیب ماں کی بیٹی کو حقیقی معنوں میں اب تک اپنی بیٹی سمجھ کر ہی اس کی پرورش کی، پالا پوسا جوان کیا، تم نے بہن ہونے کا حق ادا کر دیا، مگر میں بھی کیسی بدبخت ہوں کہ آج تک اپنی بیٹی کو اپنی بیٹی تک نہ کہہ پائی مگر میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا میں اب کیا کروں کہ.....؟" فرطِ غم سے اس کی آواز رندھ گئی۔

صغیرہ بانو نے تڑپ کر اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مرتعش آواز میں بولی۔ "صفیہ! خود کو دکھی مت کر، ہاں! دل کا بوجھ ہلکا کر لینا چاہیے، میں تجھے پھر بھی یہی مشورہ دوں گی کہ میرال بیٹی کو اب ساری حقیقت بتا دینی چاہیے کہ....."

"نن..... نہیں..... ابھی نہیں....." صفیہ سلطانہ یکدم بولی۔ وہ متوحش سی نظر آنے لگی۔

"آخر تو ایک دن اسے بتانا تو پڑے گا۔" صغیرہ بانو بولی۔ "دیکھو..... میرال پر اور ظلم مت کرو۔"

"لل..... لیکن میں نے یہ سب اس کی بھلائی کی خاطر ہی تو کیا ہے؟"

"یہ صرف تمہاری اپنی سوچ ہے، لیکن خدا کے لیے اب میرال بیٹی کو اپنی ممتا سے دور مت کرو۔"

"خاموش ہو جاؤ..... صغیرہ! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔" وہ ہسٹریائی ہونے لگی تو، صغیرہ نے تڑپ کر بہن کو گلے لگا لیا۔ دونوں بہنیں گلے لگ کر رونے لگیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور صغیرہ بانو بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

"میرال بیٹی آ گئی؟" صفیہ سلطانہ نے گھبرا کر صغیرہ کے چہرے کی طرف استفساریہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں! میں دیکھتی ہوں، پتا نہیں کیوں وہ آج کل جلدی یونیورسٹی سے لوٹ آتی ہے؟" صغیرہ بانو بڑبڑائی اور پھر صفیہ سے بولی۔ "تم خود پر قابو رکھو اور اپنا حلیہ درست کر لو۔"

صفیہ نے خود کو سنبھالا اور پھر جلدی سے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ رکھ لو، میں بھی اب چلوں گی۔" کہہ کر وہ بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی، پھر صغیرہ بانو نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے میرال کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتابوں کا بینڈ بیگ تھا، پھر اس کی بھی نگاہ صفیہ سلطانہ پر پڑ گئی۔

"سلام آنٹی۔"

"وعلیکم السلام بیٹی! جیتی رہو۔" صفیہ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو ہمیشہ کی طرح اپنی لخت جگر کو سامنے دیکھ کر اس کی ممتا بے اختیار ہونے لگی۔ یہ اس کی پیاسی ممتا کے لیے بڑے کڑے اور جاں گسل لمحات ہوتے تھے کہ وہ سامنے موجود اپنے جگر گوشے کو سینے سے بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ اس کی حالت مزید ابتر ہونے لگتی، وہ جلدی سے صغیرہ بانو کو خدا حافظ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

اس بار بھی صفیہ نے اپنی بہن صغیرہ بانو کو جمشید رضا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا مگر اب ایسا اس نے دانستہ کیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بہن یہ سن کر مزید پریشان ہو، یوں بھی جمشید رضا نے پھر دوبارہ اس سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا اور نہ ہی اب تک وہ خود اس کے لیے مزید کسی نئی پریشانی کا باعث ہی بنا تھا.....

بہرطور..... صفیہ کے نکلتے ہی میرال، صحن میں ہی کھڑی رہ گئی، صغیرہ بانو دروازے بند کر کے پلٹی تو سامنے میرال کو ہنوز گم صم کھڑے پا کر قدرے چونکی۔

"تم ابھی تک ادھر ہی کھڑی ہو بیٹی.....؟ اندر جا کر کپڑے بدل لو، ویسے آج تم جلدی نہیں آ گئیں.....؟"

"افوہ..... اماں!..... دیر سے آؤں تو مصیبت، جلدی آؤں تو آپ پریشان۔"

میرال قدرے چڑ کر بولی۔ صغیرہ بانو بالکل برا نہیں مناتی تھی مسکرا کر بولی۔ "اچھا چل اندر جا کر کپڑے بدل لے، بھوک لگی ہے تو کھانا لگا دوں؟"

"نہیں اماں! ابھی بھوک نہیں....." میرال نے کہا پھر پوچھا۔ "اماں....."

"ہاں! بیٹی؟"

"یہ عورت آخر ہے کون؟ بہت باقاعدگی سے یہاں آتی ہے، آپ سے ملنے کے لیے۔" میرال نے جانتے بوجھتے ہوئے بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"لو..... بتایا تو ہے کتنی بار.....؟ یہ میری بہت پرانے وقتوں کی سہیلی ہے۔" صغیرہ بانو نے جواب دیا۔

"مگر اماں! یہ تو بہت امیر کبیر خاتون دکھائی دیتی ہیں اور تم.....؟"

"ارے بیٹی دوستی بھلا کب امیری غریبی کو دیکھتی ہے، پھر پرانے وقتوں کی دوستی....." پھر صغیرہ بانو نے فوراً ہی دانستہ موضوع بدلا۔ "اچھا تو نہا دھو لے میں کھانا لگاتی ہوں۔" کہہ کر صغیرہ بانو ایک طرف کو چلی گئی اور میرال وہیں کھڑی اپنے ہونٹ کاٹتی رہی اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی، میرال کو اگرچہ ساری حقیقت کا علم پہلے سے ہی ہو چکا تھا کہ اس کی اصل اور حقیقی ماں، جس نے اسے جنم دیا تھا وہ صغیرہ بانو نہیں بلکہ صفیہ سلطانہ تھی، یہ حقیقت اسے ایک ایسی ہی ملاقات میں اچانک پتا چلی تھی۔

درحقیقت وہ اس عورت کی طرف سے شروع ہی دن سے کھد بد میں مبتلا رہتی تھی۔ وہ اسے بچپن سے ہی دیکھتی آ رہی تھی، جب وہ دس گیارہ برس کی تھی۔ تب سے یہ عورت (صفیہ سلطانہ) تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن ہی اس کی ماں صغیرہ بانو سے ملنے کے لیے آیا کرتی تھی۔

میرال کو یہ عورت بہت پیار کرتی تھی، اپنے ساتھ چمٹاتی تھی، سینے سے لگاتی تھی اور خوب پیار کرتی تھی، مگر پھر جیسے جیسے میرال کا شعور پختہ ہونے لگا۔ اس عوت کا آنا جانا اس حد تک کم ہو گیا کہ مہینے میں صرف دو ایک بار ہی آیا کرتی تھی۔ یہی نہیں اب وہ میرال کو بھی زیادہ پیار کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ تاہم میرال کا اس پراسرار عورت کے سلسلے میں دن بہ دن تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ میرال کا جب شعور پختہ ہونے لگا تو یہی نہیں، اس کے ذہن میں فطری طور پر بہت سے سوال بھی ابھرنے لگے، مثلاً..... اس کا باپ کون تھا؟ ان کی کفالت کون کر رہا تھا وغیرہ۔ صغیرہ بانو البتہ اسے اس سلسلے میں یہی بتاتی تھی کہ اس کا باپ ایک حادثے میں انتقال کر چکا تھا مگر وہ اپنے پیچھے ان کے لیے اتنا چھوڑ گیا تھا کہ ان کی گزر بسر ٹھیک ٹھاک ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی میرال کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اس کے اندر کا خلا بھی بڑھنے لگا۔

انہی دنوں..... میرال کی دوستی ایک لڑکے صارم سے ہو گئی، جو اب دوستی سے محبت میں بدل چکی تھی، صارم نے میرال کو اپنے بارے میں یہی بتایا تھا کہ وہ ایک امیر کبیر باپ کا بیٹا ہے اور اس کا کاروبار سنبھالتا ہے وغیرہ، حقیقت کیا تھی؟ اس کا میرال کو علم نہ تھا۔

بہ ظاہر کھلنڈری اور لاابالی طبیعت کی میرال میں احتیاط پسندی بھی تھی اور وہ حدود و قیود میں رہتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ صارم سے اس کی دوستی، بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ ایک بار ذرا تنہا موقع پا کر صارم نے محض شرارتاً اسے چھیڑنے کے انداز میں اس کے خلاف مزاج، تھوڑی جسارت کرنا چاہی تھی مگر میرال نے اسے نہ صرف بری طرح ٹوک دیا تھا بلکہ کئی دنوں تک اس سے بات تک بھی کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ بڑی مشکلوں اور معافی تلافی کے بعد ہی صارم نے اسے منایا تھا اور پھر اس روز کے بعد وہ بھی محتاط رہنے لگا تھا۔

اس روز بھی کچھ آج ہی کے جیسا اتفاق ہوا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ اس روز گھر کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ میرال نے بھی باہر اس عورت کی لمبی سی چمچماتی کار دیکھ لی تھی، کھد بد تو اسے کافی دن سے ہی تھی، آج اس نے یہ موقع ضایع نہ کیا اور دروازے پر دستک دیے بغیر دبے پاؤں اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندر کمرے میں اس کی ماں صغیرہ بانو اور وہی عورت صفیہ سلطانہ آپس میں دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھیں جو اس نے وہیں کمرے کے دروازے کے قریب کچھ دیر تک کھڑے کھڑے بہ غور سن لی تھیں اور پھر وہیں اسے ان کی باتوں سے اس راز سے آگاہی حاصل ہوئی تھی۔ میرال پر جب اس طرح اچانک اور بالکل اتفاقاً ہی یہ راز آشکار ہوا تو وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ کئی دنوں تک تو وہ بالکل ہی چپ رہی تھی۔

یہ حقیقت جان لینے کے بعد وہ اکثر تنہائی میں خوب روتی، اپنی اصلی ماں کو دیکھ کر اس کے دل میں اس کی محبت بھی جوش مارنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی سگی ماں (صفیہ سلطانہ) سے جا کر لپٹ کر خوب رو دے، اس کے ممتا بھرے سینے میں منہ چھپائے روتے ہوئے اس سے شکوہ کرے..... مگر..... پھر اچانک کیا ہوا کہ..... میرال یہ سب کچھ پی گئی، تب پھر پہلی بار اس کے دل میں اپنی ماں صفیہ سلطانہ کے لیے نفرت کا جذبہ ابھرا، ہو سکتا ہے یہ اس کا فطری ردعمل ہو، مگر اس نے پھر کسی پر یہ اہم راز ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، نہ خالہ صغیرہ بانو پر نہ ہی اپنی ماں صفیہ سلطانہ پر.....

تاہم ان حالات اور اس دردناک انکشاف کے بعد میرال کی شخصیت کو ایک زبردست شکست و ریخت کے عمل سے گزرنا پڑا جس کے باعث اس کی ''سائیکی'' بدل کے رہ گئی جو نفسیات کی ایک سنگین وجارحانہ قسم کی ''سائیکوسس'' میں تبدیل ہوگئی۔ ایسے انسان کو سب اپنے دشمن نظر آنے لگتے ہیں۔ لوگ ان سے کترانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہ چند میٹھے بول بولنے والے پر فدا بھی جلدی ہو جاتے ہیں اور اس پر اندھا بھروسا بھی کرنے لگتے ہیں اور جو ان کی خاطر پریشان ہوتے ہیں، تفکر میں مبتلا ہوتے ہیں، انہیں مزید تشویش میں مبتلا کرنا ان ''سائیکوسس'' لوگوں کا مشغلہ بن جاتا ہے، انہیں ستا کر مزہ آتا ہے۔

میرال نے صارم تک سے یہ اہم ترین راز چھپا رکھا تھا، مگر جب صارم اسے ان دنوں کھویا کھویا سا اداس اور یکدم قنوطیت زدہ محسوس کرنے لگا تو اس نے بڑی محبت سے اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کی تب میرال نے اسے اپنے اس اہم راز میں شامل کر لیا تھا۔

☆☆☆

صفیہ سلطانہ کا چونکہ ان حالات سے پہلے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا، اس لیے وہ اس گمنام بلیک میلر کو پانچ لاکھ کی خطیر رقم حوالے کرنے کے بعد کسی حد تک مطمئن ہو گئی تھی، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس سے دوبارہ رابطہ نہیں کرے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی، اس گمنام بلیک میلر کو رقم دیے ابھی بہ مشکل ایک ماہ ہی گزرا ہوگا کہ اس کی ایک روز دوبارہ کال آ گئی۔ اس بار اس نے پورے دس لاکھ کا مطالبہ کر ڈالا۔ بے چاری صفیہ سلطانہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، ہوش تب آیا جب وہ بلیک میلر اپنا مطالبہ بتانے کے بعد رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

''میرے خدا! میں کیا کروں؟'' وہ اپنی پیشانی پکڑ کے بیٹھ گئی۔

اس بلیک میلر نے اسے تین دنوں کی مہلت دی تھی، صفیہ سلطانہ کو اب اس بات کی پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ آخر اب کی بار اتنی بڑی رقم کا کیسے بندوبست کرے گی؟..... اور اس سے بڑھ کر اس کے لیے پریشانی کی یہ بات تھی کہ آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ اور کیا چلتا ہی رہے گا؟.....

اس بار یہ صورت حال صفیہ سلطانہ کے لیے خاصی گمبھیر ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اب محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت ہے؟ مگر وہ کس سے مشورہ کرتی؟..... خاصے غور کے بعد اسے اپنی بہن صغیرہ بانو کا نام ہی یاد آیا مگر وہ بھی بے چاری کیا کرے گی؟ سوائے پریشان ہونے کے، وہ بے چاری پہلے ہی آج کل میرال کے سلسلے میں پریشان رہتی تھی۔

ان حالات میں صفیہ سلطانہ خود کو بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے پریشان اور متوحش ذہن میں بار بار اس بلیک میلر کا دس لاکھ روپے کا مطالبہ گردش کر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب اس کا یہ اگلا مطالبہ کس طرح پورا کرے گی؟..... اور یہی نہیں آخر کب تک وہ اس کے مطالبے پورے کرتی رہے گی، اگرچہ اس بلیک میلر کو یہ باور کرانے کی کوشش بھی چاہی تھی کہ، وہ بے شک ایک صنعت کار کی بیوی ہے لیکن..... حقیقت یہ بھی ہے کہ اس کا شوہر مبارک احمد کسی اور ہی مزاج کا آدمی ہے، جو روپوں پیسوں کا معاملہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھنے کا عادی تھا۔ مگر وہ بلیک میلر یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھا، وہ بس یہ جانتا تھا کہ صفیہ سلطانہ ایک بہت بڑے صنعت کار کی بیوی تھی اور بس!

صفیہ سلطانہ کے بس میں اب یہ نہیں تھا کہ وہ پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنے زیورات میں سے ردوبدل کر کے، دس لاکھ روپے کی مالیت کے زیور نکال کر انہیں فروخت کرتی۔ یہ اب ممکن نہیں رہا تھا کیونکہ اس میں سے پہلے ہی

پانچ لاکھ مالیت کے زیورات نکال کر وہ فروخت کر چکی تھی، اب کی بار دس لاکھ کے زیورات کی فروخت ناممکن تھی۔ اس نے خوف اور پریشانی کو ایک طرف رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کیا۔

اس کے لیے دونوں ہی صورت مخدوش ثابت ہو رہی تھیں، پہلی تو یہ کہ اس گمنام بلیک میلر کا مطالبہ اگر تسلیم نہ کرتی تو، وہ اس کی بیٹی میرال سے متعلق اس اہم راز سے اس کے شوہر مبارک احمد کو آگاہ کر ڈالتا۔ بہ صورت دیگر..... بلیک میلر کے مطالبات کا سلسلہ اگر اسی طرح جاری رہتا تو..... وہ خود کسی نہ کسی دن اپنے شوہر کی ''بازپرس'' کا نشانہ بن سکتی تھی..... گویا دوسری صورت میں بھی یہ راز چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

بالآخر جب صفیہ سلطانہ نے دونوں صورتوں کے خطرناک نتائج ایک ہی پائے تو اس نے اب سنجیدگی کے ساتھ، اس گمنام بلیک میلر کے خلاف پہلی بار جارحانہ انداز میں غور کرنا شروع کیا اور اس کے خلاف کارروائی کرنے کا پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ وہ شوہر کے علم میں لائے بغیر بڑی رازداری کے ساتھ..... کسی اچھے اور فرض شناس پولیس آفیسر سے مدد لے اور اس بلیک میلر کو گرفتار کروا دے۔ اس پر غور کرتے ہوئے اس کے دل میں یہ بات بھی آئی کہ اگر اس طرح بلیک میلر کو گرفتار کر بھی لیا جاتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ قانون کتنی سزا دے گا؟ رہا ہونے کے بعد وہ بلیک میلر اس سے انتقام لینے کی صورت میں وہ راز اس کے شوہر کے سامنے اگل سکتا تھا لیکن یہ بعد کی بات تھی، کچھ سالوں کے لیے تو اس سے جان چھوٹ ہی جاتی اور ممکن تھا کہ اس طویل عرصے کے دوران اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کی کوئی دوسری صورت بھی نکل آتی۔ لہٰذا اس ایک نتیجے پر پہنچ کر صفیہ سلطانہ کو کچھ تسلی ہوئی۔

☆☆☆

''اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں اپنے حق کے لیے کوئی اسٹیپ اٹھانا پڑے گا میرال؟''

صارم نے بڑی سنجیدگی سے اپنے سامنے بیٹھی میرال کی طرف دیکھ کر کہا تو، وہ اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اس کے چہرے کی طرف تکنے لگی، اسے کچھ کہے بغیر بہ غور اپنی طرف متوجہ پا کر صارم نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے گویا اضافہ کیا۔

''تمہارے ایما پر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے صفیہ سلطانہ کا خفیہ تعاقب کیا تھا، وہ ایک متمول علاقے میں ''شاہانہ پیلس'' نامی ایک عظیم الشان کوٹھی میں رہتی ہے، ان کے میاں کا نام بھی میں نے معلوم کر لیا ہے، مبارک احمد نام ہے، ایک بڑا صنعت کار ہے، وہ بہت پیسے والا ہے، اس کے دو بچے بھی ہیں جو یقیناً اس آدمی کی ہی اولاد ہوں گے، اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ اس خاتون صفیہ سلطانہ کا شوہر مبارک احمد تمہارا سگا باپ بھی ہے کہ نہیں، ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ تمہارا سگا باپ ہوگا، ہوتا تو تمہاری ماں صفیہ سلطانہ تمہیں خود سے دور نہیں کرتی۔'' اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر بولا۔

''سیدھی سی بات ہے، تمہاری ماں نے اس شخص مبارک احمد سے یقیناً دوسری شادی کی ہوگی، تم اس کے پہلے شوہر کی اولاد ہوگی، دوسری شادی کرنے سے پہلے تمہاری خودغرض ماں صفیہ نے تمہیں جنم دینے کے بعد اپنی بہن یعنی تمہاری خالہ..... صغیرہ بانو کی جھولی میں تمہیں بوجھ سمجھ کر ڈال دیا اور خود عیش کر رہی ہے، مجھے تو اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ وہ عورت جو تمہاری سگی ماں ہے، باقاعدگی سے اپنی بہن صغیرہ بانو سے اس لیے ملنے آتی ہے کہ خیرات کے نام پر ہر ماہ ایک لگی بندھی رقم اس کے ہاتھ میں تھما دیتی ہوگی تاکہ غربت زدہ ماحول میں تمہاری خالہ ماں تمہاری پرورش کرتی رہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموشی سے میرال کا چہرہ دیکھنے لگا۔

دونوں اس وقت ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ کے قدرے الگ تھلگ گوشے میں دھری میز پر موجود تھے۔ سامنے میز پر چائے کے نفیس برتن سجے ہوئے تھے، سہ پہر کے چار بجے کا وقت تھا۔

اپنی بات کسی حد تک مکمل کرنے کے بعد صارم کی بھانپتی نظریں میرال کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ میرال کی آنکھوں اور چہرے سے امڈتی سرکشی اور تندی کی چمک کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ صارم اب خاموشی سے اس کے ردعمل کا منتظر تھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد میرال نے ایک عجیب ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ صارم کو اس کا ردعمل جاننے کے لیے اتنا ہی کافی تھا، لہٰذا بڑے محتاط انداز میں اس نے بات آگے بڑھائی۔

''دیکھو میرال! مجھے ان چیزوں سے اول تو کوئی دلچسپی نہیں ہے، میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، کسی شے کی کمی نہیں ہے میرے پاس، بس کمی ہے تو تمہاری، تم مجھے مل جاؤ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے، لیکن ایک سچے دوست

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور ایک وفادار ساتھی کی حیثیت سے میرا دل اس بات پر اندر ہی اندر کڑھتا ضرور ہے کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا اب تک ہو رہا ہے، وہ نہیں ہونا چاہیے تھا، یا ہو رہا ہے تو پھر اسے اب بند ہو جانا چاہیے مگر اتنا تو حق تمہارا ضرور بنتا ہے کہ تم اب خود ہی اس راز سے پردہ اٹھا دو۔ اپنی ماں صفیہ سلطانہ سے دوٹوک بات کرو، وہ ضرور تمہیں اپنی ممتا سے رجھانے کی کوشش کرے گی، اب تمہیں یہ خیرات لینے کی ضرورت نہیں، اس سے اپنا حق مانگو، وہ انکار کرے گی تو تم کورٹ میں مقدمہ دائر کر دینا، لیکن اس سے پہلے تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ راز تو افشا ہو ہی گیا، مگر آخر وہ کیا عوامل تھے، جن کے باعث تمہاری ماں صفیہ کو اپنی غریب اور بے اولاد بہن صغیرہ بانو کی جھولی میں تمہیں ڈالنا پڑا؟ اور کیوں؟ نیز یہ بھی پتا چلانا ضروری ہے کہ صفیہ سلطانہ کے شوہر مبارک احمد سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ تمہارا اصل باپ کہاں ہے؟ وغیرہ..... لیکن یہ پہلا مرحلہ بہت مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ طے کرنا ہوگا، جب تک اصل حقائق تمہارے علم میں نہ ہوں گے، تم ان دونوں کے خلاف مقدمہ نہیں لڑ پاؤ گی۔"

صارم اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میرال کے چہرے پر جوش، نفرت اور سرکشی کے ملے جلے جذبات کی سرخی واضح طور پر نمایاں ہو رہی تھی۔ صارم نے لوہا گرم دیکھ کر اسے باقاعدہ اپنے مقصد کے مطابق دھیرے دھیرے ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

جہانگیر اداس اداس سا اس وقت اپنے گھر میں ہی موجود تھا۔ اس کی ماں محلے میں کسی کام سے گئی ہوئی تھی۔ باپ بھی گھر پہ نہیں تھا۔ جہانگیر کے چشم تصور میں اس وقت میرال کا چہرہ گردش کر رہا تھا۔ اس کے دل سے ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال محو نہیں ہو پایا مگر وہ بے حد دکھی ہو رہا تھا۔ اس نے میرال سے اپنے دل کا جو حال کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا، مگر جواب میں میرال نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی یا کسی قسم کی امید افزائی نہ کی تھی، البتہ اس کی بات ہنسی میں ضرور اڑا دی تھی۔ لہٰذا اب اسے پورا یقین ہو چکا تھا کہ..... میرال اپنے اس بوائے فرینڈ کو ہی دل دے بیٹھی ہے، جسے وہ اکثر اس کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ صارم کا اسے ابھی تک نام بھی نہیں معلوم تھا۔

جہانگیر فطرتاً ایک شریف لڑکا تھا اور میرال سے بے لوث اور بلا کھوٹ محبت کرتا تھا، وہ بدفطرت لڑکوں میں سے نہیں تھا جو اپنی چاہنے والی کو کسی اور کے ساتھ دیکھ کر مشتعل ہو جاتے ہیں اور مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ بے شک رقابت کا جذبہ اس کے اندر بھی موجود تھا لیکن اس کی فطرت میں جارحانہ پن نہ تھا۔ جہانگیر سمجھتا تھا کہ محبت زبردستی حاصل نہیں کی جا سکتی، محبت میں صرف سچائی اور ایثار ہوتا ہے۔

جہانگیر اندر ہی اندر اپنا دل روتا محسوس تو کر رہا تھا، مگر بالآخر اس نے یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد ہار مان لی۔

ہاں.....! مگر یہ محبت کی ہار نہ تھی۔ وہ صرف میرال کو ہار رہا تھا کہ شاید وہ اب اس کی کبھی نہیں بن سکتی تھی لیکن میں تو اس سے محبت کرتا ہی ہوں، چاہے یکطرفہ سہی..... اور کرتا رہوں گا۔

یوں اور اس انداز میں سوچتے سوچتے اچانک اس کے اندر ایک اور بالکل عجیب جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ وہ میرال کو بہرحال دکھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بڑھ کر بے لوث اور سچی محبت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا تھا کہ وہ اب اپنی "ہار" مان لینے کے بعد..... دوسرے انداز سے میرال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔

اگر وہ اس لڑکے کے ساتھ خوش تھی، اسے اپنے زندگی کا ہمسفر بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی، تو وہ اس کی خوشیوں اور خوش آئند زندگی کے لیے دعا گو رہتے ہوئے سوچنے لگا کہ اگر میرال اس لڑکے (صارم) سے محبت کرتی تو کیا وہ لڑکا بھی واقعی اس سے سچی محبت کرتا تھا؟ وہ میرال کے لیے آگے چل کر کسی دکھ کا باعث تو نہیں بننے والا تھا؟ اگر میرال اس کے ساتھ خوش تھی تو جہانگیر بھی اس میں خوش تھا، مگر اب اسے یہ فکر تھی کہ وہ لڑکا (صارم) جس سے میرال محبت کرتی تھی، وہ میرال سے کس قدر سچا تھا؟ اور وہ تھا کون؟

بس..... جہانگیر اس بات کی آخری تسلی کرنا چاہتا تھا، کسی بزرگ کی طرح وہ اب اپنی محبت یعنی میرال کو اپنے شجر نگہبانی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جہانگیر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا وہ لڑکا میرال سے کتنا مخلص اور سچا تھا؟ بلاشبہ یہ اس کی میرال سے متعلق ایک عجیب، ناقابل بیان اور شاید نہ سمجھ میں آنے والی خواہش تھی۔

میرال عموماً سہ پہر کے ذرا دیر بعد ہی گھر سے نکلا کرتی تھی اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گنے کے جوس والے چوراہے پر صارم سے ملا کرتی تھی، جہاں وہ اپنی خوب صورت چمچماتی اسپورٹس بائیک پر اس کا منتظر ہوتا تھا۔ کم از کم اس حد تک تو دونوں کے معمولات کے بارے

میں جہانگیر اب جان چکا تھا۔

وہ اس وقت اندر اپنے کمرے میں چارپائی پر بیٹھا یہی کچھ سوچنے میں محو تھا کہ اچانک اسے باہر صحن میں خالہ صغیرہ بانو کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے ہی پکار رہی تھی۔

"اے جہانگیر بیٹا! کدھر ہو.....؟"

"جی خالہ.....! میں ادھر ہی ہوں....." یہ کہتا ہوا وہ تیر کی طرح چارپائی سے اٹھ کر کمرے سے نکلا اور صحن میں آ گیا۔

"سلام خالہ! خیریت تو ہے؟"

"اے جیتا رہ بیٹا! اللہ تجھے خوش رکھے، ایک تو ہی تو ہے جو ہم اکیلی ماں بیٹی کے کام آتا رہتا ہے۔" خالہ صغیرہ اسے دعائیں دینے لگی۔

"خالہ! ایک پڑوسی ہونے کے ناتے میرا آپ کے کام آنا فرض بنتا ہے۔" جہانگیر نے سعادت مندی سے کہا۔

"خیریت تو ہے ناں.....؟"

"بیٹا! میرال کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ خود میرے دونوں پیروں میں آج سوجن اتری ہوئی ہے، اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے، تم ذرا یہ مہربانی کر دو گے..... بیٹا؟"

میرال کی بیماری کا سن کر جہانگیر پریشان ہو گیا۔

"کک..... کیا ہوا اسے؟ میں ابھی آتا ہوں....." یہ کہہ کر وہ اپنے گھر سے نکلا اور بازو والا خالہ صغیرہ بانو کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔

"آ جاؤ، جہانگیر بیٹا! دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

وہ اندر آ گیا۔ کمرے میں دونوں ماں بیٹی موجود تھیں۔

جہانگیر نے دیکھا میرال ایک چارپائی پر نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ جہانگیر نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے وہ آگ کی طرح تپتی محسوس ہوئی، جہانگیر پریشان ہو گیا۔

"خالہ.....! اسے تو بہت تیز بخار ہے، آپ ایسا کریں جلدی سے پہلے اس کے سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں میں جا کر ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

جہانگیر فوراً ڈاکٹر کے پاس دوڑا۔

ذرا دیر بعد ہی وہ محلے کی کلینک سے ڈاکٹر صاحب کو لے آیا۔

ڈاکٹر نے میرال کا تفصیلی معائنہ کیا، انہیں تسلی دی کہ موسمی بخار ہے، اتر جائے گا، پھر ایک نسخہ تجویز کر کے تھما کے فیس پکڑے چلا گیا۔ جہانگیر نے بھی خالہ صغیرہ کو تسلی دی اور ڈاکٹر صاحب کا تجویز کردہ نسخہ لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس دوران خالہ صغیرہ نے دوائیوں وغیرہ کے پیسے بھی اسے تھما دیے تھے۔ ذرا ہی دیر میں وہ دوائیاں لے آیا۔

رات تک میرال کا بخار اتر گیا۔

صبح میرال یونیورسٹی نہیں گئی۔ جہانگیر سو کے اٹھا۔ اماں گھر کے کام میں مصروف تھی۔ جہانگیر نے منہ ہاتھ دھویا۔ باورچی خانے میں جا کر چائے بنائی، رس موجود تھے، دو رس چائے کی پیالی میں ڈبو کے برائے نام ناشتا کیا، اس وقت اس کے سیل فون پر دوست صابر علی نے رابطہ کر کے اسے مطلع کیا کہ کسی فرم میں کمپیوٹر سیکشن انچارج کی اسامی خالی ہے، اسے فوراً جا کر وہاں اپنی سی وی جمع کرانا پڑے گی، جاب پکی ہے کیونکہ اسی پوسٹ پر صابر کا بڑا بھائی تھا، جواب کویت جا رہا تھا۔ جہانگیر کے لیے یہ موقع اچھا تھا۔ اس نے جانے کب سے بی ایس ایس کر رکھا تھا اور نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری میں اس کا دل نہیں لگتا تھا، اس لیے عموماً وہ بیروزگاروں کی فہرست میں شامل رہتا تھا۔ مگر اپنے دوست صابر کی کال پر اسے امید ہو چکی تھی کہ اس بار اسے اپنے مطلب کی نوکری مل کر رہے گی۔ وہ پرامید تھا۔ اس نے صابر کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا پھر جلدی جلدی تیار ہوا۔ اپنے ضروری کاغذات کی فائل سنبھالی اور ماں کو بتا کر گھر سے نکلا۔ اس نے لباس پرانا سہی مگر اجلا اور صاف ستھرا پہنا ہوا تھا۔

اپنے گھر کا دروازہ پار کیا تو بے اختیار اس کی نظریں بازو والے دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کے دل میں خیال ابھرا کہ جاتے جاتے، خالہ صغیرہ سے میرال کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا جائے۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ صغیرہ بانو نے ہی کھولا۔ جہانگیر نے بڑے ادب سے سلام کیا۔

"جیتا رہے بیٹا۔" خالہ نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"خالہ! میرال کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اب پہلے سے کافی بہتر ہے، کہیں جا رہے ہو؟ اندر آ جاؤ؟"

"ہاں خالہ! دعا کرنا، ایک اچھی نوکری کی امید پیدا ہوئی ہے، وہیں جا رہا تھا۔" جہانگیر نے کہا۔ خالہ نے کامیابی کی دعا دی، جہانگیر سلام کر کے پلٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک اس کی نظر خالہ صغیرہ کے عقب میں کھڑی میرال پر پڑ گئی، جو صحن میں کھڑی اس کی جانب یک ٹک اور بڑی عجیب سی نظروں سے تکے جا رہی تھی۔ جہانگیر پھر رکا نہیں اور آگے بڑھ گیا۔

سہ پہر تک وہ انٹرویو وغیرہ دے کر واپس ہوا۔ اسے نوکری ملنے کی پوری امید تھی، اپنی گلی میں وہ داخل ہوا اور اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ تب پھر اس کی نظر قفل پر پڑی۔ اس کے چہرے سے بیزار کن پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کی ماں خالی گھر کو تالا لگا کر کسی پڑوسن سے ملنے گئی ہو گی۔ اس اثنا میں بازو والے گھر کا دروازہ وا ہوا جس کی کھڑکھڑاہٹ پر جہانگیر کا دل کسی خیال سے یکبارگی دھڑکا تھا۔ دروازے سے میرال نمودار ہوئی، اب تو اس کا دل جیسے دھڑکنا تک بھول گیا۔ ایک لمحے دونوں کی نظریں چار ہوئیں، مگر پھر جہانگیر نے دانستہ اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔

"جہانگیر!" میرال نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔ وہ دروازے سے تھوڑا باہر نکل کر چند قدم اس کی طرف بڑھ آئی تھی، جہانگیر نے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے ہمارا ٹھکانا لے رکھا ہے؟" میرال نے تلخ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

جہانگیر کے لیے میرال کا یہ لہجہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ تاہم وہ بولا۔ "میں سمجھا نہیں؟"

"مگر میں تمہیں خوب سمجھتی ہوں، سمجھے تم....." میرال نے پہلے سے زیادہ تیز و تند لہجے میں کہا اور جہانگیر اس کی تلخ گوئی پر بری طرح دل مسوس کر رہ گیا۔

"تم یقیناً اور اچھی طرح یہ بات جان چکے ہو کہ..... مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، تم ہماری خاطر، ہمارے لیے کچھ بھی کر لو، مگر میرا دل کبھی بھی تمہاری طرف مائل نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو گے، اگر نہیں جانتے..... تو کہو، میں تمہاری صارم سے ملاقات کرا دوں، شاید تمہیں اس کی بات پر یقین آ جائے کہ صارم مجھے اور میں اسے کس قدر پسند کرتے ہیں، اس لیے مجھ سے تم کسی قسم کی امید نہ لگاؤ۔"

جہانگیر نے بہ غور میرال کے پرجوش چہرے کا تفصیلی جائزہ لیا، محبت کی ناکامی کا کم از کم اتنا اثر تو ہوتا ہی ہے ایک عاشق نامراد پر کہ اسے ہمت کی زبان مل جاتی ہے۔ لہٰذا جہانگیر اپنے دروازے سے ہٹ کر میرال کے رخ کی طرف سیدھا کھڑا ہوا، ہاتھ میں پکڑی فائل کو اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کر کے میرال کی برہم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ لہجے میں بولا۔

"میرال! تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہاں! یہ درست ہے کہ میں تمہارے اور اس لڑکے صارم کی بارے میں سب کچھ اچھی طرح جانتا ہوں، مگر یہ سب کچھ جاننے کے باوجود میں نے تم سے آج تک کسی بات کا اصرار نہیں کیا، نہ ہی تم سے کسی جذباتی نوعیت کی بھیک مانگی ہے۔ مگر محلے داری کا مجھ پر جو فرض بنتا ہے، میں اسے ضرور نبھاتا رہوں گا۔"

اس کی بات پر میرال نے بھی تلخ روئی سے کہا۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح محلے داری کی آڑ میں تم مجھے جذباتی طور پر متاثر کرنے کی کوشش میں کامیاب رہو گے اور میرا دل جیتنے کی کوشش کرو گے تو تم اپنا وقت ہی برباد کرو گے۔"

"تم کچھ بھی سوچ لو..... یہ بہرحال تمہاری سوچ ہے۔" جہانگیر نے کہا۔ اس وقت جہانگیر کو سامنے سے اپنی ماں شکل کاک برقعہ اوڑھے آتی نظر آئی۔ میرال کی بھی آپا نُدرت پر نگاہ پڑ گئی وہ جہانگیر کو اب کے عجیب عجیب نگاہوں سے گھورتی ہوئی، اپنے گھر کی طرف پلٹی اور غالباً غصے کے اظہار کے طور پر دھڑاکے کی زوردار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اب نجانے یہ حالات کا اثر تھا، یا پھر صارم کے ورغلانے کا، عین ممکن تھا کہ میرال کے "سائیکوسس" بنتے مزاج کا دخل کہ ان تینوں خطرناک و سنگین عوامل نے مل کر میرال کے اندر جوالا مکھی سا بھر ڈالا تھا۔ صارم کی باتیں ابھی تک اس کے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ اب اس کی "ہدایات" پر بلاسوچے سمجھے عمل کر ڈالنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

صارم کی کہی ہوئی باتیں آتشیں گولوں کی طرح اس کے دل و دماغ میں برس رہی تھیں..... مگر باوجود اس کے کوئی غیر مرئی طاقت ایسی تھی جو میرال کو خالہ صغیرہ بانو اور صفیہ سلطانہ کے ساتھ متصادم ہونے سے روکے ہوئے تھی۔ یوں وہ نہ تین میں تھی نہ تیرہ میں اور یہ حالت میرال کو خطرناک قسم کے ذہنی دباؤ میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ وہ سخت چڑچڑی اور بدمزاج ہو رہی تھی اور شاید یہی سبب تھا کہ وہ آج خوامخواہ جہانگیر سے بھی الجھ بیٹھی تھی، حالانکہ بے چارے جہانگیر کا اس میں کیا قصور تھا۔ صرف اتنا کہ میرال کی ایک روز قبل سخت طبیعت خراب تھی اور جہانگیر اس کے لیے ڈاکٹر کو بلا لایا تھا، پھر اس کے بعد میرال کی حالت تیزی سے سنبھل گئی تھی۔

یہ اس روز کی بات تھی۔ صارم نے اس سے سیل فون

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر رابطہ کیا اور اس سے اشاروں کنایوں میں پوچھا کہ اب تک اس نے اس کی ہدایات پر کس حد تک عمل کیا؟

''صارم! اب بھی اس سلسلے میں سخت شش و پنج کا شکار ہوں۔ مجھ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا۔ اسی بات پر مجھے کل بہت تیز بخار نے بھی آلیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''دیکھو میرال! میں تمہیں کسی قسم کی ٹینشن میں مبتلا نہیں کرنا چاہ رہا۔'' دوسری طرف سے صارم نے ملائمت آمیزی سے کہا۔ ''بلکہ میں تو خود چاہ رہا ہوں کہ تم اس قسم کے مسلسل ذہنی دباؤ سے ہمیشہ کے لیے خود کو آزاد کر ڈالو، جو ایک مستقل عذاب کی صورت میں تمہارے دل و دماغ اور اعصاب تک پر سوار ہو چکا ہے، تم خود بتاؤ، کیا میں یہ غلط کہہ رہا ہوں کہ..... جب سے تمہیں اتفاقی طور سے یہ پتا چلا ہے کہ تم خالہ صغیرہ بانو کی نہیں بلکہ صفیہ خاتون کی بیٹی ہو اس دن سے کھوئی کھوئی اور کسی پریشان کن سوچ میں مبتلا رہنے لگی ہو، خود میں نے کیا..... تم نے بھی اپنے مزاج میں چڑچڑا پن اور قنوطیت کو محسوس کیا ہوگا، جو بہر حال کبھی بھی تمہارے مزاج کا خاصہ نہیں رہا۔ ذرا سوچو یار! تم پہلے ایسی تو نہ تھیں؟ تم تو ایک شوخ و چنچل اور ہر سے مسکراتی رہنے والی لڑکی تھیں۔'' اس نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر بولا۔

''دیکھو میرال! میں تمہیں اب مزید اداس اور قنوطیت زدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا..... میں تمہیں پہلے والے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہنستے مسکراتے شوخ و چنچل روپ میں، اور یہ تب ہی ممکن ہوگا جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں..... غور سے میری بات سنو، تمہارے قدم اٹھانے کا یہی مناسب وقت ہے، خود کو پہلے پرسکون کرو، میں تمہیں کسی کے ساتھ دھواں دھار جنگ لڑنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ مگر اپنے حق کے سلسلے میں جو کچھ کرو، پورے اعتماد اور ہوش و حواس کے ساتھ کرو، اس میں تمہارا فائدہ ہے، پہلی بات تو یہ کہ اس وقت تمہارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تم صفیہ سلطانہ کی بیٹی ہو، پھر مجھے یا تمہیں تو محض ابھی ادھورا راز ہی معلوم ہو سکا ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔ میرال بہ غور اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''یعنی ہم صرف اس قدر ہی جانتے ہیں کہ تم صفیہ سلطانہ کی بیٹی ہو، خالہ صغیرہ کی نہیں، مگر مبارک احمد کی تم بیٹی نہیں ہو سکتیں، تاہم قرائن سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری ماں صفیہ سلطانہ نے ضرور دو شادیاں کی ہوں گی لیکن تمہاری ماں صفیہ سلطانہ کے موجودہ شوہر مبارک احمد کو اس بات کا علم نہ ہوگا، جس کا ثبوت تمہاری ماں کا تمہیں خود سے دور رکھنا ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ جس کے باعث تمہاری ماں نے اپنے شوہر مبارک احمد کو اپنی پہلی شادی یا پہلے شوہر کے بارے میں بے خبر رکھا۔ لہٰذا اس حد تک تو بات طے ہوگئی کہ صفیہ سلطانہ تمہاری اصل ماں ہے جبکہ اس کا شوہر مبارک احمد تمہارا سوتیلا باپ۔ اب جبکہ تم اگر صرف قانونی طور پر یہ دعویٰ کرتی ہو کہ تم صفیہ سلطانہ کی سگی اولاد ہو تو، اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس لیے تمہیں بہت چالاکی اور مکاری سے پہلے یہ کھوج لگانا ہوگا کہ تمہارا اصل باپ کون تھا؟ اور کیا تھا؟ اور اب کہاں ہے؟''

صارم کی پر صراحت گفتگو سننے کے بعد میرال نے اپنے اندر کے اتار چڑھاؤ پر قدرے قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''مگر یہ ثبوت مجھے کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ میں ایک تو واقعی صفیہ سلطانہ کی بیٹی ہوں اور دوسرے یہ کہ میرا اصل باپ کون تھا؟ اس کے علاوہ وہ سارے حقائق جن کی بنا پر میری ماں مجھے خود سے دور رکھنے پر مجبور ہوئی۔''

''بہت آسان طریقہ ہے میرے پاس اس کا۔'' دوسری جانب سے صارم کی اسرار میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ وہ بہت دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے میرال کی رگوں میں نفرت و سرکشی کا زہر بھر رہا تھا، بولا۔

''سب سے پہلے تمہیں اپنی ماں صفیہ سلطانہ کے سامنے جذباتی رول ادا کرنا پڑے گا۔''

''وہ کس طرح؟''

''تمہیں اس سے اب کے باقاعدہ ایک تفصیلی ملاقات کرنا ہوگی، مگر کسی ایسے وقت جب تمہاری ماں اپنی بہن یعنی تمہاری خالہ..... صغیرہ بانو سے ملنے کے لیے تمہارے گھر پہنچے، تم رو رو کر بتا دو گی کہ تمہیں اس راز سے آگاہی ہو چکی ہے اور یہ کہ تمہارے دل میں، تمہاری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی کشش نے جوش مارا..... اور تم بے اختیار ہو کے اس کی ممتا کے لیے تڑپ اٹھیں.....''

''یہ مجھ سے بالکل نہیں ہوگا۔'' میرال نے فوراً نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس خود غرض عورت سے شدید نفرت ہے، جس نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مجھے..... یعنی اپنی سگی اولاد کو دھتکار پھینکا۔''

''میرال! تم پھر جذباتی ہو کے سوچنے لگیں۔'' صارم نے اسے متنبہ کیا۔ ''دیکھو میرال! تمہاری اپنی ماں سے نفرت اپنی جگہ اور تم بے شک حق بہ جانب بھی ہو، لیکن دل پہ جبر کر کے تمہیں بہر حال یہ کڑوی گولی نگلنا ہوگی اور یہ سب عارضی ہوگا۔ تم بس یہ یاد رکھو کہ تمہیں اپنا حق حاصل کرنا

ہے، اس کے لیے تمہیں یہ جذباتی قسم کا ڈراما ضرور پلے کرنا پڑے گا۔''

''ہاں! صارم! تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو، اپنا حق حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ سب کرنا پڑے گا۔'' بالآخر میرال کو یہ کہنا پڑا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ صارم جس انداز میں میرال کو اس کی ماں اور ممکنہ سوتیلے باپ مبارک احمد کے خلاف زہریلا بنا رہا تھا، میرال کے لیے یہ سب ایک فطری عمل تھا۔

''گڈ! اب تم صحیح طور پر میری بات سمجھ رہی ہو۔'' دوسری طرف سے صارم نے توصیفی لہجے میں کہا۔

''سنو۔'' وہ پھر زہر بھرنے لگا۔ ''اس طرح تم سب سے پہلے اپنی ماں صفیہ سلطانہ کو شیشے میں اتارو گی، اس کے بعد آہستہ آہستہ چالاکی سے اس سے پہلے وہ راز جاننے کی کوشش کرو گی کہ..... آخر وہ کیا وجہ تھی جس کے باعث اس نے تمہیں خود سے دور رکھا۔ پھر جو کچھ وہ بتائے تمہیں اس سے مدد حاصل کرنا ہوگی۔ تب ہی ہم اپنے منصوبے کے دوسرے اور آخری مرحلے کا آغاز کریں گے۔'' صارم نے کہا۔

میرال نے ساری باتیں بہ غور سن لینے کے بعد ایک طویل سانس خارج کی پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے صارم! اب ہمیں اپنے اصل منصوبے کا آغاز کر دینا چاہیے۔''

اس کی بات پر صارم کے ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اس وقت گلستان جوہر کے ایک کابک نما فلیٹ سے بات کر رہا تھا۔ یہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ وہاں وہ تنہا رہتا تھا۔ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ اسے ماموں نے پالا تھا، جو بے اولاد تھے۔ حال میں ان کا انتقال ہو گیا تھا جبکہ ممانی کا ان سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

اس سے پہلے صارم اپنے ماموں کے ساتھ ملیر کے ایک بوسیدہ مکان میں رہتا تھا مگر ذاتی مکان تھا۔ اس کے ماموں بلدیہ میں کلرک تھے۔ بہر طور چند لاکھ اور ایک ملیر والا ذاتی مکان صارم کو ماموں کے انتقال کے بعد ترکے میں ملا تو اس نے اسے بیچ باچ کر گلستان جوہر میں دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا۔

یہ فلیٹ اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ بہت چالاک تھا۔ وہ اب اپنا رکھ رکھاؤ اس طرح کرنے لگا تھا کہ جیسے کسی بڑے رئیس باپ کی اولاد ہو، یوں بھی خاصا خوبرو اور اسمارٹ نظر آتا تھا۔

اس نے ماموں مرحوم کے ترکے میں ملے ہوئے چند لاکھ اڑائے نہیں تھے بلکہ صدر جیسے معروف بازار میں اس نے آڈیو وڈیو کی دکان ڈال لی تھی اور دو لڑکے بٹھا دیے تھے، خود بھی وہاں بیٹھا کرتا تھا۔ مگر زیادہ تر وہی دونوں لڑکے ہی اس کی دکان سنبھالتے تھے۔

صارم فطرتاً ایک بدخصلت شخص تھا۔ اس فلیٹ میں اس نے درجنوں لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کی تھیں۔

صارم ان لڑکوں میں سے تھا جو اپنی مردانہ وجاہت کو کیش کراتے رہتے ہیں، لڑکیوں سے ہی نہیں بلکہ اس نے جنسی بھوک کی ماری عورتوں اور بیواؤں سے بھی خوب رقم لوٹی تھی اور ان پر خرچ کرنے کے بجائے ان سے الٹا خرچہ لیا کرتا تھا۔

میرال کے معاملے میں وہ بدقسمت ہی رہا تھا، اگرچہ وہ اسے اپنی خوبروئی اور لچھے دار باتوں سے اپنی محبت کے جال میں پھنسا تو چکا تھا، مگر شیطانی جال میں وہ اسے پھنسانے میں بری طرح ناکام رہا تھا، اس کی وجہ میرال کا مزاج تھا، بے شک وہ بھی صارم کو چاہنے لگی تھی، مگر محبت میں خود کو گمراہ کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی بلکہ محبت میں بھی وہ بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔

عین ممکن تھا کہ صارم اپنا راستہ بدل کر کسی اور ''شکار'' کی طرف متوجہ ہوتا کہ اچانک اسے میرال سونے کی چڑیا کے روپ میں نظر آ گئی، جب اس نے اسے اس روز..... اپنے اہم ترین راز کا شریک کار و ہم راز بنا لیا۔

وہ میرال کے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔ اب وہ اپنے ایک منصوبے پر کار فرما تھا اور بڑی مکاری اور ہوشیاری کے ساتھ میرال کو اکسانے کے لیے کامیاب ہو چکا تھا اور اسے یہ باور کرا چکا تھا کہ اسے اب اپنی ماں اور ممکنہ سوتیلے باپ مبارک احمد سے اپنا حصہ وراثت کا دعویٰ کرنا تھا، مگر اس کے لیے پہلے کچھ مزید ٹھوس ثبوت کے علاوہ اس راز سے پوری طرح آگاہی ضروری تھی کہ آخر یہ سارا معاملہ تھا کیا..... لہٰذا اس سلسلے میں وہ میرال کی نظروں کے سامنے ''برا'' یا ''مشکوک'' بنے بغیر اسے اس سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ یوں اس کا گرینڈ ماسٹر پلان بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا جس کے مطابق وہ میرال کو پہلے اس کے امیر کبیر سوتیلے باپ مبارک احمد کی جائداد و دولت میں قانونی طور پر حصہ دار بنانا چاہتا تھا اور پھر اس سے شادی کرنے کے بعد وہ میرال کے خلاف بھی اپنا اصل کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈی ایس پی راشدہ شیخ نے صفیہ سلطانہ کی بات بہ غور سنی تھی اور پھر اسے کچھ ضروری ہدایات اور تسلی وغیرہ دے کر رخصت کر دیا۔

ڈی ایس پی راشدہ شیخ نے ایک ہوشیار اور قابل ہیڈ کانسٹیبل محمد خان کو صفیہ سلطانہ کے رابطے میں دے دیا تھا۔

صفیہ سلطانہ کو اب بے چینی سے اس گمنام بلیک میلر کے فون کا انتظار تھا۔ تیسرے روز اس کا فون آ گیا۔

"دس لاکھ کی رقم کا بندوبست تو ہو گیا ہوگا؟" دوسری طرف سے اس گمنام بلیک میلر نے آواز بدل کر کہا۔

"ہاں! رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔ کہاں پہنچانا ہوگی.....؟" صفیہ سلطانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"بالکل ٹھیک جا رہی ہو، شاباش....." دوسری جانب سے بلیک میلر کی آواز ابھری۔ "اسی طرح میرے کام آتی رہیں تو تم بھی خوش رہو گی اور میں بھی....."

صفیہ سلطانہ نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس نے وہی کہا تھا جو اسے ڈی ایس پی راشدہ شیخ نے ہدایت کی تھی..... جبکہ صفیہ سلطانہ کے پاس بلیک میلر کو دینے کے لیے اب کچھ نہ تھا۔ یہ جھوٹ اس نے پولیس کے کہنے پر اس سے بولا تھا، جو ایک منصوبے کے بعد اسے گرفتار کرنے کے لیے الرٹ ہو چکی تھی۔

لہٰذا ادھر بلیک میلر نے صفیہ سلطانہ کو رقم پہنچانے کا ایک مقام بتایا اور رابطہ منقطع کر دیا تو صفیہ سلطانہ نے فوراً ہیڈ کانسٹیبل محمد خان سے رابطہ کر کے اسے سب بتا دیا۔ اس نے صفیہ کو چند ضروری ہدایات دیں اس کے بعد اسے روانہ ہونے کے لیے کہا۔

☆☆☆

صفیہ سلطانہ کو مقررہ جگہ پر رقم لے کر پہنچنے کا کہہ کر بلیک میلر بہت خوش خوش اپنے فلیٹ سے اپنی اسپورٹس بائیک پر روانہ ہوا۔ دس لاکھ روپے ملنے کی مسرت اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ بڑا شاداں و فرحاں مقررہ جگہ پر پہنچا، یہ ایک نسبتاً گنجان علاقہ تھا۔ صفیہ سلطانہ کو ادھر ہی پہنچنا تھا اور اس کے پہنچنے کا وقت ہونے والا تھا۔ بلیک میلر نے اس بار اپنے سر پہ ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ تھوڑی دیر گزری، اس نے سیل فون پر صفیہ سلطانہ سے رابطہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اگلے چند منٹوں میں وہاں پہنچنے والی تھی۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ بلیک میلر کو اس کی کار نظر آ گئی، جو ایک قدرے چوڑی سڑک والے موڑ سے اسی کی جانب رینگنے کے انداز میں آ رہی تھی اور پھر ایک فٹ پاتھ کے قریب رک گئی۔ بلیک میلر کی عقابی نظریں کار پر جم گئیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر تیزی سے اپنی بائیک موڑ کے کار کی طرف بڑھا اور سیدھی کار کی ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کی طرف ایک جھٹکے سے روک دی۔ صفیہ سلطانہ نے اس کی جانب دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے غراہٹ آمیز آواز میں اسے سر اٹھانے سے باز رکھا، وہ اس کے عقبی رخ سے ظاہر ہوا تھا اور صفیہ سلطانہ کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، یوں بھی بلیک میلر نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا، مشکل سے ہی چہرہ پہچاننے میں آتا۔ "رقم کدھر ہے؟ فوراً میرے حوالے کرو۔" اس نے غرا کے کہا۔

صفیہ سلطانہ نے برابر کی سیٹ پر رکھے ہوئے اپنے پرس کو اٹھا کے اپنی گود میں رکھا اور اسے کھولنے لگی۔

"جلدی کرو، میرے پاس وقت نہیں ہے۔" بلیک میلر نے درشتی سے کہا مگر ٹھیک اسی وقت ایک پولیس موبائل سائرن بجاتی ہوئی ایک موڑ سے اچانک نمودار ہوئی اور کار کی طرف لپکی، بلیک میلر بری طرح چونک گیا۔ پھر وہ نہ رکا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنی بائیک دوڑا دی۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا اور چالاکی سے اسے پھانسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ بتدریج اپنی ہیوی اسپورٹس بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس نے دانستہ مین روڈ کا رخ نہیں کیا تھا اور گلیوں میں بائیک دوڑانے لگا۔ اس کے تعاقب میں آتی ہوئی پولیس موبائل بہ دستور اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی، اس میں ہیڈ کانسٹیبل..... محمد خان تقریباً سات عدد پولیس نفری کے ساتھ موجود تھا اور ڈی ایس پی راشدہ شیخ کی ہدایت کے مطابق اسے ہر حالت میں اس بلیک میلر کو پکڑنا تھا۔ اس لیے وہ سر توڑ کوشش میں لگا ہوا تھا، مگر وہ بلیک میلر بھی اس کے ہاتھ نہ چڑھنے کا پورا زور صرف کیے ہوئے تھا۔

وہ دانستہ تنگ موڑ والی گلیوں سے گزرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پولیس کی لمبی چوڑی موبائل اس تک نہ پہنچ پائے..... اور وہ کسی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا مگر ایک جگہ پر بری طرح دھوکا کھا گیا، اس بار وہ جس نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہوا تھا، وہ آگے سے بند تھی، اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر اس نے فوراً اپنی بائیک موڑی، اس عرصے میں پولیس کی موبائل بھی سائرن بجاتی اس کے سر پہ آن پہنچی، وہاں افراتفری مچ گئی، اردگرد کے لوگ بھی اکٹھے ہوئے تھے، سوئے اتفاق ٹھیک اسی وقت..... جہانگیر اپنے دفتر جانے کے لیے ایک بس سے اتر کے دوسرے روٹ کی

بس پکڑنے کے لیے اس طرف سے گزر رہا تھا، تب اس کی بھی اچانک پولیس موبائل پر نظر پڑ گئی۔ اسے ڈیوٹی پر جلد پہنچنا ہوتا تھا اور اسے وہاں تک پہنچنے کے لیے دو بسیں بدلنا پڑتی تھیں۔ دوسری بھی اس علاقے کے اگلے چوراہے سے پکڑنا پڑتی تھی۔

پولیس اور لوگوں کا مجمع دیکھ کر وہ بھی ذرا دیکھنے کو رکا کہ اچانک اس کی نظر صارم اور اس کی ہیوی ڈیوٹی اسپورٹس بائیک پر پڑی۔ پولیس اس کے سر سے ہیلمٹ اتار چکی تھی۔ اب ہاتھوں میں اس کے ہتھکڑیاں ڈالے اسے موبائل میں سوار کروا رہی تھی، جہانگیر کے لیے اب آگے بڑھ جانا ممکن ہی نہ تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر پولیس نے اسے کس جرم میں گرفتار کیا تھا، بہرطور..... اس نے فوراً پولیس موبائل کی باڈی پر درج متعلقہ تھانے کے علاقے کا نام اور نمبر ذہن نشین کیا اور آگے بڑھ گیا۔

نئی نئی جاب تھی اس لیے وہ اس کی طرف سے کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا۔

بہرطور..... وہ ڈیوٹی پر پہنچا، مگر آج سارا دن اس کا دھیان صارم کی گرفتاری پر لگا ہوا تھا۔ وہ اب یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آیا پولیس نے اسے ایسا کون سا جرم کرتے ہوئے پکڑا تھا؟ چونکہ اس نے متعلقہ تھانے کے علاقے کا نام اور نمبر نوٹ کر لیا تھا، لہٰذا تھوڑی فراغت پا کر اس نے ون سیون سے تھانہ متعلقہ تھانے کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر کے، فون کھڑکا دیا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی، پانچویں بیل پر ایک اکتائی ہوئی آواز ابھری۔ "ہیلو۔"

جہانگیر نے فوراً کہا۔ "آپ کے تھانے کی پولیس نے آج صبح نو اور دس بجے کے قریب صارم نامی ایک لڑکے کو گرفتار کیا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس نے کون سا جرم کیا تھا؟"

جہانگیر نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ دوسری جانب سے وہی بیزار کن آواز ابھری۔

"یہاں آ کر معلوم کر لو کاکا جی..... ہمیں تنگ مت کرو۔" یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

☆☆☆

صارم کے لیے یہ بڑی مخدوش صورتِ حال تھی، اس طرح پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا اس کے حق میں بہتر نہ تھا، اس طرح نہ صرف اس کا پورا گرینڈ ماسٹر پلان خطرے میں پڑ گیا تھا بلکہ میرال بھی اس سے بددل ہو جاتی، پھر بلیک

WWW.PAKSOCIETY.COM

میانگ کے جرم میں جانے اسے کتنی سزا ہوتی۔

صارم کو فوراً ڈی ایس پی راشدہ شیخ کے حکم پر اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ صفیہ سلطانہ بھی وہاں موجود تھی اور اس کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے تکے جارہی تھی، اسے دیکھ کر صارم پریشان بھی ہوا اور اسے صفیہ سلطانہ پر سخت طیش بھی آیا جس نے اسے بالآخر دھوکے سے گرفتار کروادیا تھا۔ حالانکہ صارم کو اس بہ ظاہر سیدھی سادی اور گھریلو خاتون نظر آنے والی عورت سے اس قسم کی ہمت اور دلیری کی بالکل توقع نہ تھی۔

بہر طور..... ڈی ایس پی راشدہ شیخ نے خشمگیں نظروں سے ہتھکڑی لگے صارم کو گھورا اور درشت لہجے میں بولی۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی، ایک شریف اور عزت دار خاتون کو بلیک میل کرتے ہو؟ جانتے ہو اس جرم کی کیا سزا ہوتی ہے؟ سرعام گیارہ کوڑے اور نو سال قید بامشقت.....“

صارم نے اپنے چہرے پہ ندامت طاری کرتے ہوئے راشدہ سے کہا۔ ”میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں اور اس خاتون سے بھی، مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔“

”شٹ اپ۔“ ڈی ایس پی راشدہ شیخ کڑک دار لہجے میں اسے جھڑک کے بولی۔ وہ ایک بھاری بھر کم شخصیت کی بارعب عورت تھی، پولیس آفیسر کی وردی میں وہ خاصی پُروقار نظر آرہی تھی۔

”تم نے قانون اور جرم کو کھیل سمجھ رکھا ہے؟ جب چاہے اپنے ہاتھ میں لے کر کھیلنا شروع کردو۔“ وہ اس کی طرف گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ ”تمہیں اس کی پوری پوری سزا ملے گی۔“ صارم نے گھگیا کر اس کی منت سماجت شروع کردی۔

”مم..... مجھے معاف کردیں انسپکٹر صاحبہ..... اگر مجھے سزا ہوگئی تو میرا سارا تعلیمی کیریئر تباہ ہوجائے گا بلکہ میری بیمار بوڑھی ماں بھی صدمے سے مرجائے گی پھر میری جوان بہن اس بھری دنیا میں بے سہارا اور اکیلی رہ جائے گی، میں نے اپنے تنگ دست حالات سے مجبور ہوکے یہ قدم اٹھایا تھا۔ مجھے معاف کردیں خدا کے لیے۔“ اس نے بڑی مکاری سے اپنے چہرے پر معصومیت سجالی تھی۔

”شکل وصورت سے تو تم کسی بڑے گھر کے لڑکے لگتے ہو اور پڑھے لکھے بھی، مگر یہ کام کرتے ہوئے تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ تم پکڑے بھی جاسکتے ہو، اس وقت تمہیں اپنی بوڑھی ماں اور بہن کا خیال کیوں نہیں آیا؟“

”میں کیا کہوں جی؟..... بس حالات کی مجبوری انسان سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ جرم سرزد کروا ڈالتی ہے۔“ اس نے ایک بار پھر جھوٹی معصومیت کا سہارا لیا۔

ڈی ایس پی راشدہ شیخ کے سامنے والی کرسی پر براجمان صفیہ سلطانہ ہنوز صارم کے چہرے کو خاموشی سے تکے جارہی تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ ذرا.....؟“ معاً پولیس افسر راشدہ نے بہ غور اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا تھا کہ..... میرال ان خاتون کی بیٹی ہے؟“

صارم کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہ تھا، اس کے عیار ذہن نے فوراً یہ درست اندازہ قائم کرلیا کہ یقیناً صفیہ سلطانہ نے اس لیڈی پولیس افسر کو اعتماد میں لے کر اسے ساری بات سے آگاہ کرڈالا ہے لہٰذا جواباً بڑی عیاری سے بولا۔

”بس اسے اتفاق ہی کہیے کہ میرے ایک دوست جہانگیر کی معرفت مجھے یہ راز معلوم ہوگیا تھا کہ..... میرال اصل میں صغیرہ بانو کی نہیں بلکہ انہی خاتون کی اصل اور سگی اولاد ہے۔“

اس نے قریب کرسی پر بیٹھی صفیہ سلطانہ کی طرف اشارہ کرکے کہا اور دانستہ جہانگیر کا نام دے ڈالا۔

”یہ جہانگیر کون ہے؟“ اس بار صفیہ سلطانہ نے اس سے پوچھا۔

”وہ جی آپا ندرت کا اکلوتا بیٹا ہے اور آپ کی بہن صغیرہ بانو کا نہ صرف اچھا پڑوسی بننے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس کا گھر بھی آپ کی بہن کے بالکل بازو پر ہے۔“

”اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟“ صفیہ سلطانہ نے اس سے اگلا سوال کیا تو صارم دانستہ خاموش رہا۔

”جواب دو ان کی بات کا۔“ اس بار پولیس افسر راشدہ شیخ نے اس کی طرف گھور کر تحکمانہ درشتی سے کہا تو مکار صارم نے ایک اور پینترا بدلتے ہوئے جواباً کہا۔

”وہ جی..... جہانگیر ان دونوں بہنوں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا چونکہ ان کے گھر کی دیوار ایک تھی، پھر جہانگیر بھی اکثر صغیرہ بانو کے چھوٹے موٹے کام کردیا کرتا تھا اور وہ بھی اسے بیٹوں کی طرح سمجھتی تھی، اس پر پورا اعتماد کرتی تھی، اس لیے اس نے کسی طرح کان لگا کر ان دونوں بہنوں کی آپس میں ہونے والی رازدارانہ گفتگو سن لی تھی، کیونکہ وہ اکثر ان خاتون کو ایک لمبی سی چمچماتی کار میں اکثر وبیشتر وہاں آتے

جاتے دیکھا کرتا تھا۔“

”تو گویا جہانگیر نامی وہ لڑکا بھی تمہارے ساتھ اس جرم میں شامل ہے اور تمہارا ساتھی ہے؟“ افسر راشدہ شیخ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

صارم جانتا تھا کہ جہانگیر بھی میرال میں دلچسپی لیا کرتا تھا مگر وہ اسے گھاس تک نہیں ڈالتی تھی، پھر وہ کچھ سیدھا سادا لڑکا بھی تھا، اس لیے شاطر دماغ صارم کے ذہن میں فوراً جہانگیر کو پھانسنے کا خیال آیا تھا کیونکہ اس کے متعلق ایک تو وہ خود بھی تھوڑا بہت جانتا تھا، دوسرے یہ کہ..... میرال بھی کبھی کبھی جہانگیر کا مذاق اڑانے کے سلسلے میں صارم کے سامنے اس کا تفصیلی تذکرہ کرتی رہتی تھی۔

”جی ہاں! جہانگیر بھی میرے ساتھ اس جرم میں شامل ہے۔“ بالآخر اس نے جھوٹ بول دیا۔

ادھر یہ سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ ادھر جہانگیر بالآخر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکے ڈیوٹی سے ذرا جلد ہی آف ہوتے ہی فوراً متعلقہ تھانہ جا پہنچا اور صارم کے بارے میں دریافت کیا۔ جہانگیر چونکہ بے چارہ ایک سیدھا سادا لڑکا تھا اور پھر یوں بھی وہ صارم کے سلسلے میں کھوج کرنا چاہتا تھا، لہٰذا وہ قانونی پیچیدگیوں اور اس کی اونچ نیچ سے یکسر نابلد تھا، چنانچہ اسے بھی صارم کے ساتھی ہونے کے شبہے میں دھرلیا گیا اور ڈی ایس پی راشدہ کو اس کی ٹیلی فون پر اطلاع دی گئی۔ اس نے فوراً اسے پولیس ہیڈ کوارٹر، اس کے پاس پیش کرنے کا حکم نامہ جاری کردیا۔

یوں تھوڑی دیر بعد جہانگیر کو بھی ہتھکڑیاں لگا کر پیش کردیا گیا۔ جہانگیر کو بھی گرفتار دیکھ کر صارم دل ہی دل میں اپنی چالاکی پر نازاں ہوا۔ جبکہ جہانگیر بے چارہ اس نئی اور غیر متوقع افتاد پر بری طرح ہراساں وپریشان تھا۔

”یہی ہے میرا ساتھی، جہانگیر نام ہے اس کا..... آپا ندرت کا بیٹا۔“ مکار صارم نے فوراً اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ تب جہانگیر کو اس حد تک تو معاملے کا ادراک ہونے لگا کہ صارم اپنا کوئی جرم اس کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ جرم کیا تھا؟ یہ اسے ابھی تک معلوم نہیں ہوا تھا۔

”تو تم دونوں اس جرم کے شریک کار ہو۔“ افسر راشدہ شیخ نے دانت پیس کر حیران پریشان کھڑے جہانگیر کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”کونسا جرم؟..... کیسا جرم.....؟ مجھے کچھ نہیں معلوم، یہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ پھنسانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے، انسپکٹر صاحبہ؟“ جہانگیر نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے

تصویری تحریریں

فراعنہ کے زمانے میں آج کی طرح الفاظ وحروف سے تحریر کا کام نہیں لیا جاتا تھا بلکہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے تصویروں کی مدد لیتے تھے۔

اس تصویری طریقہ تحریر کے کئی نمونے اہرام کی دیواروں اور شکی الواح پر لکھے ہوئے ملے ہیں۔ اس تصویری زبان کو سمجھنا بہت دشوار تھا حتیٰ کہ 1798ء میں سکندریہ کے قریب ایک ساحلی قصبے ”رشید“ سے نپولین کی فوج کو ایک پتھر ملا جس سے اس تحریر کو پڑھنے میں مدد ملی۔ یہ ڈیڑھ فٹ چوڑا اور سوا دو فٹ لمبا اور قریباً دو انچ موٹا سیاہ چمکیلا پتھر تھا جس پر ہیروغلافی، مصری اور یونانی زبان میں ایک تحریر لکھی ہے۔ اسے ”حجر رشید“ کہتے ہیں۔ یہ آج کل برٹش میوزیم میں پڑا ہے۔ اس پتھر کی مدد سے مصر کا ماضی بولنے چھپانے اور گنگنانے لگا۔ مورخین اسے ”علم کی کنجی“ کے نام سے لکھتے ہیں۔

مرسلہ: احسان سحر، میانوالی

راشدہ شیخ سے کہا۔

”بکواس بند کروائیں.....“ وہ غصے سے کالے رنگ کا رول میز پر بجاتے ہوئے، اسے درشت نظروں سے گھور کر بولی۔ ”ہر بڑے مجرم کا ساتھی، اسی طرح چالاکی سے اپنی لاتعلقی ظاہر کرتا ہے، اب تم دونوں لمبے عرصے تک حوالات کی سیر کروگے۔“

جہانگیر بے چارہ سخت پریشان اور تشویش زدہ نظر آنے لگا، اس کا چہرہ تو بالکل ہی ست کے رہ گیا تھا، ساتھ ہی اسے اس طرح ہتھکڑیاں بندھے قریب کھڑے صارم پہ بھی بے انتہا غصہ آیا جس نے اسے بے گناہ اپنے ساتھ پھنسادیا تھا۔ مگر صفیہ سلطانہ، جو خاصی دیر سے جہانگیر کے چہرے کا بہ غور جائزہ لینے میں محو تھی اس سے بولی۔

”کیا تم مجھے جانتے ہو.....؟“ اس کی بات پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

جہانگیر نے پہلی بار غور سے اسے دیکھا۔

صفیہ سلطانہ کے لیے تو جہانگیر اجنبی ہی تھا، البتہ جہانگیر کے سلسلے میں ایسا نہ تھا، جب صفیہ سلطانہ اکثر و بیشتر اپنی لمبی سی چمچماتی کار میں خالہ صغیرہ بانو سے ملنے اس کے گھر آیا کرتی تھی، تو دو تین بار جہانگیر کی بھی اس پر نظر پڑ گئی تھی، اس نے اکثر اس خاتون کو خالہ صغیرہ بانو کے گھر آتے جاتے دیکھا ہوا تھا، بولا۔

"زیادہ تو نہیں، البتہ آپ کو دو تین بار خالہ صغیرہ بانو کے ہاں آتے جاتے ضرور دیکھ چکا ہوں....."

"تم نے کبھی میری اور خالہ صغیرہ بانو کے درمیان ہونے والی باتیں سنی تھیں؟"

کسی خیال کے تحت صفیہ سلطانہ نے دل پہ جبر کر کے پوچھا۔ جہانگیر کو اس کے سوال پر یقینی طور پر حیرت ہوئی، وہ اس کی طرف دیکھ کر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا.....؟" صفیہ سلطانہ کو جہانگیر کے اس الجھن آمیز انداز پر یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ واقعی ہر معاملے سے انجان تھا، اس نے افسر راشدہ شیخ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ جہانگیر نامی یہ شخص بالکل بے قصور ہے جبکہ صارم اسے واقعی اپنے ساتھ پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"میں آپ لوگوں کا بہت شکر گزار رہوں گا اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ مجھے آخر کس جرم میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟" جہانگیر نے اب کے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے، میں بھی اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکوں، یا پھر اپنی صفائی میں مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع مل سکے، بغیر اپنا جرم جانے میں اپنے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟..... تاہم میں اپنی سچائی کا اس حد تک ثبوت تو دے سکتا ہوں کہ اب جبکہ خالہ صغیرہ بانو کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو ان سے میرے کردار کے بارے میں تسلی کی جا سکتی ہے۔"

افسر راشدہ شیخ نے صفیہ سلطانہ پر ایک نگاہ ڈالی، پھر ایک گہری ہنکاری بھرنے کے بعد جہانگیر کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "صارم نامی یہ شخص، صفیہ سلطانہ کو بلیک میل کر رہا تھا اور یہ پانچ لاکھ کی خطیر رقم بھی ان سے اینٹھ چکا ہے، دوسری بار اس نے ان سے دس لاکھ کی رقم کا مطالبہ کیا تھا مگر عین وقت پر ہم نے اسے رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا، اس کا کہنا تھا کہ تم بھی بلیک میلنگ کے اس کھیل میں اس کے ساتھ شامل ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ....." جہانگیر یک دم جوش میں آ کر بولا۔ اس کے دل میں صارم کے خلاف نفرت کی لہر سی ابھری تھی۔

"میں تو خود اسے سخت ناپسند کرتا ہوں، نہ ہی ہم نے آج تک ایک دوسرے سے بات تک کی ہے کبھی؟"

"تو پھر یہ تمہارا نام اور تمہیں کیسے جانتا ہے؟" صفیہ سلطانہ نے پوچھا۔

"ہاں! یہ مجھے جانتا ہے، مگر میں اسے نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟..... اپنی بات کی وضاحت کرو....." راشدہ شیخ نے گہری متانت سے کہا۔

"اس کے لیے آپ خالہ صغیرہ بانو کی بیٹی....." جہانگیر کسی خیال سے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

صفیہ سلطانہ اپنی بیٹی میرال کے تذکرے پر کچھ بے چین سی ہو گئی۔ "تم کہیں میرال کے متعلق تو نہیں بات کر رہے ہو؟"

"جج..... جی..... مم..... مگر..... وہ دونوں ماں بیٹی شریف عورتیں ہیں، میں نہیں چاہتا کہ وہ تھانے کچہریوں کے چکروں میں پڑیں۔" اس کے جواب نے صفیہ سلطانہ کو بے حد متاثر کیا۔ وہ بولی۔

"اچھا تم یہ بتاؤ پھر یہ بدخصلت شخص صارم تمہیں کیسے جانتا ہے؟..... ذرا کھل کر بات کرو، یہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔"

تب جہانگیر کو اس خاتون کے لہجے اور بات سے حوصلہ ہوا، اور پھر اس نے بتا دیا کہ صارم نے یقینی طور پر میرال کو اپنی محبت کے جھانسے میں پھنسا رکھا ہے اور میرال بھی اب اس کی محبت کا دم بھرنے لگی ہے جبکہ وہ یعنی جہانگیر خود پہلے ہی سے صارم کے کردار و شخصیت کے سلسلے میں مشکوک تھا۔

جہانگیر کی یہ باتیں غور سے سنی گئیں، بالخصوص صفیہ سلطانہ کے چہرے پر سوچ کے تاثرات نمایاں ہو گئے تھے، اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ جہانگیر سے متاثر ہو رہی تھی، افسر راشدہ شیخ نے بھی یہی بات محسوس کی تھی۔

پھر کچھ سوچتے ہوئے صفیہ سلطانہ نے افسر راشدہ شیخ سے جہانگیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ممکن ہو سکے تو میں اس لڑکے کی ضمانت دے سکتی ہوں۔"

افسر راشدہ شیخ نے پُرخیال انداز میں اپنے سر کو ہلکی

سی اثباتی جنبش دی، اس کے بعد جہانگیر کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے چھوڑ دیا گیا جبکہ صارم کو دوبارہ حوالات بھیج دیا۔ صفیہ سلطانہ نے بھی راشدہ شیخ کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت لے کر جہانگیر کے ساتھ ہی باہر اپنی کار کی طرف بڑھی۔

جہانگیر نے رہا ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا، تاہم ابھی اس کی یہ الجھن دور نہیں ہوئی تھی کہ آخر صارم، صفیہ سلطانہ نامی اسی خاتون کو کیوں اور کس بات پر بلیک میل کر رہا تھا؟ بہرطور..... جہانگیر کا اب پہلے فرض بنتا تھا کہ سب سے پہلے خاتون کا شکریہ ادا کرے، لہٰذا اس کے ہمراہ پولیس ہیڈ کوارٹر کے احاطے میں آ کر اس نے صفیہ سلطانہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ صفیہ سلطانہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنی کار کا دروازہ کھولنے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ سہ پہر کے چار بجنے والے تھے، مبارک احمد بزنس ٹرپ پر ایک دن کے لیے "آؤٹ آف سٹی" تھے۔ آج چھٹی تھی، بچے بھی گھر پہ ہی تھے۔ صفیہ نے یہاں آتے آتے، شاہانہ پیلس انہیں فون کر کے اپنے تھوڑی دیر بعد آنے کی اطلاع دے دی تھی۔

اس نے جہانگیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم مجھے ایک اچھے انسان معلوم ہوئے اور تمہاری باتوں سے مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ تم بے قصور ہو اور تمہیں صارم جان بوجھ کر اپنے ساتھ پھنسانا چاہتا ہے۔" پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ "ایک بات بتاؤ، کیا واقعی صغیرہ بانو کی بیٹی میرال اور صارم ایک دوسرے کے اتنا قریب آ چکے ہیں کہ جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے؟"

"جی بالکل! مگر مجھے صارم شروع ہی سے ناپسند تھا، آج اپنی آنکھوں سے میں نے اس کے کرتوت بھی دیکھ لیے، مگر آنٹی! افسوس تو اس بات کا ہے کہ میرال اس خبیث لڑکے سے واقعی محبت کرتی ہے، یہ جانے بغیر کہ وہ کس قماش کا انسان ہے۔"

"ہوں....." صفیہ سلطانہ نے پُرسوچ ہنکاری بھری۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "لیکن اب تو تم نے خود دیکھ لیا ہے کہ صارم کی اصل حقیقت کیا ہے؟..... اب تو تم میرال کو بتا سکتے ہو کہ..... صارم کس کردار کا مالک ہے؟"

"وہ میری بات کا کبھی بھروسا نہیں کرے گی؟" جہانگیر نے ہولے سے اپنا سر جھکا کے کہا۔

"کیوں؟..... تم تو اس کے محلے دار ہو اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم اس کے گھر بھی آتے جاتے ہو، ان کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے رہتے ہو؟" صفیہ سلطانہ نے پوچھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے آنٹی!....." جہانگیر نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور اضافہ کیا۔ "میرا جو محلے داری کا فرض بنتا ہے، وہ میں دیانت داری سے نبھاتا ہوں اور صرف خالہ صغیرہ بانو ہی کے نہیں بلکہ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر میرال کو میں جانتا ہوں، صارم کے حوالے سے شاید وہ میری طرف سے شدید غلط فہمی کا شکار رہنے لگی

حسد

علم نحو کا امام اصمعی بہت بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن صحت و توانائی قابل رشک تھی۔ کسی نے پوچھا حضرت! آپ کی عمر کیا ہے؟

اصمعی نے جواب دیا۔ "ایک سو بیس سال!"

اُس شخص نے حیرت سے کہا: "اول تو اتنی لمبی عمر ہر ایک کو ملتی نہیں، اس پر قابل رشک صحت و توانائی۔ آخر اس صحت کا راز کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیے؟"

اصمعی نے جواب دیا۔ "اس کا کوئی راز نہیں۔ زندگی کی قاتل ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے "حسد" میں زندگی بھر اس سے دور رہا ہوں۔"

مرسلہ:
عمران بھٹہ۔ سیالکوٹ

"کیا بات ہے آج سیٹھ سرکار بھائی اتنے اُداس اُداس کیوں ہیں؟"

"صدمہ ہی ایسا پہنچا ہے، کوئی چھوٹے دل والا ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔"

"کیا کسی کا انتقال ہو گیا ہے؟"

"انتقال پر تو صبر آ جاتا ہے، ہمارے سرکار بھائی کو پانچ لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا ہے۔"

"پانچ لاکھ کا نقصان؟ کس کاروبار میں؟"

"سیٹھ سرکار بھائی نے کپڑے کی جو مل قائم کی تھی، اُس کے بارے میں تخمینہ لگایا گیا تھا کہ دس لاکھ کا نفع ہو گا، لیکن صرف پانچ لاکھ کا نفع ہوا، ہے نا دل ٹوٹ جانے والی بات؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے..... اور مجھے ناپسند کرتی ہے۔ اب بھی اگر میں اسے صارم کے متعلق بتاؤں گا تو..... وہ..... اسے بھی میری رقابت..... ہی سمجھے گی۔"

"رقابت.....؟" صفیہ سلطانہ کے منہ سے بے اختیار استفہامیہ نکلا تو جہانگیر خفیف سا ہونے لگا۔

"تو کیا تم بھی میرال سے....." وہ پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا....." وہ قدرے جھینپ کر بولا۔ "دراصل میرال ایسا سمجھتی ہے کہ اگر میں صارم سے متعلق اس سے کوئی بات کروں گا تو وہ بالکل غلط ہوگا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے، تم پھر ابھی میرال سے کچھ مت کہنا۔" وہ اس سے بولی۔ "میں خود کل صغیرہ بانو کے ہاں آؤں گی اور خود میرال کو....." صفیہ سلطانہ اچانک کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ اسے اچانک ہی یاد آیا، وہ بھول گئی تھی کہ صارم سے متعلق وہ میرال سے کیا بات کر پائے گی.....؟ کیا اسے یہ بتائے گی کہ صارم اسے بلیک میلنگ کے جرم میں داخل حوالات ہے اور اسے کس بات پر بلیک میل کر رہا تھا؟ شاید نہیں، وہ میرال سے کبھی یہ نہیں کہہ سکتی تھی۔

"آپ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگئیں آنٹی؟" جہانگیر نے استفہامیہ پوچھا۔

"آں..... ہا.....! نن..... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، او کے..... میں چلتی ہوں۔" وہ جلدی سے اپنی کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ جہانگیر کو فوراً ہی کچھ یاد آیا وہ کھڑکی کے قریب آ کے بولا۔

"آنٹی! پلیز! کیا یہ بات مجھے بتانا پسند کریں گی کہ..... صارم آپ کو کس بات پر بلیک میل کر رہا تھا؟"

"خدا حافظ۔" صفیہ سلطانہ نے جواب دینے کے بجائے یہ کہا اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

ایک بڑی پریشانی سے چھٹکارا مل چکا تھا۔ مگر جہانگیر کی زبانی صفیہ سلطانہ کو میرال اور صارم کے مابین جس تعلق کے بارے میں معلوم ہوا تھا وہ ایک نئے تشویش آمیز تفکر میں اسے مبتلا کر گیا تھا۔ میرال بہرحال اس کی بیٹی تھی اور وہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ میرال ایک مجرم ذہنیت رکھنے والے دشمن کے دام الفت میں گرفتار ہو۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ جس طرح جہانگیر کے لیے صارم سے متعلق میرال کو کچھ بتانا مشکل تھا اسی طرح اس کا بھی میرال سے صارم کے جرم کا ذکر کرنا مشکل تو کجا ناممکن ہی تھا۔

پھر وہ کیا کرے؟..... وہ سوچنے لگی۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ اب اپنی بہن صغیرہ بانو سے اس سلسلے میں ذکر کر کے ہی رہے گی۔

وہ اس روز صغیرہ بانو کے ہاں دن کے گیارہ بجے پہنچی۔

"ہائے اللہ میں مرگئی..... اس موئے لڑکے صارم کو کس طرح یہ سب معلوم ہوا؟" صفیہ سلطانہ سے یہ ساری بات سننے کے بعد صغیرہ بانو نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

"اس بات کی تو مجھے بھی حیرانی ہے آپا!" صفیہ سلطانہ پریشانی سے بولی۔ "مگر اب وہ بلا تو ٹل گئی ہے، لیکن اس بات کی اب فکر پڑ گئی ہے کہ میرال بیٹی کو کیسے یہ بتایا جائے کہ وہ جس لڑکے سے محبت کرتی ہے، وہ اچھے کردار کا انسان نہیں ہے۔"

"اے چھوڑو اب اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" صغیرہ بانو نے کہا۔ "وہ موا تو گیا اب لمبے عرصے کو جیل میں، دفع کرو اس موئے کو، اور اس بات کو۔" اس نے کہا۔ صفیہ بھی یہ سوچنے لگی کہ میرال سے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ صارم تو گیا اندر لمبے عرصے کے لیے۔ وہ خود ہی یہ سمجھ کر اسے بھول بھال جائے گی کہ شاید وہ اس سے ناتا توڑ کے کہیں دور جا چکا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس نازک معاملے کو چھیڑے بغیر اسے ادھر ہی دفنا دیا جائے۔

☆☆☆

میرال، صارم کے بغیر پریشان سی ہوگئی تھی، اس کے بغیر پھر اس پر قنوطیت اور چڑچڑاہٹ طاری ہوگئی تھی، آج اسے تیسرا دن تھا، وہ اس سے ملنے تک نہیں آیا تھا اور ان تین دنوں میں میرال اس کے سیل فون پر چھپن سو بار رابطہ کرنے کی کوشش کر چکی تھی، مگر بے نتیجہ..... دوسری جانب سے بدستور اس کا سیل فون آف جا رہا تھا۔ وہ اب صارم کی طرف سے تشویش آمیز تفکر کا شکار ہوگئی تھی، نہ وہ مل رہا تھا نہ ہی اس سے ٹیلی فونک رابطہ ہو پا رہا تھا، میرال اس کی طرف سے سخت پریشانی میں مبتلا تھی، اسے صارم پر پورا بھروسا تھا، وہ اسے اس طرح بتائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا تھا اور پھر اس کی تشویش کی سب سے بڑی وجہ اس کا سیل فون تھا جو مسلسل آف جا رہا تھا۔ اس کے مضطرب دل و دماغ میں طرح طرح کے اندوہناک وسوسے اٹھ رہے تھے، کہیں خدانخواستہ اسے کوئی حادثہ تو نہیں پیش آ گیا تھا؟ مگر وہ اب اسے ڈھونڈے کہاں؟..... آخر اس کے ساتھ ایسا کون سا حادثہ رونما ہوا تھا؟ میرال کو اس بات پر بھی سخت پچھتاوا

ہو رہا تھا کہ وہ صارم کے ٹھکانے سے بھی لاعلم تھی کہ وہ رہتا کہاں تھا؟ اب وہ اسے کہاں تلاش کرے؟..... سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا، وہ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں جہانگیر کے متعلق بھی آیا کہ کہیں، اس نے جوش رقابت میں صارم کو کسی قسم کا کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا.....؟ مگر وہ اسے اس قبیل کا آدمی سمجھتی نہیں تھی، لیکن یہ بھی وہ جانتی تھی کہ معاملہ محبت اور لڑکی کا ہو تو کچھ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

اس روز وہ جہانگیر کے سر چڑھ گئی۔

یہ سنیچر کی صبح آٹھ بجے کا وقت تھا۔ جہانگیر کا باپ ریٹائر ہو چکا تھا، اب اس کی کھٹارا سی موٹر سائیکل مکمل طور پر جہانگیر کے استعمال میں آ چکی تھی، وہ اس میں ڈیوٹی پر جانے کے لیے گھر سے نکلا تو یونیورسٹی کے لیے گھر سے نکلتی ہوئی میرال سے اس کا سامنا ہوگیا۔

"صارم کہاں ہے.....؟" اس نے جہانگیر کو گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ جہانگیر کو میرال کے اس طرح اچانک یہ سوال پوچھنے کی قطعاً کوئی توقع نہ تھی، لہٰذا وہ بری طرح سٹپٹا گیا۔ جھوٹ وہ بھی میرال سے نہیں بولنا چاہتا تھا، مگر وہ اس کے ہسٹریائی مزاج سے بھی واقف تھا کہ ایسے موقع پر وہ کس قدر سرکش اور جذباتی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی پُرسوچ خاموشی پر میرال نے پھر جارحانہ انداز میں اس کی طرف گھور کے پوچھا۔

"میں پوچھتی ہوں، صارم کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟..... وہ اچانک کدھر غائب ہوگیا ہے؟..... ورنہ میں اس کی گمشدگی کی تھانے میں جا کر تمہارے خلاف بھی رپورٹ لکھوا دوں گی، مجھے کم ہمت مت سمجھنا جہانگیر.....!"

جہانگیر کے لیے اب جائے ماندن۔ نا پائے رفتن جیسی مثال صادق ہونے لگی، وہ میرال کے مزاج سے واقف تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنے جس عزم کا اظہار کر رہی تھی، وہ اس پر عمل بھی کر سکتی تھی۔ لہٰذا مختصراً بولا۔

"وہ حوالات میں ہے۔"

"کک..... کیا.....؟" میرال کے سر پر جیسے بم پھٹا۔

"صارم حوالات میں ہے؟..... اور..... اور..... تم نے مجھے بتایا تک نہیں.....؟ کس قدر "چیپ" انسان ہو تم....." اس کے غصیلے لہجے کی نفرت کو محسوس کر کے جہانگیر کا سوختہ دل بکھرنے لگا۔ بولا۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا، لیکن....."

"لیکن کیا.....؟ ہاں.....! تم نے اس لیے نہیں بتایا کہ کہیں میں اسے حوالات سے چھڑانے کی کوشش نہ کر پاؤں؟" میرال نے بڑے نفرت خیز لہجے میں اس سے کہا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی جہانگیر! کہ تم اس حد تک بھی گر سکتے ہو؟ تم تو محبت کا ایک الگ اور بڑا سلجھا ہوا فلسفہ رکھتے تھے۔ بڑی بڑی باتیں کیا کرتے تھے؟ آخر تم نے اپنی شقاوت اور صارم سے نفرت کا زہر اگل ہی دیا ناں؟" وہ سراپا نفرت کی تفسیر بن گئی۔

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو، میرال! پہلے میری پوری بات سمجھ لو۔" جہانگیر نے اپنے دفاع میں کہنا چاہا مگر میرال مارے نفرت و غیظ کے بپھری ہوئی تھی، اسے کچھ بولنے اور کہنے کا موقع دیے بغیر بولی۔

"مجھے پورا یقین ہے جہانگیر! اس میں بھی تمہاری ہی کوئی سازش ہوگی، تم نے ہی صارم پر کوئی جھوٹا الزام لگا کر اسے پھنسوایا ہوگا، تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری اٹوٹ محبت پر یوں گھناؤنے انداز میں شب خون مار کے ہمارے بیچ دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟ ہاں.....! ہرگز نہیں جہانگیر! یہ تمہاری ایک گندی خوش فہمی ہی ہوگی۔"

جہانگیر بڑی کرب ناک اور بے بس نظروں سے لال پیلی ہوتی میرال کا چہرہ تکتا رہ گیا۔

"نہیں، جہانگیر نہیں، میں تمہیں غلط کب سمجھتی آئی ہوں، بالکل ٹھیک ٹھیک سمجھتی آئی ہوں میں تمہیں اب تک....." اس کے لہجے میں نفرت کے ساتھ زہریلا طنز بھی گھلا ہوا تھا۔

بالآخر جہانگیر نے کہا۔ "تو پھر بہتر یہی ہے کہ تم خود تھانہ فیروز آباد جا کر معلوم کر لو کہ حقیقت کیا ہے۔" یہ کہہ کر جہانگیر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

میرال نے اسی وقت تھانہ فیروز آباد جانے کا قصد کیا اور پھر یونیورسٹی جانے کے بجائے منی بس میں بیٹھ کر سیدھی تھانہ فیروز آباد جا پہنچی۔

☆☆☆

اسے صارم سے ملاقات کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

میرال کو وہاں دیکھ کر صارم اس سے نظریں چرانے کے بجائے بہ غور اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ کرنے لگا۔

"صارم! تت..... تم ٹھیک تو ہو ناں! پولیس والوں نے تمہیں مارا پیٹا تو نہیں؟" اسے دیکھتے ہی میرال نے بے اختیار تفکر آمیز تشویش سے پوچھا تو عیار صارم کو تسلی ہوئی کہ میرال اس سے ابھی بددل نہیں ہوئی۔ بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میرال! مجھے اس مار پیٹ کی بالکل بھی پروا نہیں ہے، لیکن جو جھوٹے اور گھناؤنے الزام کی مار مجھے دی گئی ہے، جس کے باعث مجھے تو اپنے آپ سے بھی شرمندگی محسوس ہونے لگی ہے۔" اس کی شاطرانہ اداکاری کی حقیقت سمجھے بنا میرال نے اسے بڑی یقینی محبت کے ساتھ ازراہ تشفی کہا۔

"تم ایسی کسی فکر کو اپنے دل و دماغ میں جگہ مت دو صارم! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، مجھے تم پر پورا بھروسا ہے، میں جان چکی ہوں کہ یہ کس کی سازش ہے؟"

"ہمارے حقیقت جان لینے سے کیا ہوجائے گا، میرال!" صارم نے بڑی مکارانہ فروتنی سے کہا۔

"ایک شریف انسان کا جھوٹے الزام میں پھنس جانا کس قدر عذاب ناک ہوتا ہے، یہ میرا دل جانتا ہے۔ شفاف آئینے کو داغ دار کیا جائے تو وہ اپنا داغ خود نہیں دھو سکتا، تم مجھے بے گناہ سمجھتی ہو تو میں سمجھوں گا میرا داغ دھل گیا۔ مجھے اب کوئی پروا نہیں۔" اس نے میرال کی طرف دیکھ کر اپنی نظروں کو محبت پاش بناتے ہوئے کہا، تو وہ تڑپ کر بولی۔

"تم بے گناہ ہو، مجھے پورا یقین ہے، صارم! بالکل اسی طرح جس قدر مجھے اپنے ہونے پر یقین ہے۔"

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، مگر میرال کی مثال ایسے اندھے انسان کی تھی جو آنکھیں تو چاہتا ہی نہیں تھا، اس لیے کہ وہ جو کچھ دیکھتی اور سمجھتی تھی وہ صرف اور صرف صارم کی آنکھوں سے دیکھتی اور سمجھتی تھی، محبت میں اندھا ہونا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ میرال بھی صارم کی محبت میں اندھی تھی۔

لہٰذا وہ حقیقت کی کھوج کیے بنا اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"تم فکر نہ کرو صارم! میں تمہارے لیے ایک بڑے وکیل کا بندوبست کروں گی۔"

"جانتا ہوں میرال! تم میرے لیے سب کچھ کرسکتی ہو، لیکن میں تمہیں کسی ناممکن کام میں الجھانا نہیں چاہتا، میری بات غور سے سنو کسی وکیل وغیرہ کے چکر میں مت پڑو، تمہیں اس بات کا تو یقین ہو ہی گیا ہے نا کہ، مجھے جھوٹے الزام میں پھنسوانے کے منصوبہ میں تمہاری ماں صفیہ سلطانہ اور جہانگیر کا ہی ہاتھ ہے، وہ دونوں ڈی ایس پی راشدہ شیخ سے بھی ملے تھے، وہ تمہاری ماں کی کوئی بچپن کی سہیلی ہے، تم بھی اب ذرا چالاکی سے کام لو، اپنی ماں پر اب یہ ظاہر کردو کہ تم اس راز سے واقف ہوچکی ہو، اس طرح تم ان کی ایک جذباتی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتی ہو، ابھی ان سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں، اپنا کام نکالو، ان سے میرے سلسلے میں معافی تلافی کی بات کرو، کیونکہ تمہاری ماں نے ہی جہانگیر کے ساتھ منصوبہ بنا کر مجھے پھنسوایا تھا، اب وہی مجھے اس لاک اپ سے باہر نکلوا سکتی ہے۔ ایک بار میں باہر آجاؤں پھر ان دونوں سے نمٹیں گے۔"

سچ کی پوٹ میں جھوٹ کی آمیزش کی جائے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے، میرال کے لیے یہی جان لینا کافی تھا کہ بھلا جہانگیر اور صفیہ سلطانہ، ڈی ایس پی راشدہ سے کیوں کر ملے تھے؟ اور پھر جہانگیر کو صارم کی گرفتاری کا کس طرح علم ہوا؟ بہرطور، میرال نے صارم کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ اپنی ماں صفیہ سلطانہ کے آنے کا انتظار نہیں کرسکتی تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کا اتا پتا اسے معلوم نہ تھا اور ہوتا بھی کیونکر؟ حتیٰ کہ خالہ صغیرہ بانو کو بھی نہیں معلوم تھا، ناچار میرال نے یہ مسئلہ تھانے جاکر صارم سے دوسری ملاقات پر "ڈسکس" کیا تو اس نے فوراً شاہانہ پیلس کا فون نمبر اسے دے دیا۔

میرال نے فوراً اپنے سیل فون پر شاہانہ پیلس کا نمبر ملایا، اتفاق سے دوسری جانب صفیہ سلطانہ نے ہی فون اٹھایا تھا۔

"ہیلو، کون؟"

"میں، میرال بول رہی ہوں، امی جان!" میرال جی کڑا کر کے اور آواز و لہجے میں محبت بھری حلاوت سموتے ہوئے بولی تو دوسری جانب سے چند ثانیوں کے لیے ساکت سی خاموشی چھا گئی، میرال جانتی تھی کہ یقیناً ماں "شاک" میں آچکی ہوگی، وہ دوبارہ بولی۔

"امی جان! میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز نہ تھا، مگر میں نے جب سے یہ راز جانا ہے کہ آپ میری اصل اور حقیقی ماں ہیں، تو یقین جانیے میرا... دل خوشی سے بھر گیا۔ مگر مجھے قلق بھی ہوا کہ آخر آپ نے اب تک مجھے کیوں اپنی ممتا سے دور رکھا..... میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں، آپ کے گلے لگ کے رونا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں یہاں کا ٹیلی فون نمبر کس نے دیا؟" دوسری جانب سے صفیہ سلطانہ نے غیر جذباتی لہجے میں پوچھا جس پر میرال کو تھوڑی حیرت ہوئی تھی، تاہم جواباً بولی۔

"وہ..... وہ..... خالہ صغیرہ نے۔" اس نے جھوٹ بولا تھا۔

"جھوٹ مت بولو، میرال! آپا صغیرہ بانو کے پاس میرا کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں ہے۔" دوسری جانب سے صفیہ

سلطانہ کی سپاٹ آواز ابھری۔ ”سچ کیوں نہیں بولتیں کہ شاہانہ پیلس کا نمبر تمہیں اس بلیک میلر صارم نے دیا ہے۔“

میرال کو ماں کی طرف سے ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ غصہ تو اسے بھی آیا مگر پیتے ہوئے بولی۔

”امی جان! اس نے ہی مجھے نمبر دیا تھا، مگر وہ بلیک میلر نہیں ہے، یہ ساری سازش جہانگیر کی ہے، وہ مجھ سے.....“

”تمہاری عقل پر کیا پردہ پڑ گیا ہے، میرال بیٹی.....؟“ صفیہ سلطانہ کے لہجے میں سپاٹ پن بھی تھا اور ممتا بھری تنبیہ بھی۔ ”جہانگیر ایک شریف لڑکا ہے جبکہ صارم ایک بلیک میلر ہے، تمہاری زبانی یہ راز جان لینے کے بعد اس نے ہی مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی، پھر میں نے ہی اسے پولیس کے ہاتھوں (on the spot) رنگے ہاتھوں پکڑوایا تھا، جہانگیر کو بھلا یہ راز کیسے معلوم ہوسکتا تھا؟ وہ تو اب بھی کچھ نہیں جانتا۔“

ماں کی بات کو میرال تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی، بولی۔ ”جہانگیر اور ہمارے گھر کے بیچ صرف ایک دیوار کا فاصلہ ہے، پھر گھر آنے جانے کی خالہ جان نے اسے جس قدر بلا روک ٹوک آزادی دے رکھی ہے، وہ محلے میں اور کسی لڑکے کو حاصل نہیں، جب میں کان لگا کر اس راز سے آگاہ ہوسکتی ہوں، تو جہانگیر کے لیے بھلا کیا مشکل ہوسکتی ہے۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے کہ جہانگیر مجھے بلیک میل کر رہا تھا؟“ صفیہ سلطانہ نے پوچھا۔

”ہاں! وہ صارم سے رقابت رکھتا ہے، یہ ساری اسی کی سازش ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرال کے لہجے میں جوش اتر آیا تھا۔

”اور..... میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں.....؟“

میرال کے پاس اپنی ماں کے اس سوال کا بڑا سخت جواب تھا، مگر اسے صارم کی ہدایت بھی یاد تھی، موضوع بدل کے بولی۔

”امی جان! صارم کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی، اسے جیل ہوگئی تو میں.....“ فرط رقت سے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکتی تھی، دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ صفیہ سلطانہ ریسیور پکڑے کسی پُرسوچ خاموشی میں مستغرق تھی، وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کی بیٹی کی آنکھوں میں دغاباز صارم کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے، وہ اس کے خلاف کچھ دیکھنا تو درکنار سننا بھی پسند نہیں کرتی اور صفیہ سلطانہ میرال کو کچھ دکھانا چاہتی تھی، مگر کیسے؟

اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

☆☆☆

اس کے اگلے روز صارم شخصی ضمانت پر لاک اپ سے رہا ہوچکا تھا۔

صارم اپنی چالاکی پر بہت خوش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے میرال کو جذباتی کمزوری بنا کر بالآخر صفیہ سلطانہ کو اپنی رہائی کے لیے مجبور کر ہی ڈالا تھا۔ اب وہ تیزی کے ساتھ اپنے منصوبے کے ادھورے رہ جانے والے تار و پود کو دوبارہ مکمل کرنے میں مصروف ہوگیا۔

اس کے سامنے اس کا منصوبہ بالکل واضح تھا، مبارک احمد کی سوتیلی بیٹی سہی، مگر بہرحال وہ صفیہ سلطانہ کی سگی بیٹی تھی اور صغیر سلطانہ ایک بڑے صنعت کار کی بیوی تھی اور اس ناتے میرال کا اپنے سوتیلے باپ کی جائداد و دولت پر کچھ نہ کچھ حق تو بنتا ہی تھا، اس کا منصوبہ مرحلہ وار تھا، پہلا مرحلہ طے ہوچکا تھا، اگلے مرحلے کے لیے، اس نے میرال کو اپنی اس ہدایت کا پابند بنایا کہ وہ اپنی خالہ صغیرہ بانو سے کسی طرح یہ راز بھی جاننے کی کوشش کرے کہ آخر وہ کیا عوامل تھے جن کی بنا پر اس کی ماں صفیہ سلطانہ نے اسے یعنی میرال کو اپنی بہن صغیرہ بانو کی گود میں ڈال دیا تھا۔

لیکن میرال جانتی تھی کہ جب تک وہ اپنی خالہ صغیرہ کے سامنے یہ بات واشگاف انداز میں ظاہر نہیں کرے گی کہ وہ (میرال) بھی اس راز سے بہت پہلے ہی واقف ہوچکی ہے، وہ شاید اسے کچھ بتانے سے کترانے کی کوشش کرے۔

چنانچہ اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ بات انہیں بتادی اور ساتھ ہی یہ اصرار بھی کر ڈالا کہ وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے کہ آخر اس کی حقیقی ماں صفیہ سلطانہ نے کس مجبوری کی بنا پر اسے اپنی بڑی بہن صغیرہ کے سپرد کیا تھا مزید یہ کہ وہ آخر کس کی بیٹی تھی؟ اس کا باپ کون تھا؟

صغیرہ بانو اس سلسلے میں پہلے ہی ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگی تھی اور سمجھتی تھی کہ اب میرال سے کچھ چھپانا بیکار تھا اور حقیقت جاننا اس کا حق بھی بنتا تھا، چاہے یہ حقیقت تلخ ہی سہی.....

☆☆☆

صفیہ سلطانہ اور صغیرہ بانو دونوں سگی بہنیں تھیں۔

صفیہ اپنی بہن صغیرہ کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت تھی، جبکہ صغیرہ بانو واجبی شکل و صورت کی مالک تھی، مگر دونوں بہنوں میں محبت تھی۔ دونوں کا تعلق غریب گھرانے سے تھا، یہ ڈھاکا میں رہتے تھے، باپ کسی کارخانے میں مزدوری کرتا تھا۔

دونوں بہنوں کے مزاج میں نمایاں فرق یہ تھا کہ صغیرہ بانو ایک صابر و شاکر لڑکی تھی مگر صفیہ کے مزاج میں الھڑ پن تھا، وہ کھلنڈری طبیعت کی ایک لاابالی اور قدرے آزاد خیال لڑکی تھی، ضدی بھی تھی، اس ضد کے باعث اس نے ہائر سیکنڈری کے بعد بھی یونیورسٹی تک تعلیم جاری رکھی تھی، جبکہ صغیرہ بانو تو میٹرک کرتے ہی تعلیم کو خیرباد کرچکی تھی اور اس دوران اس کی شادی بھی کردی گئی تھی۔ اس کا شوہر بھی ان ہی کی طرح ایک عام حیثیت کا شخص تھا۔

ادھر صفیہ سلطانہ یونیورسٹی میں ایک لڑکے جمشید رضا کو دل دے بیٹھی تھی، جس کی ابتدا دوستی سے ہوئی جو بعد میں محبت میں بدل گئی، دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جمشید رضا بھی صفیہ سے محبت کا دم بھرتا تھا۔ جمشید رضا ایک خوبرو اور اسمارٹ نظر آنے والا نوجوان تھا۔ وہ ایک بڑے باپ کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔ اس کے باپ کا ڈھاکا میں کاغذ کا بڑا کارخانہ تھا۔

درحقیقت صفیہ اپنی گھٹن آمیز زندگی سے فرار بھی چاہتی تھی اور کچھ اونچے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اپنی بہن صغیرہ کی طرح ایک غربت کی پوٹ سے نکل کر دوسری میں لپٹ کر ساری عمر اپنے مزدور ٹائپ شوہر کے ساتھ چولہا جھونکتے اور تنگ دستی پھونکتے ہوئے گزارے۔ یوں اسے جمشید رضا کی صورت میں اپنے اونچے خوابوں کی تعبیر کا راستہ نظر آیا جو بعد میں سراب ہی ثابت ہوا۔

جمشید رضا ایک فلرٹ ٹائپ نوجوان تھا، خوب صورت لڑکیوں کو اپنی جھوٹی محبت کے جال اور اپنی امیرانہ خوبروئی کے حصار میں پھنسا کر اپنا مقصد پورا کرتا اور پھر نئی تتلی تلاشتا۔ صفیہ بھی اس کے لیے ایک ایسی ہی رنگین اور خوب صورت تتلی ثابت ہوئی۔

جمشید رضا چالاک شخص بھی تھا، صفیہ سلطانہ جیسی خوب صورت مگر غریب طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو پھانسنا اس کے لیے اور بھی آسان ہوتا تھا، مگر یہ وہ بھول گیا تھا کہ ہر لڑکی ایسی نہیں ہوتی جیسی کہ وہ سمجھتا تھا، صفیہ سلطانہ آزاد خیال سہی مگر بے راہ رو ہرگز نہ تھی، ٹھیک ہے اس نے کچھ اونچے خواب ضرور دیکھے تھے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ ایسے خوابوں کی تعبیریں حاصل کرنے کے لیے خود کو کھلونا بنا دے۔ پھر وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی تھی، وہاں شرقیت اور شرافت کا بھی پاس کیا جاتا تھا۔

لیکن اگر شکاری کو ایسے مشکل شکار کو دام میں لانے کے لیے ہتھکنڈے نہ آتے ہوں، تو پھر وہ یوں شکاری ہی کیوں کر کہلائے۔

جمشید رضا بھی اسی میدان کا منجھا ہوا گھاگ شکاری تھا، محبت ہی محبت میں وہ پہلے صفیہ سلطانہ کو پگھلانے لگا اور جب وہ پگھل گئی تو بہ آسانی اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ صفیہ سہاگن بننے سے پہلے کنواری ماں بن گئی، ناچار اس نے بھی آخر تک جمشید رضا سے یہ آس باندھے رکھی کہ وہ متوقع آفت کے نازل ہونے سے پہلے اسے اپنا لے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔

اپنا گھناؤنا مقصد حاصل کرچکنے کے بعد جمشید رضا اس سے کترانے لگا اور ایک دن یہ ہوا کہ وہ اچانک ہی منظر سے غائب ہوگیا۔

ادھر صغیرہ بانو کی شادی کو چوتھا سال تھا، اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

صفیہ پر ہر لمحہ پہاڑ کی طرح بیتنے لگا، ایک جھوٹ کی پوٹ تھی، جسے چھپانا ممکن نہ تھا، گناہ کی تلوار کسی بھی لمحے پھلتی پھولتی پوٹ کو چیرے ڈالنے کے لیے تیار تھی۔

عموماً اس طرح کی بدنامی کا خوف ایک کنواری ماں کو موت سے بھی بڑا محسوس ہوتا ہے اور موت ہی میں اسے پناہ محسوس ہوتی ہے، مگر صفیہ کو اس کی بھی تو ہمت نہ ہوسکی۔

صغیرہ ہی وہ واحد ہستی تھی جس سے اسے اُمید تھی کہ وہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالے گی اور یہ ذکر بھی وہ صرف اس سے کرسکتی تھی۔

صغیرہ نے بھی ”رازداں بہن“ کا فرض ادا کرتے ہوئے اسے یہ ناجائز بچہ ضائع کرنے سے منع کیا اور خود بیمار ہونے کے بہانے خدمت کے لیے صفیہ کو اپنے ہاں بلالیا۔

پھر کسی طرح ایک گمنام چھوٹے میٹرنٹی ہوم میں صفیہ نے ایک چھوٹی سی بچی کو جنم دیا جسے صغیرہ نے اپنے نام کردیا۔ بلاشبہ ایک بہن نے دوسری دکھی بہن کو جس طرح مشکلات جھیل کر اس مشکل سے نکالا تھا۔ یہ وہی جانتی تھی۔

معاملہ یوں اندر ہی اندر رفع دفع ہوگیا۔

اس بن باپ کی بچی کا نام صغیرہ بانو نے میرال رکھا جو اب اس کی بیٹی کہلانے لگی۔ مگر ممتا بھی ایک انوکھی شے ہوتی ہے، جو بطن سے ہی پھوٹتی ہے، صفیہ کو بھی اپنی بچی سے محبت تھی، مگر وہ اسے اب اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتی تھی۔

ابھی شاید قدرت کو اور امتحان منظور تھے، مگر اس امتحان میں کوئی آزمائش نہ تھی، صفیہ پڑھی لکھی اور گریجویٹ تھی، ایک درمیانے درجے کا رشتہ آگیا اور یوں وہ مبارک

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمد کے نام کردی گئی۔

صفیہ سلطانہ جو جاں گسل حالات سے گزری تھی، عموماً اس سے محرومی اور عجیب طرح کا تمرد پھوٹتا ہے، مبارک احمد کی بیوی بنتے وقت اس کے دل و دماغ نے ایک بوجھ ضرور محسوس کیا تھا مگر اس تاویل اور توجیہہ کا کیا کیا جائے جو فرار کا ہر راستہ خود ہی ڈھونڈ لیتی ہے، سو یہ سوچ کر صفیہ سلطانہ نے بھی اپنے ضمیر کو تھپکنا چاہا تھا کہ اسے دھوکا دینے والا اگر ایک مرد تھا تو کیا ہوا، اسی مرد نے اسے دوبارہ سنبھال بھی لیا تھا۔ ایک مرد نے اگر دوسرے مرد کے گناہ کا کفارہ ادا کیا تھا تو پھر اس کی تفصیل و تمہید میں کیوں جایا جائے؟ قرض سے قرض ہی ادا ہوتا تھا تو کیا برا تھا؟

مبارک احمد کسی فیکٹری میں معمولی عہدے پر فائز تھا، مگر مزدور نہ تھا جسے اپنی کمر سیدھی کرنے کا ہی موقع نہیں ملتا، مبارک احمد پڑھا لکھا، ہوشیار اور محنتی انسان تھا، وہ آگے بڑھنا جانتا تھا، یہ بھی کہ وقت کے پہیے پر کس طرح سفر کر کے ترقی کی شاہراہ اوج پر پہنچا جاتا ہے۔

اس نے خوب ترقی کی، کاروبار کے اسرار و رموز سے آشنا ہوا، تو سب سے پہلے اس نے ڈھاکا کو خیر باد کہہ کر کراچی آ کر اپنے چھوٹے کاروبار کی بنیاد رکھی جو خوب پھلا پھولا تھا، ڈھاکا سے کراچی ہجرت کرنے میں مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کا بھی ہاتھ تھا۔

اس دوران صغیر کے ماں باپ بھی مر چکے تھے، لے دے کے ایک بہن صغیرہ بانو ہی بچی تھی، بعد میں صفیہ نے اسے بھی کراچی بلا لیا اور ناظم آباد کے علاقے میں ہی اس کے لیے ایک عدد مکان کا بھی بندوبست کر دیا۔ بدقسمتی سے صغیرہ بانو کے شوہر خورشید خان کا انتقال ہو گیا اور اب صغیرہ بانو اور میرال ہی اس مکان میں رہنے لگے، میرال اب صغیرہ بانو کو ہی اپنی حقیقی ماں سمجھنے لگی تھی، جبکہ صفیہ سلطانہ شوہر سے چھپ چھپ کے اپنی بہن سے ملنے آتی رہی، اسے لگا بندھا خرچہ بھی دیتی رہتی تھی۔

☆☆☆

یہ ساری حقیقت جان لینے کے بعد میرال کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایکا ایکی اسے اپنا وجود اندر کہیں ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ راز جاننے کے بعد اس کا سب کچھ ختم ہو گیا ہو، کچھ بھی باقی نہ رہا ہو، یہ جان لینے کے بعد کہ اس کے وجود کی کوئی حقیقت کوئی شناخت نہ تھی۔ وہ خود کو سراپا احساس ندامت اور شرمندگی کے قصر فنا میں گرتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ ''کاش! میں یہ راز جاننے کی ضد ہی نہ کرتی، یہ بے رحم راز، راز ہی رہتا۔ یہ راز جان لینے کے بعد اب اس کے پاس سر اٹھا کے جینے کو رہ ہی کیا گیا تھا؟ سب کچھ ہی تو جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بڑے کرب کے ساتھ سوچنے لگی۔ وہ ایک بن بیاہی ماں کی بیٹی تھی، بن باپ کی بیٹی تھی، یہ کریہہ حقیقت آج اس کے سامنے آشکارا ہو چکی تھی، وہ کون تھی اور کس کی بیٹی تھی؟ اس کا جواب تو خود اس کے پاس بھی نہ تھا اور ایسے بھیانک سوالات..... کے ساتھ اس زنگ آلود سماج میں جینا کسی حد تک مشکل ہی نہیں اذیت ناک بھی تھا۔

اس کے دل و دماغ میں اپنی ماں (صفیہ سلطانہ) کے لیے نفرت کا جو الاؤ دہکتا رہتا تھا وہ اب یہ راز جان لینے کے بعد سب جیسے بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ پہلے وہ اپنی ماں کو مجرم سمجھتی تھی، اب وہ اسے مظلوم سمجھنے لگی تھی۔

میرال کے اندر زبردست ہلچل مچنا شروع ہو گئی، وہ ایک تباہ کن شکست و ریخت کے عمل سے گزرنے لگی، جاننے اور سوچنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کا مجرم کون تھا؟ جمشید رضا! جس نے اپنی جھوٹی محبت کے نام پر اس کی ماں (صفیہ سلطانہ) کو دھوکا دیا تھا؟ یا اس کی ماں خود..... جو اس کے دھوکے میں آ گئی تھی.....؟ وہ کسے اپنا مجرم کہے؟

''بیٹی! تجھے یہ مکروہ راز جان کر یقیناً صدمہ ہوا ہوگا۔'' معا خالہ صغیرہ نے میرال کے تنے ہوئے چہرے سے اس کے اندر کی جوار بھاٹا کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس سے کہا۔ ''لیکن تیری ضد کی وجہ سے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب بتانا پڑا.....'' یہ کہہ کر خالہ صغیرہ روتی سسکتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

رہائی پانے کے بعد صارم کو پہلے سے زیادہ گل کھلانے کا موقع ہاتھ آیا، اس سے پہلے وہ صفیہ سلطانہ سے گمنام بلیک میلر کی حیثیت سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھنا چاہتا تھا لیکن اب وہ ایسا کھل کے کرنا چاہتا تھا۔ صارم کے منہ کو حرام لگ گیا تھا، وہ صفیہ سلطانہ کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا چاہتا تھا، ایک طرف بلیک میل کر کے دوسری طرف میرال کو اس کی جذباتی کمزوری بنا کر، ویسے بھی شکر خورے کے منہ کو شکر لگ چکی تھی۔ چنانچہ اس نے پھر ایک روز شاہانہ پیلس کا نمبر ملایا۔

حسب توقع دوسری جانب سے صفیہ سلطانہ نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو، خاتون! یقیناً میں اب آپ کے لیے اجنبی نہیں رہا ہوں۔'' صارم بڑی معنی خیز مکاری سے بولا۔

''تم.....!'' دوسری طرف سے صفیہ سلطانہ کی لرزتی آواز ابھری۔

''ہاں! میں، تمہارا شناسا، مہربان، مگر آپ نے تو ہماری قدر ہی نہ کی اور تھانے بھیج دیا۔ پھر دیکھ لو، باہر نکل ہی آیا ناں۔'' صارم کی آواز پُرغرور اور ایک طنز آمیز عداوت لیے ہوئے تھی۔

''اب کیا چاہتے ہو تم؟ میں نے تو تمہیں ضمانت پر رہا کرایا ہے۔''

''تم نے ہی مجھے دھوکے سے پھنسوایا تھا، مجھ پر تم نے کوئی احسان نہیں کیا، سمجھیں تم۔'' وہ پھنکارتی آواز میں بولا۔

''اب کیا چاہتے ہو؟..... کیوں فون کیا ہے مجھے؟'' صفیہ نے لہجے کو پُرسکون رکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''دس لاکھ روپے۔''

''کیا.....؟'' صفیہ کی یوں آواز برآمد ہوئی جیسے اس نے کوئی غیر متوقع بات سن لی ہو۔

''ہاں! پورے دس لاکھ روپے لوں گا، اس بار۔'' صارم سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ تھانے چلے جانے کے بعد میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا۔ ہرگز نہیں خاتون! آخر کو تمہارے اتنے بڑے اور اہم ترین راز کا امین ہوں۔''

''تو گویا تم دوبارہ حوالات میں جانا چاہتے ہو۔'' صفیہ سلطانہ نے بھی بالآخر اس سے یہ کہنے کی ہمت کر ڈالی۔

''اب تم دوبارہ یہ غلطی نہیں کر سکتیں اور نہ ہی مجھے دھوکے سے دوبارہ پولیس کے ہاتھوں رنگے ہاتھوں گرفتار کروا سکتی ہو۔'' وہ پورے یقین اور پُرغرور زعم سے بول رہا تھا۔

''اس لیے کہ تمہاری لاڈلی بیٹی میرال کو تم سے زیادہ مجھ پر بھروسا ہے، اس کا ثبوت تو تم نے بھی دیکھ لیا تھا کہ وہ میری رنگے ہاتھوں گرفتاری کے باوجود مجھے مجرم سمجھنے سے انکاری تھی اور اب بھی تم جتنی کوشش کر ڈالو، میرال کبھی بھی مجھ سے بدظن نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں! وہ تمہاری جھوٹی محبت کے دام میں بری طرح پھنس چکی ہے۔'' صفیہ سلطانہ نے تسلیم کرنے والے انداز میں کہا اور اس کے شکست خوردہ لہجے پر بے اختیار صارم کے ہونٹوں پر پُرغرور مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

بولا۔ ''اور تم جس قدر بھی اسے میری طرف سے

ملاقات

قسمت کا حال جاننے کے لیے ایک مینڈک نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا تو جواب ملا۔ ''عنقریب تمہاری ملاقات ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی سے ہوگی، جو تمہارے متعلق سب کچھ جان لینے کی خواہش مند ہوگی۔'' مینڈک نے خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے دوبارہ سوال فیڈ کیا۔ ''میری ملاقات اس سے کہاں ہوگی؟ کسی پارٹی میں، کسی نہر کے کنارے، کسی جھیل کنارے یا سمندر کا ساحل؟''

جواب ملا۔ ''میڈیکل لیبارٹری میں، چیر پھاڑ کی میز پر۔''

☆☆☆

بلا معاوضہ

ایک روز جنرل منیجر صاحب جلدی دفتر آ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ کلرک ایک کونے میں لیڈی ٹائپسٹ کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف ہے۔ انہوں نے کلرک کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اس کام کی تنخواہ دی جاتی ہے؟''

کلرک نے جواباً مودبانہ عرض کیا۔ ''نہیں جناب یہ کام میں بلا معاوضہ انجام دیتا ہوں۔''

☆☆☆

اکیسویں صدی

ایک صاحب دفتر سے گھر پہنچے تو اپنے چھوٹے بیٹے کو گھر کی دہلیز پر بیٹھے دیکھا۔ وجہ پوچھی تو بیٹے نے جواب دیا۔ ''پاپا..... آپ کی بیوی سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا۔''

☆☆☆

ایک صاحب نے اپنے دفتر کے ساتھی سے پوچھا۔ ''آپ کی بیوی سے آپ کی ملاقات پہلی مرتبہ کس نے کروائی تھی۔''

''بس یہ سمجھ لو کہ اچانک خود ہی مصیبت گلے پڑ گئی، میں کسی کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں چاہتا۔'' ساتھی نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

مرسلہ: قیصر اعوان، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بدل کرنے کی کوشش کروگی، اس کے دل میں تمہارے لیے ہی نفرت میں اضافہ ہوگا۔"

"اس لیے کہ ترپ کا پتا اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔" صفیہ سلطانہ نے شکست خوردہ آواز میں کہا۔

"گڈ! خاصی عقل مند خاتون ہو۔" وہ خوش ہو کے بولا۔ "مجھے پہلے سے یقین تھا کہ اب تمہارے پاس اپنی شکست اور میری بات تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارا نہیں بچا۔ مجھے دس لاکھ چاہئیں، فوراً سے پیشتر....."

"مل جائیں گے تمہیں، لیکن ایک شرط پر۔" دوسری جانب سے صفیہ سلطانہ نے کہا۔

"تم شرط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو، خاتون! مگر پھر بھی سننے کی حد تک مجھے اپنی شرط بتا سکتی ہو۔"

"تمہیں میری بیٹی میرال کا پیچھا چھوڑنا ہوگا۔"

اس کی بات سن کر صارم کے عیار دماغ میں یکلخت ایک اور منصوبہ پرورش پانے لگا۔ دولت بننے کا جو خواب اس نے میرال کو اپنی سگی ماں اور سوتیلے باپ کے خلاف استعمال کر کے دیکھ رکھا تھا، وہ اب ایک شارٹ کٹ سے اسے پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بولا۔

"مجھے بھی میرال سے کوئی دلی وابستگی نہیں ہے، مگر اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ ایک "بگ ڈیل" کرنا پڑے گی پھر میں ہمیشہ کے لیے میرال اور تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" دوسری طرف سے صفیہ سلطانہ نے فوراً کہا۔

"اس کے لیے تمہیں، مجھے ایک کروڑ کی ادائیگی کرنا ہوگی، نقد، بڑے نوٹوں میں۔" صارم بولا۔

"ایک کروڑ بہت زیادہ ہیں، میں پچاس لاکھ دے سکتی ہوں۔" صفیہ سلطانہ بولی۔

"میں جانتا ہوں، تمہیں اپنی بیٹی میرال سے کس قدر محبت ہے اور اس کی طرف سے سخت ذہنی کرب میں مبتلا ہو، ضمیر تمہیں ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ اس لیے تم اس کی بھلائی کے لیے ہر ممکن قدم اٹھانے پر کمربستہ بھی ہو، اس لیے تمہارے لیے یہ سودا زیادہ مہنگا نہ ہوگا۔" وہ چالاکی سے بولا۔ "تم مجھے دو قسطوں میں پوری پے منٹ کر سکتی ہو۔ پچاس ابھی، پچاس بعد میں....."

دوسری طرف سے پُرسوچ انداز کی خاموشی چھائی رہنے کے چند منٹوں بعد صفیہ سلطانہ کی آواز ابھری۔

"ٹھیک ہے، لیکن دوسری قسط میں چھ ماہ سے پہلے نہیں دے سکتی۔"

"پھر پہلی قسط مجھے دو دنوں کے اندر اندر چاہیے۔"

"پچاس لاکھ مجھے تمہیں کہاں پہنچانا ہوں گے؟" صفیہ سلطانہ نے پوچھا۔

"میں اس وقت ہی بتاؤں گا، اب دو دن بعد رابطہ ہوگا۔"

"ایک منٹ، میرا دوسرا سیل نمبر رکھ لو، آئندہ اس نمبر پر مجھ سے رابطہ کرنا۔"

"اوکے۔"

پھر اس نے صارم کو اپنا سیل نمبر دے دیا۔

☆☆☆

دو دن بیت گئے۔ مقررہ وقت آن پہنچا۔

اپنی بیٹی میرال کو صارم کا اصل روپ دکھانے کے لیے صفیہ سلطانہ کے دماغ میں ایک ترکیب سمائی۔ بہ ظاہر یہ ایک عام اور سادہ سی منصوبہ بندی تھی، مگر وہ اس کے خاطر خواہ نتیجے سے پُرامید تھی۔

چنانچہ وہ مقررہ وقت پر سب سے پہلے..... اپنی بہن صغیرہ بانو کے ہاں جا پہنچی۔ وقت ایسا تھا کہ میرال بھی گھر پہ ہی تھی، میرال، ماں کو دیکھ کر شدت جذبات سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ صفیہ کو حیرت ہوئی یہ کیا ماجرا ہے؟ مگر بعد میں صغیرہ نے اسے بتا دیا کہ میرال کی پیہم ضد کے پیش نظر بالآخر اسے میرال کو وہ سب بتانا پڑا تھا، تب صفیہ کو بھی بیٹی کے کرب کا اندازہ ہوا، مگر باوجود اس کے اس نے میرال کو صارم کا اصل چہرہ دکھانے کی ٹھانے رکھی تھی۔ جس کے متعلق میرال اب بھی ابہام کا شکار تھی۔ لہٰذا صفیہ نے اسے تسلی تشفی دے کر خود سے علیحدہ کیا اور پھر اپنے سیل فون کا وائڈ اسپیکر آن کر دیا۔ تاکہ اس کی صارم سے ہونے والی گفتگو کو میرال بھی سن سکے۔ اس کے بعد اس نے صارم کے سیل پر اس سے رابطہ کیا۔

میرال یہ سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، شاید اب اسے بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ اب ایک اور کرب انگیز انکشاف سے گزرنے والی تھی۔

صارم کو اپنی ہوشیاری اور شاطر دماغی کا زعم تھا اور شکاری تب ہی مات کھاتا ہے جب وہ حد سے زیادہ اپنے آپ پر اعتماد کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی رابطہ ہوا، صارم نے پوچھا۔

"رقم کا بندوبست ہو گیا؟"

"ہاں!" صفیہ اپنا سیل فون منہ کے قریب کرتے

ہوئے بولی اور ساتھ ہی سامنے بت بنی کھڑی میرال کی طرف دیکھا۔

"رقم کا بندوبست میں نے کر لیا ہے، جگہ بتاؤ رقم تمہیں کہاں اور کس جگہ پہنچانی ہے؟"

"خوب۔" سیل فون کے وائڈ اسپیکر سے صارم کی آواز ابھری۔ "میں تمہیں اپنے فلیٹ کا پتا دے رہا ہوں، ابھی رقم لے کر وہاں پہنچو اور ہاں..... مجھے پورا یقین ہے کہ اس بار تم پہلے کی طرح مجھے دھوکے سے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروانے کی بے وقوفی نہیں کروگی، سمجھیں تم؟" دوسری جانب سے صارم نے تہدیدی لہجے میں صفیہ کو خبردار کیا۔ صفیہ نے اسے تسلی دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور پُرجوش نظروں سے سامنے کھڑی بیٹی کے زرد پڑتے چہرے کی طرف دیکھنے لگی، پھر بولی۔

"بیٹی! شاید اب تمہیں میری بات کا یقین آ گیا ہوگا، لیکن یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ صارم بھی تمہیں وہاں میرے ساتھ دیکھ کر سمجھ لے کہ اب اس کے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے، کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ صارم بھی تمہارے لیے..... دوسرا جمشید رضا ثابت ہو۔ آؤ..... میرے ساتھ بیٹی۔"

میرال کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ادھر صارم، اپنے فلیٹ میں شاداں و فرحاں بیٹھا، بے چینی کے ساتھ صفیہ سلطانہ کا انتظار کر رہا تھا، اس جیسے شخص کے لیے پچاس لاکھ کی پہلی قسط معمولی رقم نہ تھی، پھر محض ایک ماہ بعد پچاس لاکھ کی دوسری قسط بھی اسے ملنے والی تھی، یعنی وہ پورے ایک کروڑ روپے کی مالیت کی دولت کا مالک بن رہا تھا۔ یہی نہیں، صارم، صفیہ سلطانہ کو اب مستقل طور پر اپنے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی بنانا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اب اس کے سامنے بالکل بے بس ہو چکی تھی اور اس کے یقین کی وجہ ایک طرف تو یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر مبارک احمد سے یہ راز چھپائے رکھنا چاہتی تھی کہ میرال اس کی بیٹی تھی، دوسری جانب میرال بھی اس کی کوئی بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی، چنانچہ صارم کے مطابق صفیہ سلطانہ اب اس کے نرغے میں پوری طرح سے پھنس چکی تھی۔

اچانک کال بیل بجی، وہ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے صفیہ سلطانہ کو ایک بریف کیس تھامے کھڑا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی، صفیہ سلطانہ نے اندر قدم رکھا۔ صارم نے اس کے عقب میں دروازہ بولٹ کرنا چاہا تو صفیہ سلطانہ نے فوراً اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔"

صارم معنی خیز انداز میں مسکرایا، پھر للچائی ہوئی نظروں سے صفیہ سلطانہ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھایا، مگر صفیہ نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"پہلے مجھ سے صاف صاف بات کرو، یہ رقم لینے کے بعد تم میرال کے راستے سے ہٹ جاؤ گے اور مجھے بھی بار بار

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلیک میل نہیں کرو گے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" وہ گویا اپنے تئیں دل ہی دل میں صفیہ سلطانہ کی "بے وقوفی" پر ہنس کر بولا۔ "ہمارے درمیان یہی ڈیل ہوئی ہے لاؤ..... اب رقم مجھے دے دو۔"

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ صفیہ سلطانہ ذرا بھی نہ چونکی مگر صارم، میرال کو اپنے فلیٹ کے دروازے پر دیکھ کر ضرور بری طرح چونک گیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اسے صفیہ سلطانہ کی چال کا اندازہ ہوا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

"ص..... صارم.....! تت..... تم..... واقعی.....؟"

میرال یہ کہہ کر ایک سنگین خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کی دم بہ خود نگاہیں صارم کے سفید پڑتے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں، ان میں کرب بھی تھا اور بیتے دنوں کی خوشگوار لمحوں کی یادیں بھی..... ان سنگین نگاہوں کے سامنے سب کچھ پاش پاش ہو رہا تھا۔

جب سب کچھ ختم ہو جائے تو زمین بنجر ہونے کے بعد بے حس ہو جاتی ہے، صارم کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میرال کی پرواہ کیے بغیر کینہ توز نظروں سے صفیہ سلطانہ کی طرف گھورتے ہوئے قہرناک لہجے میں بولا۔

"تم نے دوبارہ مجھے دھوکا دیا۔ میں خود کو بڑا عیار اور شاطر سمجھتا تھا مگر تمہارے ہاتھوں مجھے دوبارہ زک اٹھانا پڑی۔ ٹھیک ہے، اب جبکہ تم نے میرال کے سامنے بھی میرے چہرے سے نقاب ہٹا ہی دی ہے، تو میں بھی تم سے اس کا انتقام لے کر ہی رہوں گا اور اس وقت تمہارے شوہر مبارک احمد سے جا کر....."

"تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، برخوردار!" اچانک دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے مبارک احمد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ صارم کے لیے یہ دوسرا بڑا دھچکا تھا۔ صفیہ سلطانہ کے ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ رقصاں تھی۔

مبارک احمد نے ایک بازو اپنی بیگم صفیہ سلطانہ کے کاندھے پر دھرا اور دوسرا قریب متحیر سی کھڑی میرال کی طرف پھیلا کر پُرشفیق مسکراہٹ سے بولے۔ "آؤ بیٹی!" اور میرال کے دل کے فاصلے جیسے یکلخت گھٹ کر سمٹ گئے اور وہ خود بھی مبارک احمد کے بازو میں جا سمٹی۔

"مجھے اگر صفیہ پہلے ہی یہ سب بتا دیتی تو، میں خوشی اور کھلے دل سے تمہیں بھی اپنی اولاد ہی کی طرح اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتا۔ مگر دیر آید درست آید، شاید تقدیر کو اس شخص کا اصل اور مکروہ چہرہ بے نقاب کرنا تھا، جس کے ساتھ تم آئندہ کی زندگی بتانے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔"

صارم جلتی سلگتی کیفیات میں کھڑا ان سب کو متحیرانہ اور شعلہ فشاں نظروں سے گھور رہا تھا۔

"میں تمہارے منہ پر تھوکتی ہوں صارم! آئی ہیٹ یو۔" میرال نے بڑی نفرت خیز نظروں سے صارم کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور پھر جب مبارک احمد، صفیہ اور میرال کو لیے جانے کو پلٹا تو یکدم پیچھے سے صارم کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔

"رک جاؤ تم سب۔"

یہ تینوں قدرے چونک کر پلٹے تو بے اختیار صفیہ سلطانہ کے حلق سے خوف کے مارے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی، میرال کی آنکھوں میں بھی سراسیمگی اتر آئی۔

صارم کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول تھا جس کی مہیب نال کا رخ ان تینوں کی طرف تھا۔ وہ غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں اگر خالی ہاتھ رہ گیا ہوں تو تم تینوں کو بھی اب جینے کا حق نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سب سے پہلے نال کا رخ پریشان کھڑے مبارک احمد کی طرف کر دیا۔ ان کا چہرہ تاریک ہو گیا، موت انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی اور پھر پستول چلنے کا دھماکا ہوا۔ صفیہ اور میرال کی خوف سے چیخیں نکل گئیں، مگر ان میں ایک مردانہ چیخ بھی شامل تھی اور یہ چیخ..... مبارک احمد..... کی نہیں بلکہ خود صارم کی تھی، اس کے سینے سے خون ابلنے لگا۔

"اس کا یہی انجام ہونا تھا۔"

ایک شناسا آواز عقب سے ابھری تھی، تینوں چونک کر مڑے، دروازے کی چوکھٹ پر جمشید رضا ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ مبارک احمد اور میرال اسے پہچان نہیں پائے تھے لیکن..... صفیہ سلطانہ اسے بھلا کیسے بھول سکتی تھی؟

☆☆☆

صفیہ سلطانہ نے بہت غور و خوض کے بعد بالآخر اس رات اپنے شوہر مبارک احمد سے وہ سب کہہ ڈالا تھا جو ایک خوف زدہ راز کی صورت اس کے سینے میں پوشیدہ تھا۔

انسان کی زندگی میں کبھی ایسا موقع بھی آتا ہے جب مصیبتیں اور پریشانیاں اسے اپنے حصار میں جکڑ لیتی ہیں تو پھر وہ ان سے نکلنے کے لیے ایک آخری جوا ضرور کھیلتا ہے چاہے مجبور ہو کے سہی۔

صفیہ سلطانہ نے بھی ایسا ہی ایک آخری جوا کھیلا تھا اور

مبارک احمد یہ سب سن کر پہلے تو یکدم سناٹے میں آ گئے تھے۔

"میں آپ کی مجرم ہوں، آپ جو سزا دیں مجھے قبول ہوگی، لیکن اللہ جانتا ہے، میں اپنے سنگین ماضی کے اس بدنما داغ کو دھونے کی خاطر آپ کی وفادار بن کر رہی ہوں، آپ کی خاطر میں نے ایک معصوم جان (میرال) کو خود سے دور کر دیا، مگر اب میں نہیں چاہتی کہ جمشید رضا جیسا کوئی اور شخص میرال کو دھوکا دے، معاف تو خدا بھی کر دیتا ہے، آپ میرے مجازی خدا ہیں، میرا سر آپ کے قدموں میں ہے، آپ جو سلوک چاہیں کریں مجھے قبول ہوگا اور اپنے دونوں بچوں عاقب اور حرا کی قسم کھاتی ہوں، اف تک نہ کروں گی، نہ ہی روز حشر آپ سے سوال کروں گی اور اگر اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میری بخشش ہو گئی تو مجھے قسم ہے اسی حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ آپ کے بغیر جنت میں قدم نہ رکھوں گی۔"

اس کی آہ و زاری پر مبارک احمد لرزے کی کیفیت سے دوچار ہو گئے۔ وہ کاروباری معاملات میں بے شک سخت گیر اصول رکھتے تھے۔ مگر ایسے معاملات میں وہ خوف خدا بھی دل میں رکھتے تھے.....

تب انہوں نے بھی صدق دل کے ساتھ انہیں نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ان کی مدد کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

☆☆☆

صارم کے قتل کے جرم میں جمشید رضا کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔

جمشید رضا کون تھا؟ یہ اب کسی سے چھپا نہیں رہا تھا ایک قابل نفرین حوالے سے وہ یاد رکھے جانے کے قابل نہ تھا، بالخصوص صفیہ سلطانہ کے لیے تو وہ ایک انتہائی معتوب شخص تھا، البتہ اس معتوب شخص نے عین آخری لمحات میں اچانک نمودار ہو کے وہ کچھ کر دکھایا تھا جو یاد رکھا جانے والا ایک قابل لحاظ عمل ضرور کہا جا سکتا تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس کی وہاں اچانک اور غیر متوقع موجودگی کا کیا جواز تھا؟

اس الجھے ہوئے سوال نے شاید اور کسی کو نہیں تو صفیہ کو ضرور بری طرح مخمصے میں ڈال دیا تھا، اگرچہ وہ جمشید رضا کو کسی بھی حوالے سے لائق اعتنا نہیں سمجھنا چاہتی تھی مگر یہ پھانس اس کے سینے میں اٹک کر ضرور رہ گئی تھی کہ آخر جمشید رضا کا صارم سے کیا تعلق تھا یا وہ محض اتفاق تھا؟

تاہم پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد صفیہ سلطانہ کو صرف اسی قدر پتا چل سکا کہ صارم، جمشید کا بیٹا تھا۔ اس

> ہم اس وقت مفاہمت کے خواہش مند ہوتے ہیں جب ہم غلطی پر ہوں اور اس وقت انصاف چاہتے ہیں جب دوسرے غلطی پر ہوں۔
>
> تلوار دو قسم کی ہوتی ہے، ایک لوہے کی اور دوسری محبت کی، لوہے کی تلوار ایک کو دو کرتی ہے اور محبت کی تلوار دو کو ایک کر دیتی ہے۔
>
> مرسلہ: حنظلہ خراسانی، بہاولپور

حوالے سے صفیہ سلطانہ کو سخت ذہنی اذیت تو ہوئی تھی مگر اسے یہ دکھ بھی ہوا کہ جمشید رضا نے ان تینوں (مبارک احمد، میرال اور صفیہ سلطانہ) کی جان بچانے کی خاطر اپنے جنونی بیٹے کو گولی مار کے ہلاک کر ڈالا تھا۔

صفیہ سلطانہ کو پہلی بار نفرت کے احساس تلے جمشید رضا کے لیے ایک تاسف آمیز کسک محسوس ہونے لگی، وہ برا سہی، لیکن اس نے اس کے شوہر کی جان بچانے کی خاطر اپنے لخت جگر کو مار ڈالا تھا اور پھر وہ صفیہ سے معافی کا بھی تو خواستگار رہتا تھا، اس نے جو ماضی میں صفیہ کے ساتھ کیا تھا، اب وہ اپنے اس کیے پر نادم بھی تو تھا۔

یہ تھیں وہ سب باتیں جو صفیہ سلطانہ کو کشاں کشاں سلاخوں کے پیچھے مقید جمشید رضا کی طرف لے گئیں۔

جمشید رضا اسے دیکھ کر حیران ہوا پھر سلاخوں کے قریب آ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور اسی طرح جھکے ہوئے سر سے بولا۔ "اگر تم مجھے معافی کا موقع دینے آئی ہو تو تمہارا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھول پاؤں گا۔"

"تم نے اپنے بیٹے صارم کو ہلاک کر دیا؟" وہ اس سے صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

"ہاں!" وہ بولا۔ "لیکن صارم میرا بیٹا نہیں تھا۔"

اس کی بات پر صفیہ سلطانہ نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولتا رہا۔

"ڈھاکا کے سیاسی حالات خراب ہوتے ہی میں بھی مشرقی پاکستان چلا آیا۔ یہاں بھی میرا وہی وتیرہ تھا، یعنی خوب صورت لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر اپنا مقصد نکالتا، لیکن پھر میری گناہ آلودہ زندگی نے پلٹا کھایا..... اس کی وجہ نویرا تھی، وہ ایک دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، میرا ارادہ اس کی دولت پر عیش کرنا تھا اور میں نے ایسا کیا بھی، مگر میں اسے دھوکا دیتا رہا اور اس سے بے وفائی کرتا رہا، کیونکہ نویرا سے شادی کے بعد میں ایک اور لڑکی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلچسپی لینے لگا جو دوسری لڑکیوں سے مختلف تھی، یعنی اس نے اب تک اپنا آپ مجھ پر نچھاور نہیں کیا تھا، وہ مجھ سے شادی کا ارادہ رکھتی تھی، یہ انسان کی فطرت ہے، جو آسانی سے ملتا ہے اسے حاصل کر کے چھوڑ دیتا ہے اور جو نہیں ملتا اسے حاصل کرنے کی آگ مزید بھڑک اٹھتی ہے یہی سبب تھا کہ میں اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کا مطالبہ تھا کہ میں اپنی پہلی بیوی یعنی نویرا کو طلاق دے دوں، جبکہ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ مجھے اس کی دولت کی ضرورت تھی اور رخشندہ کو اس کی پروا نہ تھی، حالانکہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، وہ صرف مجھے چاہتی تھی۔ میں چونکہ رخشندہ کو ہر قیمت پہ حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اپنی دولت مند بیوی کو طلاق دینے کی صورت میں اس کی دولت سے بھی محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ تب میں نے نویرا کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس دوران ہی مجھے ایک افسوس ناک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ جانے کیوں انہی دنوں نویرا اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی، وہ کمزور اور بیمار پڑتی جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی، شاید میری بے رخی یا پھر میری بے وفائی اس پر آشکارا ہو چکی تھی۔

پھر ایک روز اس نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی، وہ بہت حساس تھی، اس نے میرے نام ایک خط چھوڑا جس میں یہی لکھا تھا کہ اسے میرے اور رخشندہ کے بارے میں علم ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی اسی محبت کی خاطر ہی ان کے راستے سے خود ہٹ رہی تھی۔

نویرا کے اس اقدام پر بلاشبہ میرے جیسے بے حس اور سنگ دل آدمی کو بھی دکھ ہوا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بہرطور..... میں نے رخشندہ سے شادی کر لی۔

اب میں واقعی سنجیدہ ہو کر اپنی گھریلو زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ مگر شاید قدرت نے دنیا ہی میں میرے لیے سزا تجویز کر دی تھی۔

رخشندہ کے ساتھ شادی کو کئی سال بیت گئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ہم نے ایک بچہ یتیم خانے سے ایڈاپٹ کر لیا تھا، اس کا نام صارم رکھا۔ ہم اسے حقیقی اولاد کی طرح چاہنے لگے، شاید اسی بے جا لاڈ پیار کے باعث وہ بگڑتا چلا گیا..... اور آوارہ ہو گیا۔ وہ جوان ہو گیا تھا۔

خدا کی قدرت اور انہونی پر کسے اعتبار نہیں؟..... کرنا خدا کا یہ ہوا کہ رخشندہ کو اتنے عرصے بعد ایک بیٹا ہوا اس کا نام سلیم رکھا گیا۔ صارم کے مقابلے میں یہ اپنا خون تھا..... مگر پھر بھی ننھا منا ہونے کے باعث سلیم ہماری توجہ کا مرکز بن گیا۔ جبکہ صارم مزید بگڑتا گیا۔ حتیٰ کہ مجھے اس کی غلط حرکتوں کی وجہ سے تنگ ہو کر اسے اپنے گھر سے بے دخل کرنا پڑا۔

اس دوران اچانک رخشندہ کا ایک کار حادثے میں انتقال ہو گیا، یہ بہت کڑا وقت تھا میرے لیے..... کیونکہ اب ننھے سلیم کی عمر ہی کیا تھی؟ تاہم اس کے لیے میں نے ایک گورنس کا انتظام کر لیا تھا۔ میں نے صارم کو پوری طرح نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اسے لگا بندھا خرچہ دیتا رہتا تھا۔ مگر اس کی دن بہ دن بڑھتی ہوئی آوارگیوں اور غلط لوگوں سے میل جول کے باعث میں اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا اور اب میری توجہ کا مرکز میرا اپنا بیٹا سلیم تھا، جو ابھی بہت چھوٹا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ صارم مجھ سے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کرنے لگا، وہ مجھے تنگ کرنے لگا تو میں نے بھی اسے بالآخر بتا دیا کہ وہ میری اولاد نہیں ہے اور یتیم خانے سے گود لیا ہوا ایک لاوارث بچہ تھا اس پر اس کی سرکشی مزید بڑھ گئی، اس نے مجھے مختلف حیلوں حربوں سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی تنگ آ کر بلاتردد اسے دھمکی دے ڈالی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ زندگی گزرتی رہی کہ اچانک میں نے تمہیں دیکھ لیا۔ اس روز اسکول میں بچوں کا رزلٹ ڈے تھا۔ تمہیں یاد ہوگا۔"

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ ماحول میں یکلخت سنگین سی خاموشی طاری ہو گئی۔ صفیہ سلطانہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ مگر بولی کچھ نہیں، اسے بدستور خاموش پا کر وہ تڑپ کر صفیہ سے بولا۔ "مجھے معاف کر دو پلیز..... صفیہ! شاید پھر خدا بھی مجھے معاف کر دے۔"

"تم نے اپنی ضمانت کا کوئی بندوبست کیا؟" بالآخر صفیہ نے پوچھا۔ اسے اس کے چھوٹے بیٹے سلیم کا خیال آیا تھا۔

"ہاں! میرے وکیل نے مجھے امید دلائی ہے۔ میں بہت جلد بری ہو سکتا ہوں، کیونکہ میں نے تین افراد کے دفاع میں یہ قدم اٹھایا تھا۔"

صفیہ سلطانہ کو تسلی ہو گئی۔ پھر ایک نظر اس نے سلاخوں کے پیچھے کھڑے جمشید رضا کے تھکے ہوئے چہرے پر ڈالی اور فقط دھیرے سے بولی۔

"خدا بھی تمہیں معاف کرے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

☆☆☆

دن صغیرہ بانو کے لیے بھی مسرت بھرا تھا، جب
رال کو ایک حقیقی بیٹی کی صورت میں اپنی ماں صفیہ
مبارک احمد کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس کے گھر
ے اور وہ دن اس کے لیے خوشیوں بھرا تھا، مگر
خوش آئند مسرتوں کا ابھی آخری سماں باقی تھا.....
جہانگیر..... وہ..... جہانگیر سے ملنے اور اس سے
ملنے کے لیے بڑی شدت کے ساتھ بے تاب تھی،
سب کو باتیں کرتا چھوڑ کر، صحن میں آئی اور دیوار کی
پائی کھسکا کر آپا ندرت کے گھر میں جھانکا تو وہاں
اور دم بہ خود سناٹے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔
ندرت کا گھر یوں دکھائی دے رہا تھا، جیسے
سے اسی طرح خالی پڑا ہو۔ میرال کو اپنے سینے میں
را سا محسوس ہونے لگا۔ آپا ندرت کا خالی پڑا گھر،
ت آسیبی نظر آنے لگا۔ پھر وہ جلدی سے چارپائی کو
اتری، اور دیوانہ وار باہر کو لپکی، گلی میں نمودار
دوالے گھر کے دروازے پر سے ٹاٹ ہٹایا اور
ے رہ گئی، ایک استہزائیہ ہنسی کی طرح.....
پہ پڑا تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ سینہ تو گھٹ ہی
سانسیں بھی جیسے تازیانہ بن گئیں۔
کی یہ خزاں گزیدہ کیفیات بھلا خالہ صغیرہ بانو سے
رہ سکتی تھیں۔
موقع پر خالہ نے اسے وہ ایک چھوٹے اور سادہ
ملفوف خط تھما دیا جو ایک روز قبل ہی جہانگیر نے
سی ہمت سے کام لیتے ہوئے خالہ صغیرہ کے ہاتھ
کو دینے کے لیے پکڑا دیا تھا۔ میرال دم بہ خود ہو کر
دستی خط پڑھنے لگی۔
میرال۔
ے نہ بولنے کی کمزوری، میری اس قدر طاقت
گی، مجھے اس کا ادراک اس روز ہو گیا تھا جب میں
روز اپنی دبی ہوئی ہمتوں کو مجتمع کر کے بالآخر
سامنے ایک اظہار کی صورت یہ اعتراف کر لیا تھا
سے محبت ہے..... مگر جب مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ
محبت میں گرفتار ہو تو میں لاشعوری طور پر نہ سہی
ش کے تئیں تمہاری پرائی الفت کے راستے سے
۔ مگر میری یکطرفہ محبت کے ناتے مجھ پر یہ فرض تو
اس کی حفاظت بھی کروں۔
پورے خلوص دل سے تمہیں بہر حال خوش دیکھنا
پتا نہیں یہ میرے مزاج کی کون سی مجبوریت تھی کہ
میرے سر ایک اور سودا سمایا۔ ہاں! میرال! میں تسلی کرنا
چاہتا تھا کہ تمہیں جس سے اس قدر محبت ہے، آیا وہ بھی تم سے
سچا ہے یا نہیں؟ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میری دیوانہ وار محبت
کی کون سی رو تھی، جس پر میں بہہ نکلا تھا اور تمہارے ہاتھوں
مجھے منہ کی کھانی پڑی تھی، صارم کا جب اصل روپ میرے
سامنے آیا تو، تم نے اسے میری سازش پر محمول کیا، اسے
میری رقابت کا شاخسانہ قرار دیا۔ مگر میں نے تمہیں کوئی
دوش نہ دیا۔ صرف تمہارے لیے دعا ہی کر پایا۔
نوکری کے سلسلے میں میری پروموشن کے بعد پوسٹنگ
کسی دوسرے شہر ہو گئی ہے۔ میرا ویسے بھی اب یہاں سے
چلے جانا ہی بہتر تھا۔ سو میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو لے کر
دوسرے شہر جا رہا ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ کاش! تمہیں
کوئی دکھ نہ پہنچے اور تم سدا خوش اور سکھی رہو اور..... جو بے
اندازہ محبت تم نے جس شخص کو اپنی سونپ رکھی ہے، کاش! وہ
بھی اس سچے موتی کی پاکیزگی کو اپنی خوش نصیبی سمجھ کر راہ
راست پر آجائے۔
پورا یقین ہے مجھے اس بات کا کہ تمہارے لیے مجھے
ڈھونڈنا کچھ مشکل نہ ہوگا، مگر جانتا ہوں تمہاری مجھ سے نفرت
کبھی بھی تمہیں میری تلاش کی راہ پر نہیں ڈال سکتی۔ یہی
سوچ کر میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا ہے کہ گھٹ
گھٹ کر زندگی گزارنا ایک گناہ ہی کے زمرے میں آتا
ہے..... تو کیوں نہ ایک ثواب ہی کما لیا جائے۔
میں نے ایک معذور اور بے سہارا عورت سے شادی
کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی نامراد اور یکطرفہ محبت کو
تمہاری محبت سے نہ سہی ایک ثواب حاصل کر لینے سے ہی
بامراد کر لوں..... تمہیں یقیناً میرے اس عجیب فیصلے پر حیرت
ہوگی، مگر اٹل حقیقت یہی ہے۔ اللہ حافظ۔
سدا خوش رہو۔
جہانگیر.....“
خط پڑھ کر میرال نے اپنی پرنم آنکھیں بھینچ لیں.....
بند کناروں سے آب غم ٹپکنے لگا اور جہانگیر کا خط بھیگتا رہا۔
میرال کے لیے، جہانگیر کو تلاشنا واقعی مشکل نہ تھا لیکن
وہ تو اپنی یکطرفہ اور نامراد محبت کے راستے، ثواب کمانے
کے لیے گامزن ہو چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی، کیا، ثواب کا یہ
راستہ روکنا، گناہ کے زمرے میں تو نہیں آئے گا.....؟
وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی..... مگر مقدر کے ستاروں
کی چال کو سمجھنے سے قاصر ہی رہی.....